یورپ مسلمانوں کی نظر میں

برنارڈ لیوس

ترجمہ: مسعود اشعر

یورپ مسلمانوں کی نظر میں

برنارڈ لیوس

ترجمہ:

مسعود اشعر

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

Institute of Islamic Studies
LIBRARY
Punjab University, Lhr.

مندرجات

مغربی زبان میں تاریخ اسلام بہت سے مورخوں نے لکھی ہے۔ اور ان میں سے بہت سی تاریخ کا ترجمہ اردو میں بھی ہوا ہے۔ برنارڈ لیولیس کی موجودہ کتاب "The Muslim Discovery of Europe" ایک انوکھی کتاب ہے۔ ان کی تحریر حقیقت پسندانہ ہے اور ٹھوس ثبوت کی بنیاد پر لکھی گئی ہے۔ اپنی کتاب میں مصنف نے اسلامی معاشرے اور قوم اسلام کے عروج وزوال کا ایک دستاویزی ریکارڈ پیش کیا ہے۔ جس کا طرۂ امتیاز انکی غیر جانب داری، غیر جذباتی اور تجزیاتی حربہ ہے۔

تاریخ نگاری اساسی طور پر معروضی ہوتی ہے۔ یعنی Objective پھر بھی اسکے وجود میں موضوئی مؤرخانہ اسلوب کے بہت سے عناصر شامل ہوتے ہیں۔ جسے انگریزی زبان میں Subjective کہتے ہیں برنارڈ لیولیس ایک معتبر مورخ ہیں۔ نصف صدی سے زیادہ کی مدت سے صرف اسلام اور عرب ممالک کی تاریخ لکھنے میں مصروف ہیں۔ آج انکی عمر نوے سال سے زیادہ ہے۔ یہ اپنی محنت شاقہ سے مرتب کردہ تاریخ کے وسیلے سے ایک مدت تک ہمارے احترام کے مستحق رہینگے۔ انکی کتابوں کا ترجمہ دنیا کی تیس مہذب زبانوں میں کیا جاچکا ہے۔ مگر افسوس اس بات کا ہے کہ انکی ایک بھی کتاب کا ترجمہ اسلامی ممالک کی زبانوں میں ابھی تک نہیں کیا گیا ہے۔ اردو ترجمہ اور بنگالی ترجمہ اسکی شروعات ہے۔ اس ترجمہ میں صرف ہم ہی نے پہل کی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس کتاب کی ایک ایک کاپی پاکستان کی ہر لائبریری میں جگہ پائے تاکہ اردو دان طبقہ کو اپنے جدامجد کی تاریخ کے دور سے آشنا کیا جاسکے۔

جب میں نے پہلی بار "The Muslim Discovery of Europe" کا مطالعہ کیا تو حیران رہ گیا۔ جو باتیں اس کتاب میں لکھی گئی ہیں آج تک دوسرے مورخوں نے نہیں لکھیں۔ ان باتوں نے ہمارے جذبات میں ہلچل مچادی ان میں سے ہم دو تین موضوعات پر روشنی ڈال رہے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہم نے اردو اور بنگالی ترجمہ پر زور دیا ہے۔

۱۔ سنہ ۱۴۹۲ء میں واس کوڈے گاما نے ہندوستان کا پتہ لگایا اور یورپ کے ممالک کے تاجروں نے افریقہ کے جنوبی ساحل سے ایک طویل بحری سفر طے کرنے کے بعد ہندوستان اور دوسرے مشرق بعید ممالک کے ساتھ تجارت شروع کردی اور اسکی خوشحالی میں اضافہ ہونے لگا۔ اسکے ڈیڑھ سو سال بعد مسلمانوں کو احساس ہوا کہ وہ غریب سے غریب ترکیوں ہوتے جارہے ہیں۔ جب یہ احساس ہوا تو اس وقت یورپ کے لوگوں کا معیار زندگی ترکوں اور عربوں کے معیار زندگی سے آٹھ گنا زیادہ بہتر تھا۔

۲۔ جب نپولین نے مصر فتح کیا تو فرانسیسیوں نے عربی زبان میں روزانہ اخبار جاری کیا اور ساری دنیا کی خبریں چھاپنے لگے۔ دنیائے اسلام کی تاریخ میں یہ روزنامہ اخبار کی پہلی اشاعت تھی جبکہ یورپ میں ایک سو سال قبل سے روزانہ اخبار چھپنے کی مثال موجود تھی۔ مصر کے لوگ دور دور کے گاؤں سے دس پندرہ میل پیدل چل کر اخبار پڑھنے کیلئے آنے لگے تھے۔

۳۔ خوددار مصری غیر ملکی فرانسیسیوں سے نجات پانا چاہتے تھے اور محب وطن مجاہد سر پر کفن باندھ کر نکلے اور ارادہ کیا کہ نپولین کا سر قلم کر دینگے۔ مجاہدوں نے ہر ممکن کوشش کی مگر ناکام رہے اور دس پندرہ مجاہد گرفتار کر لئے گئے۔ ان پر مقدمہ چلا جس میں صرف ایک مجاہد کا جرم ثابت ہوا اور اسکو سزائے موت دی گئی باقی مجرموں کو باعزت رہا کر دیا گیا کیونکہ انکے خلاف ٹھوس ثبوت موجود نہیں تھا۔ اس فیصلہ نے مصر کے قاضیوں میں احساس کمتری پیدا کر دیا۔ مصری روائت میں اگر قاتلانہ حملہ بادشاہ وقت پر ہوا تھا تو مشکوک بھی سزائے موت کا مستحق تھا۔

۴۔ سلطنت عثمانیہ کے دور میں چند فرانسیسی جنرلوں اور روسی ایڈمرلوں نے اسلام مذہب قبول کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ آئندہ جنگوں میں جب ترکی اور یورپ میں تصادم ہو تو مسلمانوں کی فتح ہو۔ اور وہ یورپ پر پھر سے حاوی ہو جائیں۔ اس مقصد سے ان افسروں نے مسلمانوں کی فوجی صلاحیت بڑھانے کیلئے اچھی اچھی کتابیں لکھیں۔ مگر حکومت اور سلطانِ وقت نے ان کتابوں کا ترکی اور عربی زبانوں میں ترجمہ کرنے کی اجازت نہیں دی کیونکہ سلاطین اور علماؤں کی نظر میں کافروں کی زبان میں لکھی ہوئی کتابوں کا اسلامی زبان میں ترجمہ کرنا کفر اور گناہ سمجھا جاتا تھا۔

۵۔ جب ترک یورپ کی جنگوں میں شکست کھانے لگے تو ایک فرانسیسی جنرل نے جو نو مسلم تھا ترکی سپہ سالار سے کہا کہ تمہارے فوجی افسر اور سپاہی زمین کے نشیب و فراز سے ناواقف ہیں۔ جس سے انکو پتہ نہیں چلتا کہ کونسا علاقہ پہاڑی ہے اور کونسا علاقہ ترائی میں ہے۔ کونسی ندی مشرق سے مغرب کی طرف بہتی ہے یا جنوب سے شمال کی جانب۔ ایسے نقشوں کی مدد سے فوجی مہم میں آسانی ہوتی ہے۔ ایسے نقشہ کو انگریزی زبان میں Topographic map کہتے ہیں

جب فرانسیسیوں نے اس نشیب و فراز کا نقشہ ترکی کے فوجی افسروں کو دیا تو ایک بھی فرد ایسا نہیں تھا جو اس نقشہ کو سمجھتا۔ آخر میں مجبور ہو کر سلطان ترکی نے اپنے کمیشن افسروں کو حکم دیا کہ تم فرانسیسی زبان سیکھو تا کہ فوجی مہم کیلئے آئندہ جنگوں میں تم کو Topographic maps کے سمجھنے میں آسانی ہو۔ یہ ترکی حکمرانوں کی زندگی میں پہلا موقع تھا۔ جب انہوں نے کافروں کی فرانسیسی زبان سیکھی اور انکے شان و شوکت کو ٹھیس لگی۔

ہمیں امید ہے اس ترجمہ کو نوجوان طبقہ شوق سے پڑھیگا۔ تا کہ ان میں قوم کی خدمت کرنے کا جذبہ پیدا ہو اور وہ جذبات سے زیادہ عقل سے کام لیں۔

(خدا حافظ)

سید عارف علی

اس کتاب کے بارے میں

مسلمان آٹھویں صدی میں یورپ پہنچے۔ استنبول پر قبضے کے بعد مسلم افواج اٹلی اور فرانس تک جا پہنچیں۔ گبن جیسے مغربی مورخ کہتے ہیں کہ اگر 737 عیسوی میں جنوب مغربی فرانس کے مقام پواتیا(Poitiers) پر مسلمانوں کو شکست نہ ہوتی تو آج دنیا کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔ مسلمانوں نے قرونِ وسطیٰ کے پسماندہ اور غیر مہذب اسپین کو تہذیب وتمدن اور ترقی وخوش حالی سے آشنا کیا۔ اسپین میں ہی ادیبوں، شاعروں، مغنیوں اور فلسفیوں کے علاوہ سائنس دانوں اورانجینئروں کی ایک بڑی تعداد سامنے آئی جس نے اس غیر ترقی یافتہ علاقے میں نہایت ترقی یافتہ شہر بسائے اور پورے یورپ میں علم ودانش کے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔

آٹھویں صدی میں ہی بغداد کے عباسی خلیفہ مامون نے یونانی حکما کی تخلیقات کے تراجم کرائے۔ یورپ نے مسلمانوں کی وساطت سے ہی یونانی علوم وفنون تک رسائی حاصل کی۔ مامون کے زمانے میں ''سرالاسرار'' کے نام سے ایک عربی رسالہ لکھا گیا جس کے بارے کہا گیا کہ وہ ارسطو کے ان رہنما اصولوں پر مبنی ہے جو اس نے اپنے شاگرد سکندر اعظم کو بتائے تھے۔ اس عربی رسالے نے ہی میکیاویلی کو اپنی مشہور کتاب ''پرنس'' لکھنے پر اکسایا۔ محمد حسن عسکری تو کہتے ہیں کہ دانتے نے اپنی نظم Divine Comedy کا سارا نقشہ ''فتوحات مکیہ'' سے لیا۔ اسی طرح قدیم یورپ کی کئی کلاسیکی تخلیقات کا مآخذ عربی ادب وروایات ہیں۔ بعد میں عثمانی فتوحات نے ان روایات اور اس تہذیب کو یورپ کے وسیع علاقوں تک پھیلایا۔

یہ ساری فتوحات اور یہ تمام کارنامے اپنی جگہ لیکن سوال یہ ہے کہ مسلمانوں نے یورپ کو کس نظر سے دیکھا؟ انہوں نے یورپی تہذیب کے فکری اور فنی ارتقاء کو کس طرح سمجھا یا سمجھنے کی کوشش کی؟ بلکہ سوال اس طرح ہونا چاہیے کہ یہ کوشش بھی کی یا نہیں؟ یہی موضوع ہے اس کتاب کا۔

برنارڈ لوئیس اسے مسلمانوں کی دریافت کہتا ہے۔ یعنی مسلمانوں نے یورپ کو علمی اور فکری سطح پر کیسے دریافت کیا۔ اس مقصد کے لیے اس نے مسلمان سیاحوں، یورپ جانے والے عام مسلمان مسافروں، مسلمان سفارتی نمائندوں، مسلم مورخوں اور سرکاری حکام، وہاں کے روزنامچوں، روودادوں، رسالوں، کتابوں، مخطوطوں اور خط و کتابت کو کھنگالا ہے۔ اس کی تحقیق و تفتیش کا یہ سلسلہ قریب قریب طلوع اسلام سے شروع ہوتا ہے اور بیسویں صدی کے اوائل تک جاری رہتا ہے۔ مصنف نے اپنا نقطہ نظر ثابت کرنے کے لیے بہت محنت کی ہے۔ ایسے ایسے مخطوطے تلاش کیے ہیں جن تک اس سے پہلے کسی کی رسائی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے مسلمانوں کی اپنی تحریروں سے ہی اپنے دعوے کی بنیاد مضبوط بنائی ہے۔

مصنف کے اس دعوے کو جھٹلانا یقیناً مشکل ہے کہ یورپ کے ساتھ مسلمانوں کا تعلق اور ربط وضبط، خواہ وہ دوستی کا تھا یا دشمنی کا، گیارہ بارہ سو سال رہا لیکن سوائے ابتدائی زمانے کے، مسلمانوں نے یورپ کو سمجھنے اور اس کے دل و دماغ میں اترنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ لیکن وہ خود ہی اس حقیقت کا اعتراف بھی کرتا ہے کہ کوئی قوم اگر سیاسی، معاشی اور معاشرتی طور پر دنیا کے بڑے حصے پر اپنا تسلط قائم کر لے تو وہ خود مرکزیت کا شکار ہو جاتی ہے۔ اور اس کے اندر خود پسندی اور خود نمائی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی مثال آج کے زمانے میں دنیا کی بڑی طاقتوں بلکہ واحد سپر پاور کے بے لگام طرز عمل کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ مسلمان فاتح قوم تھے، انہیں اپنے تہذیب و تمدن اور اپنے علم و فکر پر ناز تھا اور پھر مصنف خود مانتا ہے کہ مسلمانوں کے عروج کے زمانے میں یورپ کے پاس مسلمانوں کو دینے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کے اندر یہ ذہنیت اپنی کامیابیوں اور کامرانیوں کے ساتھ ایسی پختہ ہوتی چلی گئی کہ جب یورپ کے پاس دینے کو بہت کچھ آ گیا تو اس وقت بھی وہ اسے حقارت سے ہی دیکھتے رہے اور اس کی ترقی و خوش حالی کو حقیر اور کمتر ہی گردانتے رہے۔ نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔

مسلمانوں کے مقابلے میں یورپ اور عیسائیوں کے بارے میں مصنف کا دعویٰ یہ ہے کہ انہوں نے ابتدا سے ہی مسلمانوں کے بارے میں جاننے اور ان کی تاریخ اور ان کے طرز فکر کو سمجھنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ اس کتاب میں چونکہ مصنف کا یہ موضوع نہیں ہے اس لیے اس نے بجا طور پر اس پر تفصیل کے ساتھ بحث نہیں کی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یورپ یا مغرب نے بھی ابتدا میں اسلام اور مسلمانوں کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ اس کی تاریخ، اس کے عقائد

اور اس کی علمی و فکری کاوشوں کو مسخ کرنے اور اس کے خلاف نفرت پھیلانے کی ہر ممکن سعی کی تھی۔ یہ سلسلہ پہلی صلیبی جنگ سے شروع ہوا اور کسی نہ کسی حد تک بیسویں صدی تک جاری رہا۔ ان کی تحریروں میں جنگ جو عیسائیوں کے خلاف لڑنے والے مسلمانوں کی جو تصویریں پیش کی گئیں ان میں وہ کسی طرح بھی انسان نظر نہیں آتے بلکہ ایسے سفاک عفریت دکھائی دیتے ہیں جن سے درندے بھی پناہ مانگیں۔ حالانکہ کیرن آرم سٹرانگ کی تازہ تحقیق اس کے برعکس ثابت کرتی ہے۔ عیسائی گھروں میں بچوں کو ایسی ایسی کہانیاں سنائی جاتی تھیں کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت یورپی سائیکی کا حصہ بن گئی جس کا اظہار کسی نہ کسی حوالے سے آج بھی ہوتا نظر آتا ہے۔ مصنف کے دعوے کے برعکس مسلمانوں اور اسلام کو سمجھنے کا حال تو یہ تھا کہ صلیبی جنگوں کے زمانے میں یورپ کو یہ بتایا گیا کہ عربوں نے ہیکل سلیمانی میں ایک بت نصب کیا ہے جس کا نام میہومت (Mehomit) ہے اور مسلمان وہ دوسرے بتوں کے ساتھ اس کی بھی پرستش کرتے ہیں۔ کہا گیا کہ یہ میہومت چاندی کا مجسمہ ہے جسے مقناطیس کے ذریعہ ہوا میں معلق رکھا جاتا ہے۔ ان فرضی داستانوں اور اس افترا پردازی کا واحد مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلائی جائے اور ان کے خلاف جنگی جنون پیدا کیا جائے۔

یورپ کی تحقیق اور تفتیش تو یہ تھی کہ مسلمانوں کو مسلمان یا مسلم ہی نہیں کہا جاتا تھا بلکہ ابتدا میں سارسین اور مور یا ترک کہا جاتا تھا' بعد میں انگریزوں نے اسے محمڈن کر دیا۔ سارسین یونانی لفظ سارا کینوس (Serakenos) سے لیا گیا ہے جو یقیناً عربی کے لفظ مشرق کی یونانی شکل ہے۔ اسی طرح مور شمالی افریقہ کے ان مراوی مسلمانوں کے حوالے سے کہا گیا جنہوں نے اسپین فتح کیا تھا۔ اسپین میں انہیں مورو بھی کہا گیا۔ چونکہ فلپائن پر اسپین کا قبضہ رہا اس لیے وہاں آج بھی مسلمانوں کو مورو کہا جاتا ہے۔

جنگ بازیافت کے بعد عیسائیوں نے اسپین پر دوبارہ قبضہ کیا تو انہیں وہاں ایسا سیاسی' معاشرتی و معاشی نظام ملا جس میں مذہبی یا نسلی منافرت نام کو بھی نہیں تھی لیکن مغرب نے دانستہ طور پر اس سے چشم پوشی کی اور مذہب کے نام پر پکڑ دھکڑ شروع کر دی۔ پھر قتل و غارت کا جو بازار گرم ہوا وہ یورپ کی سفاک تاریخ کا ایک ہولناک باب ہے۔ پروٹسٹنٹ عیسائی فرقے کا رہنما مارٹن لوتھر کیتھولک عیسائیوں کے مقابلے میں زیادہ روشن خیال مانا جاتا ہے لیکن اس نے بھی جب اسلام کو جاننے کی کوشش کی تو وہ بھی یہی انکشاف کرتا نظر آیا کہ مسلمان بت پرست ہیں۔ دراصل یورپ

میں مسلمانوں اور اسلام و مشرق کو جاننے کی سنجیدہ کوششیں اس وقت شروع ہوئیں جب نپولین نے مصر پر قبضہ کیا۔ لیکن اس تحقیق میں بھی مستشرقین نے بعض اوقات جو گل کھلائے ہیں اس کی تفصیل ایڈورڈ سعید کی کتاب Orientalism میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر مزید معلومات درکار ہوں تو مائیکل فریسیتو اور ڈیوڈ آر بلینک کی مرتب کردہ کتاب Western View of Islam in Medieval and Early Modern Europe: Perception پوری طرح رہنمائی کر سکتی ہے۔ لیکن یہ سارے حقائق بیان کر کے میں مسلمانوں کی اپنی کوتاہیوں کے لیے جواز پیش نہیں کر رہا ہوں۔ صرف وہ حقیقت بیان کر رہا ہوں جو واقعی تلخ ہے۔

زیر نظر کتاب کا مصنف برنارڈ لوئیس مشرق وسطیٰ کی تاریخ پر سند مانا جاتا ہے۔ گذشتہ سال وہ اسی 80 سال کا ہوا تو اسے خراج تحسین پیش کرنے کے لیے کئی کتابیں شائع ہوئیں۔ ان میں ایک کتاب The Jew Discovery of Islam بھی ہے۔ برنارڈ لوئیس نے مشرق وسطیٰ اور مسلمانوں پر سولہ کتابیں لکھی ہیں۔ وہ برٹش اکیڈیمی کا فیلو، امریکن فلاسوفیکل سوسائٹی اور امریکن اکیڈیمی آف آرٹس اینڈ سائنس کا رکن ہے۔ نیز انسٹیٹیوٹ دی فرانس کا بھی کارسپانڈنٹ (رکن) ہے۔ آج کل وہ پرنسٹن یونیورسٹی امریکہ میں پروفیسر ایمیرٹس ہے۔ برنارڈ لوئیس کی زیر نظر کتاب اس اعتبار سے اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے کہ اس نے یورپ کے بارے میں مسلمانوں کے طرز فکر کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے مطالعہ سے مسلمان اپنے آپ کو سمجھ سکتے ہیں۔

آخر میں ترجمہ کے بارے میں بھی ایک وضاحت ضروری ہے۔ میں نے یہ ترجمہ آج کے قاری کو سامنے رکھ کر کیا ہے۔ یہ قاری فارسی اور عربی کی کتابوں سے زیادہ انگریزی کتابوں سے واقف ہے۔ اسی لیے میں نے یورپ کے شہروں اور وہاں کے تاریخی مقامات کے وہ نام لکھے ہیں جو آج مستعمل ہیں۔ مسلمانوں نے ان مقامات کو جو نام دیئے تھے وہ پرانی تاریخی کتابوں میں تو محفوظ ہیں لیکن عام طور پر اب وہ استعمال نہیں کیے جاتے۔ میں نے آج کے قاری کو ناموں کی اس الجھن سے بچانے کی کوشش کی ہے۔

مسعود اشعر، لاہور

جنوری 2001ء

پیش لفظ

تاریخ نویسی کی مغربی روایت میں "دریافت" کی اصطلاح عام طور پر اس عمل یا اس اقدام کے لیے استعمال کی جاتی ہے جو یورپ، بالخصوص مغربی یورپ نے پندرھویں صدی سے لے کر بعد کے زمانوں تک باقی دنیا کو دریافت کرنے کے لیے کیا۔ تاہم زیر نظر کتاب کا موضوع دوسرا ہے۔ یہاں موضوع ہے متبادل دریافت۔ یہ دریافت بعض اعتبار سے مغربی دریافت سے مماثلت رکھتی ہے لیکن کچھ اور پہلوؤں سے یہ مختلف بھی ہے۔ یہ عمل مغربی دریافت سے پہلے شروع ہوتا ہے اور اس کے بعد تک جاری رہتا ہے۔ اس عمل میں شامل انجانے اور دور افتادہ مقامات پر رہنے والے وحشی لوگوں کو دریافت کرنے کے شوقین یورپ کے لوگ نہیں ہیں بلکہ یہاں یورپ کے لوگ ہی وہ پراسرار اور خوش نما وحشی ہیں جنہیں عالم اسلام کی سرزمینوں سے آنے والے علم کے جویا لوگوں نے دریافت کیا۔ انہیں دریافت کیا اور ان کا مشاہدہ اور مطالعہ کیا۔ زیر نظر صفحات میں کوشش کی گئی ہے کہ مغرب کے متعلق مسلمانوں کے علم اور اس علم کے ارتقائی مدارج کا جائزہ لیا جائے۔ اس کہانی کا آغاز اس وقت سے ہوتا ہے جب یورپ کی سرزمین پر پہلے مسلمان نے قدم رکھا۔ یہ کہانی جاری رہتی ہے اسلام کے خلاف عیسائی مغرب کے زبردست جوابی حملوں، اس کے جواب میں مسلمانوں کی جہادی جنگوں اور اس کے ساتھ ہی بحیرۂ روم کے ساحلوں پر آباد مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان تجارتی اور سفارتی رابطوں اور قرون وسطی کے خاتمے کے بعد ترکی، ایران اور مراکش میں مسلمان سلطنتوں کی وسعت اور فروغ تک۔ اس عرصے میں مسلمانوں نے یورپ کو عبوری طور پر دریافت کیا۔ اور اس کہانی کا انجام ہوتا ہے اٹھارویں صدی میں جب شرق اوسط کے مسلمان علاقوں پر یورپ زور شور سے اپنا اثر جمانے لگتا ہے۔ یورپی اثرات کے یہ ابتدائی مراحل ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے جس میں مسلمانوں کی جانب سے یورپ کی دریافت ایک مجبوری بن جاتی ہے، یہ ان پر تھوپی گئی ہے اور اکثر و

بیشتر دردناک داستان بھی ہے۔

کتاب کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصے میں اسلام اور مغرب کے رشتوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں جانے پہچانے واقعات کو نامانوس زاویہ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ یہ ہے دشمنی کا زاویہ۔ میں نے توزر اور پواتیا کی جنگوں کو چارلس مارتیل کی نظر سے نہیں بلکہ عربوں کی نظر سے دیکھا ہے۔ اسی طرح پانتو کی جنگ کو ترکوں کی نظر سے اور ویانا کے محاصرے کو محاصرہ کرنے والوں کی نظر سے دیکھا ہے۔ یہ اندازِ تحریر اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ اس میں مسلمانوں کے نقطۂ نظر کو اور اس بیانیہ میں موجود اسلام کے مقام کو اہمیت دی گئی ہے۔

دوسرا حصہ اس موضوع سے متعلق ہے کہ یورپ اور مسلمانوں کے درمیان اظہار و ابلاغ کا ذریعہ کیا تھا۔ ترجمانی کرنے والے کون تھے‘ ترجمہ اور ایک دوسرے کی ترجمانی کیسے ہوتی تھی۔ اس حصے میں سیاحوں‘ تاجروں‘ سفارت کاروں‘ جاسوسوں اور اس طرح کے ایسے دوسرے لوگوں کا ذکر بھی ہے جنہوں نے مسلمان علاقوں سے یورپ کا سفر کیا۔ کچھ توجہ ان لوگوں پر بھی مرکوز کی گئی ہے جنہوں نے ترجمانی کے فرائض ادا کیے‘ یا جو پناہ گزیں تھے یا مسلمان ملکوں کے غیر مسلم باشندے تھے یا یورپ کے نومسلم تھے۔ مسلمانوں کی کتابوں میں مغربی یورپ کی جو تصویر پیش کی گئی ہے‘ بالخصوص تاریخ وجغرافیہ کی کتابوں میں یورپ جس طرح نظر آتا ہے اس حصے کا اختتام اس کی تشریح پر ہوتا ہے۔

کتاب کے تیسرے حصے میں خاص موضوعات سے بحث کی گئی ہے جیسے اقتصادی امور‘ حکمرانی اور عدل وانصاف‘ سائنس اور ٹیکنالوجی‘ ادب اور فنون لطیفہ‘ عوام اور معاشرہ۔

پچھلے چند برسوں میں یورپ کی طرف سے اسلام کی دریافت پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ تاہم ان میں سے اکثر کتابوں میں مسلمان مجہول اور خاموشی سے سر تسلیم خم کرنے والے لوگ نظر آتے ہیں۔ حالانکہ یورپ اور مسلمانوں کے درمیان جو رشتہ رہا ہے‘ خواہ وہ جنگ میں رہا ہو یا امن میں‘ ہمیشہ مکالمے کا رشتہ رہا ہے‘ یک طرفہ کلام کا نہیں رہا۔ دریافت کا عمل دوطرفہ ہی رہا۔ مغرب کے بارے میں مسلمانوں کا تصور بھی اتنا ہی توجہ طلب ہے جتنا اسلام کے متعلق یورپ کا تصور۔ مگر مسلمانوں کے تصور کو بہت کم اہمیت دی گئی ہے۔

مجھے اس کتاب کے لکھنے میں کافی وقت لگا۔ بیس پچیس سال سے بھی زیادہ عرصہ ہوا جب مجھے اس موضوع سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ میں نے اپنا پہلا مقالہ 1955ء میں انٹرنیشنل

کانگریس آف ہسٹاریکل سائنسیز کے اس اجلاس میں پیش کیا تھا جو روم میں منعقد ہوا تھا۔ اس کے بعد دوسرے مقالے لکھے جن میں دریافت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ پھر شمالی افریقہ' مشرق وسطیٰ وغیرہ کی یونیورسٹیوں اور علمی اداروں میں اس موضوع پر لیکچر دیئے۔ ان میں امریکہ کی کئی یونیورسٹیاں بھی شامل ہیں۔ بی بی سی کے تھرڈ پروگرام میں اس موضوع کو زیادہ تفصیل کے ساتھ پیش کیا۔ 1957ء میں کالج دی فرانس میں پانچ لیکچر دیئے۔ ان تمام مقامات پر میرے میزبانوں اور سامعین نے جس توجہ سے میرے خیالات سنے اور بعض اوقات مجھے یہ موقع فراہم کیا کہ میں اپنے خیالات کو زیادہ بہتر بناؤں' اس کے لیے ان کا بے حد شکر گزار ہوں۔

پرنسٹن

20-اپریل 1981ء

رابطے اور اثرات و نتائج

ساتویں صدی کے ابتدائی برسوں میں جب حضرت محمد ﷺ نے دین اسلام کی دعوت دی تو اس وقت تک بحیرۂ روم کا سارا علاقہ عیسائی دنیا کا حصہ تھا۔ بحیرۂ روم کے یورپی، ایشیائی اور افریقی ساحلوں کی آبادی بھی کم و بیش عیسائی مذہب کے مختلف فرقوں پر ہی مشتمل تھی۔ یونانی / رومی مذاہب میں سے صرف دو مذہب باقی رہ گئے تھے۔ وہ تھے یہودی اور مانی مذہب۔ لیکن ان علاقوں کی بہت کم آبادی ان دونوں مذاہب کی پیروی کرتی تھی۔ بحیرۂ روم کے مشرقی ساحلوں پر مشرقی اور رومی سلطنت، جسے مورخین بازنطینی سلطنت کہتے ہیں فروغ پذیر تھی۔ اس کا دارالحکومت کانسٹنٹی نوپل (بعد میں قسطنطنیہ) تھا اور اس کی حکمرانی شام، فلسطین، مصر، شمالی افریقہ کے کچھ علاقوں، ایشیائے کوچک اور جنوبی یورپ پر تھی۔ بحیرۂ روم کے مغربی ساحلوں پر رومی ریاست ختم ہو چکی تھی لیکن سلطنت روما کے کھنڈروں سے انہوں نے جن وحشی لوگوں کو بیدار کیا تھا اور جو سلطنت قائم کی تھی اس نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا اور کبھی کامیابی اور کبھی ناکامی کے ساتھ اس نے رومن ریاست اور عیسائی کلیسا کی ایک شکل برقرار رکھی تھی۔ ادھر عیسائیت کی قلمرو بحیرۂ روم کے علاقوں تک ہی محدود نہیں تھی۔ بازنطین کی مشرقی سرحدوں سے آگے، میسوپوٹیمیا، ایرانی سلطنت کے اہم مرکزی علاقے اور مغربی صوبے ساتویں صدی کے ابتدائی برسوں میں زیادہ تر عیسائی تھے اور اس لیے وہ عیسائی دنیا کا حصہ تھے اگرچہ وہ سلطنت روما میں نہیں تھے۔ حتیٰ کہ عرب میں بھی، روما اور ایرانی سلطنتوں کی سرحدوں کے پار عیسائی اور یہودی اقلیتیں بت پرستوں کی اکثریت کے ساتھ رہتی تھیں۔

632 میں حضرت محمد ﷺ کے وصال کے بعد چند عشروں کے اندر ہی عرب مسلمان ہجوم در ہجوم جزیرہ نمائے عرب سے نکلے اور بازنطین اور ایران کی ان عظیم سلطنتوں پر حملہ آور ہوئے

جنہوں نے مشرق وسطیٰ کو آپس میں تقسیم کر رکھا تھا۔ عربوں نے ان دونوں سے وسیع علاقے چھین لیے۔ ایران کی پوری سلطنت فتح کر کے عرب مملکت میں شامل کر لی گئی۔ سلطنت روما سے عربوں نے شام، فلسطین، مصر اور شمالی افریقہ کا باقی حصہ چھینا۔ یہی علاقے بعد میں اسپین اور بحیرۂ روم کے جزائر بالخصوص سسلی پر عرب حملوں کا مرکز بنے۔ بازنطینی اور غیر یونانی افواج کو شکست دینے کے بعد عرب اس قابل ہو گئے کہ ان ملکوں کو اسلامی قلمرو میں شامل کر لیں۔ اس طرح وہ دونوں جانب سے عیسائی ملکوں کے لیے خطرہ بن گئے۔ مشرق میں شام اور عراق کی جانب سے اناطولیہ پر دباؤ بڑھایا گیا۔ پھر یہی دباؤ یونانی اور عیسائی علاقوں اور بازنطینی سلطنت کے قلب پر ڈالا گیا۔ اس کے ساتھ ہی مغرب میں مفتوحہ اسپین سے عرب اور بربر افواج نے پیرنیز کی طرف پیش قدمی کی۔ چنانچہ سارے مغربی یورپ کے اسلامی سلطنت میں مدغم ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ کچھ عرصے مسلمان فوجیں سسلی اور جنوبی اٹلی پر بھی قابض رہیں۔ حتیٰ کہ روم پر بھی ان کے قبضے کا امکان پیدا ہو گیا تھا۔

مغرب کی تاریخی روایت کے مطابق وہ فیصلہ کن جنگ جس نے مسلمانوں کی پیش قدمی روک دی اور مغربی یورپ کو عیسائیت کے لیے محفوظ کیا، وہ تور اور پواتیا کی جنگ تھی جہاں فرینک فوجوں نے، جن کی کمان چارلس مارتیل کر رہا تھا۔ 732 میں مسلمانوں کو بری طرح شکست دی۔ یہی موقع تھا جب یورپ کے ایک وحدت اور ایک اکائی ہونے کا تصور ابھرا۔

اب یہ احساس پیدا ہوا کہ یورپ کے کسی ایک علاقے کی شکست و فتح سارے یورپ کی شکست و فتح ہو گی۔ گبن کی کتاب Decline and fall of the Romans Empire کا یہ مشہور حصہ اس جنگ کے بارے میں مغربی تصور کی صحیح تعبیر پیش کرتا ہے کہ اگر اس جنگ میں شکست ہو جاتی تو مغرب کا مقدر کیا ہوتا:

> پیش قدمی کرنے والی فاتح افواج کی صف بندی اس طرح کی گئی تھی کہ وہ جبل الطارق سے لُوار کے کناروں تک ایک ہزار میل میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اگر یہی صف بندی آگے تک پھیل جاتی تو سارا سین (مسلمان) پولینڈ کی حدود اور اسکاٹ لینڈ کے پہاڑی علاقوں تک پہنچ جاتے۔ دریائے رائن، دریائے نیل اور فرات سے زیادہ ناقابل عبور نہیں ہے اور عرب بحری بیڑہ کسی بھی بحری مقابلہ کے بغیر دریائے ٹیمز کے دہانے تک پہنچ جاتا۔ اور (آج) غالباً قرآن کی

> تفسیر آکسفورڈ کے اسکولوں میں پڑھائی جا رہی ہوتی، اور اس کے منبروں سے مختون لوگوں کے سامنے حضرت محمد ﷺ پر نازل ہونے والی وحی کی تقدیس اور سچائی کی تصدیق کی جا رہی ہوتی۔(۱)

گبن لکھتا ہے "(صرف) ایک شخص کی غیر معمولی ذہانت اور اس کی قسمت نے عیسائی دنیا کو ان آفات سے بچا لیا۔"

چارلس مارتیل کی کامیابیوں اور تور اور پواتیا کی جنگ کے نتائج کو مسلم روایات میں دوسری طرح دیکھا گیا ہے۔ عربوں کے پاس تواریخ کا وسیع ذخیرہ موجود ہے جس میں جہاد کے مختلف مراحل پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے اور نہایت دیانتداری کے ساتھ فاتحین کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا گوشوارہ پیش کیا گیا ہے۔

یقیناً وہ (عرب) اس حقیقت سے واقف تھے کہ فرانس میں وہ مغرب کی جانب اپنی توسیع کی آخری حد تک پہنچ چکے ہیں۔ بعض مورخین نے ناربون شہر کو، جس پر عربوں کا قبضہ 759 تک رہا، فرینک کی سرزمین پر مسلمانوں کی فتوحات کا آخری مقام قرار دیا ہے۔ بعد میں آنے والے ایک مصنف نے، جو عجائبات کا بہت شیدائی تھا، ناربون کے ایک مجسمے کا ذکر بھی کیا ہے جس پر یہ عبارت کندہ تھی۔ "اسمٰعیل کے بیٹو، واپس چلے جاؤ، یہ آخری حد ہے جہاں تک تم جا سکتے ہو۔ اگر تم مجھ سے پوچھو گے تو میں تمہیں بتاؤں گا کہ تم روزِ حشر تک آپس میں ایک دوسرے کی تکا بوٹی کرتے رہے ہو گے۔" تاہم قرونِ وسطیٰ کے عرب مورخین تور اور پواتیا کا نام تک نہیں لیتے حتیٰ کہ وہ چارلس مارتیل کے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتے۔ اس جنگ کا ذکر بلاط الشہداء، یعنی شارع شہدا کے زیرِ عنوان کیا گیا ہے اور اسے نسبتاً معمولی جھڑپ قرار دیا گیا ہے۔ اس کا ذکر گیارہویں صدی تک کہیں نہیں ملتا۔ اس صدی میں بھی ہسپانوی عرب مورخوں کی تحریروں میں ہی ملتا ہے۔ عربوں کی وقائع نگاری میں اس کا تذکرہ سرسری طور پر ہی کیا گیا ہے۔ شمالی افریقہ اور چین اسپین میں نہایت اہم عرب فتوحات کا وقائع نگار ابن عبدالحکم (871-807) صرف اتنا لکھتا ہے:

> عبیدہ (شمالی افریقہ کا گورنر) نے اسپین کی عملداری عبدالرحمٰن ابن عبداللہ العکی کو سونپ دی۔ عبدالرحمٰن لائق فائق آدمی تھا جس نے فرینک کے خلاف معرکہ آرائی کی۔ وہ لوگ ہسپانیہ کے دور افتادہ دشمن ہیں۔ اس نے کافی مالِ غنیمت جمع کیا اور ان پر فتح حاصل کی۔ اس کے بعد وہ ایک اور مہم پر روانہ ہوا اور اس

نے اور اس کے رفقاء نے جام شہادت نوش کیا۔ اس کی شہادت 115 ہجری (34-733) میں ہوئی۔" (2)

دوسرے مورخین بھی اسی طرح بہت مختصر تذکرہ کرتے ہیں: قابل ذکر بات تو یہ ہے کہ طبری (وفات 923) جو مشرق کا نہایت ہی اہم عرب مورخ ہے اور ابن القطیہ جو مسلم ہسپانیہ کا ممتاز مورخ ہے، دونوں ہی تو از اور پواتیا کی جنگ کا قطعاً حوالہ نہیں دیتے۔

تاہم ایک بات ہے۔ مسلم تاریخ نویسی کی روایت میں تورز اور پواتیا کی جنگ کو تو نظر انداز کیا گیا ہے یا اس کا ذکر سرسری طور پر کیا گیا ہے لیکن اس کے برعکس اسی دور میں کانسٹنٹی نوپل (قسطنطنیہ) کو فتح کرنے کے لیے عرب کوشش پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اس شہر کے ناکام محاصروں اور اس پر حملوں کی بہت داستانیں بیان کی گئی ہیں۔ یہ داستانیں تاریخ کی کتابوں میں ہی نہیں ملتیں بلکہ سینہ بسینہ چلنے والی روایتوں میں بھی ان کا بہت ذکر ہے۔ اس جنگ کے بعض معرکے اور واقعات اس طرح بیان کیے جاتے رہے ہیں جیسے مسیح موعود کا زمانہ آنے ہی والا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پواتیا کو نظر انداز کر کے اور قسطنطنیہ پر زیادہ توجہ دے کر مسلمان مورخین نے ان واقعات کو مغربی مورخوں کے مقابلے میں زیادہ صحیح تناظر میں دیکھا ہے۔ پواتیا میں عیسائی افواج کا مقابلہ ایک ایسی مسلمان فوج سے ہوا جسے زیادہ سے زیادہ ایک گروہ کہا جا سکتا ہے جو اپنی سرحدوں سے ہزاروں میل دور کسی پشت پناہی کے بغیر لڑ رہا تھا۔ عیسائیوں نے ایک ایسے جیش پر قابو پالیا جو اپنی آخری حد تک پہنچ چکا تھا اور اپنی ساری توانائیاں ضائع کر چکا تھا۔ اس کے مقابلے میں قسطنطنیہ کا دفاع کرنے والے یونانیوں کو خلیفہ کی افواج کے تازہ دم دستوں سے مقابلہ کرنا پڑا جنہوں نے اپنی قلعہ بندیوں سے دشمن کے دارالحکومت پر زبردست حملہ کیا تھا۔ یونانیوں کا مقابلہ ایک مضبوط اور طاقتور فوج سے ہوا جس کی پیش قدمی انہوں نے روک دی۔ گبن کے بقول جبل الطارق سے موار تک کا فاصلہ ایک ہزار میل سے زیادہ ہے۔ لیکن جبل الطارق عرب سرزمین سے کئی ہزار میل دور ہے۔ عربوں کے لیے مشرقی یورپ کے راستے دریائے رائن تک پہنچنا زیادہ آسان تھا۔ یہ راستہ اس راستے سے بہت کم دشوار گزار تھا جو انہوں نے آمو دریا اور چین کی سرحدوں تک پہنچنے کے لیے اختیار کیا تھا۔ یہ قسطنطنیہ کو فتح کرنے میں عرب افواج کی ناکامی ہی تھی جس نے مشرقی اور مغربی دونوں سلطنتوں کو بچا لیا تھا تو از اور پواتیا کی اس جنگ کا اس میں اتنا دخل نہیں تھا جس میں عرب حملہ آوروں کو شکست ہوئی تھی۔

عرب ان دونوں عیسائی سلطنتوں کا فرق بخوبی جانتے تھے۔ بازنطین کے لیے وہ روم (Rum) کی اصطلاح استعمال کرتے تھے۔ بازنطین اپنے آپ کو سلطنت روم (Rome) کہتے تھے اور اس کے باشندے رومن کہلاتے تھے۔ آج تک اسلامی زبانوں میں یونانیوں کو رومی اور سابق بازنطینی سلطنت کے علاقوں کو ارض روم کہا جاتا ہے۔ عرب یونانی زبان کو رومی کہتے ہیں اور اتفاق کی بات یہ ہے کہ خود یونانیوں میں بھی یونانی زبان کی جو عیسائی شکل ہے اسے اکثر رومائیکے کہا جاتا ہے۔ کہنے والوں میں بازنطینی بھی شامل تھے اور آج کل کے لوگ بھی۔ عرب جغرافیہ داں بھی اس حقیقت سے ناواقف نہیں تھے کہ اٹلی میں ایک شہر کا نام روم ہے۔ تاہم ان کے لیے اس کی زیادہ اہمیت نہیں تھی۔ ان کے لیے باسفورس کے کنارے آباد علاقے زیادہ اہم تھے۔ ویسے بھی اٹلی کا شہر روم عربوں میں زیادہ مشہور نہیں تھا۔

قسطنطنیہ میں شکست کھانے کے بعد بھی مسلمان فوجیں اپنی سلطنت کی مشرقی اور مغربی دونوں سرحدوں پر مسلسل پیش قدمی کرتی رہیں۔ لیکن وہ اپنی سلطنت کی توسیع میں آخری سرحد تک پہنچ گئی تھیں۔ مغرب میں 827 اور 902 کے درمیان سسلی کی فتح اُن کی واحد کامیابی تھی۔ مشرق میں ہندوستان اور چین کی سرحدوں پر مسلمانوں کی پیش قدمی رک گئی تھی۔ وسط میں بازنطین کی سرحدوں پر نسبتاً سکون رہا اور قسطنطنیہ کی فتح مستقبل بعید تک ملتوی ہوتی رہی۔

عیسائیوں کے خلاف جہاد کا پہلا مرحلہ عملاً ختم ہو چکا تھا۔ ابتدائی فاتحین کا جوش و جذبہ بہت عرصے پہلے ٹھنڈا پڑ چکا تھا اور مال غنیمت یا شہادت کے لیے ان کا شوق بھی پورا ہو چکا تھا۔ آٹھویں صدی کے وسط میں بنو اُمیہ کے بعد آنے والے عباسی خلفاء نے شام سے اپنا دارالحکومت مشرق کی جانب بغداد منتقل کر دیا تھا۔ اس طرح انہوں نے خلافت کو بحیرۂ روم سے منسلک کرنے کے بجائے ایشیاء سے منسلک کر دیا تھا۔ مذہبی جنگوں یا جہاد کے ساتھ ان کی دلچسپی برائے نام ہی تھی۔ اسی طرح انہیں مشرقی سرحدوں کی بھی زیادہ فکر نہیں تھی۔

کچھ عرصے کے لیے بحیرۂ روم کے ساحلوں پر واقع کئی اسلامی ریاستوں نے یورپ کی عیسائی ریاستوں کے خلاف جدوجہد جاری رکھی۔ لیکن جلد ہی ان کی توجہ کافروں کے خلاف جہاد کے بجائے اپنے داخلی مسائل کی طرف مبذول ہو گئی۔ ابتدائی دور سے ہی عالم اسلام کے اندر فرقہ وارانہ اختلافات موجود تھے۔ یہ اختلافات سنی اکثریت اور شیعہ اقلیت کے درمیان تھے۔ سنی عقیدے کا مرکز بغداد میں تخت نشین عباسی خلفاء تھے۔ شیعہ عقیدے کے لوگ مختلف گروہوں میں

بٹے ہوئے تھے۔ لیکن سب شیعان علی کے نام پر اکٹھے تھے۔

یہ لوگ سُنّی اجماع اور سنی خلیفہ دونوں کی شرعی حیثیت کو نہیں مانتے تھے۔ دسویں صدی میں سنی خلافت کا مدمقابل ایک فرقہ فاطمی سامنے آیا۔ اس نے پہلے تونس میں اور پھر مصر میں اپنی حکومت قائم کی اور عباسیوں کے مقابلے میں خود سارے عالم اسلام کی خلافت کا دعویٰ کیا۔ فاطمیوں سے پہلے بھی بعض علاقوں میں چند خود مختار حتیٰ کہ آزاد حکمران بھی رہے تھے لیکن وہ زبانی طور پر ہی سہی عباسی خلفاء کو اپنا خلیفہ مانتے تھے۔ فاطمیوں نے ایسا بھی نہیں کیا۔ اس کے برعکس انہوں نے اپنے آپ کو جائز خلیفہ قرار دیا اور اعلان کیا کہ وہ عباسی خلفاء کو جنہیں وہ غاصب کہتے تھے، خلافت سے نکال باہر کریں گے۔ چنانچہ اب ایک کے بجائے مسلمانوں کے دو خلیفہ بن گئے جبکہ جلد ہی ان کی تعداد تین ہو گئی کیونکہ فاطمیوں کی بڑھتی ہوئی توسیع پسندی اور شر انگیزی کے خطرات سے خوف زدہ ہو کر ہسپانیہ میں غرناطہ کے اموی امیر نے بھی اپنے علاقوں میں اپنے خلیفہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس طرح مذہبی اختلاف و افتراق اور خلفاء کی باہمی آویزشیں عالم اسلام کا اصل مسئلہ بن گئیں اور سرحدوں پر ہونے والی کشمکش کو فراموش کر دیا گیا۔ سنی اور شیعہ دونوں فرقوں میں یہ احساس عام ہو گیا کہ کامیابیوں اور کامرانیوں کا دور گذر چکا' اسلام اور عیسائیت کی سرحدیں مستقل اور پختہ ہو چکیں اور اب غیر مسلم مملکتوں کو تسلیم کرنا حتیٰ کہ ان کے ساتھ سفارتی روابط قائم کرنا بھی ناگزیر ہو چکا ہے۔

لیکن مسلمانوں کی طرف سے تو جہاد ختم ہو چکا تھا مگر عیسائیوں کی صلیبی جنگیں اب شروع ہو رہی تھیں۔ عیسائی اس بات کو نہیں بھولے تھے کہ مسلمانوں کی سلطنت کا ایک حصہ ان علاقوں پر مشتمل ہے جو کسی زمانے میں عیسائی علاقے تھے۔ اور ان میں وہ مقدس سرزمین بھی شامل ہے جہاں عیسائی مذہب نے جنم لیا تھا۔ عیسائیوں کو جوابی حملے کا حوصلہ اس لیے بھی ہوا کہ مسلمان اختلاف و افتراق کا شکار تھے اور ان کی کمزوری سب پر عیاں ہو چکی تھی۔ مسلمانوں کی سلطنت پر پہلی چڑھائی ان لوگوں کی طرف سے ہوئی جو مسلمان تھے نہ عیسائی۔ مشرق میں وہ خزار ترک تھے اور مغرب میں وائکنگ۔ یہ دونوں بت پرست تھے۔ لیکن یہ جھڑپیں بہت مختصر تھیں اور جلد ہی ان کا خاتمہ ہو گیا۔ اس سے زیادہ اہم حقیقت یہ تھی کہ عیسائی اپنی طاقت مجتمع کر رہے تھے اور ان کے اندر یہ عزم پیدا ہو رہا تھا کہ کھوئے ہوئے عیسائی علاقے دوبارہ فتح کیے جائیں۔

عیسائیوں کی ازسرنو فتح مندیوں کا آغاز ان علاقوں کی آخری حدود سے ہوا۔ اسپین

ایک چھوٹی سی عیسائی مملکت تھی۔ جس نے جزیرہ نمائے آئبیریا میں بڑی مشکل سے اپنا وجود برقرار رکھا ہوا تھا۔ اس مملکت نے دور شمال میں اپنے آپ کو مستحکم کرنے اور اپنے علاقوں کو توسیع دینے کی مہم شروع کی۔ اس مہم میں فرینک اور نارمن فوجوں نے اس کا ساتھ دیا۔ انہوں نے مسلمان علاقوں پر حملے شروع کیے۔ ادھر مشرق میں کاکیشیا کے علاقوں جارجیا اور آرمینیا کے عیسائیوں نے اپنے مسلم حکمرانوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ حتیٰ کہ دسویں صدی کے آخری نصف میں بازنطین کے لوگوں نے بھی اپنے کھوئے ہوئے علاقے حاصل کرنے کے لیے میسوپوٹیمیا شام اور یونانی جزیروں پر حملے شروع کر دیئے۔

گیارہویں صدی کے دوران میں عیسائی افواج نے مسلمانوں کے خلاف بڑی بڑی فتوحات حاصل کرلیں۔ مشرق میں جارجیا کی عیسائی سلطنت نے مسلمانوں کی پیش قدمی کا مقابلہ کیا اور اپنی سلطنت کی توسیع کے ایک نئے دور میں داخل ہوگئی۔ اس عرصے میں اس نے بحیرۂ اسود اور کیسپیئن کے درمیان ماورائے کوہ قاف کے تمام علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ بحیرۂ روم کے وسطی علاقوں میں عیسائی حملہ آور سارڈینیا اور سسلی تک پہنچ گئے اور مسلمان حکمرانوں سے وہ علاقے دوبارہ چھین لیے۔ جزیرہ نمائے آئبیریا میں اسپین کے تولیدو اور پرتگال کے کوئمبرا شہر دوبارہ عیسائیوں کے ہاتھ آ گئے۔

آخر میں یہ ہوا کہ 1098ء کے اوائل میں مغربی یورپ کے ایک گروہ نے مسلسل حملے کر کے شام اور فلسطین کے ساحلی میدانوں پر قبضہ کرلیا اگرچہ یہ قبضہ عارضی ثابت ہوا۔ عیسائی مورخین ان حملوں کو صلیبی جنگیں کہتے ہیں۔

مسلمانوں میں یہ جنگیں کچھ ایسی زیادہ شہرت نہیں رکھتیں۔ کروسیڈ (Crusade) اور کروسیڈر (Crusader) کے الفاظ اس دور کی مسلم تحریروں میں نظر نہیں آتے اور سچی بات تو یہ ہے کہ بظاہر عربی یا دوسری اسلامی زبانوں میں ان الفاظ کا کوئی متبادل بھی نہیں تھا حتیٰ کہ بہت بعد میں عیسائیوں کی عربی تحریروں میں صلیبی جنگ کا لفظ گھڑا گیا۔ اس زمانے کے مسلمانوں کی نظر میں صلیبی جنگیں لڑنے والے محض فرینک یا کافر تھے جو ان کافر اور وحشی گروہوں میں سے تھے جو عالم اسلام پر حملہ کر رہے تھے۔ ان میں اور دوسرے کافر گروہوں میں فرق یہ تھا کہ یہ زیادہ خون آشام اور زیادہ جنگجو تھے اور انہوں نے کامیابیاں بھی حاصل کیں۔ اس معاملے میں مسلمان یورپ کے عیسائیوں سے زیادہ مختلف نہیں تھے۔ عیسائیوں نے بھی کافی عرصے تک اسلام کو عیسائیت کا

مدمقابل مذہب تسلیم کرنے سے انکار کیا اور وہ بھی مسلمانوں کو منکرحق اور ملحد گردانتے تھے۔ زیادہ نرم الفاظ استعمال کرتے تو مسلمانوں کو ان کی علاقائی شناخت کے اعتبار سے سارسین، مور ترک یا تاتار کہہ دیتے تھے۔

صلیبی جنگوں میں عیسائیوں کی فتح میں مسلمانوں کی اپنی کمزوریوں کو ہی بڑا دخل تھا۔ گیارہویں صدی کے وسط تک مسلمانوں میں زوال کے آثار شروع ہو گئے تھے۔ ان کے اندرونی اختلافات اور سیاسی آویزشوں کے نتیجے میں ان کے علاقوں پر کامیاب حملے شروع ہو چکے تھے۔ یہ حملے ان لوگوں کی جانب سے تھے جنہیں مسلمان اندرونی اور بیرونی وحشی اور کافر کہتے تھے۔ یہ حملے اور یہ پیش قدمیاں قریب قریب تین صدیوں تک جاری رہیں۔ افریقہ میں ایک نئی تحریک شروع ہو گئی تھی۔ اس تحریک میں جنوبی مراکش اور سینگال اور نیجر کے بربر قبائل شامل تھے۔ ان قبائل نے اپنا دائرہ اختیار وسیع کرنا شروع کیا تھا کہ ایک نئی بربر سلطنت قائم ہو گئی۔ اس سلطنت میں شمال مغربی افریقہ اور مسلم ہسپانیہ کا بڑا حصہ شامل تھا۔ مشرق کی جانب وسط ایشیا اور اس سے آگے تک ترکوں اور منگولوں نے مسلمان علاقوں پر حملے کیے۔ ان لوگوں کی فتوحات اور بہت بڑی تعداد میں ان کی آمد سے شرق اوسط کے معاشرہ کا علاقائی، معاشرتی اور ثقافتی رنگ و روپ ہی بدل گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت کے اندر سیاسی نظم ونسق تباہ ہو گیا تھا کہ بدو اور دوسرے خانہ بدوش قبائل کی ہمت اتنی بڑھ گئی کہ وہ ان مقامات پر بھی اپنے مویشی چرانے لگے جو کاشت کیے ہوئے اور سیراب تھے۔

لیکن جن طاقتوں نے عالم اسلام کو مہلک نقصان پہنچایا وہ یہ نہیں تھیں۔ بدو اور بربر تو بہرحال مسلمان تھے اور ترک بھی کچھ عرصے پہلے مسلمان ہو گئے تھے۔ بلکہ ترکوں نے جس جانفشانی سے اسلام کا پرچم بلند کیا اس کی مثال اور کہیں نہیں ملتی۔ مسلمانوں کو جس ہلاکت خیز خطرے کا سامنا کرنا پڑا وہ شمال کے کافروں کی طرف سے تھا۔ یعنی یورپ کی طرف سے۔

اسی دور میں دمشق کے وقائع نگار ابن القلانسی نے 490 ہجری مطابق 1096-1097 عیسوی میں صلیبی عیسائیوں کی آمد کا حال اس طرح بیان کیا ہے:

> اس سال قسطنطنیہ کے سمندر کی جانب سے فرینک فوجوں کی آمد کے بارے میں اطلاعات آنا شروع ہو گئیں۔ ان فوجوں کی تعداد اتنی تھی کہ ان کا شمار ممکن نہیں تھا۔ ایک کے بعد ایک اطلاع ایسی ہی آ رہی تھی جوں جوں لوگوں کو ان کا علم

ہوتا گیا ان کی پریشانی اور بے چینی بڑھتی گئی۔(4)

ایک صدی سے زیادہ عرصے بعد بہت دور موصل کے عظیم مورخ ابن الاثیر ان واقعات کو زیادہ وسیع تناظر میں دیکھتا ہے۔

فرنگی اقوام کا پہلی بار سامنے آنا' ان کی طاقت میں اضافہ' سرزمین اسلام پر ان کے حملے اور ان میں سے بعض علاقوں پر ان کے قبضے اس وقت نمایاں ہوتے ہیں جب وہ اندلس میں تولید وار دوسرے شہروں پر قبضہ کر لیتے ہیں' جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ پھر 494 ہجری (92-1091) میں وہ سسلی پر حملہ کرتے ہیں اور اس پر قبضہ کر لیتے ہیں' یہ بھی پہلے بیان ہو چکا ہے۔ اس کے بعد وہ افریقہ کے ساحلوں کی طرف پیش قدمی کرتے ہیں' جہاں چند مقامات فتح کر لیتے ہیں جنہیں بعد میں آزاد کرا لیا جاتا ہے۔ پھر وہ دوسرے مقامات پر قبضہ کرتے ہیں جس کا بیان آگے کیا جائے گا۔ پھر جب 490 ہجری (97-1096) کا سال آیا تو انہوں نے سرزمین شام پر چڑھائی کر دی۔ (5)

یہاں سے صلیبی عیسائی اپنے سامنے آنے والی ہر رکاوٹ پر قابو پاتے ہوئے بڑھتے رہے حتیٰ کہ انہوں نے فرینک' عیسائی حکومتوں کا ایک سلسلہ قائم کر دیا جو شام و فلسطین کے ساحلوں سے وادیٔ سینا تک پھیلتا چلا گیا تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کی سرزمین سے عیسائی حکومتوں کی باقیات کے خاتمے کے لیے دو صدی سے زیادہ کا عرصہ لگا۔ یہ مقصد جہاد کے ذریعہ حاصل کیا گیا۔

پہلے پہل تو ان نئے لوگوں کی آمد پر مسلمان شہزادوں نے نہایت بے اعتنائی کا مظاہرہ کیا حتیٰ کہ ان لاطینی ریاستوں نے شامی و فلسطینی سیاست کی بساط پر اپنے قدم جما لیے۔ اصل جہاد کافی پہلے ختم ہو چکا تھا اور جہاد کا جذبہ فراموش کیا جا چکا تھا۔ یہ دور قتل و غارت اور تبدیلیوں کا دور تھا اور ہر سمت سے سرزمین اسلام پر حملے ہو رہے تھے۔ وسط ایشیا بر افریقہ اور پھر عیسائیوں کی طرف سے مسلسل دباؤ ڈالا جا رہا تھا۔ اس وقت عالم یہ تھا کہ فلسطین اور شام کے ساحل ہاتھ سے نکل جانے پر حلب' دمشق اور قاہرہ تک میں کوئی توجہ نہیں دی جا رہی تھی۔ دوسرے مقامات پر تو کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ ابن الاثیر نے تیرہویں صدی کے اوائل میں ان مہاجرین کا حال لکھا ہے جو صلیبی عیسائیوں کے مقبوضہ فلسطین سے بغداد میں آئے تھے اور جنہوں نے وہاں کے مقامی

باشندوں سے مدد کی درخواست کی تھی۔ کسی نے بھی ان کی مدد نہیں کی۔ ان لوگوں کو تو فلسطین کے حالات کے بارے میں صحیح معلومات تک نہیں تھیں۔ چنانچہ جب ایک عراقی شاعر نے بیت المقدس کے سقوط اور اس کے دفاع میں مسلمانوں کی ناکامی کا نوحہ لکھا تو اس نے بھی فاتحین کو رومی یعنی بازنطینی بتایا۔(6)

وہاں تو حال یہ تھا کہ مشرق اور مغرب دونوں علاقوں میں مسلمان حکمران اپنے نئے ہمسایوں سے تعلقات بہتر بنانے حتیٰ کہ بعض اوقات اپنے برادر مسلمانوں کے خلاف ان کے ساتھ اتحاد تک کرنے پر آمادہ رہتے تھے۔ دو سو سال سے زیادہ عرصے تک حملہ آور عیسائی اور مسلمان شام اور فلسطین میں ایک دوسرے کے اتنے قریب رہے کہ جنگیں بھی ہوتی تھیں اور آپس میں تجارت بھی ہوتی۔ ایک دوسرے کے پاس سفارتیں بھی بھیجی جاتی تھیں حتیٰ کہ اپنے ہی بھائیوں کے خلاف ان کے ساتھ اتحاد بھی ہو جاتا تھا۔ صلیبی جنگوں کے بعد صدیوں تک مغربی تاجر اور عیسائی زائرین مصر، شام اور مراکش وغیرہ آتے جاتے رہے اور مسلمان حکمرانوں نے ایک کے بعد دوسرے عیسائی ملکوں سے تجارتی معاہدے کیے۔

ادھر مغرب بعید میں عیسائیوں کی فتوحات مکمل ہو چکی تھیں۔ ہسپانیہ اور پرتگال سے مسلمان حکمران ہی نہیں مسلمان رعایا بھی نکالی جا چکی تھی۔ اور کچھ ہی عرصے بعد فاتح عیسائی اپنے سابق حکمرانوں کو افریقہ تک دھکیل رہے تھے۔ تاہم مشرق میں صلیبی جنگجو یورپ سے آنے والی کمک کی وجہ سے کچھ عرصے کے لیے تو اپنے قدم جمانے میں کامیاب رہے لیکن مسلمانوں کے مسلسل حملوں نے انہیں کمزور کر دیا اور آخر کار 1291 میں مملوک سلطان نے فلسطین میں عکہ کی بندرگاہ پر انہیں شکست دے کر لاطینی طاقتوں کا آخری قلعہ بھی ان کے ہاتھ سے چھین لیا۔

صلیبی جنگوں کا تھوڑا بہت جذبہ یورپ میں کچھ عرصے برقرار رہا جس نے مصر میں مملوک حکمرانوں اور ادھر نئے ابھرتے ہوئے عثمانی ترکوں کے خلاف ناکام حملوں کی حوصلہ افزائی کی۔ لیکن پھر قرون وسطیٰ کے آخری دور میں صلیبی جنگوں سے یورپ کی دلچسپی ختم ہو گئی اور وہ دوسری مصروفیات میں لگ گئے۔ اس زمانے میں ایسا ہوا کہ عیسائی تو اپنی صلیبی جنگوں کو بھول گئے لیکن مسلمانوں کو جہاد یاد رہا اور انہوں نے ایک بار پھر ایمانی جذبہ کے ساتھ جہاد شروع کر دیا۔ پہلے انہوں نے عیسائیوں کے ہاتھوں کھوئے ہوئے اپنے علاقے واپس لیے اور ان کا دفاع کرنے کے لیے پیش قدمی کی پھر فتح و نصرت کا ایسا طوفان آیا کہ وہ ان نئی سرزمینوں اور نئے لوگوں تک

دین اسلام کا پیغام دینے پہنچ گئے جنہیں وہ پہلے جانتے تک نہ تھے۔

جن ملکوں پر صلیبی عیسائیوں نے دوسو سال کے قریب حکومت کی وہاں بھی کئی اعتبار سے ان کے اثرات بہت ہی کم رہے۔ ان ملکوں میں وہ ایک بااثر کیتھولک اقلیت سے زیادہ اور کچھ بھی پیدا نہیں کر سکے۔ ان میں بیرن' پادری اور تاجر شامل تھے۔ مقامی آبادی کی اکثریت مسلمانوں' مشرقی کلیسا کے مختلف عیسائی فرقوں اور چند یہودیوں پر مشتمل تھی۔ جونہی صلیبی جنگجو وہاں سے رخصت ہوئے یہ علاقے دوبارہ آسانی کے ساتھ اسلامی معاشرہ میں مدغم ہو گئے۔

لیکن دو اعتبار سے صلیبی عیسائیوں نے اپنے مستقل اثرات بھی چھوڑے۔ ان میں سے ایک مسلم ریاستوں میں غیر مسلم رعایا کی کمزور سے کمزور تر ہوتی حیثیت تھی۔ اپنے مقبوضہ علاقوں میں حفاظتی انتظامات کے لیے ان حکمرانوں نے عیسائی رعایا کو اتنی زیادہ مراعات دی تھیں کہ مسلمان آبادی میں ان سے نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ ان دونوں مذاہب کے درمیان اتنی طویل جنگیں ہوئیں اور پھر عیسائی حکمرانوں نے مسلمانوں پر ظلم وستم بھی بہت کیے جن کی وجہ سے دشمنی اور معاندت میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ اس دور کے بعد مسلمانوں' عیسائیوں اور یہودیوں کے درمیان تعلقات بگڑتے ہی چلے گئے۔ بعض اوقات تو یہ نفرت اور معاندت انتہا کو پہنچ گئی۔

دوسری تبدیلی مشرق وسطیٰ اور یورپ کے درمیان تعلقات کی نوعیت کی تھی۔ گیارہویں صدی سے پہلے یہ تعلقات نہایت محدود پیمانے پر تھے۔ صلیبی ریاستوں نے تعلقات کا ایک نیا ڈھانچہ بنانے میں پہل کی جسے بعد میں کسی نہ کسی طرح مسلمان حکمرانوں نے بھی برقرار رکھنا مناسب سمجھا۔ صلیبی حکومتوں کے زمانے میں یورپی تاجروں بالخصوص اطالوی سوداگروں نے بحیرۂ روم کے مشرقی ساحلوں پر اپنے مراکز قائم کر لیے تھے۔ ان منظم مراکز کا نظم ونسق ان کے اپنے سربراہوں کے پاس ہی تھا اور ان کے اپنے ہی قوانین تھے۔ جب مسلمانوں نے ان علاقوں کو دوبارہ فتح کیا تب بھی یہ انتظام تبدیل نہیں ہوا۔ بلکہ مسلمان حکمرانوں نے یہ احتیاط برتی کہ ان کے معاملات میں کسی قسم کا دخل نہیں دیا اور ان کے کاروبار کو ترقی دی کیونکہ یہ کاروبار دونوں کے لیے ہی فائدہ مند تھا۔ یورپ کے تاجروں نے خوب ترقی کی۔ یہ تاجر مصر تک بھی پہنچ گئے جس پر صلیبی طاقتوں کا کبھی قبضہ نہیں رہا تھا۔

یورپ کے ساتھ ان نئے رابطوں نے ان عیسائی اقلیتوں کو بھی متاثر کیا جو مشرق وسطیٰ

میں مسلم حکمرانوں کی رعایا تھیں۔ اس زمانے سے مغرب کے ساتھ ان کا رابطہ بڑھنا شروع ہوا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ یورپ کے ساتھ وہ تجارت کر رہے تھے دوسرے عربی بولنے والے عیسائیوں کے توسط سے یورپ کے ساتھ مذہبی تعلق بھی تھا۔ ان لوگوں نے مشرقی کلیسا سے اپنا رشتہ توڑ لیا تھا اور روم کے کلیسا کے ساتھ تعلق قائم کر لیا تھا۔ ان تجارتی اور مذہبی رابطوں اور رشتوں کی وجہ سے عربی بولنے والے مقامی عیسائیوں کا ایک خاص گروہ پیدا ہو گیا تھا جو یورپی زبانوں سے بھی واقف تھا اور ان کے ساتھ اس کا ربط وضبط بھی تھا۔ مغرب سے متاثر مشرق وسطیٰ کے ان عیسائیوں نے آگے چل کر ان علاقوں میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ تاہم ان مقامی عیسائیوں اور مشرق وسطیٰ میں رہنے والے یورپی تاجروں کا یہ کردار کافی عرصے محدود ہی رہا۔ صلیبی جنگوں کے زمانے میں مسلم اکثریت اور عیسائیوں کے درمیان جو معاشرتی دوری پیدا ہو گئی تھی اس کا اثر وہاں رہنے والے مغربی تاجروں پر بھی پڑا تھا۔ مسلمانوں کے ساتھ ان کے تعلقات محض کاروبار تک ہی تھے یا پھر سیاسی رابطوں تک محدود تھے۔

1174 میں صلاح الدین نے خلیفہ کے نام ایک خط بغداد بھیجا تھا جس میں ان علاقوں میں عیسائی تاجروں کی حوصلہ افزائی کرنے کا جواز پیش کیا گیا ہے جو علاقے صلیبی طاقتوں سے واپس لیے گئے تھے۔ اس نے لکھا کہ ان کے ساتھ اس نے ایسے انتظامات کر لیے ہیں جن سے تجارت میں مسلمانوں کو فائدہ پہنچے گا۔

> ”وینس پیسا اور جے نوا کے باشندے یہاں آیا کرتے تھے' کبھی کبھی حملہ آوروں کی صورت میں' ان کے لالچ اور طمع سے جو نقصان پہنچتا تھا اس پر قابو نہیں پایا جا سکتا تھا اور اس شیطنت کی آگ کو بجھایا نہیں جا سکتا تھا۔ کبھی وہ سیاحوں کی شکل میں آتے تھے اور اپنے ساتھ جو اشیاء لاتے تھے ان سے اسلام پر تسلط جمانے کی کوشش کرتے تھے اور ہمارے انتہا ہی فرمان ان کے ساتھ نبٹ نہیں سکتے تھے...... اب ان میں سے ایک بھی ایسا باقی نہیں ہے۔ اب وہ ہماری سرزمین پر جنگی ہتھیار لاتے ہیں اور انہوں نے اچھی سے اچھی چیز جو بنائی ہے یا جو انہیں ورثے میں ملی ہے وہ ہمیں دے دیتے ہیں۔ (8)

صلاح الدین نے اس کی وضاحت اس طرح کی کہ ”ہم نے ان کے ساتھ جو تعلقات قائم کیے ہیں اور جن شرائط پر ان کے ساتھ لین دین شروع کیا ہے اس کی وجہ سے یہ خاطر خواہ

تبدیلی پیدا ہوئی ہے۔ یہ ایسی تبدیلی ہے جسے ہم پسند کرتے ہیں اور وہ ناپسند' جسے ہم ترجیح دیتے ہیں اور وہ ترجیح نہیں دیتے۔"

عیسائی کلیسا کا خیال بھی یہی تھا۔ وہ اسے ناپسند کرتا تھا لیکن اس کے تمام مذہبی فرمان اور کلیسا بدر کرنے کے احکام بھی عیسائیوں اور مسلمانوں کے تجارتی تعلقات کے فروغ کو نہیں روک سکتے تھے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ چند قلعوں کے سوا مشرق میں صلیبی جنگجوؤں کے جو مستقل آثار باقی رہ گئے ہیں ان میں مغرب کے ساتھ تجارتی تعلقات کی تجدید کے اثرات کی وجہ سے ہی ہیں۔

ادھر مغرب کی تجارت کو تو فروغ ملا لیکن مغرب کی فوجی قوت کو پے در پے شکستوں کا سامنا کرنا پڑا۔ صلیبی جنگجوؤں کو ان کے تمام مفتوحہ علاقوں سے نکال باہر کیا گیا اور اب تک عیسائیوں کے قبضے میں جو علاقے رہ گئے تھے' ان کا بہت بڑا حصہ مسلمان حملہ آوروں کے ہاتھ آ گیا۔ اسلام کے ابتدائی زمانہ کی طرح مسلمانوں نے ایک بار پھر عیسائی سلطنت کے خلاف جہاد شروع کیا تھا۔ اس مرتبہ ان کی فوجیں یورپ کے قلب تک پہنچ گئیں۔

اس بار جس جہاد میں صلیبی طاقتوں کو شکست ہوئی اور ان سے جو علاقے خالی کرائے گئے وہ جہاد ان ملکوں سے نہیں شروع ہوا تھا جن پر انہوں نے قبضہ کیا تھا اور نہ ان لوگوں نے اس جہاد میں حصہ لیا جو ان کے محکوم رہے تھے یا جن کے لیے وہ خطرہ بنے تھے۔ بلکہ یہ نیا جوش و جذبہ مشرق کے دور دراز علاقوں سے اور ایک نئی طاقت کی طرف سے آیا تھا۔ یہ طاقت تھی ترک جاں نثاروں کی۔ ترک مشرقی ایشیا سے تعلق رکھتے تھے جو دسویں اور گیارہوں صدی کے درمیان سرزمین خلافت میں وارد ہوئے تھے اور مسلمانوں کے فوجی اور سیاسی رہنما بن گئے تھے۔ انہیں صلیبی طاقتوں نے بھڑکایا تھا۔ شام پر ان کا قبضہ بھی اسی اشتعال کا نتیجہ تھا۔

ترک غلبہ کے دوران ہی عالم اسلام کی فوجی طاقت کا احیا ہوا اور نئی طاقت کے ساتھ جہاد شروع کیا گیا جس سے بہت سے علاقے فتح ہوئے۔ ان میں سے چند علاقے تو ہمیشہ کے لیے عالم اسلام کا حصہ بن گئے۔ ترکوں کی سب سے بڑی فتح اور عیسائیوں کی زبردست شکست وہ تھی جب ترکوں نے مشرقی اناطولیہ پر قبضہ کر لیا۔ اناطولیہ بازنطین سلطنت کا سب سے مضبوط قلعہ تھا جو ایک زمانے سے مسلمانوں کی پیش قدمی کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ گیارہویں صدی کے آخر اور بارہویں صدی میں سلجوق ترکوں نے اناطولیہ کو خالص ترک اور مسلمان سرزمین بنا لیا۔ بعد

میں یہ علاقہ یورپ پر دوسرے اور انتہائی خطرناک مسلم حملوں کا نقطۂ آغاز بنا۔

دریں اثناء مشرق کی طرف سے آنے والے ایک نئے اور زیادہ خطرناک دشمن نے خود مسلمانوں پر بھی حملہ کیا اور ان کے علاقے فتح کر لیے۔ تیرھویں صدی کے ابتدائی برسوں میں ایک منگول سردار نے جسے بعد میں چنگیز خان کے لقب سے یاد کیا گیا' منگولیا کے متحارب قبائل کو اکٹھا کیا اور ان کے غول کے غول لے کر فتوحات کی مہم پر روانہ ہو گیا۔ 1220ء تک سارا وسط ایشیا اس کے قبضے میں تھا اور دوسرے سال منگولوں نے آمو دریا عبور کر کے ایران کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ 1228ء میں چنگیز خاں کی موت کے بعد ایک مختصر عرصے کے لیے امن وسکون پیدا ہوا لیکن جلد ہی اس کے جانشین' ایک نئے خان نے دوبارہ حملے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ 1240ء تک منگولوں نے مغربی ایران پر قبضہ کر لیا اور جارجیا' آرمینیا اور شمالی میسوپوٹیمیا پر ہلہ بول دیا۔ 1243ء میں ان کا مقابلہ اناطولیہ کے سلجوق سلطان کی فوجوں سے ہوا اور وہ ان پر چھا گئے۔

تیرھویں صدی کے وسط میں منگولوں نے مغرب کی جانب پیش قدمی کا منصوبہ بنایا اور اس پر عمل بھی کیا۔ چنگیز خان کے پوتے شہزادہ ہلگیو یا ہلاکو نے خانِ اعظم کے حکم سے آمو دریا عبور کیا۔ اسے حکم تھا کہ مصر تک مسلمانوں کے تمام علاقے فتح کر لیے جائیں۔ چنانچہ صرف چند مہینے کے اندر لمبے لمبے بالوں والے یہ منگول آندھی طوفان کی طرح ہر قسم کی مدافعت کا مقابلہ کرتے سارے ایران پر بڑھتے چلے گئے اور آخر کار 20 فروری 1258ء کو بغداد پہنچ کر دم لیا۔ وہ ڈاکو اور لٹیروں کی طرح شہر میں داخل ہوئے' جو کچھ سامنے نظر آیا لوٹ لیا باقی کو نذر آتش کر دیا اور 20 فروری 1258ء کو آخری خلیفہ اور اس کے خاندان کے ان تمام افراد کو تہہ تیغ کر دیا جو ان کے قابو آسکے۔ اسلام کی تاریخ میں پہلی بار غیر مسلم لوگوں نے اسلام کے پایہ تخت پر حملہ کیا تھا انہوں نے خلافت کے عظیم تاریخی ادوار کو تباہ کیا اور اللہ کا نام لینے والوں پر کافروں کی حکومت قائم کر دی۔ صرف مصر میں ہی مملوک سلطانوں نے اپنے قدم جمائے رکھے اور براعظم افریقہ میں منگولوں کی پیش قدمی کو روکے رکھا۔

شمال میں منگولوں کی پیش قدمی جاری رہی۔ وسط ایشیاء سے مغرب کی جانب بڑھتے ہوئے ان کے شاہسوار بحیرۂ کیسپین اور بحیرۂ اسود کے شمالی اور جنوبی دونوں سمت تمام علاقے پامال کرتے چلے گئے۔ آج جو ملک روس کہلاتا ہے انہوں نے اسے فتح کیا اور پولینڈ اور ہنگری کی سرحدوں پر سائیلیشیا تک پہنچ گئے۔ بحیرۂ اسود کے شمالی علاقے میں فاتح منگولوں نے پہلی بار

گھاس کے میدانوں والے لوگوں کا جن میں اکثریت ترکوں کی تھی' ایک سیاسی ڈھانچہ قائم کیا۔ یہ لوگ اس سارے علاقے میں پھیلے ہوئے تھے۔ چونکہ منگولوں کی اپنی تعداد بہت کم تھی اس لیے انہوں نے اپنی ترک رعایا پر زیادہ بھروسہ کیا اور ان کے ذریعہ حکومت کی۔ بعد میں انہی ترکوں نے مغرب کی جانب نقل مکانی کی۔ ایک زمانے بعد منگولوں نے اپنی زبان ترک کر کے ترکی زبان ہی اختیار کر لی اور ترکوں کے اندر ہی ضم ہو گئے۔

یہ بات مشرقی یورپ کے میدانی علاقوں کے لیے زیادہ اہم تھی' جہاں ترک قبائل بہت زیادہ بااثر تھے۔ یہ ترکوں اور منگولوں کے ملے جلے لوگ عام طور پر تاتار کہلاتے ہیں۔ تاتار کی اصطلاح ترکوں اور منگولوں کی ایک خاص ملی جلی شکل کے لیے استعمال ہوتی ہے لیکن عام طور پر ان سب کو ہی تاتار کہا جاتا ہے۔ روس کی تاریخ میں ان کے تسلط کے زمانے کو ''تاتاری طوقِ غلامی'' کا دور کہا جاتا ہے۔

خان اعظم کی سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہوئے تو اس کے بعد اس کی قلمرو کئی ریاستوں میں تقسیم ہو گئی۔ ہر ریاست کا حکمران اپنے آپ کو چنگیز خاں کا جانشین کہتا تھا۔ مشرقی یورپ میں منگولوں کی حکومت کو روس میں اور یورپ میں بھی ''سنہری غول کی خانیت'' کہا جاتا تھا۔ تیرھویں صدی کے آخری برسوں اور چودھویں صدی کے اوائل میں منگول ترکوں میں مدغم ہو گئے اور انہوں نے دین اسلام قبول کر لیا تو اس کے بعد ترکوں کی مسلم مملکت کا بالٹک سے بحیرۂ اسود تک سارے مشرقی یورپ تک غلبہ ہو گیا۔ اب مسکوی اور سلاوی حکمران ان کے باجگذار بن گئے تھے۔ لیکن پندرھویں صدی میں ''سنہری غول کی خانیت'' کمزور پڑ گئی اور آخر کار 1502ء میں اس کا تخت الٹ دیا گیا۔ اس کے بعد کازان' استراخان اور کرائمیا میں چھوٹی چھوٹی مسلم ریاستیں بن گئیں۔ یہ مشرقی یورپ میں مسلم غلبہ کے خاتمے کا آغاز تھا۔ اس کے ساتھ ہی روسیوں کی سرکشی اور بالآخر ان کے غلبہ کا راستہ کھل گیا۔

جنوب کی سمت ذرا آگے بڑھ کر منگولوں نے ایران اور عراق پر اپنے قدم جما لیے تھے اور اناطولیہ میں سلجوق حکومت کا خاتمہ کر دیا تھا۔ لیکن وہ مصر میں بچی کچھی مملوک سلطانوں کی اسلامی حکومت پر غلبہ نہیں حاصل کر سکے۔ مصر میں ایران کے منگول حکمرانوں کو مملوک سلطانوں کے ساتھ زندگی اور موت کی جنگ لڑنا پڑی تو قدرتی طور پر انہوں نے مشترکہ دشمن کے خلاف اپنے حلیف تلاش کرنا شروع کیے۔ یورپ میں عیسائی شہزادے اس کے لیے بڑے جوش و خروش کے ساتھ تیار

ہو گئے۔ وہ اس مہم میں نئی صلیبی جنگوں کی ابتداد یکھ رہے تھے۔ اگر چہ انہوں نے اس میں تھوڑی سی احتیاط برتی لیکن انہیں اسلامی سلطنت سے باہر ایک عظیم غیر مسلم طاقت حلیف کے طور پر مل رہی تھی جو دو محاذوں پر جنگ میں مصروف تھی۔ کچھ عرصے کے لیے منگول خان کے دربار اور یورپ کے درباروں کے درمیان زور شور کے سفارتی سرگرمیاں جاری رہیں۔ منگولوں کی جانب سے جو سفارتی نمائندے اس کام میں مصروف تھے وہ زیادہ تر مشرقی کلیسا کے عیسائی تھے۔ یہ لوگ روم' فرانس اور حتیٰ کہ انگلستان تک پہنچے۔ انگلستان میں شاہ ایڈورڈ اوّل نے منگولوں کے ساتھ اتحاد کے لیے تھوڑی بہت دلچسپی ظاہر کی۔ اسی طرح یورپی عیسائی سیاح' تاجر' سفارتی نمائندے اور مشنری خان اعظم کے مفتوحہ ایران گئے۔ چونکہ یہ سارے علاقے منگولوں کے قبضے میں تھے اس لیے بعض لوگوں نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا۔ جیسے مشہور سیاح مارکو پولو خشکی کے راستے ایشیا کے تمام علاقوں کو عبور کرتا منگولیا اور چین پہنچ گیا۔

اناطولیہ میں سلجوق مسلمانوں کی حکومت منتشر ہو جانے سے مغرب کی جانب سلجوق ترکوں کی پیش قدمی رک گئی تھی۔ اناطولیہ کی سلطنت کو سلطنت روم کہا جاتا تھا۔ اب یہ ہوا کہ جو جہاد رک گیا تھا وہ سلجوق ترکوں کے وارث عثمانیوں نے دوبارہ شروع کیا۔ سلطنت عثمانیہ کا آغاز سرحدی جنگ جو ترکوں کی ایک چھوٹی سی ریاست کے قیام سے ہوا۔ یہ ریاست ان کئی ریاستوں میں سے ایک تھی جو سلجوق سلطنت کے منتشر ہونے کے بعد وجود میں آئی۔ عثمانیہ سلطنت کا نام اس کے پہلے حکمران عثمان کے نام پر پڑا جس نے روایات کے مطابق 1299 سے 1326ء تک حکومت کی۔

پہلی عثمانی حکومت مسلمانوں اور عیسائیوں کی سرحدوں کے درمیان اناطولیہ کے مقام پر قائم ہوئی۔ اس کے حکمرانوں کا لقب سرحدی سردار تھا یا پھر انہیں غازی کہا جاتا تھا۔ چودھویں صدی کے ترک شاعر نے عثمانی سلطانوں کا جو قصیدہ لکھا وہ سب سے پہلا تاریخی حوالہ ہے۔ اس میں ''غازی'' کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ وہ ''خدا کے دین کا گماشتہ ہے...... اللہ کا برگزیدہ بندہ ہے جسے خدا کی زمین کو مشرکوں کی غلاظت سے پاک کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے...... وہ اللہ کی ذوالفقار ہے'' (9) وقت گزرنے کے ساتھ عثمانی طاقت میں اضافہ ہوا اور ان کے مفتوحہ علاقوں میں بھی توسیع ہوئی اور اس طرح ایک چھوٹی سی حکومت بڑی ریاست میں تبدیل ہوئی اور پھر ایک عظیم سلطنت بن گئی۔ عثمانی سلطنت اپنے آغاز سے ہی ایک مشن کے ساتھ قائم ہوئی تھی اور یہ مشن تھا کافروں کے خلاف جہاد۔

اس جہاد میں یورپ وہ سرحد تھی جس کی طرف عثمانی ترک اور دوسرے مسلمان بھی اسی طرح حریص نظروں سے دیکھتے تھے۔ جیسے یورپ سولہویں صدی سے اٹھارویں صدی تک امریکہ کو دیکھا کرتا تھا۔ شمالی اور مغربی سرحدوں کے پار مال و دولت سے معمور یہ وحشی سرزمین تھی۔ مسلمانوں کا دینی فریضہ تھا کہ وہ اس سرزمین تک اپنا مذہب اپنی تہذیب اور امن و سلامتی کا پیغام پہنچائیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ انعام و اکرام بھی حاصل کریں جو نئی سرزمینوں پر پہلے قدم رکھنے والے حاصل کرتے ہیں۔ عثمانی سلطنت کی توسیع کی راہ میں جب رکاوٹیں پیدا ہوئیں اور ترکوں کی پیش قدمی بند ہوئی تو سلطنت عثمانیہ میں بھی زبردست تبدیلیاں واقع ہوئیں اور اپنی سرحدوں سے پار جو علاقے تھے ان کے بارے میں ان کا تصور بھی بدلا۔

اپنے عروج کے زمانے میں عثمانی سلطان اپنے آپ کو بازنطین شہنشاہوں کا جائز وارث قرار دیتے تھے۔ اسی دعوے کی بنیاد پر وہ سلطانِ روم کہلاتے تھے۔ 1453ء میں قسطنطنیہ کی فتح کے بعد سلطان محمد ثانی نے فاتح کا لقب اختیار کیا۔ اب قدیم سلطنت کے دونوں حصے ایشیا اور یورپ اس کے ہاتھ میں تھے۔ قدیم بازنطینی دارالحکومت اب اس کا پایہ تخت تھا۔

ترک وقائع نگار قسطنطنیہ کی فتح کے بہت سے کوائف بیان کرتے ہیں۔ ابتدا میں غازیوں اور ترجمانوں کے بیان پر کوائف نہایت سادہ اور واقعاتی سے ہیں۔ انہی میں سے ایک غازی مورخ عروج اس طرح لکھتا ہے:

> ایڈرین میں اژدہا کے برابر توپیں تیار کی گئیں اور بندوقیں تان لی گئیں۔ سلطان محمد ایدر سے استنبول روانہ ہوا تو اس کے ساتھ یہ توپیں تھیں۔ جب یہ توپیں وہاں لگائی گئیں اور انہیں ہر طرف سے داغا گیا تو انہوں نے استنبول کے قلعوں کے برج اور ان کی دیواریں مسمار کردیں اور ان کے اندر موجود کافر وہ فتح حاصل نہیں کر سکے جس کے لیے وہ لڑ رہے تھے۔ استنبول کا حکمران بہادر تھا' اس نے جان بخشی کی درخواست نہیں کی۔ پادریوں نے کہہ رکھا تھا کہ ان کی مقدس کتاب میں لکھا ہے کہ اس شہر کو کوئی فتح نہیں کر سکتا۔ ان کی بات کا اعتبار کرتے ہوئے اس نے قلعہ کے برجوں پر توپیں اور بندوقیں نصب کردی تھیں۔ اس کے جوان ان برجوں میں گئے تو انہوں نے بے ہودہ کلمات کہنا شروع کردیے۔ اللہ ان سے ناراض ہوا انہوں نے پیغمبر اسلام کی شان میں گستاخی کی

اور اہانت آمیز الفاظ استعمال کیے۔ ان کے اس غرور و تکبر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر تباہی نازل کی۔ سلطان محمد ابن سلطان مراد نے جذبات کی شدت سے مغلوب ہو کر اعلان کیا "یہ سب اللہ کی خوشنودی کے لیے ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے لوٹ مار کا حکم دیا۔ غازی قلعہ کی دیواروں میں پڑنے والے شگافوں کے راستے قلعہ کے اندر داخل ہو گئے اور کافروں کو تلواروں کی نوک پر رکھ لیا۔ یہ شگاف توپوں نے پیدا کیے تھے۔ غازیوں کے بعد باقی سپاہیوں کے لیے بھی راستہ کھل گیا۔ وہ خندقوں کے راستے آئے اور اوپر چڑھنے کے لیے سیڑھیاں لگائیں۔ پھر انہوں نے وہ سیڑھیاں پھینک دیں اور دیواروں پر چڑھ گئے۔ برجوں کے اندر پہنچ کر وہاں موجود کافروں کا خاتمہ کیا اور پھر شہر کے اندر داخل ہو گئے۔ انہوں نے مال و اسباب لوٹا اور تباہی مچائی۔ انہوں نے ان (کافروں) کی دولت لوٹی اور ان کے لڑکے لڑکیوں کو غلام بنایا۔ سلطان محمد نے سارے گھر بار بھی تباہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس طرح جو کچھ اٹھایا جا سکتا تھا اٹھا لیا گیا۔ مسلمانوں نے اتنا مال غنیمت اکٹھا کر لیا کہ 2400 سال پہلے تعمیر ہونے والے استنبول میں اب تک جو کچھ بھی جمع کیا گیا تھا وہ سب غازیوں کی ملکیت بن گیا۔ وہ تین دن مال غنیمت جمع کرتے رہے۔ تین دن بعد مال و اسباب جمع کرنے کا حکم واپس لے لیا گیا۔ استنبول 21۔ ربیع الاوّل سن 857 ہجری (مطابق 29 مئی 1453 عیسوی) کو بروز منگل فتح کیا گیا۔

(10)

یہ بیان جو سادہ ترکی زبان میں سیدھے سادے لوگوں کے لیے لکھا گیا ہے سرحدوں پر لڑنے والے غازیوں کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔ تاہم سلطنت عثمانیہ کے سولہویں صدی کے ترک مورخوں نے زیادہ فصیح ادبی زبان میں اسے اس طرح لکھا ہے:

وہ وسیع و عریض علاقہ ...... غلطیوں کے باعث اُلو کے گھونسلے سے شان و شوکت کا پایۂ تخت بن گیا۔ مسلم سلطان کی مہتم بالشان کوششوں سے بے حیا مشرکوں کے (کلیسائی) گھنٹوں کی شیطانی آوازیں مسلمانوں کی اذانوں میں بدل گئیں۔ اور رفیع الشان عقیدے کے اظہار کے لیے پنج وقتہ نمازوں کی شیریں

صدائیں آنے لگیں اور جہاد میں شامل لوگوں کے کان اذانوں کے لحن سے بھر گئے۔ شہر کے اندر جو کلیسا تھے وہ اپنے منحوس بتوں سے خالی ہو گئے۔ اور ان کی غلاظت اور بت پرستانہ گندگی سے پاک ہو گئے۔ تصویروں کے چہرے مسخ کرنے اور اسلامی محراب و منبر تعمیر ہو جانے کے بعد بہت سے کلیسا اور راہبوں کی خانقاہیں رشک جناں بن گئیں۔ مشرکوں کی عبادت گاہیں پاکباز لوگوں کی مساجد قرار پائیں اور اسلام کی منشور شعاعوں نے اس مقام کی تاریکی کو مار بھگایا جو اب تک سفلہ کافروں کی جائے پناہ تھی۔ اور ایمان کی سحر خیز کرنوں نے ظلم و تعدی کی بھیانک سیاہی کو دور کر دیا۔ اس کے بیان کے لیے ایک ہی لفظ کافی ہے۔ "نا قابل مزاحمت جیسے تقدیر" خوش قسمت سلطان اس نئی قلمرو کے نظم و نسق کا حاکم اعلیٰ بن گیا۔ (11)

قسطنطنیہ کی فتح اور اسے اپنا دار الحکومت بنانے کے بعد مشرکوں اور عیسائی روم کے مسلمان وارثوں کے لیے یہ قدرتی بات تھی کہ اب وہ مغرب کی جانب نظر کرتے۔ عثمانی افواج بحیرۂ ایڈیارٹک کی دونوں سمت سے پیش قدمی کر رہی تھیں۔ شمالی سرحد پر عثمانی گھوڑ سوار رسالے وینس کے قریب تک پہنچ گئے تھے۔ جنوبی سرحد پر انہوں نے البانیہ کے ساحل پر اپنی پوزیشن مضبوط کر لی تھی اور ملحقہ جزیروں پر قبضہ کر لیا تھا۔ اگست 1480ء میں عثمانی بحری بیڑے کے کپودان (امیر البحر) صادق احمد پاشا کی کمان میں ایک بحری مہم البانیہ کے مقام دلونا سے روانہ ہوئی۔ اس نے اوترانتو کی اطالوی بندرگاہ پر قبضہ کر لیا۔ اس سے اگلے موسم بہار میں پاشا نے ایک نئی مہم کے لیے اپنے دستے اکٹھے کیے جس کا مقصد اپنے دفاعی مورچے کو مضبوط بنانا اور اٹلی میں عثمانی فتوحات کو آگے بڑھانا تھا۔

884ء میں (وقائع نگار کہتا ہے) احمد پاشا ایک عظیم بحری بیڑے کے ساتھ جزیرہ نمائے اپولیا کی سمت روانہ ہوا۔ اللہ کی مدد اور ظل الٰہی سلطان کی توجہ خاص کے ساتھ اس نے اپولیا کے قلعہ پر دھاوا بول دیا۔ یہ قلعہ استنبول کی قلعہ بندیوں کی طرح ہی تھا' اس نے کافی علاقہ فتح کر لیا۔ بتوں کی عبادت گاہیں مساجد بن گئیں اور وہاں پنج وقتہ نمازیں ادا کی جانے لگیں۔ (12)

لیکن اس وقت سلطان محمد فاتح بستر مرگ پر تھا۔ اس کی وفات نے پاشا کے منصوبوں

پر عمل درآمد روک دیا کچھ ہی زمانے بعد آنے والے ایک ترک مورخ کے الفاظ ہیں:

> سلطان کے دوسری دنیا کو سدھارنے تک (پاشا) اپولیا میں ہی رہا اور بڑی بڑی فتوحات کرتا رہا۔ سلطان محمد کی وفات کے بعد پاشا سلطان بایزید کی پیشوائی کے لیے حاضر ہوا اور اپولیا میں جو کافر تھے انہوں نے مسلمانوں کے لیے بہت پریشانیاں پیدا کیں۔ خلاصہ یہ کہ کافروں نے اپولیا پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور وہاں جو مسلمان تھے ان میں سے کچھ مر گئے اور کچھ بعد از خرابی بسیار بچ نکلنے میں کامیاب ہوئے۔(13)

بایزید ثانی اور اس کے بھائی جم کے درمیان جانشینی کے لیے جو آویزش شروع ہوئی اس کی وجہ سے اوترانتو سے عثمانی فوجیں واپس بلالی گئیں اور اٹلی کی فتح کا منصوبہ ملتوی کر دیا گیا' جسے بعد میں آخر کار ترک ہی کر دیا گیا۔ چند سال بعد 1494ء اور 1495ء میں فرانس نے جس آسانی سے ایک کے بعد ایک اطالوی ریاست فتح کی اور اسے کسی قسم کی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر ترک افواج اپنے منصوبے پر جمی رہتیں تو اٹلی کا بیشتر علاقہ بلکہ پورا اٹلی ہی کسی مشکل کے بغیر فتح کر لیتیں۔ اور 1480ء میں جب یورپ کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہو رہا تھا اٹلی پر ترکوں کی فتح دنیا کی تاریخ ہی بدل دیتی۔ تاہم عثمانیوں نے اٹلی تو فتح نہیں کیا البتہ ان کے دلوں میں فتوحات کا جذبہ اسی طرح زندہ رہا اور عثمانی افواج یورپ میں دور تک پیش قدمی کرتی چلی گئیں۔

ان کا ارادہ اس سے بھی آگے جانے کا تھا۔ سولہویں صدی کے بعد کی تواریخ میں بار بار کسی دور افتادہ داستانی شہر قزل ایلما یا سرخ سیب کا حوالہ ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ نام شہر میں موجود ایک بہت بڑے کلیسا کے سنہری گنبد کی شکل کی وجہ سے پڑا تھا۔ سرخ سیب کا شہر ترک مسلمانوں کی فتوحات کی آخری منزل تھی اور خیال تھا کہ اس کی فتح کے بعد جہاد مکمل ہو جائے گا اور اسلام کو فتح مبین حاصل ہو جائے گی۔ اس خیالی شہر کو مختلف عیسائی دارالحکومتوں کے ساتھ منسوب کیا جاتا رہا کہ مسلم سپاہ کی وہ منزل مقصود ہے۔ پہلے وہ شہر قسطنطنیہ تھا' پھر بوداپیسٹ ہوا اور پھر کبھی ویانا اور کبھی روم کہا گیا۔ اور سچی بات یہ ہے کہ ترکوں نے قسطنطنیہ کو اپنا دارالحکومت بنایا' بوداپیسٹ پر ڈیڑھ سو سال تسلط رکھا۔ دو مرتبہ ویانا کا محاصرہ کیا اور کچھ عرصے کے لیے روم کے لیے بھی خطرہ بنے رہے۔

سلطان سلیمان ذی شان (1566-1520) کے عہد تک سلطنت عثمانیہ اپنے اقتدار کے عروج پر تھی۔ یورپ میں عثمانی افواج یونان اور بلقان کو اپنا تابع بنا چکی تھیں اور ہنگری کو روندتی ہوئی ویانا کا محاصرہ کر رہی تھیں۔ مشرق میں عثمانی جنگی جہاز بحر ہند میں پرتگالیوں کو للکار رہے تھے۔ ادھر شمالی افریقہ کے تمام مسلمان حکمران' مراکش کے سوا' سلطنت عثمانیہ کے زیر نگیں تھے۔ اس طرح مسلمانوں کی بحری طاقت مغربی سمندروں حتیٰ کہ بحر اوقیانوس تک پہنچ چکی تھی جہاں شمالی افریقہ کے جاں بازوں نے جزائر برطانیہ جیسے دور افتادہ علاقوں پر بھی حملہ کر دیا تھا۔

اسلام کے ابتدائی دور کی طرح ایک بار پھر ایسا لگتا تھا کہ اسلام عیسائی حکمرانوں کے لیے زبردست خطرہ بن گیا ہے۔ صلیبی جنگیں ختم ہو چکی تھیں ان کی جگہ جہاد نے لے لی تھی۔ بلکہ ایلیزبتھ اوّل کے دور کا مورخ رچرڈ نوبز (Richard Knobs) جب ترک سلطنت کو "دنیا کے لیے نئی دہشت" قرار دیتا ہے تو دراصل اس زمانے کے نصرانی عوام کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ حتیٰ کہ آئس لینڈ جیسے دور دراز ملک تک میں بھی لوتھر کے ماننے والے دعاؤں کی جو کتاب استعمال کرتے تھے اس میں ایک دعا یہ تھی کہ "خداوندا ہمیں پوپ کی مکاری اور ترکوں کی دہشت سے محفوظ رکھ۔" یہ محض خیالی دہشت نہیں تھی کیونکہ 1627ء میں شمالی افریقہ کے فوجی آئس لینڈ پہنچ گئے تھے اور وہ کئی سو آدمی غلام بنا کر الجزائر لے گئے تھے جہاں انہیں غلاموں کی منڈی میں فروخت کر دیا گیا۔

سلطان سلیمان ذی شان کی فتوحات ترک مسلمانوں کے عروج کی انتہا تھی اور ان کے زوال کا آغاز بھی۔ عساکر عثمانیہ ویانا سے پسپا ہوئیں اور عثمانی بحری بیڑہ بحر ہند سے واپس بلا لیا گیا۔ کچھ عرصے عثمانی سلطنت کی فوجی طاقت اور اس کے ظاہری دبدبے نے عثمانی ریاست اور معاشرہ کے انحطاط اور زوال کو چھپائے رکھا۔ ہنگری میں ترک جاں نثار اور عیسائی بے نتیجہ جنگ مسلسل لڑتے رہے اور حتیٰ کہ کافی زمانے بعد 1683ء میں ترکوں نے ویانا پر قبضہ کرنے کے لیے دوبارہ کوشش کی۔ لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی اور اس مرتبہ انہیں جس شکست کا سامنا کرنا پڑا وہ قطعی اور آخری شکست تھی۔ لیکن دنیا کے دوسرے علاقوں' خاص طور پر مشرقی افریقہ اور جنوب مشرقی ایشیا میں اسلام مسلسل فروغ پذیر تھا۔ البتہ یورپ میں مسلمانوں کو فیصلہ کن پسپائی کا سامنا تھا۔ تاہم مختصر عرصے کے لیے عثمانی فتوحات نے اس پسپائی کو اپنی کامیابیوں میں چھپا لیا۔ جس کی وجہ سے کچھ تاخیر ہوئی لیکن اس ناکامی کو کوئی روک نہیں سکا۔

پہلے عظیم جہاد کا جواب یورپ نے اپنے علاقوں کی بازیابی کی جنگ اور صلیبی جنگوں سے دیا تھا۔ اب مسلمانوں کی دوسری یلغار کا جواب یورپ نے اپنی توسیع پسندی سے دیا جو آخرکار سامراجی قوت کی شکل میں بدل گیا۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے کہ یہ مہم یورپ کے دور دور افتادہ علاقوں سے شروع ہوئی۔ ان ملکوں سے جو خود مسلمانوں کے زیر اقتدار رہے تھے جیسے جزیرہ نمائے آئبیریا کے ملک اور روس۔ یہ طوفان بڑھتا ہی چلا گیا۔ حتیٰ کہ اس نے پورے عالم اسلام کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

1492ء میں فرڈی نینڈ اور ازابیلا کی فوجوں نے ہسپانیہ میں مسلمانوں کے آخری گڑھ پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس وقت تک یورپ کے جوابی حملے تیز ہو چکے تھے۔ قریب ڈھائی سو سال قبل 1267ء میں پرتگال پر دوبارہ ان کا قبضہ ہو چکا تھا۔ 1415ء میں پرتگال نے مراکش کے عثمانی ساحل پر سیوتہ فتح کر لیا اور اس طرح وہ مسلمانوں کے علاقے میں داخل ہو گئے سولہویں صدی میں پرتگال نے مراکش میں پاؤں جمانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ ایک مختصر سے عرصے انہوں نے طنجہ پر اپنا قبضہ برقرار رکھا بلکہ چند فوجی ٹھکانوں پر تو ان کا قبضہ کچھ زیادہ عرصے رہا۔ لیکن 1578ء میں مراکشی عساکر نے پرتگال کو قصر الکبیر کے مقام پر شکست دے دی۔

ادھر اسپین کی سپاہ بھی جنگ بازیافت کے جوش میں آگے بڑھ رہی تھیں۔ وہ اپنے سابق حکمرانوں کا تعاقب کرتے ہوئے یورپ سے افریقہ پہنچ گئی تھیں اور 1510ء میں انہوں نے شمالی افریقہ کے ساحل پر مراکش میں ملیلا سے طرابلس تک متعدد مقامات پر اپنا پرچم لہرا دیا تھا۔ لیکن ان کی یہ کوشش بارآور ثابت نہیں ہوئی تاہم ان کا قبضہ بھی صرف اتنا تھا کہ مسلمانوں کو اپنی صفیں درست کرنے اور اپنے آپ کو مستحکم کرنے سے روکا جائے اور اپنے ساحلوں اور اپنے بحری جہازوں کو مسلمانوں کے حملوں سے محفوظ کیا جائے۔ جوں ہی عثمانی بحری بیڑہ بحیرۂ روم میں طاقت پکڑتا گیا ہسپانوں حکمرانوں کو اپنی فکر ہو گئی اور انہوں نے شمالی افریقہ پر حملوں کا ارادہ ترک کر دیا۔ اب پرتگال کی طرح ان کی بھی کوشش یہی تھی کہ جو چھوٹے چھوٹے قلعے ان کے قبضے میں ہیں انہی پر اکتفا کیا جائے۔

مشرق کے خلاف مغربی یورپ کے حملے نے اب کسی اور جانب ہی رخ کیا۔ واسکوڈی گاما جب کالی کٹ پہنچا تو اس نے اس کی وجہ یہ بیان کی کہ وہ عیسائیوں اور گرم مسالوں کی تلاش میں ہندوستان آیا ہے۔ گویا عیسائیوں کی تازہ مہم کا یہ ایک معقول جواز تھا جس نے پرتگالیوں کو ایشیا

کی طرف روانہ کیا۔ اور اگر دوسرے انداز سے دیکھا جائے تو کسی حد تک یہ مسلمانوں کے جہاد کا بھی جواب تھا اگرچہ یہ جواب کافی تاخیر سے دیا جا رہا تھا۔ عیسائیوں کے جذبات کی شدت ان پرتگالیوں میں کہیں زیادہ تھی جن کے بحری بیڑے مشرق کی جانب روانہ ہوئے۔ نئے ملکوں اور نئے علاقوں کی دریافت کے یہ سفر مذہبی جنگ کا ہی حصہ سمجھے جاتے تھے اور انہیں جنگ بازیافت ہی تصور کیا جا رہا تھا۔ یہ جنگ اسی پرانے دشمن کے خلاف تھی۔ ادھر مشرقی سمندروں میں مصر، ایران اور ہندوستان کے حکمران بھی مسلمان تھے جو پرتگالیوں کے اصل دشمن تھے۔ انہیں بھی پرتگالیوں نے ہی ختم کیا۔ پرتگالیوں کے بعد یورپ کی دوسری بحری طاقتیں میدان میں آئیں اور انہوں نے مل کر افریقہ اور جنوبی ایشیا میں یورپ کی بالادستی قائم کی جو بیسویں صدی تک برقرار رہی۔

ان کا اقتدار اتنا مستحکم اور محفوظ تھا کہ وہ مشرق کے میدان جنگ میں آپس میں بھی لڑتے رہے، جس سے کبھی کبھی مقامی طاقتوں نے بھی فائدہ اٹھایا۔ ایسی ہی ایک لڑائی بہت مشہور ہے۔ پرتگالیوں نے خلیج فارس کی بندرگاہ ہرمز پر قبضہ کر رکھا تھا۔ 1622ء میں ایرانی فوج نے برطانیہ کی مدد سے انہیں وہاں سے نکال باہر کیا۔ فارسی کی رزمیہ نظموں میں اس فتح کا ذکر کیا گیا ہے اور ایرانی مورخوں نے برطانیہ کے ساتھ اس عبوری اتحاد کے جواز پیش کیے ہیں:

> اب صورت حال بدل گئی تھی کیونکہ انگریزوں کے ایک وفد نے صفوی دربار میں پیش ہو کر کہا کہ جب بھی شاہ کی خواہش ہوگی ان کی افواج پرتگالیوں سے ہرمز مقام خالی کرانے کے لیے ایران کی مدد کریں گی۔ انہوں نے وضاحت کی کہ وہ پرتگالیوں کے دشمن ہیں اور یہ دشمنی پرتگالیوں کے ساتھ ان کے فرقہ وارانہ اختلافات کی وجہ سے ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہرمز کی دوبارہ فتح کے بعد دوسری بندرگاہوں میں موجود برطانوی جہاز اس بات کی ضمانت ہوں گے کہ پرتگالی دوبارہ ان علاقوں میں پیر نہ جما سکیں۔ شاہ عباس نے انگریزوں کی اس پیشکش کو قبول کرنے کا فیصلہ کیا۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے "نصرانی کنوئیں کا پانی ناپاک ہے لیکن صرف مردہ یہودی کو ہی تو نہلانا ہے اس لیے ڈرنے کی کیا بات ہے۔" (15)

1580ء میں ایک عثمانی جغرافیہ داں نے جو کتاب لکھی اس میں مسلمانوں کو خبردار کیا

گیا تھا کہ امریکہ' ہندوستان اور خلیج فارس میں یورپی باشندوں اور تاجروں کے قدم جمانے سے اسلامی دنیا اور مسلمانوں کی تجارت کو زبردست خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔

> بحیرۂ روم اور سوئیز کے درمیان رود بار کو کاٹ دینا چاہیے اور سوئیز کی بندرگاہ میں ایک بہت بڑا بحری بیڑہ تیار کرنا چاہیے۔ اس کے بعد ہندوستان اور سندھ کی بندرگاہوں پر قبضہ کرنے کے بعد کافروں کو وہاں سے بھگانا اور وہاں کی بیش قیمت اشیاء اپنے دارالحکومت لانا آسان ہو جائے گا۔(16)

عثمانیوں کی بدقسمتی یہ تھی کہ اس تجویز کو قبول نہیں کیا گیا۔ ایسی ہی تجویز پوپ کی طرف سے اپنے پیروکاروں کو بھی پیش کی گئی تھی اور وہ بھی ان سنی کر دی گئی تھی۔ اس کے بجائے عثمانی سلطنت اور ان کے اصل مدمقابل اسپین کے درمیان عارضی جنگ بندی ہو گئی جس نے دونوں کو اپنے ہی مخالف فرقوں کے خلاف لڑنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا۔ ترک سلطان ایرانی شیعوں کے خلاف لڑ رہے تھے اور اسپین کا بادشاہ شمالی یورپ کے پروٹسٹنٹ لوگوں کے خلاف برسر پیکار تھا۔ اس وقت تک نہر سوئیز نہیں کھلی تھی اور صدیوں بعد جب وہ کھلی تو وہ اور ہی سامراجی طاقتوں کے کام آئی۔ سولہویں صدی میں بحر ہند میں سلطنت عثمانیہ کی بحری مہم اس لیے ناکام ہو گئی کہ پرتگالیوں کے جہاز اور ان کا توپ خانہ زیادہ جدید اور زیادہ طاقتور تھا۔

اپنے کھوئے ہوئے علاقوں کی بازیابی' ان پر دوبارہ قبضے اور جوابی حملے کا یہی انداز ایک اور یورپی ملک میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس پر بھی قرون وسطیٰ میں مسلمانوں نے قبضہ کیا تھا۔ یہ ملک تھا روس۔ اسپین پر شمالی افریقہ کے مسلمانوں کی حکومت کے مقابلے میں روس پر منگول مسلمانوں کا قبضہ ایک مختصر عرصے کے لیے تھا۔ اور اس کا اثر بھی بہت ہی محدود رہا۔ تاہم ''تاتاریوں کی غلامی کے طوق'' نے روسیوں کے ذہنوں پر گہرا اثر چھوڑا تھا۔

روسیوں کی بازیافت کا عمل آئبیریا کی نسبت ذرا بعد میں شروع ہوا۔ 1380ء میں ماسکو کے شہزادۂ اعظم دمتری دونسکوی نے کولی کوودو کے میدان جنگ میں گھمسان کی لڑائی کے بعد تاتاریوں کو شکست دے دی' روس کی تاریخ اور روسی داستان میں اس جنگ کے بڑے قصیدے پڑھے گئے ہیں لیکن حقیقت میں یہ فیصلہ کن جنگ نہیں تھی کیونکہ دو سال بعد تاتاریوں نے ایک بار پھر شمال پر چڑھائی کر دی' روس کی زرعی اراضی کو تہہ و بالا کیا اور ماسکو پر قبضہ کر لیا جہاں سے وہ دوبارہ خراج وصول کرنے لگے۔ آخر 1480ء میں ماسکو کے ایوان اعظم نے روس کو اس خراج اور

اس محکومی سے آزاد کیا۔

ہسپانوی قوم اور پرتگالیوں کی طرح روسیوں۔ نے بھی اپنے سابق حکمرانوں کا طوق اتارنے کے بعد ان کا تعاقب شروع کر دیا۔ لیکن ان کی کامیابی ہسپانوی اور پرتگالی لوگوں سے زیادہ بڑی تھی۔ دولگا کے تاتاریوں کے ساتھ ایک طویل اور خوفناک جنگ کے بعد روس نے 1552ء میں کازان پر قبضہ کرلیا۔ اس کامیابی کے علاوہ کسی دشواری کے بغیر وہ دریائے دولگا کے بہاؤ کی جانب بڑھتے ہی چلے گئے۔ اور 1556ء میں انہوں نے استراخان کا ساحلی شہر قبضے میں لے لیا۔ اب دولگا روسیوں کے قبضے میں تھا اور وہ بحیرۂ کیسپیئن تک پہنچ گئے تھے۔ جنوب کی سمت راستے میں آنے والے تمام مسلمان علاقے اب ان کے ہاتھ میں تھے وہ اب براہ راست سلطنت عثمانیہ اور کریمیا کے علاقے میں بسنے والے تاتاریوں پر حملے کر رہے تھے۔

عثمانیوں نے اس خطرہ کو محسوس کرتے ہوئے اس کا جواب دینے کی کوشش کی۔ استراخان کی طرف ایک زبردست فوج روانہ کی گئی تاکہ اس پر قبضہ کر کے اسے مسلمانوں کے دفاعی نظام کے لیے قلعہ کے طور پر استعمال کیا جائے۔ اس منصوبے کا ایک حصہ یہ بھی تھا کہ دریائے ڈان اور دولگا کو ملانے کے لیے ایک نہر نکالی جائے جس کے ذریعہ عثمانی بحری بیڑہ کو بحیرۂ اسود اور کیسپین کے درمیان آمدورفت کی سہولت مل جائے۔ اگر ایسا کر لیا جاتا تو سلطنت عثمانیہ کو وسط ایشیا کی مسلم ریاستوں کے ساتھ براہ راست رسل ورسائل کا موقع مل جاتا اور جنوب یا مشرق کی جانب روس کی کسی بھی پیش قدمی کے خلاف ایک مضبوط دفاعی فصیل بن جاتی۔ (17)

لیکن یہ منصوبہ ناکام ہو گیا بلکہ مکمل ہی نہیں ہو سکا۔ تاتار کے خان کچھ عرصے کے لیے روسیوں کے حملے روکتے رہے اور عثمانی سلطان کے ساتھ ان کا سلسلہ برقرار رہا۔ سلطان کو وہ خلیفہ تسلیم کرتے تھے۔ عارضی طور پر بحیرۂ اسود ترکوں اور اس علاقے کے مسلمانوں کے قبضے میں رہا اور کریمیا اور استنبول کے درمیان خاصی تجارت بھی ہوتی رہی۔ یہ تجارت غذائی اجناس اور مشرقی یورپ کے غلاموں کی تھی۔ لیکن اب یہ راستہ روسیوں کی زبردست پیش قدمی کے لیے کھل چکا تھا۔

ادھر مغربی یورپ کے بحری جہاز تاجروں کو لے کر افریقہ کے گرد چکر لگا رہے تھے۔ ان تاجروں نے جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیا کے شہروں میں اپنے تجارتی مراکز بنا لیے تھے تو دوسری طرف روسی سپاہی اور انتظامی ماہرین خشکی کے راستے بحیرۂ اسود، کیسپئین، سلسلہ کوہ پامیر اور بحرالکاہل کی طرف پیش قدمی کر رہے تھے۔ ان کے پیچھے پیچھے روسی تاجر اور کسان بھی تھے۔ مغربی

یورپ کے لوگوں کی طرح مشرقی یورپ کی پیش قدمی میں بھی ان کی فوجی اور ٹیکنالوجی کی برتری نے نہایت اہم کردار ادا کیا۔ روسیوں کو اپنی پیش قدمی میں کسی بڑی رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ مغربی یورپ کی سامراجی طاقتوں کے پاس ایسے مضبوط بحری جہاز تھے جو بحراوقیانوس کی طوفانی موجوں کا مقابلہ کر سکتے تھے' ان کے ہاں جہاز رانی کی مہارت بھی تھی اور بحری اسلحہ ایسا تھا جس کا جواب کسی ایشیائی ملک کے پاس نہیں تھا۔

براعظم یورپ میں صرف ایک مقام پر ایک مسلم مملکت یعنی سلطنت عثمانیہ نے زوال آمادہ ہونے کے باوجود بلقان' ایجین اور قسطنطنیہ کی طرف بڑھتی عیسائی یورپ کی یلغار کو روکا۔ اس وقت مسلمانوں کی یہ سب سے زیادہ طاقت ور سلطنت تھی۔ تاہم عثمانی ترک جہاں یورپ کا مقابلہ کر رہے تھے وہاں آہستہ آہستہ یورپ کے زیر اثر بھی آتے جا رہے تھے۔ حتیٰ کہ انہوں نے یورپ کے بہت سے طور طریقے بھی اختیار کرنا شروع کر دیئے تھے۔ ان تبدیلیوں نے مسلمانوں کو بادل ناخواستہ اپنے آپ کو حالات کے مطابق ڈھالنے پر مجبور کر دیا۔ اب تک تو وہ اپنے مذہب کی حقانیت کی وجہ سے اپنے آپ کو باقی دنیا سے برتر تصور کرتے تھے اور انہیں حقارت کی نظر سے دیکھتے رہے تھے مگر اب انہوں نے کافروں کو مسلسل طاقت حاصل کرتے دیکھا تھا۔ ان کا تاریخ کا تصور یہ تھا کہ مسلمان خدا کی حقانیت کے علم بردار ہیں اور ان کا دینی فریضہ یہ ہے کہ وہ حق وصداقت کا پیغام باقی دنیا تک پہنچائیں۔ ان کا بادشاہ یا سلطان پیغمبر اسلام کا خلیفہ تھا۔ کرۂ ارض پر صرف اسلامی مملکت ہی جائز اور حقیقی مملکت تھی اور اسلامی برادری ہی سچائی کی نقیب تھی جسے چاروں جانب سے کفر کی وحشت و بربریت کی تاریکی نے گھیرا ہوا تھا۔ اس امت پر خدا کے انعام واکرام کا ثبوت یہ تھا کہ اسے اس دنیا میں فتح و نصرت حاصل ہو رہی تھی۔ نعمت خداوندی کی یہ ارزانی اس وقت بھی تھی اور رسول کریم ﷺ کے زمانے سے ہوتی آئی تھی۔

یہ عقیدہ اسلام کے آغاز سے چلا آ رہا تھا۔ اسے تقویت ملی پندرھویں اور سولھویں صدی عثمانیوں کی فتوحات سے۔ اور اسے مزید زندگی بخشی دو سو سال بعد اٹھارویں صدی میں مسلم افواج کی کامیابیوں نے۔ مسلمانوں کے لیے یہ یقین کرنا بہت مشکل تھا کہ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اب حالات کو بدلنے میں مسلمانوں کی طاقت فیصلہ کن کردار ادا نہیں کر سکتی اب ان کے دشمن عیسائیوں کے ہاتھ میں فیصلہ کن طاقت ہے اور مسلم حکومتوں کی زندگی کا انحصار بعض اوقات عیسائی حکمرانوں کی امداد اور بعض اوقات ان کی خوشنودی پر ہے۔

اگرچہ ایک طرف روس کی کوسک فوجیں اور دوسری طرف چھوٹے اور ہلکے تیز رفتار پرتگالی بحری جہاز شمال اور جنوب دونوں سمت سے یلغار کر رہے تھے پھر بھی مشرق وسطیٰ سے شمالی افریقہ تک وسیع علاقے پر مسلمان حکومتوں کی آزادی برقرار تھی۔ سولہویں صدی سے انیسویں صدی تک یورپی طاقتوں کی توسیع کا جو زمانہ تھا اس میں عالم اسلام کے پانچ سیاسی مرکز ابھر کر سامنے آئے۔ یہ تھے ہندوستان' وسط ایشیا' ایران' سلطنت عثمانیہ اور شمالی افریقہ۔ ہندوستان میں مسلمان اگرچہ اقلیت میں تھے لیکن انہوں نے اپنی حکومت قائم کی تھی۔ سولہویں صدی میں وسط ایشیا سے آنے والے ترک و مغل سپاہی بابر نے اپنا شاہی سلسلہ نسب قائم کیا۔ اس کے دور حکومت اور اس کے بعد آنے والے اس کے جانشینوں کے دور حکومت میں ہندوستان کے اندر مسلمانوں کا اقتدار اپنے آخری اور عظیم الشان دور میں داخل ہوا۔ اس کا خاتمہ مغربی یورپ کے ساتھ معرکہ آرائی کے بعد ہوا۔

اس سے آگے وسط ایشیا میں منگول مسلمانوں کی مملکتوں کی ٹوٹ پھوٹ کے بعد بحیرۂ کیسپین سے چین تک ایک وسیع علاقے میں چھوٹی چھوٹی مسلم ریاستیں وجود میں آ گئی تھیں۔ ان ریاستوں کو بھی آگے بڑھتی یورپی طاقت سے مقابلہ کرنا پڑا۔ اس بار یہ طاقت روس تھی جس نے آخر کار انہیں فتح کر کے روسی سلطنت میں شامل کر لیا۔

اسلامی دنیا کی بالکل مخالف سمت میں شمالی افریقہ کے اندر مراکش نے چند صدیوں تک اپنی آزادی برقرار رکھی لیکن الجزائر' تونس اور لیبیا نے سلطنت عثمانیہ کی اطاعت قبول کر لی۔ تاہم مقامی طور پر ان کے اپنے حکمران ہی حکومت چلاتے رہے۔ بعد میں انیسویں اور بیسویں صدی میں یہ تینوں ملک فرانس' اسپین اور اٹلی کی نوآبادی بن گئے۔

صرف دو ملک ایسے تھے جو اس عالمی تباہی و بربادی سے بچے رہے۔ یہ تھے ترکی اور ایران۔ حالانکہ ان کی آزادی کو بھی کئی بار خطرہ پیش آیا اور ان کے حصے بخرے بھی ہوئے لیکن کسی زمانے میں بھی وہ اپنی مکمل آزادی سے محروم نہیں ہوئے۔

ابتدا میں پرتگالیوں نے بعض علاقوں پر قبضہ جمانے کی کوشش کی لیکن بعد میں ایشیا میں مغربی یورپ کے ملکوں کی سرگرمیاں عام طور پر تجارتی اور بحری امور تک ہی محدود ہیں۔ ان کی سیاسی حاکمیت یقیناً اس کے نتیجے میں پیدا ہوئی لیکن یہ کام بتدریج ہوا۔ اس کے بعد بھی وہ زیادہ تر جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیا اور مشرقی افریقہ تک ہی محدود رہے۔ مشرق وسطیٰ پر ان کا اثر و رسوخ

بالواسطہ ہی رہا۔ وسط ایشیا کے علاقوں میں مغربی یورپ کی سیاسی اور فوجی دلچسپی کافی عرصے بہت ہی کم رہی البتہ مشرقی یورپ ادھر کافی دلچسپی لیتا رہا۔

تاہم ایشیا اور افریقہ میں پرتگالیوں اور بعد میں انگریزوں اور ولندیزیوں کی حکومتیں مستحکم ہو جانے کا مطلب یہ تھا کہ ایران اور سلطنت عثمانیہ گھیرے میں آ گئے۔ یہ گھیرا یا محاصرہ ہی تھا جس کی وجہ سے گرم مسالوں کی تجارت میں اور بحری راستے میں تبدیلی وقوع پذیر ہوئی۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ اس کی وجہ شروع میں افریقہ کے گرد پرتگالی جہازوں کا چکر کاٹنا تھا درست نہیں ہے۔ یہ تجارت جو صدیوں سے بحیرۂ احمر اور خلیج فارس کے راستے بحیرۂ روم اور یورپ تک کی جاتی تھی اور جس کے راستے میں مشرق وسطیٰ بھی فائدہ اٹھاتا تھا اب بڑے سمندروں کے راستے پر ڈال دی گئی تھی ان سمندروں پر دونوں جانب مغربی طاقتوں کا قبضہ تھا۔

یہ تبدیلیاں بہت سست رفتار تھیں اور ان کے اثرات بھی جلد ظاہر نہیں ہوئے۔ چنانچہ استنبول میں متعین شاہی سفیر او گئیر گیسلا دی لیسبیک جیسے ذہین وفطین مبصر نے اپنے مراسلے مورخہ 1555ء میں شکایت کی کہ یورپ کی طاقتیں انڈیز (جنوب مشرقی ایشیا) اور دنیا کے دوسرے کنارے پر جا کر سمندروں میں مالِ غنیمت جیسے سونا' چاندی حاصل کرنے کے لیے اپنی قوت ضائع کر رہی ہیں حالانکہ مسیحی یورپ کے اپنے وجود کو ہی ترکوں سے خطرہ لاحق ہے۔

سولھویں صدی کے آخر تک بھی یہ خطرہ ختم نہیں ہوا تھا...... 1683ء میں ترکوں نے ویانا پر قبضہ کرنے کے لیے دوسری اور آخری کوشش کی۔ کئی ہفتے کے محاصرہ کے بعد آخر کار ترک فوجوں کو وہاں سے پسپا ہونا پڑا۔ اس زمانے کا ایک ترک وقائع نگار اپنے روایتی اختصار اور بے باکی کے ساتھ یہ کہانی یوں بیان کرتا ہے:

> (ان کا) ایک سپاہی پکڑا گیا اور اس سے تفتیش کی گئی۔ اس نے کہا کہ آسٹریا کے شہنشاہ نے ہر جانب مراسلے روانہ کیے ہیں اور تمام عیسائی حکمرانوں سے مدد طلب کی ہے۔ پولینڈ کا بادشاہ' جس بدبخت کا نام سربیسکی ہے' بذات خود اس کی مدد کو آیا ہے۔ اس کے ساتھ لیتھوانیا کے سپاہی اور قازق سردار ہیں اور پولش کافروں کی 35000 گھوڑ سوار اور پیادہ فوج ہے۔ آسٹریا کے بادشاہ نے اپنے آدمی بھی اکٹھے کیے ہیں جن کے لیے جتنی بھی کمک حاصل کی جا سکتی ہے وہ کی ہے۔ گھوڑ سواروں اور پیادوں میں 85000 چنے ہوئے جرمن سپاہی

ہیں۔ ان کے علاوہ 40000 شہسوار اور 80000 پیادے اور ہیں جو ایک لاکھ بیس ہزار بن جاتے ہیں۔ یہ سب اس جگہ اکٹھے ہو گئے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ ان کا ارادہ عساکر اسلام پر دھاوا بولنے کا ہے جو ویانا کے گرد خندقوں میں موجود ہیں۔(19)

عثمانی وقائع نگار نے اس تباہی و بربادی کو بھی چھپانے کی بالکل کوشش نہیں کی جو اس کے بعد ہوئی:

...... ہر چیز جو شاہی (عثمانی) کیمپ میں تھی، دولت اور اسلحہ اور قیمتی اشیاء سب پیچھے رہ گئیں اور جہنمی لوگوں کے ہاتھ آئیں۔ بدبخت کافر اپنے دستے (خدا اسے غارت کرے) کے ساتھ دو صفیں بنا کر آئے۔ ایک دریائے ڈینیوب کے کنارے کنارے آگے بڑھی اور اس نے قلعہ بندی میں داخل ہو کر خندقوں پر حملہ کر دیا۔ دوسری نے شاہی عساکر کے کیمپ پر قبضہ کر لیا۔ انہیں خندقوں میں جو زخمی سپاہی ملے ان میں سے کچھ کو انہوں نے قتل کر دیا اور باقی قیدی بنا لئے۔ خندقوں میں جو دس ہزار جاں نثار رہ گئے تھے وہ جنگ لڑنے کے قابل نہیں تھے۔ کیونکہ وہ بندوقوں، توپوں، بارودی سرنگوں، پتھروں اور دوسرے ہتھیاروں سے زخمی ہو چکے تھے۔ بعض تو ایسے تھے جن کے ہاتھ پاؤں بھی نہیں تھے۔ ایسے سپاہیوں کو انہوں نے مار ڈالا۔ انہیں چند ہزار اپنے سپاہی جو قید میں ملے انہیں رہا کرا لیا۔ وہ اتنی زیادہ دولت اور ساز و سامان لوٹنے میں کامیاب ہوئے۔ جو بیان سے باہر ہے۔ اس لیے انہوں نے عساکر اسلام کا تعاقب کرنے کا سوچا تک نہیں۔ اگر وہ ایسا کرتے تو بڑی تباہی ہوتی۔ خدا ہمیں محفوظ رکھے۔ یہ اتنی زبردست اور تباہ کن شکست ہے جس کی مثال سلطنت عثمانیہ کے اقیام سے آج تک نہیں ملتی۔(20)

1525ء میں ترکی نے ویانا پر قبضہ کرنے کی جو کوشش کی وہ کامیاب تو نہیں ہوئی لیکن اس سے تعطل کی صورت حال پیدا ہو گئی جس کی وجہ سے سلطنت عثمانیہ پھر بھی یورپ کے قلب میں خطرہ بنی رہی۔ دوسرا محاصرہ اور دوسری پسپائی بالکل مختلف معاملہ ہے۔ اس بار ناکامی واضح اور قطعی تھی۔ اس پسپائی کے بعد میدان جنگ میں تباہ کن شکست ہوئی اور کئی شہر ہاتھ سے نکل گئے۔ ان تبدیلیوں پر عثمانیوں کے جو جذبات تھے ان کا اظہار اس زمانے کے ایک گانے میں نہایت خوبی

کے ساتھ کیا گیا ہے۔ یہ بودا کی شکست کا نوحہ ہے جسے 1686ء میں عیسائیوں نے دوبارہ فتح کر لیا تھا۔

مساجد میں نمازیں نہیں پڑھی جاتیں
حوضوں میں وضو نہیں کیے جاتے
ہائے! رستی بستی آبادیاں اجڑ گئیں
اور آسٹریا کے لوگوں نے ہمارا خوبصورت بودا چھین لیا

غیر شاعرانہ انداز میں اسے اس طرح سمجھ لیجئے کہ آسٹریا کی فتح کے زمانے میں ایک عثمانی افسر بلغراد گیا۔ اس نے دیکھا کہ نئے حکمرانوں نے شہر میں کئی تبدیلیاں کی ہیں۔ انہوں نے چند مساجد کو فوجی بیرکوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ ان میں سے ایک مسجد کا گنبد توڑ دیا گیا ہے اور میناروں کو کلاک ٹاور بنا دیا گیا ہے۔ غسل خانے ویسے ہی رہنے دیئے گئے ہیں لیکن انہیں رہائشی کمرے بنا دیا گیا ہے۔ صرف ایک غسل خانہ برقرار ہے۔ دریائے ڈینیوب کے کنارے پر جو گھر تھے وہ سب شراب خانے بن گئے ہیں۔ رعایا میں سے غریب لوگ بہت ہی کمزور ہو گئے ہیں اور جرمن ان پر بہت ظلم کرتے ہیں۔

26 جنوری 1699ء کو کارلووٹنر کے مقام پر جس صلح نامہ پر دستخط کئے گئے وہ سلطنت عثمانیہ اور سلطنت ہیبسبرگ کے درمیان ہی نہیں بلکہ عیسائیت اور اسلام کے درمیان بھی تعلقات میں ایک نیا موڑ ثابت ہوا۔ اور یہ زیادہ اہم حقیقت تھی۔ گزشتہ چند صدی سے سلطنت عثمانیہ مسلمانوں کی سب سے ممتاز طاقت تھی۔ یہ مغربی عیسائی ہمسایوں کے ساتھ ایک ہزار سال کے تنازعات میں مسلمانوں کی نمائندگی کرتی تھی۔ اگرچہ یورپ کے مقابلے میں مسلمانوں کی اصل طاقت کئی اعتبار سے کمزور پڑ چکی تھی لیکن کچھ عرصے کے لیے یہ حقیقت عیسائیوں اور مسلمانوں اور مغرب کی نظر سے پوشیدہ رہی۔ تاہم ویانا سے پسپائی اور اس کے بعد ہونے والی شکست سے دونوں کے تعلقات کی نوعیت واضح ہو گئی۔ یورپ کے لیے ترکی اب بھی دردِ سر تھا لیکن یہ مسئلہ ترکی کی اپنی کمزوری سے پیدا ہوا تھا۔ ترک طاقت کے خطرے کا اس میں کوئی دخل نہیں تھا۔ اسلام پہلے ہی کلیسا کی نظر میں کوئی بڑا مد مقابل مذہب نہیں رہا تھا اب وہ فوجی خطرہ بھی نہیں رہا۔ ترکی میں بھی یہ احساس پیدا ہو گیا تھا کہ اس کی سرحدوں سے باہر اب وحشت و بیابانی اور جہالت کا دور دورہ نہیں ہے اور وہاں وہ کافر اور وحشی نہیں بستے جنہیں فتح کر کے اپنی مرضی سے اپنی رعایا بنایا جا سکتا ہے۔

بلکہ وہ نہایت خطرناک دشمن ہیں جو پوری سلطنت کے لیے ایک بڑا خطرہ ہیں۔

مغرب کی بحری طاقت کا خطرہ سولہویں صدی میں ہی خوفناک شکل اختیار کر گیا تھا۔ سلیمان ذی شان کے وزیر اعظم لطفی پاشا نے بیان کیا ہے کہ ایک دن فاتح شام و مصر سلطان سلیم اوّل (1512-1520) نے اپنے مشیر اعلیٰ سے کہا "میرا مقصد فرنگیوں کی سرزمین فتح کرنا ہے" اس پر مشیر نے جواب دیا "میرے سلطان اعظم' آپ ایک ایسے شہر میں رہتے ہیں جس کا مربی سمندر ہے۔ جب سمندر غیر محفوظ ہوتا ہے تو کوئی جہاز نہیں آتا' اور جب کوئی جہاز نہیں آتا تو استنبول کی خوش حالی جاتی رہتی ہے"' جس وقت یہ بات چیت ہو رہی تھی اس وقت سلطان سلیم بستر مرگ پر تھا اس کے لیے وہ کچھ نہیں کر سکا۔ لطفی پاشا نے یہ بات سلطان سلیمان کے سامنے پھر چھیڑی اور کہا۔ "پہلے سلطانوں کے زمانے میں ایسے تو بہت تھے جنہوں نے زمین پر حکمرانی کی لیکن بہت کم ایسے ہوئے ہیں جن کی حاکمیت سمندروں پر رہی۔ جنگ لڑنے میں کافر ہم سے برتر ہیں۔ ہمیں ان پر قابو پانا چاہیے۔" (23) ترکوں نے ان پر قابو نہیں پایا۔ اس کا نتیجہ **1571**ء میں لیپانتو کی عظیم بحری جنگ میں عثمانیوں کی تباہ کن شکست کی صورت میں سامنے آیا۔

یہ بہت بڑا صدمہ تھا اور ترکوں نے اپنے روایتی انداز میں اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ اس زمانے کی ایک ترک دستاویز میں الجزائر کے حاکم کی رپورٹ کا حوالہ ملتا ہے۔ اس رپورٹ میں حاکم نے اس جنگ کے بارے میں نہایت ہی اختصار کے ساتھ اس طرح لکھا:

> بدبخت کافروں کے ساتھ شاہی بیڑہ کا مقابلہ ہوا اور رضائے خداوندی نے دوسری جانب منہ موڑ لیا۔ (24)

قابل ذکر بات یہ ہے کہ یورپ کی دستاویزوں میں تو اس جنگ کو اس یونانی بندرگاہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جس کے قریب یہ لڑی گئی لیکن ترک وقائع میں اسے سنگن **(Singin)** کہا گیا۔ یہ ترکی لفظ ہے جس کے معنی ہیں کمر توڑ شکست۔ لیکن یہ جنگ اتنی فیصلہ کن نہیں تھی جیسی کہ پہلے نظر آتی تھی کیونکہ بحیرۂ روم میں عثمانیوں نے اپنی بحری طاقت کا بڑا حصہ دوبارہ حاصل کر لیا تھا اور آئندہ حملوں کے خلاف تمام ساز و سامان جمع کر لیا تھا۔ ایک ترک وقائع نگار بتاتا ہے کہ جب سلطان سلیم دوئم (1566-1574) نے اپنے وزیر اعظم سوکولو محمد پاشا سے معلوم کیا کہ لیپانتو میں تباہ ہو جانے والے جہازوں کی جگہ نیا بحری بیڑہ تیار کرنے پر کتنا خرچ آئے گا تو وزیر اعظم نے جواب دیا۔ "سلطنت کی طاقت اتنی زیادہ ہے کہ اگر آپ چاہیں کہ سارے بیڑہ کو چاندی کے

لنگروں' ریشمی رسّوں اور اطلس کے بادبانوں سے آراستہ کردیا جائے تو ہم ایسا کرسکتے ہیں۔'' (25)

یورپ میں عثمانی عساکر کی شکست بہت ہی زیادہ سنگین تھی اور اسے فوراً تسلیم بھی کرلیا گیا۔ اس کے نتیجے میں بڑے بڑے صوبے ہاتھ سے نکلے اور باقی صوبوں کے لیے ایک نیا خطرہ سامنے آیا۔ سب سے زیادہ اہم بات یہ ہوئی کہ سلطنت عثمانیہ اور اس کے ہمسایہ دشمنوں کے درمیان تعلقات کی نوعیت بدل گئی۔

شکست کے اثرات زائل کرنے کے لیے ترکوں نے ایک نیا راستہ اختیار کیا۔ یہ سفارتی حکمت عملی تھی۔ نئی تدبیر یہ تھی کہ مغربی یورپ کے ملکوں بالخصوص برطانیہ اور ہالینڈ سے مدد طلب کی جائے کہ وہ ان کی طرف سے ثالث کے فرائض انجام دیں اور ترکی کے دشمن ہمسایوں کے ساتھ تعلقات میں ایک نیا توازن پیدا کریں۔

اس سے پہلے بھی مغربی طاقتوں کے ساتھ مذاکرات کی کوششیں ہو چکی تھیں۔ سلیمان نے فرانس کے بادشاہ فرانس اوّل کے ساتھ سلطنت ہیسبرگ کے خلاف ایک قسم کا معاہدہ کیا تھا۔ اس معاہدہ کو فرانسیسی اور ان کے یورپی مخالف سیاسی اتحاد کہتے تھے۔

ترک اسے دوسرے انداز میں دیکھ رہے تھے۔ سولہویں صدی کا ایک مصنف لکھتا ہے:

> فرانس کا بے (بے ترک لقب ہے جس نے فرانس کے شہنشاہ کی حیثیت کم کر کے اسے ترکی کے صوبائی گورنر کے برابر بنا دیا) ہمیشہ اپنی وفاداری (یہاں ترکی لفظ انتساب استعمال کیا گیا جو عام طور پر غلام و آقا کے رشتے میں استعمال کیا جاتا تھا) ''آشیانہ مسرت و بہجت کے پایہ تخت کے ساتھ جتاتا تھا اور اپنی تابع داری کا اعلان اس دربار عالیہ کے سامنے کرتا تھا جو طاقت کا سرچشمہ ہے...... اپنے آپ کو محاصرہ میں دیکھ کر اور اپنے وزیروں مشیروں سے صلاح و مشورے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ دانش مندی کا تقاضہ یہ ہے کہ پناہ طلب کی جائے اور عالم گیر تخت سلطانی کے ساتھ رابطہ کی کوشش کی جائے۔

چنانچہ فرانس کے ''بے'' نے مدد حاصل کرنے کے لیے اپنا سفیر استنبول بھیجا اور یہ پیغام پہنچایا:

> ایک شقی القلب دشمن' بدکار ہنگری والوں کی مدد سے ہمارے اوپر غالب آگیا ہے اور اس نے ہمارا علاقہ فتح کرلیا ہے۔ اگر سلطان عالم فراخدلانہ سرپرستی

فرمائیں اور ہمارے دشمنوں کے اس بدبخت مددگار کی پیش قدمی روک دیں تو
ہم اس کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائیں گے اور اس کے ناپاک عزائم خاک
میں ملا دیں گے۔ ہم سلطان عالی شان کے احسانات کے غلام بخوشی اپنی گردن
جھکائیں گے اور اپنے سر طوق وفاداری کے آگے کر دیں گے۔(26)

مورخ لکھتے ہیں کہ جلیل القدر اور عالی ظرف سلطان کو غم زدہ اور بدقسمت فرانسیسی پر رحم آ گیا اور انہوں نے اس کی مدد کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ ترک افواج منحوس ہنگری والوں کی سرکوبی کے لیے روانہ ہو گئیں۔

1552ء میں تو فرانس اور ترکی نے ہسپانوی بندرگاہوں پر مشترکہ حملہ بھی کیا تھا۔ اس کا ذکر تمام ترک تاریخوں میں تو نہیں البتہ چند کتابوں میں ضرور ملتا ہے۔

سولہویں صدی کے آخری برسوں میں انگلستان کی ملکہ ایلزبتھ اوّل کے ساتھ کئی معاملات پر خط و کتابت ہوئی۔ اس میں کہیں کہیں مشترکہ دشمن ہسپانیہ کے خلاف ممکنہ محاذ بنانے کا حوالہ بھی ملتا ہے۔ لیکن یہ کوئی مستقل کوشش نہیں تھی۔ اس میں مغرب کی جانب سے ہی پہل ہوتی تھی۔ ترکی کے لیے یہ مذاکرات اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ اس لیے اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ البتہ ویانا میں دوسری شکست کے بعد نئی سفارتی سرگرمیاں شروع ہوئیں جنہوں نے آنے والے زمانے کے لیے طریقہ کار متعین کیا۔ اٹھارویں صدی کے دوران میں عثمانیوں میں یہ شعور اجاگر ہوا کہ اب وہ عالم اسلام کی وہ سلطنت نہیں رہے جو عیسائی طاقت کے مدمقابل تھی بلکہ بہت سی مملکتوں میں سے ایک مسلم مملکت ہیں۔ اس کے اپنے حلیف بھی ہیں اور حریف بھی۔ تاہم اس خیال کو قبول کرنا بھی آسان نہیں تھا اور اٹھارویں صدی میں اس خیال کی مخالفت کرنے والے بھی بہت تھے۔ ترکی روس اور آسٹریا دونوں کے ساتھ لڑ رہا تھا۔ اس وقت مضبوط دلائل کے ساتھ یہ تجویز سامنے آئی کہ سویڈن اور پروشیا کے ساتھ معاہدے کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں کیونکہ سویڈن بھی آسٹریا کے ساتھ جنگ لڑ رہا تھا۔ خیال یہ تھا کہ اس طرح عقب میں آسٹریا کا دباؤ ختم ہو جائے گا۔ چنانچہ 1789ء اور 1790ء میں ان دونوں ملکوں کے ساتھ معاہدے ہو گئے۔ جو ایک طرح سے فوجی اتحاد تھے۔ ترک کافی عرصے سے یورپی طاقتوں کے ساتھ مل جل کر رہنے کے عادی ہو چکے تھے حتیٰ کہ ان تعلقات کو عام طور پر ''دوستی'' یا ''دوستانہ'' کے الفاظ سے یاد کیا جاتا تھا۔ یورپ والے کبھی کبھی انہیں اتحاد بھی کہتے تھے لیکن ترکوں نے ایسا کبھی نہیں کہا۔ ان کے نزدیک عیسائی طاقتوں کے ساتھ

اتحاد خواہ وہ دوسری عیسائی قوتوں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو عجیب وغریب اور کس حد تک نفرت انگیز بات تھی۔ فوج کے قاضی القضاۃ شانی زادے نے ایسے اتحاد کی مذمت کی اور اسے شریعت کے منافی قرار دیا۔ اس کے لیے اس نے قرآن کی آیت کا حوالہ دیا کہ "اے ایمان والو۔ میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ" (27) تاہم مفتی اعظم حامدی زادے مصطفےٰ آفندی نے قاضی کے فتوے کو رد کر دیا اور یہ حدیث پیش کی "اللہ تعالیٰ اسلام کے نصب العین ان لوگوں کے ہاتھوں پورے کرائے گا جو اسلام میں سے نہیں ہیں۔" اس کے ساتھ اس نے دوسرے حوالے اور دوسرے دلائل بھی پیش کیے (28) چنانچہ یہ رائے فوقیت حاصل کر گئی حالانکہ بہت سے لوگ ایسے تھے جو اسے قبول کرنے کو تیار نہیں تھے۔

صرف ایک علاقے میں پرانے طرز کا جہاد جاری رہا۔ وہ علاقہ تھا مغربی بحیرۂ روم۔ بربر ریاستوں میں جو آزاد مراکشی سلطنت کا حصہ تھیں اور الجزائر، تونس اور طرابلس کی ریاستوں نے جو برائے نام ہی عثمانی خلافت کے ماتحت تھیں عیسائی طاقتوں کے خلاف جہاد جاری رکھا تھا۔ یہ جہاد خشکی کے بجائے بحری راستوں پر جاری تھا جو عیسائی حکومتوں کے لیے مستقل درد سر بنا ہوا تھا۔ یورپ کی نظر میں یہ لوگ سمندروں میں جنگ لڑنے والے بحری قزاق تھے لیکن وہ خود اپنے آپ کو مجاہد اور غازی کہتے تھے۔ یورپ کے لیے گہرے سمندروں میں جو چیز بحری قزاقی تھی وہ شمالی افریقہ کی ریاستوں کے لیے اسلام کے دشمنوں کے خلاف بحری جہاد تھا۔ اس جہاد میں جو جہاز پکڑے گئے ان سے خاصہ مال و دولت حاصل ہوا جو مجاہدوں میں مال غنیمت کے طور پر تقسیم ہوا۔ یہ سہولت عیسائی سپاہیوں کو حاصل نہیں تھی۔ اسلامی شریعت کے مطابق جو کافر جنگ میں گرفتار ہوں انہیں غلام بنا کر فروخت کرنا جائز تھا۔ اگر وہ بازار کی مروجہ قیمت کے حساب سے اپنا تاوان پیش کر دیتے تو ان کے اپنے لیے بہتر ہوتا۔ اور اگر ایسا نہ کرتے تو اپنے نئے آقاؤں کے غلام بنے رہتے۔

ادھر شمالی افریقہ کی ریاستوں کی اجازت سے جو نجی جہاز راں ان بحری جنگوں میں حصہ لے رہے تھے انہیں عیسائی حکومتوں کی طرف سے بھی نہ صرف برداشت کیا جاتا تھا بلکہ بعض اوقات ان کی حوصلہ افزائی بھی کی جاتی تھی کیونکہ یورپی طاقتوں کے اپنے اندر بھی باہمی مناقشت تھی جو اٹھارویں صدی تک جاری رہی۔ نپولین کی جنگ اور فرانس کی انقلابی جنگوں نے شمالی افریقہ کی ریاستوں کو اور بھی اہمیت دے دی تھی۔ ان کی ہمدردیاں اور ان کی خیر سگالی حاصل کرنے

اوران کے علاقوں میں مقامی سہولتیں تلاش کرنے کے لیے متحارب یورپی طاقتوں کے درمیان جو مقابلہ شروع ہوااس سے ان ریاستوں کی پوزیشن اور بھی مستحکم ہوگئی۔تاہم 1815ء کے بعد یورپی طاقتوں کواس کی ضرورت نہیں رہی اور مغربی ملکوں نے جن میں اب امریکہ میں شامل ہو گیا تھا۔ ٹھوس اقدام کیا اور مغربی جہازوں کی آمدورفت کو پیش آنے والے اس خطرہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کی کارروائی کی گئی۔

اس زمانے کی عجیب وغریب صورت حال اور مغربی حکومتوں اور شمالی افریقہ کی ریاستوں کے تعلقات کی دلچسپ تصویر میڈرڈ میں متعین عثمانی سفیر کی درج ذیل رپورٹ سے سامنے آتی ہے۔یہ رپورٹ 1787ء اور 1788ء کے دوران میں لکھی گئی۔سلطان کے نمائندے کی حیثیت سے وہ سفیر الجزائر کے بے (حاکم) اور ہسپانیہ کے بادشاہ کے درمیان ہونے والے نئے معاہدے سے خاصہ پریشان نظر آتا ہے اور میڈرڈ میں بے کے سفیر سے اس بارے میں بات چیت کرتا ہے۔الجزائر برائے نام ہی سلطنت عثمانیہ کے ماتحت تھا۔الجزائر کا بے اسے یقین دلاتا ہے:

> صلح کا معاہدہ (مصالحہ) جوالجزائر نے ہسپانیہ کے ساتھ کیا ہے۔وہ پورے کا پورا الجزائر کے مفاد میں ہے۔اس معاہدے کی رو سے ہسپانیہ کو اپنے 1250 قیدی چھڑانے کے لیے فی قیدی ایک ہزار ریال تاوان ادا کرنا تھا۔دلچسپ بات یہ ہے کہ معاہدے کے بعد جب یہ رقم الجزائر پہنچی تو الجزائر والوں نے وہ پوری کی پوری رقم رکھ لی حالانکہ کئی قیدی مر بھی گئے تھے۔اس پر ہسپانوی کچھ بھی نہیں کر سکے۔اس دستاویز میں یہ بھی لکھا ہے کہ شاہ ہسپانیہ پانچ سو توڑے جواہرات اور دوسری اشیاء کے علاوہ بھاری نقد رقم بھی دے گا اور بحریہ اور اسلحہ خانے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہوگی وہ بھی دے گا......ایک سو سے زیادہ الجزائری قیدی ہسپانیہ کی قید میں ہیں جن کے لیے الجزائر کو بھی تاوان ادا کرنا تھا لیکن اس نے کہا ''ہمیں ان غداروں اور بزدلوں کی ضرورت نہیں ہے۔اگر وہ ایسے نہ ہوتے تو اس طرح گرفتار نہ ہوتے۔'' ہسپانیہ نے جواس پر حیرت زدہ تھا' کسی دوسرے ملک کو یہ بات نہیں بتائی۔خلاصہ کلام یہ ہے کہ انہوں نے شاہ مراکش کو ذاتی خط لکھا جس میں کہا گیا تھا کہ ''اگر آپ انہیں

(قیدیوں کو) چاہتے ہیں تو ہم آپ کی خاطر انہیں رہا کر سکتے ہیں۔'' موخرالذکر (شاہ مراکش) نے اسلامی یکجہتی کی خاطر اس سے اتفاق کیا اور قیدی رہا کر دیئے گئے۔ اس نے ہر ایک کو سفر خرچ اور کپڑے دیئے اور انہیں الجزائر واپس بھیج دیا۔ ہسپانیہ نے اپنی بے عزتی چھپانے کے لیے یہ اڑا دیا کہ اس نے مراکش کے حکمران کی درخواست پر ایسا کیا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ الجزائر یوں کی قوت ایمانی نے کافروں پر اپنا اثر دکھایا اور ہسپانوی یہ اقدام کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ایک دن میڈرڈ میں ایک اہم الجزائری شخصیت کے ساتھ بات چیت کرتے ہوئے میں نے پوچھا ''آپ نے ان کے ساتھ صلح کیوں کی حالانکہ آپ ان سے بہت زیادہ فائدہ اٹھا رہے تھے؟'' اس نے جواب دیا بے شک ہمارا فائدہ بہت زیادہ ہے۔ یہ صلح زیادہ سے زیادہ تین سال چلے گی۔ اس عرصے میں ہم اپنے فوائد برقرار رکھیں گے۔ جہاں تک آج کا تعلق ہے ہم دو یا تین سال کے لیے بہت کچھ جمع کر رہے ہیں اور کہیں کوئی نقصان بھی نہیں ہوا ہے۔'' اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ صلح پانی پر لکھی تحریر سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔(29)

وقتی کامیابیوں کے باوجود اٹھارویں صدی مجموعی طور پر اسلامی مملکتوں کے لیے بہت برا زمانہ تھا۔ نو مسلم ریاستوں میں اس بدلتی ہوئی صورت حال کا احساس و ادراک کئی طریقوں سے ظاہر ہوا۔ اس تبدیلی میں کئی عوامل کارفرما تھے۔ یورپ کے ساتھ نبٹنے میں مشرق وسطیٰ کی ریاستوں کو کئی قسم کی پیچیدگیوں کا سامنا تھا جس میں اسلحہ اور جنگی ساز و سامان کی بڑھتی ہوئی قیمتیں بھی شامل تھیں۔ سولھویں اور سترھویں صدی میں جو افراط زر اور گرانی کا طوفان آیا تھا اس سے ان کی تجارت اور داخلی معیشت پر بہت برا اثر پڑا تھا۔ خرابی اور نقصان کا یہ عمل ٹیکنالوجی میں ان کی پسماندگی کی وجہ سے اور بھی تیز ہو گیا۔ مشرق وسطیٰ کے ملکوں کے اندر زراعت' صنعت اور مواصلات میں ترقی بالکل نہیں ہو رہی تھی۔

قیمتوں میں بڑی تبدیلی سولھویں صدی کے آخر میں شروع ہوئی۔ امریکہ سے سونا چاندی آنا شروع ہوا تو اس کا اثر مشرق وسطیٰ کے ملکوں پر بھی پڑا۔ پہلے ان قیمتی دھاتوں کے لیے قوت خرید مغرب کے مقابلے میں سلطنت عثمانیہ میں بہت زیادہ تھی۔ اگرچہ ایران اور ہندوستان

سے کم تھی۔ ایرانی اشیا خاص طور سے ایرانی ریشم کی مانگ سلطنت عثمانیہ اور یورپ دونوں میں بہت تھی۔ لیکن اس کے مقابلے میں عثمانی اشیاء کی مانگ اس حساب سے نہیں تھی۔ سلطنت عثمانیہ سے دو سب سے اہم چیزیں جو یورپ کو برآمد کی جاتی تھیں وہ تھیں اناج اور بنا ہوا کپڑا۔ یہ کپڑا ایک زمانے میں تیار شکل میں برآمد کیا جاتا تھا لیکن آہستہ آہستہ یہ تجارت بھی کم ہوگئی۔ بعد میں صرف سوتی کپڑا ہی برآمد کیا جاتا رہا جو مشرق وسطیٰ سے برآمد کی جانے والی ایک نئی چیز تھی جس کا زیادہ عرصے کاروبار ہوتا رہا۔ اب تجارت کا رخ واضح طور پر بدل گیا تھا۔ اب یورپ بنا ہوا کپڑا مشرق وسطیٰ کو برآمد کررہا تھا۔ اس میں ہندوستانی کپڑا بھی شامل تھا۔ ایران سے وہ کپاس، موہیر اور خاص طور پر ریشم خام مال کی شکل میں درآمد کررہا تھا۔ اسی لیے اس میں حیرت کی بات نہیں ہے کہ مغرب سے سونے اور چاندی کی وافر درآمد کے باوجود عثمانی سلطنت کا ریکارڈ یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہاں زر و جواہر کی ہمیشہ کمی رہی حتیٰ کہ سکہ سازی کی ضرورت پوری کرنے کے لیے بھی یہ قیمتی دھاتیں کم پڑ جاتی تھیں۔

مغرب سے تمباکو اور مکئی کی کاشت کا طریقہ حاصل کرنے کے بعد زرعی آمدنی سے کچھ فائدہ حاصل ہونے لگا تھا لیکن عام صورت حال یہ تھی کہ ٹیکنالوجی اور معیشت کی ترقی رک گئی تھی۔ یورپ میں جو زرعی اور صنعتی انقلاب آرہا تھا مشرق وسطیٰ میں اس کا کوئی متبادل نہیں تھا اور وہاں کے ملکوں پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ مشرق وسطیٰ کی صنعت و حرفت دست کاریوں تک محدود تھی اور اٹھارویں صدی کے آخر تک خوب پھلتی پھولتی رہی لیکن اس میں تیکنیکی ترقی کے آثار بہت ہی کم نظر آتے تھے۔

ان تبدیلیوں نے سلطنت عثمانیہ کی فوجی رسد اور فوجی ساز و سامان کی فراہمی پر بھی بہت برا اثر ڈالا۔ انہیں جہاز سازی، توپوں کی تیاری حتیٰ کہ بارود کے لیے بھی خام مال مشکل سے مل رہا تھا۔ عثمانی فوجی طاقت اور اس کے اثرات میں کمی اور اس کے زوال کے متعدد عوامل میں سے ایک یہ بھی تھا۔ یہ عامل اس وسیع تر عمل کا ایک حصہ تھا۔ جس میں حریفوں کے مقابلے میں عثمانی طاقت کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی گئی۔ نئی دنیا کی دریافت اور وہاں نو آبادیوں کے قیام نے عالمی تجارت کا مرکز ثقل بحر اوقیانوس جنوبی افریقہ اور جنوبی ایشیا کے گہرے سمندروں کی طرف منتقل کر دیا۔ بحیرۂ روم اور مشرق وسطیٰ کے علاقے اگرچہ اب بھی کئی اعتبار سے اہمیت رکھتے تھے لیکن وہ بڑی حد تک اپنی اقتصادی اہمیت ختم کرتے جارہے تھے۔ خاص طور سے ان کے وہ فوائد ختم ہو رہے تھے جو

یورپ' ایشیا اور افریقہ تینوں براعظموں کو ملانے والے علاقے کی وجہ سے اسے حاصل تھے۔ بڑے سمندروں کے راستے کھل جانے کے باعث اب مشرق وسطیٰ اور بحیرۂ روم کی وہ پہلے والی اہمیت نہیں رہی تھی اور ان علاقوں کی حکومتوں کی پرانی حیثیت بھی کم ہو گئی تھی۔

مشرق وسطیٰ پر یورپ کا معاشی تسلط برقرار رکھنے اور اسے فروغ دینے میں کئی عوامل نے اہم کردار ادا کیا۔ ایک طرف یورپ کے لیے مشرق وسطیٰ کی مصنوعات کی برآمد محدود کر دی گئی بلکہ بعض حالات میں تو یورپ کے اندر درآمدات پر حفاظتی محصول اور ٹیکسوں کی وجہ سے ان کی برآمد بند ہی ہو گئی۔ دوسری طرف ایسے معاہدے کرائے گئے کہ ان علاقوں میں مغربی جہازوں کی آمد و رفت پر کوئی پابندی باقی نہیں رہی۔ وہ بلا روک ٹوک ہر قسم کا سامان لے کر آتے جاتے رہتے تھے۔ ان معاہدوں کو انگریزی میں Cpitulation کہا جاتا تھا (لاطینی میں Capitula یا ابواب کا مطلب ہے اشیا کی فہرست پر مشتمل دستاویز) سلطنت عثمانیہ میں یہ اصطلاح ان مراعات کے لیے استعمال کی جاتی تھی جو عثمانی اور دوسرے مسلم حکمرانوں کی طرف سے عیسائی ملکوں کو دی جاتی تھیں۔ ان کی رو سے عیسائی ملکوں کے باشندے مسلمانوں کے زیر تسلط علاقوں میں رہائش اختیار کر سکتے تھے۔ ان پر وہ مالی اور دوسری پابندیاں بھی عائد نہیں ہوتی تھیں جو مسلمان ملکوں کے اپنے غیر مسلم باشندوں پر عائد تھیں۔ اصل میں تو یہ مراعات یا رعایت ابتداء میں طاقت ور شہنشاہ کی جانب سے عنایات خسروانہ کے طور پر اپنے خدمت گاروں یا وفادار درخواست گزاروں کو دی جاتی تھی۔ مراعات دینے والے اور لینے والے کے درمیان اس تعلق کو سمجھنے کے لیے ان دستاویزوں کی زبان کا مطالعہ ضروری ہے۔ ان میں وفاداری' اطاعت گزاری حتیٰ کہ غلامی یا محکومی (ترکی زبان میں رکیت) تک کے الفاظ استعمال کیے جاتے تھے۔ اس سے مراعات حاصل کرنے والے کی حیثیت کا پتہ چلتا تھا۔ (30) مسلمان ریاستوں کے تدریج زوال اور اپنے عیسائی ہمسایوں کے ساتھ عملاً تعلقات کی نوعیت میں تبدیلی کے ساتھ یہ مراعات ابتدائی رعایت کے مقابلے میں بہت زیادہ ہو گئی تھیں۔ گویا اب یہ مراعات بادل ناخواستہ دی جاتی تھیں۔ ان میں ٹیکسوں اور مقامی قوانین سے استثناء بھی شامل تھا۔ اب عیسائی ملکوں کے باشندے اپنے ہی سفارت کاروں اور اپنی ہی حکومت کے سامنے جواب دہ تھے۔ اٹھارویں صدی کے آخر تک یہ حال ہو گیا تھا کہ یورپی حکومت کو جو مراعات دی جاتی تھیں ان میں نہایت اہم تجارتی اور مالی امور بھی شامل تھے۔ عملی طور پر مغربی طاقتوں نے اتنے اختیارات حاصل کر لیے تھے کہ وہ مراعات کے حقوق کا ناجائز

فائدہ اٹھانے لگے تھے۔ اب ان کے سفارت خانوں کی طرف سے ہی مال واسباب اور تجارتی حقوق کے لیے سرٹیفکیٹ جاری کیے جاتے تھے۔ اصل میں تو ان اسناد کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان ملکوں میں مغربی ممالک جو ملازم بھرتی کریں یا ان کے جو ایجنٹ وہاں موجود ہیں انہیں تحفظ فراہم کیا جائے لیکن انہوں نے مسلمانوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ہر ایک کو یہ اسناد جاری کرنا شروع کر دی تھیں۔ اب یہ اسناد مقامی تاجروں کے ہاتھ بھی فروخت کی جانے لگی تھیں جو خلاف قانون تھیں۔

شروع میں ترکوں نے اپنی اس کمزوری پر غور تو کیا لیکن اسے خالصتاً فوجی مسئلے کی صورت میں حل کرنے کی بکوشش کی۔ میدانِ جنگ میں عیسائی فوجیں مسلمان فوجوں پر اپنی برتری ثابت کر چکی تھیں اس لیے ترکوں کے نزدیک فاتحوں کے اسلحہ، جنگی تیکنیک اور فوجی تربیت کا طریقہ اختیار کرنے میں فائدہ تھا۔ چنانچہ عثمانی افسروں اور مصنفوں نے اس پر بے شمار یادداشتیں پیش کیں اور کتابیں لکھیں۔ انہوں نے سلطنت کی توجہ اس جانب مبذول کرائی۔ ان میں سے ایک کتاب جو ہنگری کے نومسلم ابراہیم متفریقہ نے لکھی وہ 1731ء میں استنبول میں شائع ہوئی۔ ترکی میں جو پہلا پریس لگایا گیا تھا اس سے طبع ہونے والی ابتدائی کتابوں میں سے یہ ایک تھی۔ یہ پریس خود ابراہیم نے ہی لگایا تھا۔ بظاہر یہ کتاب انتظامی اور فوجی حکمت عملی کے بارے میں ہے۔ اس کتاب کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصے میں ایک منضبط نظام حکومت کی اہمیت پر بحث کی گئی ہے اور یورپ میں رائج مختلف نظاموں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں جغرافیہ کی سائنسی تعلیم کی قدر و قیمت اجاگر کی گئی ہے اور لکھا ہے کہ اس طرح ہم اپنے اور اپنے ہمسایوں کے علاقوں کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کر سکیں گے جو جنگی حربوں اور حکومت کے استحکام کے لیے ضروری ہے۔ تیسرے حصے میں مصنف نے یورپ کے مختلف ملکوں میں فوجوں کے نظم و ضبط اور ان کی جنگی تربیت کے جو مختلف طریقے رائج تھے ان پر روشنی ڈالی ہے۔ ان فوجوں کی کمان کے ڈھانچے، جنگی طریقہ کار اور فوجی قوانین کا تفصیل کے ساتھ تجزیہ کیا گیا ہے۔ ابراہیم فرنگی کافروں کے بارے میں بات کرتے ہوئے خاصہ محتاط ہے اور بار بار ان سے نفرت کا اظہار کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات واضح کرتا ہے کہ فرنگی افواج زیادہ طاقت ور اور عثمانی عساکر کے مقابلے میں کئی اعتبار سے برتر ہیں۔ اس نے لکھا کہ اگر زندہ رہنا ہے تو عثمانی افواج کو ان کا راستہ روکنا ہوگا۔ (31)

آخر سلطنت عثمانیہ نے سبق سیکھا۔ 1729ء میں ایک فرانسیسی امیرزادہ کاؤنٹ دی بونیوال ترکی پہنچا جہاں اس نے اسلام قبول کیا اور اپنا نام احمد رکھا۔ اس نے حکومت کی ملازمت بھی اختیار کرلی۔ 1731ء میں اسے توپ خانے کے دستوں کی اصلاح کا فریضہ سونپا گیا۔ 1734ء میں فوجی انجینئرنگ کی تعلیم کا ادارہ قائم کیا گیا اور دوسرے سال احمد کو پاشا بنایا گیا اور اسے توپ خانے کے دستوں کا افسر اعلیٰ کا عہدہ دے دیا گیا۔ تاہم یہ تجربہ ناکام ہوگیا۔ 1773ء میں ایک اور تجربہ کیا گیا اور بحری انجینئرنگ کا ایک ادارہ قائم کیا گیا۔

مغرب سے فوجی ماہروں کی آمد سے کئی اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ یہ ماہر جو ترک افسروں کو جنگی تربیت دینے کے لیے بلائے گئے زیادہ تر فرانسیسی تھے۔ ان کی آمد سے جو تبدیلیاں رونما ہوئیں ان میں ایک تو یہ تھی کہ عیسائی کافروں کے بارے میں عام مسلمانوں کا جو رویہ تھا وہ کسی حد تک بدلا۔ اب عیسائی کافر استاد تھے اور طالب علم مسلمان جو اب تک کافروں سے نفرت کرتے آئے تھے۔ اس کے علاوہ انہیں کافروں کی ہی زبان میں تربیت بھی قبول کرنا پڑ رہی تھی۔ اب اس کا علم حاصل کرنا وہ ضروری سمجھتے تھے۔ اپنے استادوں کو جاننے کے لیے ان کی زبان پڑھنا ضروری تھا۔ اس کے علاوہ قواعد وضوابط پر بڑی کتابیں بھی انہی کی زبان میں تھیں۔ اب انہوں نے فرانسیسی زبان پڑھی تو پھر دوسری فرانسیسی کتابیں پڑھنے کا شوق بھی پیدا ہوا۔ وہ کتابیں پڑھیں تو انہیں وہ زیادہ دلچسپ اور زیادہ فکر انگیز معلوم ہوئیں۔

اسی زمانے میں ایک اور اتنی ہی اہم ایجاد ترکی پہنچی۔ وہ تھا پرنٹنگ پریس جس کے لیے ابراہیم متفریقہ نے نہایت اہم کردار ادا کیا۔ ترکی میں پرنٹنگ پریس پندرھویں صدی میں یورپ سے یہودی لے کر گئے تھے۔ پریس استنبول' سلونیکا اور دوسرے شہروں میں لگائے گئے تھے۔ یہودیوں کے بعد یونانیوں اور آرمینیا کے باشندوں نے اس کام کو آگے بڑھایا۔ انہوں نے ترکی میں اپنی زبانوں کے مطابع قائم کیے۔ لیکن ان پر یہ پابندی تھی کہ وہ ترکی یا عربی زبان میں کوئی کتاب شائع نہیں کریں گے۔ یہ پابندی اٹھارویں صدی کے اوائل تک برقرار رہی۔ حتیٰ کہ اسے ایک سفیر کے بیٹے سعید چلپی کے اصرار پر ختم کیا گیا۔ سعید کو 1721ء میں پیرس بھیجا گیا تھا۔ ترکی زبان میں پہلی کتاب 1729ء میں چھپ کر سامنے آئی۔ سعید کے پریس کو 1742ء میں زبردستی بند کردیا گیا۔ اس وقت تک اس میں سترہ کتابیں چھپ چکی تھیں۔ ان میں بیشتر تاریخ' جغرافیہ اور لسانیات سے متعلق تھیں۔ 1784ء میں اس پریس نے دوبارہ کام شروع کیا۔ اس وقت تک

سارے مشرق وسطیٰ میں پرنٹنگ پریس کا رواج عام ہو چکا تھا۔

اس کے باوجود مغربی اثرات کا دائرہ محدود ہی رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مغربی افکار آبادی کے ایک مختصر سے حلقے تک ہی پہنچتے تھے۔ اس محدود اثر کو بھی دبانے اور بعض اوقات انہیں بدنام کرنے کے لیے تحریک چلائی گئی۔ 1742ء میں جو پرنٹنگ پریس بند کیا گیا وہ اسی تحریک کا نتیجہ تھا۔ اگر یہ سمجھا جائے کہ ان اثرات کو قبول کرنے کی وجہ فوجی شکست تھی تو ان کا اثر اٹھارویں صدی کے اوائل میں کسی حد تک واقعی کم ہوا کیونکہ اس زمانے میں عثمانیوں نے دشمنوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا اور چند فتوحات بھی حاصل کی تھیں۔ لیکن اٹھارویں صدی کے آخر تک جو حالات پیدا ہوئے اور جن ہزیمتوں کا سامنا کرنا پڑا انہوں نے ان افکار کے فروغ کو مہمیز دی۔ پہلا دھکا تو اس وقت لگا جب 1774ء میں کچک گینارجہ کا معاہدہ ہوا جس میں روسیوں کے ہاتھوں ترکوں کی کمر توڑ شکست کی توثیق کی گئی اور اس کے نتیجے میں روس کو ترکی پر علاقائی' سیاسی اور تجارتی فوقیت حاصل ہوگئی۔ دوسرا دھکا یہ لگا کہ روس نے 1783ء میں کریمیا کو اپنے علاقوں میں شامل کر لیا۔ اگرچہ ترکی کے ہاتھ سے پہلی بار اس کے علاقے نہیں نکلے تھے لیکن اس سے کہیں زیادہ بڑی تبدیلی رونما ہوئی۔ پہلے جو علاقے ہاتھ سے نکلے تھے وہ ایسے مفتوحہ علاقے تھے جن کی آبادی کی اکثریت عیسائی تھی اور ترک آبادی صرف افسروں اور وہاں بس جانے والے مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ کریمیا کا معاملہ مختلف تھا۔ وہاں ترکی زبان بولنے والے مسلمان آباد تھے جو تیرھویں صدی میں منگولوں کی فتح کے وقت سے بلکہ اس سے بھی پہلے سے وہاں رہتے آ رہے تھے۔ پہلی بار مسلمانوں کے ہاتھ سے ایک ایسا علاقہ نکلا تھا جہاں مسلمان آباد تھے اور یہ بہت بڑا صدمہ تھا۔

تیسرا دھکا فرانس کی طرف سے لگا جدھر سے مشرق وسطیٰ میں مسلم علاقوں کے قلب پر حملہ کیا گیا۔ صلیبی جنگوں کے بعد یہ سب سے بڑا حملہ تھا۔ 1798ء تک فرانسیسی فوج' جس کی کمان جنرل بوناپارٹ کر رہا تھا' مصر میں داخل ہوگئی اور معمولی جھڑپوں کے بعد وہاں قبضہ کر لیا۔ اس وقت مصر سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ تھا۔ مصر پر فرانس کا قبضہ مختصر عرصے کے لیے ہی تھا اور وہاں دوبارہ مسلمان حکومت قائم ہوگئی لیکن اس واقعہ سے عرب سرزمین کی جنگی اہمیت اور عربوں کی فوجی کمزوری ظاہر ہوگئی۔ اس وقت تک یہ عرب سرزمین سلطنت عثمانیہ کے زیر حفاظت اور اس سے زیادہ اس کے حیطۂ اختیار میں تھی۔

اس تیسرے واقعے کا جو سب سے زیادہ معنی خیز نتیجہ برآمد ہوا وہ انقلاب فرانس کے

نئے خیالات اور نئے افکار کا عالم اسلام میں دخول تھا۔ نئے افکار اور نئے نظریات کی یہ پہلی تحریک تھی جس نے وہ تمام سرحدیں توڑ دیں جس نے منکرین اسلام کی دنیا کو اسلام اور ایمان والوں کی دنیا سے الگ کر رکھا تھا۔ اس تحریک نے مسلم افکار پر بہت ہی گہرے اثرات مرتب کیے۔ دوسری تمام تحریکیں تو ناکام ہو گئی تھیں لیکن یہ تحریک کامیاب رہی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ انقلاب فرانس بلاشبہ سیکولر انقلاب تھا جس کا کسی مذہب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس نے خالصتاً غیر مذہبی انداز میں یورپ کے اندر انقلاب برپا کیا۔ اس سے پہلے یورپ میں جو تحریکیں ابھریں' جیسے نشاۃ ثانیہ' اصلاح مذہب' سائنسی انقلاب اور روشن خیالی کی تحریک' انہوں نے اسلامی دنیا کو بالکل متاثر نہیں کیا تھا حتیٰ کہ وہاں کسی نے ان پر توجہ تک نہیں دی تھی۔ غالباً اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ سب اپنے طریقہ اظہار میں عیسائیت کے ماتحت تھے اس لیے مسلمانوں کے فکری دفاع نے ان کا راستہ روکے رکھا۔ یقیناً سیکولرزم بذات خود مسلمانوں کے لیے قابل توجہ نہیں تھا بلکہ وہ تو اس کے خلاف ہی تھے لیکن چونکہ یہ ایک ایسا نظریہ تھا جس کا تعلق عیسائیت سے نہیں تھا اس لیے اس پر غیر جانبداری کے ساتھ غور کیا جا سکتا تھا۔ وہ غیر جانبداری جو اپنے مخالف مذہب کے رنگ میں رنگے ہوئے کسی نظریہ کے لیے ممکن نہیں تھی۔ اس سیکولر یا مذہبی طور پر غیر وابستہ نظریہ میں شاید مسلمانوں کو وہ طلسمی نسخہ مل گیا جس کے ذریعہ وہ مغربی علوم حاصل کر سکتے تھے اور اپنی روایات اور اپنے عقائد کو خطرے میں ڈالے بغیر ترقی کر سکتے تھے۔

شروع شروع میں سرکاری اشرافیہ نے ان واقعات کو اس رنگ میں نہیں دیکھا۔ جس وقت یہ انقلاب فرانس سے نکل کر دوسرے یورپی ملکوں میں پھیل رہا تھا اس وقت تک مسلمان اسے فرانس کا یا زیادہ سے زیادہ عیسائی ملکوں کا اندرونی معاملہ سمجھتے رہے۔ سلطنت عثمانیہ' ایک اسلامی ریاست کی حیثیت سے عیسائی دنیا کے اس خلفشار سے بالکل پریشان نہیں تھی اور اپنے آپ کو اس مسیحی بیماری سے بچا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ بلکہ بعض لوگوں نے تو اسے اپنے لیے فائدہ مند جانا تھا۔ سلطان کے پرائیویٹ سیکرٹری احمد آفندی نے 1792ء میں اپنی ڈائری میں لکھا کہ اس انقلاب نے یورپی طاقتوں کی توجہ دوسری طرف مبذول کرا دی ہے اور ان کی حرص وطمع کو ایک اور راستہ مل گیا ہے' اس لیے اس نے عثمانیوں کی زندگی آسان بنا دی ہے۔ اس نے نہایت عاجزی کے ساتھ دعا مانگی کہ "یا اللہ فرانس کے اس طوفان کو فرنگی آتشک کی طرح سلطنت (عثمانیہ) کے دوسرے دشمنوں تک بھی پھیلا دے اور انہیں ایک دوسرے کے ساتھ طویل تنازعوں میں پھنسا دے۔ اور

اس طرح ایسے نتائج پیدا کر جو سلطنت کے لیے فائدہ مند ہوں۔ آمین (32)

عیسائیوں کے شر سے مامون و محفوظ ہو جانے کا یہی احساس تھا جس کی وجہ سے ترکی نے روس کی یہ پیشکش مسترد کر دی کہ فرانس کے خلاف مشترکہ اقدام کیا جائے۔ حتیٰ کہ جب آسٹریا، پروشیا اور روس کے سفیروں نے متفقہ طور پر یہ درخواست کی کہ ترکی میں رہنے والے فرانسیسی باشندوں کو اپنی ٹوپیوں پر سہ رنگا نشان لگانے سے روک دیا جائے تو اسے بھی قبول نہیں کیا گیا۔ عثمانی مورخ جاوید پاشا نے ایک بات چیت کا حوالہ دیا ہے:

> ایک دن آسٹریا کا ترجمان اعلیٰ ترک افسر اعلیٰ رشید آفندی کے پاس آیا اور کہا ''خدا فرانسیسیوں کو قرار واقعی سزا دے۔ انہوں نے ہمیں بہت دکھ پہنچائے ہیں۔ خدا کے واسطے آپ ان کے سروں سے یہ نشان اتروا دیجئے'' اس پر رشید آفندی نے جواب دیا ''میرے دوست' ہم آپ کو کئی مرتبہ سمجھا چکے ہیں کہ سلطنت عثمانیہ ایک مسلم ریاست ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی ان کے ان بلوں پر توجہ نہیں دیتا۔ ہم دوست ملکوں کے تاجروں کو اپنا مہمان مانتے ہیں۔ ان کی مرضی ہے وہ جس قسم کی ٹوپی چاہے اوڑھیں اور جیسے بھی بلے چاہیں لگائیں۔ اگر وہ اپنے سروں پر انگوروں کی ٹوکریاں بھی رکھ لیں تو دربار عالیہ کا یہ منصب نہیں ہے کہ ان سے جواب طلب کیا جائے کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ آپ خواہ مخواہ اپنے آپ کو زحمت دے رہے ہیں۔'' (33)

اکتوبر 1797ء میں کامپوفورمیو کے معاہدے کے تحت فرانس نے وینس کی ریاست اور سلطنت ختم کر دی اور اس کے علاقے آسٹریا کے ساتھ بانٹ لیے۔ انہوں نے آیونیا کے جزائر اور البانیہ اور یونان کی سرحدوں کے ساتھ بعض علاقوں پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس طرح فرانس اور ترکی جو صدیوں سے دوست تھے اب ہمسایہ بن گئے اور قدیم دوستی کشیدگی کا شکار ہو گئی۔ فرانسیسی جمہوریہ کے یونانی باشندے جب سلطنت عثمانیہ میں شامل یونانی علاقوں میں رہنے والے یونانی الاصل لوگوں کے پڑوسی بن گئے تو ان کا اور ترکوں کا فرق واضح ہونے لگا اور ان کے درمیان تعلقات بھی شروع ہو گئے۔ کچھ ہی عرصے بعد موزیا کے عثمانی گورنر نے استنبول کو پریشان کن خبریں بھیجنا شروع کر دیں۔ اس نے لکھا کہ فرانس دربار عالیہ کے ساتھ دوستی کے دعوے تو کرتا ہے لیکن اس کے عزائم اچھے نہیں ہیں۔ وینس کی سلطنت کے وارث ہونے کی حیثیت سے وہ وینس

کے سابق مقبوضات جیسے کریٹ کے جزائر اور خود موریا کی واپسی کا مطالبہ کرنے کے منصوبے بھی بنا رہا ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں ہے۔ سلطنت (عثمانیہ) کی سرحدوں پر ایسے جلسوں اور تقریبوں کے انعقاد کی تشویشناک خبریں بھی آ رہی ہیں جن میں آزادی، مساوات حتیٰ کہ یونان کی قدیم عظمت کی بحالی کے لیے تقریریں کی جاتی ہیں۔ اس وقت جب روسی سفیر نے ان باتوں کا ذکر کیا اور فرانس میں پیش آنے والے واقعات سے تمام حکومتوں کے لیے خطرے کی پیش گوئی کی تو ترک پاشاؤں نے نہایت توجہ سے ان کی بات سنی اور عثمانی افسر اعلیٰ احمد عاطف آفندی نے ایک یادداشت لکھی کہ مجلس وزارت کا اجلاس بلایا جائے جس میں روس اور آسٹریا کی اس دعوت پر غور کیا جائے کہ فرانس کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنایا جائے تاکہ انقلاب کو پھیلنے سے روکا جائے۔ اس عجیب وغریب تجویز کی وضاحت وصراحت بھی ضروری تھی۔ چنانچہ احمد عاطف آفندی نے نہایت دردمندی کے ساتھ لکھا:

> درج بالا معروضات کے مدنظر قابل غور سوال یہ ہے۔ آیا سلطنت کو وہی خطرہ درپیش ہے جو دوسری مملکتوں کو ہے یا ایسا نہیں ہے؟ اس تنازع کے آغاز سے ہی اگرچہ سلطنت نے غیر جانبداری کا راستہ اختیار کرنا پسند کیا ہے، تاہم اس نے دوستی اور خیر سگالی کا اظہار کرنے اور ایسا کام کرنے میں پس وپیش نہیں کی جس سے عملاً جمہوریہ فرانس کی مدد ہوتی ہو۔ اس کی وجہ سے دوسری طاقتوں کو بار بار احتجاج کرنا پڑا ہے۔ جب فرانس شدید مشکلات کا شکار تھا اور اس پر قحط اور وباؤں نے دھاوا بول رکھا تھا اس وقت سلطنت نے مامون من اللہ سرزمین سے وافر مقدار میں اشیائے صرف ان کے لیے اکٹھی کیں اور فرانس کی بندرگاہوں تک انہیں پہنچانے کا بندوبست کیا۔ اس طرح انہیں بھوک اور موت سے نجات دلائی۔ اس کے جواب میں جمہوریہ فرانس اور اس کے جنرل اپنے قول وفعل سے سلطنت کی رعایا کو نقصان پہنچانے سے باز نہیں آئے۔ خاص طور سے وینس کی تقسیم کے وقت انہوں نے عرتا کے نزدیک بترینو پرگا پریویزا اور وونتزا اور دیگر جزیروں پر قبضہ کر لیا۔ ان کا یہ عمل قدیم یونانیوں کی یاد دلاتا ہے انہوں نے ان مقامات پر آزادی (لبرٹی) کے نام سے جو حکومتیں قائم کی ہیں ان کے ان سے شیطانی عزائم کا اظہار ہوتا ہے جو کسی تبصرے یا وضاحت کا محتاج

نہیں۔(35)

یہاں پر سلطنت کے یونانی اور دوسرے عیسائی باشندوں کو ہی نشانہ تصور کیا جا رہا تھا خود مسلمانوں کو نہیں لیکن یکم جولائی 1798ء کو بونا پارٹ نے مصر فتح کر لیا اور اسلامی تاریخ کے ایک نئے دور کا آغاز ہو گیا۔

ان تبدیلیوں سے اس وقت کے مسلمان کتنے بے خبر اور کیسے بے نیاز تھے؟ اس کا اظہار مصری مورخ جبرتی کی اس ڈائری سے ہوتا ہے جو وہ ان بے مثال اور بے نظیر واقعات کے بارے میں روزانہ لکھ رہا تھا:

بروز اتوار 1213 ہجری (مطابق 1798ء عیسوی) رمضان المبارک کی 19 تاریخ کو اسکندریہ کی بندرگاہ سے پیامبروں کے ہاتھ خط (قاہرہ) آئے ان کا مضمون یہ تھا کہ جمعرات کے دن اس مہینے کی آٹھ تاریخ کو دس انگلستانی جہاز بندرگاہ پر آئے اور ساحل سے دور لنگر انداز ہوئے جو شہر کے لوگوں کو نظر آ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد پندرہ جہاز اور آئے۔ بندرگاہ کے لوگ انتظار کرتے رہے کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ پھر ایک چھوٹی کشتی بندرگاہ پر آ کر لگی۔ اس میں دس آدمی تھے۔ وہ ساحل پر آئے اور شہر کے امراء اور امیر شہر السید محمد کریم کے مقرر کردہ رئیس سے ملاقات کی۔ ان سے وہاں آنے کا سبب دریافت کیا گیا تو انہوں نے بتایا کہ وہ انگریز ہیں اور وہ ان فرانسیسیوں کی تلاش میں آئے ہیں جو فوج کی بھاری نفری کے ساتھ کسی نامعلوم منزل کی جانب روانہ ہوئے ہیں۔ ہم نہیں جانتے ان کا ارادہ کیا ہے۔ ہمیں خدشہ ہے کہ وہ آپ پر حملہ کر دیں گے اور آپ ان کے خلاف مزاحمت کرنے اور انہیں بندرگاہ پر اترنے سے روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔"

السید محمد کریم کو ان کی بات پر اعتبار نہیں آیا۔ وہ اسے ایک چال سمجھا۔ اس نے انہیں سخت جواب دیا جس پر انگریزوں کے نمائندوں نے کہا "ہم گہرے سمندر میں اپنے جہاز پر انتظار کریں گے اور بندرگاہ پر نظر رکھیں گے ہم آپ سے کچھ نہیں مانگتے سوائے پانی اور کھانے کے سامان کے جن کا ہم معاوضہ ادا کریں گے۔" اسے بھی قبول نہیں کیا گیا اور جواب دیا گیا۔" یہ سلطان کی سرزمین

ہے۔ یہاں فرانسیسیوں یا کسی اور کا کوئی کام نہیں ہے۔ اس لیے آپ ہمارے پاس سے چلے جائیں۔" اس پر انگریز نمائندے واپس چلے گئے اور ان کے جہاز بھی روانہ ہو گئے تاکہ وہ اسکندریہ کے بجائے کہیں اور سے کھانا دانہ حاصل کر سکیں...... اسی مہینے کی بیس تاریخ کو بروز بدھ اسکندریہ، روضہ اور دامن حور کی بندرگاہ سے پیغام آئے کہ اٹھارہ تاریخ بروز پیر کافی تعداد میں فرانسیسی جہاز آ گئے ہیں...... وہ ایسے جنگی ساز و سامان اور فوجیوں کے ساتھ لنگر انداز ہوئے جو ساحل سمندر کے باشندوں کے لیے بالکل اجنبی تھے۔ اور دوسری صبح تک وہ ٹڈی دل کی طرح شہر کے اردگرد پھیل گئے۔ (36)

جبرتی اور اس کے مصری معاصرین مصر میں بونا پارٹ کی آمد، اس کی سرگرمیوں اور آخر کار اس کی روانگی کا نہایت تفصیل کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔ لیکن کہیں بھی فرانس کی تاریخ سے کسی قسم کی دلچسپی یا تشویش ظاہر نہیں کرتے حتیٰ کہ باقی یورپ سے بھی انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ فرانسیسی آئے۔ کچھ عرصے مقیم رہے۔ انہوں نے مختلف کام کیے اور وہ چلے گئے کسی نے یہ جاننے کی یا کسی سے یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ آخر وہ آئے کیوں تھے اور چلے کیوں گئے۔ کافروں کی آمد قدرتی آفت سمجھی گئی جس پر انہیں کوئی اختیار نہیں تھا اور نہ اس کی وضاحت کی ضرورت تھی۔ ان میں سے صرف ایک لبنانی عیسائی نے جس کا نام نکولا ترک بتایا جاتا ہے، انقلاب فرانس کا ایک مختصر سا تذکرہ لکھا ہے جو یقیناً عربی زبان میں پہلی کوشش ہے۔ اس نے 1789ء سے 1804ء تک کے مصر کی جو تاریخ لکھی ہے یہ اس کا مقدمہ ہے:

ہم دنیا میں جمہوریہ فرانس کے ظہور کی تاریخ سے شروع کرتے ہیں جب انہوں نے اپنے بادشاہ کو قتل کیا۔ یہ عیسائی دور کے سال 1792ء بمطابق 1207 ہجری کا آغاز تھا۔ اس سال سلطنت فرانس کے سارے عوام بادشاہ، بلکہ اور امراء کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ بادشاہ کے زمانے کے مروج نظام کے خلاف نئے نظام اور نئے نظم و نسق کا مطالبہ کر رہے تھے۔ انہوں نے دعویٰ کیا اور ثابت بھی کیا کہ بادشاہ کے خصوصی اختیارات نے اس سلطنت میں بہت تباہی مچائی ہے اور یہ کہ شہزادے اور عمائدین تو اس سلطنت کی تمام اچھی چیزوں سے فائدہ اٹھا رہے تھے جبکہ باقی عوام افلاس و نکبت کی زندگی گزار رہے تھے۔

اس لیے وہ سب کے سب اٹھ کھڑے ہوئے اور بیک آواز اعلان کیا: ''ہم اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک بادشاہ کو تخت سے نہیں اتار دیں گے۔ اور جمہوریت قائم نہیں کر دیں گے۔ وہ دن پیرس میں نہایت مسرت اور شادمانی کا دن تھا' اور بادشاہ شہزادے اور عمائدین خوف زدہ تھے اور لوگ بادشاہ کے پاس آئے اور اسے اپنے عزائم سے آگاہ کیا......'' (37)

فرانس اور باقی یورپ میں جو واقعات پیش آ رہے تھے نکولا نے بڑی حد تک ان کے بارے میں درست ہی لکھا۔

مسلمانوں کی بے احتیاطی اور بے نیازی کو اس وقت شدید صدمہ کا سامنا کرنا پڑا جب مشرقِ وسطیٰ کے قلب میں فرانسیسی پہنچ گئے۔ اب انہیں احساس ہوا کہ انگلستان ہی ایک ایسی طاقت ہے جو فرانس کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ حالانکہ اس وقت وہ واحد طاقت نہیں تھی۔ جس وقت برطانیہ اور فرانس مشرقی بحیرۂ روم میں اپنی سرگرمیاں تیز کر رہے تھے اس وقت روس جنوب کی جانب خشکی کے راستے مسلسل پیش قدمی کر رہا تھا۔ 1783ء میں کریمیا پر قبضے کے ساتھ ہی ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ وہاں سے روس نہایت تیزی کے ساتھ بحیرۂ اسود کے شمالی ساحلوں کی دونوں سمتوں میں بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ وہ ان علاقوں پر قبضے کر رہا تھا جن پر پہلے ترک' تاتار اور دوسرے مسلمان حکومت کرتے تھے اور وہی لوگ وہاں آباد بھی تھے۔ اس سے ترکی اور روس کے درمیان ایک اور جنگ چھڑ گئی۔ جس کے بعد 1792ء میں عثمانی حکومت مجبور ہو گئی کہ تاتار علاقوں کے روس میں مدغم ہو جانے کو قبول کر لے اور سرکیشیا میں دریائے کبان کو روس اور سلطنت عثمانیہ کی سرحد تسلیم کر لے۔ روسیوں نے بحیرۂ اسود پر مسلمانوں کا صدیوں پرانا اقتدار ختم کر دیا تھا اور مشرق اور مغرب دونوں جانب سے سلطنت عثمانیہ کی سرحدوں کے لیے خطرہ بن گئے تھے۔ روسی ایران کے لیے بھی خطرہ تھے جہاں قاچار خاندان برسرِ اقتدار آ گیا تھا اور نئی حکومت نے کاکیشیا میں روسیوں کے قبضے میں چلے جانے والے علاقے واپس لینے کی ناکام کوشش کی تھی۔ ایرانی حملے کے خطرے کی وجہ سے جارجیا کی عیسائی سلطنت نے روس سے مدد کی درخواست کی اور زارِ روس نے جنوری 1801ء تک جارجیا کو روسی سلطنت میں شامل کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد 1802ء میں روس نے جارجیا اور بحیرۂ کیسپیئن کے درمیان داغستان کی تنظیم نو کی' اسے روس کا زیرِ حفاظت علاقہ قرار دیا پھر تھوڑے ہی عرصے بعد کاکشیا کی ایک اور چھوٹی ریاست اپنے ساتھ شامل کر لی۔ اس

طرح ایران پر حملے کا راستہ صاف ہوگیا۔ چنانچہ اس نے 1804ء میں ایران پر حملہ کیا اور آرمیںیا اور شمالی آزربائیجان پر قبضہ کرلیا۔

اس وقت تک فرانس مصر سے واپس جا چکا تھا لیکن یہ خطرہ برابر موجود تھا کہ وہ پھر آسکتا ہے۔ وہاں انگریزوں کی موجودگی سے بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ نکولا کی تحریر سے بھی مسلمانوں کے ان خدشات کا اظہار ہوتا ہے جو مشرق اور یورپ سے مسلمانوں کو تھے۔

> اس مہینے (فروری 1804ء) میں اس ملک کو دوسرے علاقوں سے خبریں ملیں کہ فرانس نے بحیرۂ روم میں ایک بڑا لشکر بھیجا ہے۔ جس میں متعدد جہاز اور لاتعداد سپاہی شامل ہیں۔ یہ فوج مشرق کی سمت جا رہی تھی...... مشرق کے لوگ اس سے بہت خوف زدہ تھے اور یہ بھی افواہ تھی کہ انگریز بھی جہازوں اور فوجیوں کے ساتھ اسکندریہ کی جانب آرہے ہیں...... فرانس سے سرزمین مصر کو محفوظ رکھنے کے لیے...... یہ افواہیں پھیلتی چلی گئیں اور مصریوں کے دماغ ان یورپی ملکوں کے بارے میں سخت پریشان ہوگئے لیکن وہ ان کی جنگی صلاحیت اور بہادری دیکھ چکے تھے۔ لوگوں نے کہا کہ کوئی ایک فرنگی بادشاہ مصر کی سرزمین ضرور چھین لے گا کیونکہ وہ جنگ اور دو بدو لڑائی میں مسلمانوں کی کمزوری اور استقامت میں کمی دیکھ چکے تھے۔
>
> ان دنوں سلطان قسطنطین برادر سلطان ایلیگزینڈر سلطان روس جسے المسکوب کہا جاتا ہے' کے بارے میں افواہیں اڑ رہی تھیں کہ اس نے سلطنت جارجیا پر قبضہ کرلیا ہے اور ایران کے علاقے فتح کرلیے ہیں اور بغداد کی طرف بڑھ رہا ہے۔ عثمانی ریاست اس سلطان سے بہت ہی خوف زدہ تھی جسے ''زرد چٹان'' یا ''زرد وحشی کہا جاتا تھا'' ماسکو کی ریاست سلطان احمد کے زمانے سے جو 1115ھ (1703 عیسوی) میں تخت نشیں ہوا سلطان سلیم کے زمانے تک جو 1203 (1789 عیسوی) میں تخت نشین ہوا' عثمانی مملکت کے ساتھ کئی جنگیں لڑ چکی تھی۔ یہ سلطنت لوگوں کو کچلتے ہوئے اور زمینوں پر قبضہ کرتے ہوئے 1218 (1804 عیسوی) تک کسی وقفے کے بغیر بڑھتی اور پھیلتی چلی گئی تھی۔ وہ بہت طاقتور ہوگئی تھی۔ وقت ان کے ساتھ تھا اور اس مملکت نے تاتاریوں اور

جارجیوں اور ایرانیوں سے ان کی سرزمین چھین لی تھی۔ وہ پھیلنا شروع ہوگئی ہے اور جب تک اللہ کی مرضی ہوگی پھیلتی رہے گی۔ (38)

لیکن فرانسیسی واپس نہیں آئے۔ 1802ء کے صلح نامے کے تحت وہ مصر اور آیونیا کے جزائر دونوں سے واپس چلے گئے۔ اب چونکہ فرانس ترکی کا ہمسایہ نہیں تھا اس لیے وہ ترکوں تک اپنے افکار پہنچانے کی زیادہ اہلیت رکھتا تھا۔ 1803ء سے 1806ء تک پیرس میں متعین ترک سفیر خالد آفندی کا یہ خط بہت کچھ ظاہر کرتا ہے۔

> آپ میرے لیے دعا کیجئے کہ میں کافروں کی سرزمین سے بحفاظت واپس آجاؤں کیونکہ میں پیرس تک تو آ گیا ہوں لیکن ابھی تک میں نے وہ فرنگی سرزمین نہیں دیکھی جس کا لوگ ذکر کرتے ہیں اور جس کی تعریف کرتے ہیں۔ کس یورپ میں یہ حیرت انگیز چیزیں اور دانش مند فرنگی پائے جاتے ہیں مجھے علم نہیں۔
>
> اللہ اکبر۔ ان لوگوں کے دماغ اور ان کے عقائد۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس فرنگی سرزمین کو جس کی تعریفوں سے ہمارے کان ایک عرصے سے بھرے جارہے ہیں، ہم نے نہ صرف مختلف بلکہ اس کے برعکس پایا (جو سنا تھا) اگر کوئی شخص آپ کو خوف زدہ کرنے کے لیے یا گمراہ کرنے کے لیے فرنگی سرزمین کی تعریف کرے تو اس سے دریافت کیجئے "کیا تم یورپ گئے ہو؟" اگر وہ کہے "میں وہاں گیا ہوں اور میں نے وہاں عیش کیے ہیں" تو یقیناً وہ جانبدار ہوگا اور فرنگیوں کا جاسوس ہوگا۔ اگر وہ کہے "نہیں" "میں وہاں نہیں گیا۔ میں نے تو تاریخ کی کتابوں میں پڑھا ہے" تو پھر دو باتیں ہوں گی۔ یا تو وہ گدھا ہوگا کہ فرنگیوں نے جو لکھا ہے اس پر اعتبار کرتا ہے یا پھر مذہبی تعصب کی وجہ سے فرنگیوں کی تعریف کررہا ہوگا۔ (39)

آخری جملے میں یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ جو بھی فرنگیوں کی تعریف کرتا ہے وہ خود بھی عیسائی ہے، غالباً عثمانی عیسائی، جو اپنے یورپی ہم مذہب کی تعریف وتوصیف کررہا ہے۔

خالد آفندی پکا قدامت پرست ہے اور مغرب کی ہر چیز سے نفرت کرتا ہے لیکن اس کا خط ظاہر کرتا ہے کہ فرانسیسی اثرات کتنے مضبوط ہوچکے تھے۔ فرانسیسی افکار پھیلنے کی تصدیق شاہی

مورخ احمد آزفندی کی تحریروں سے بھی ہوتی ہے۔ جس نے 1791ء سے 1803ء تک کے واقعات کو قلمبند کیا۔ اس نے ترکی میں فرانسیسی سرگرمیوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ فرانسیسیوں نے اپنے آپ کو دوست کی حیثیت سے پیش کیا تھا اور وسیع پیمانہ پر اس کا پروپیگنڈہ کیا تھا۔ انہوں نے سلطنت کے زعما میں ہی نہیں عام لوگوں میں بھی ذہنی انتشار پیدا کر دیا تھا۔ اپنے فاسد خیالات پھیلانے کے لیے انہوں نے مسلمانوں کا ہی سہارا لیا۔ ان کے ساتھ دوستی جتائی اور اس طرح دوستانہ میل جول سے انہوں نے بہت سے لوگوں کو پھانس لیا۔

> چند نفس پرست لوگوں نے جنہوں نے وفاداری کا لبادہ اتار دیا تھا وقتاً فوقتاً ان سے سیاست سیکھی۔ بعض لوگ جوان کی زبان سیکھنے کی خواہش رکھتے تھے انہوں نے فرانسیسی استاد رکھ لیے ان کا محاورہ اختیار کر لیا اور فخر کرنے لگے...... ان کی گنوارو بول چال پر۔ اس طرح فرانسیسی کمزور دماغ اور سطحی ایمان والے لوگوں کے دلوں میں اپنے رسم و رواج اور اپنا طرزِ فکر داخل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ سنجیدہ ذہن اور دور اندیش لوگوں اور دوسری مملکتوں کے سفیروں نے اس خطرے کو محسوس کیا۔ (ان خطرات سے) گھبرا کر اور ان سے متنفر ہو کر مضمر طور اور علی الاعلان ان خیالات کی مذمت کی اور خبردار کیا ان نتائج و عواقب سے جو ان سرگرمیوں سے سامنے آ سکتے تھے' یہ بدباطن گروہ اور مکروہ غول بہت ہی چالاک اور چکر باز تھا۔ اس نے پہلے تو اپنی سیاست کا بیج مملکت کے زعما کے دلوں کی زمین پر بویا پھر ترغیب و تحریص کے ذریعہ...... نعوذ باللہ شرعی قوانین کی بے حرمتی کرتے ہوئے ان کے دماغوں تک رسائی حاصل کر لی۔ (40)

مشرق وسطیٰ پر مغرب کا اثر و رسوخ اب ایک نئے اور طوفانی دور میں داخل ہو گیا تھا۔

❁......❁......❁

دنیا کا مسلم تصور و ادراک

مغربی دنیا نے صدیوں کے تجربات و مشاہدات کے بعد بنی نوع انسان کی تقسیم در تقسیم کے متعدد طریقے اختیار کر رکھے تھے۔ یونانیوں نے دنیا کو یونانی اور وحشی انسانوں میں تقسیم کیا' یہودیوں نے یہودی اور غیر یہودی (Gentiles) کہا۔ بعد میں یونانیوں نے جغرافیائی درجہ بندی بھی کی جس میں دنیا براعظموں۔ یورپ' ان کا اپنا براعظم اور ایشیا میں منقسم نظر آتی تھی۔ براعظم ایشیا ان کی نظر میں وہ علاقہ تھا جو بحیرۂ ایجین کے دوسری جانب تھا۔ آخر جب انہوں نے بحیرۂ ایجین سے دور زیادہ بڑا اور زیادہ دور افتادہ ایشیا دیکھا تو پہلے ایشیا کو ایشیائے کوچک قرار دیا اور زیادہ وسیع علاقے کو ایشیا ہی کہا۔ پھر ایشیا (یعنی غیر یورپ) کو مزید حصوں میں تقسیم کیا۔ اور وہ علاقہ جو بحیرۂ روم کے جنوب میں تھا اسے یونانی اور لاطینی زبان میں ایک نیا نام دیا گیا یعنی پہلے لیبیا بعد میں افریقہ۔ قرون وسطیٰ کی دنیا یورپ والوں کے نزدیک ابتدا میں دو حصوں میں منقسم تھی۔ ایک عیسائی دنیا' دوسرے بے دین لوگوں کی دنیا۔ عیسائی دنیا کے اندر یہ تقسیم بادشاہتوں کے حساب سے تھی۔ جدید دنیا نے قومی ریاست کو ایک اکائی تسلیم کیا جو قوم کے تشخص اور وفاداری کا مرکز ہے۔

دنیا اور اس کے لوگوں کے بارے میں مسلمانوں کا تصور بالکل مختلف نظریہ پر قائم تھا۔ انیسویں صدی تک تاریخ اور جغرافیہ کے مسلمان مصنفین براعظموں کے ان ناموں سے واقف نہیں تھے۔ ان کے لئے ایشیا ایک نامعلوم خطہ تھا۔ یورپ کا جسے وہ عروفہ کہتے تھے کوئی واضح تصور نہیں تھا۔ کتابوں میں اس کا ذکر سرسری ملتا ہے۔ الفریکا کو معرب کر کے ''افریقہ'' (بکسر الف) بنالیا گیا تھا اور یہ نام دیا گیا تھا عرب کے مغرب میں اس مشرقی حصے کو جو تونس اور اس سے ملحقہ علاقوں پر مشتمل تھا۔ مسلم جغرافیہ دانوں نے دنیا کو موسموں کے حساب سے اقلیموں میں تقسیم

کیا ہوا تھا۔ اقلیم (موسم) قدیم یونانی لفظ Clima کی عربی شکل ہے۔ لیکن یہ خالصتاً جغرافیائی درجہ بندی ہے اور جدید یورپی محاوروں کے مطابق اس کا سیاسی یا تہذیبی درجہ بندی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مسلمان مورخین کی تحریروں میں اقلیم کا کہیں ذکر نہیں ملتا اور ایسا لگتا ہے جیسے مسلمانوں کی اپنی شناخت میں اس کا کوئی حصہ نہیں تھا۔

دنیا کو ملکوں اور قوموں میں تقسیم کرنا اسلامی دنیا میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا حالانکہ مغربی دنیا میں اپنے تشخص اور نسبت کے لیے یہ تقسیم بہت ہی اہمیت رکھتی تھی۔ مسلمانوں کے نزدیک علاقائی درجہ بندی کی اتنی کم اہمیت تھی کہ بہت سے ملکوں کے اپنے نام ہی نہیں تھے۔ آج کی دنیا میں جو بہت سے ملکوں کے نام اور ان کی حد بندی نظر آتی ہے وہ نئے زمانے کی ایجاد ہے۔ ان میں سے بعض نام جیسے شام، فلسطین یا لیبیا قدیم روایات سے کھود کر نکالے گئے ہیں۔ اور بعض نام جیسے عراق، یا تونس قرون وسطی کے صوبوں کے نام تھے اور پاکستان تو بالکل ہی نئی اختراع ہے۔ عربیہ اور ترکی اپنی تمام تر قدامت اور اپنے لوگوں کی منفرد شناخت کے باوجود نئے نام ہیں جو مغرب نے دیئے ہیں۔ عربی زبان میں عرب کے لئے کوئی علاقائی اصطلاح نہیں ہے بلکہ ان مقامات کو سرزمین عرب یا جزیرہ نمائے عرب لکھا جاتا تھا۔ ترکی کا نام اگرچہ مغربی دنیا صدیوں سے لیتی چلی آ رہی تھی لیکن وہ خود ترکی زبان میں صرف بیسویں صدی میں ہی استعمال کیا گیا۔ یہ نام اس ملک کو دیا گیا جسے پہلے شاہی خاندانوں کے نام سے یا علاقائی ناموں سے پکارا جاتا تھا۔ قدیم کلاسیکی تحریروں میں تو اکثر ملک یا صوبے کے لیے ایک ہی نام استعمال ہوتا تھا حتیٰ کہ مرکزی شہر کا نام بھی وہی ہوتا تھا۔ عام طور پر شہر کا نام ہی اس کے اردگرد پھیلے ملک کا نام بن جاتا تھا۔ انیسویں صدی سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ خود مختاری کا اطلاق علاقائی حدود پر کیا گیا ہو یا اسے علاقائی اصطلاح میں پیش کیا گیا ہو۔ بلکہ معاملہ اس کے برعکس تھا۔ کسی بادشاہ کو علاقائی حدود کا پابند کرنا اس کی بے عزتی سمجھا جاتا تھا۔

علاقائی قومیتوں کے ناموں کا بھی کم وبیش یہی حال تھا۔ عرب، ایرانی یا ترک قومیتیں اسلامی تحریروں میں نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ ان گروہوں کو زبان، ثقافت اور بعض اوقات خاندانوں کے حوالے سے ممیز بھی کیا جاتا تھا اور مسلمانوں کے انفرادی تشخص کے لیے ان کی خاصی اہمیت بھی تھی۔ لیکن اس کی سیاسی اہمیت شاذ ونادر ہی تسلیم کی جاتی تھی۔ مسلمان شہنشاہ عام طور پر اپنی خود مختاری اور اپنے القاب قوموں کے حوالے سے متعین نہیں کرتے تھے اور نہ ہی گروہی، لسانی یا

علاقائی قوم کو مملکت کے وجود کی قدرتی اساس سمجھا جاتا تھا۔

دنیا کے نئے اسلامی تصور میں دنیا کو دارالاسلام اور دارالحرب میں تقسیم کیا گیا تھا۔ دارالاسلام میں وہ تمام ممالک شامل تھے جہاں اسلامی شریعت نافذ تھی یعنی اسلامی سلطنت۔ دارالحرب باقی دنیا تھی۔ ان کے نزدیک جس طرح آسمانوں پر ایک اللہ ہے اسی طرح زمین پر بھی ایک ہی فرمانروا اور ایک ہی قانون خداوندی نافذ ہونا چاہیے۔ مثالی دنیا مسلمانوں کے نزدیک یہ ہے کہ ایک ہی برادری ہو جس کی ایک ہی مملکت ہو جس کا سربراہ ایک ہی حاکم اعلیٰ ہو۔ یہ مملکت ان منکرین اسلام کو برداشت کرلے گی اور ان کی حفاظت بھی کرے گی جو فتوحات کے ذریعہ اس کی رعایا میں شامل ہوئے ہوں بشرطیکہ وہ بت پرست نہ ہوں بلکہ اہل کتاب ہوں۔ تاہم اسلامی شریعت دائرہ اسلام سے باہر کسی دوسرے انداز سیاست کے دائمی وجود کو تسلیم نہیں کرتی۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب تمام بنی نوع انسان اسلام قبول کرلیں گے یا اسلام کی حکمرانی کے سامنے سرنگوں ہوجائیں گے۔ مسلمانوں کا یہ دینی فرض ہے کہ جب تک یہ مقصد حاصل نہ ہوجائے اس کے لیے جدوجہد کرتے رہیں۔

مسلمان فقہا نے اس جدوجہد کو جو نام دیا ہے وہ ہے جہاد' یہ ایک عربی لفظ ہے جس کا مطلب ہے کوشش یا سعی پیہم۔ جو شخص یہ فریضہ ادا کرتا ہے وہ مجاہد کہلاتا ہے۔ قرآن میں یہ لفظ بار بار آتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ منکرین اسلام کے خلاف جنگ کی جائے۔ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں یہی مفہوم عام تھا۔ شریعت کی رو سے دارالاسلام اور دارالحرب کے درمیان رشتے کے لیے وہ مقدس قانون تھا جو قدیم فقہا نے وضع کیا ہے اور جس کے مطابق مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اس وقت تک جہاد جاری رکھیں جب تک تمام نوع انسانی کو مشرف باسلام نہ کرلیں یا انہیں اپنے تابع فرمان نہ کرلیں۔ چنانچہ اصولی طور پر مسلم اور غیر مسلم ملک کے درمیان صلح نامہ قانوناً ناممکن تھا۔ جنگ' جو صرف اسلام کی عالم گیر فتح و نصرت کے بعد ہی ختم ہوسکتی ہے روکی نہیں جاسکتی تھی۔ وہ صرف ضرورت یا مصلحت کے تحت ہی عارضی طور پر ملتوی کی جاسکتی تھی۔ فقہاء کے خیال میں یہ جنگ بندی محض عبوری دور کے لیے ہی ہوسکتی تھی۔ یہ مدت دس سال سے زیادہ نہیں ہوسکتی تھی اور اس عرصے میں کسی وقت بھی مسلمانوں کی طرف سے یک طرفہ طور پر یہ جنگ بندی ختم کی جاسکتی تھی البتہ اسلامی شریعت کی رو سے دوبارہ جنگ شروع کرنے سے پہلے فریق مخالف کو بروقت مطلع کرنا ضروری تھا۔

امن کے اس عرصے میں کافروں کے ساتھ میل جول کی حوصلہ شکنی کی جاتی تھی۔ اسلامی شریعت حرام اور مکروہ فعل میں تمیز روا رکھتی ہے۔ دارالحرب کا سفر مکروہ فعل شمار ہوتا تھا اور فقہاء عام طور پر اس بات پر متفق تھے کہ کسی مسلمان کے لیے دارالحرب کے سفر کا جواز یہی ہو سکتا ہے کہ وہ قیدیوں کا تاوان ادا کرنے جائے۔ حتیٰ کہ تجارت کو بھی اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا اگرچہ بعض فقہاء انتہائی ضرورت کے وقت عیسائی سرزمین سے غذائی اجناس خریدنے کی اجازت دے دیتے تھے۔

(1)

جہاد سے متعلق قوانین نے شریعت کے بڑے حصے کی طرح' اسلامی دور کے ابتدائی ڈیڑھ سو سال میں کلاسیکی شکل اختیار کی تھی' جب عرب افواج فرانس' بازنطین' چین اور ہندوستان کی طرف پیش قدمی کر رہی تھیں اور ایسی کوئی وجہ نظر نہیں آ رہی تھی کہ اسلام کی آخری اور قطعی عالم گیر فتح پر شک وشبہ کیا جائے۔ فتح تو نہ صرف یقینی تھی بلکہ سامنے دکھائی دے رہی تھی۔ تاہم اس کے بعد اس پہلو سے بلکہ دوسرے پہلوؤں سے بھی شرعی نظام اور سیاسی حقائق کے درمیان فاصلہ پیدا ہونا شروع ہوا۔ بعد میں واحد عالم گیر اسلامی مملکت جو عملاً اور اصولاً پہلی یا دوسری صدی میں موجود تھی کئی مملکتوں میں تقسیم ہو گئی۔ اور وقت گزرنے کے ساتھ عالم اسلام اور باقی دنیا کے درمیان باہم رواداری کا رشتہ قائم ہو گیا۔ باقی دنیا کو اب بھی دارالحرب ہی قرار دیا جاتا تھا لیکن اسے دائرہ اسلام میں داخل کرنے کا ارادہ مسیح موعود کی آمد تک ملتوی کر دیا گیا۔ اس عرصے میں مسلم اور غیر مسلم ملکوں کے درمیان کم وبیش مستحکم سرحدیں وجود میں آ گئیں جہاں جنگ کے بجائے حالت امن کو تسلیم کیا جاتا تھا۔ سرحدوں پر چڑھائی کر کے حدود کی خلاف ورزی تو کی جا سکتی تھی' اور جنگ کے ذریعے سرحدوں میں بھی ردوبدل ہو جاتا تھا لیکن عیسائیوں کی جنگ بازیافت اور صلیبی جنگوں کے زمانے سے سرحدوں میں اس قسم کا ردوبدل زیادہ تر مسلمانوں کی سرحدوں میں توسیع کے بجائے ان میں کمی کی صورت میں ہی ظاہر ہو رہا تھا۔

حالات کی تبدیلی اور اس کے نتیجے میں بیرونی دنیا سے قائم ہونے والے سفارتی اور تجارتی تعلقات نے فقہاء کے لیے نئے مسائل پیدا کر دیئے۔ انہوں نے دوسرے امور کی طرح ان مسائل کا مقابلہ بھی شریعت کی نہایت ماہرانہ تشریح کے ذریعہ کیا۔ جہاد کے فریضے کو مشروط کر دیا گیا اور اس کی نئی تشریح وتعبیر کی گئی۔ دارالحرب کے ساتھ جنگ کا خاتمہ صرف محدود مدت کی صلح نامہ کے ذریعہ ممکن تھا لیکن اس صلح نامہ کی تجدید ضرورت کے مطابق جتنی بار چاہیں کی جا سکتی تھی۔

اس طرح یہ ایسی حالت امن تھی جس کی مدت قانون کے مطابق بڑھائی جاسکتی تھی۔
بعض فقہاء نے درمیانی راستہ اختیار کیا۔ اور غیر مسلم ملک اب دارالصلح یا دارالعہد قرار پائے۔ ان میں وہ ملک شامل تھے جنہوں نے مسلمانوں کے ساتھ باہمی تعلقات قائم کرنے کے لیے معاہدے کیے تھے۔ ان معاہدوں کے تحت وہ مسلمان ملکوں کی بالادستی تسلیم کرتے تھے اور انہیں خراج ادا کرتے تھے۔ لیکن اپنے ملکوں میں وہ کسی حد تک خود مختار تھے اور اپنے انداز کی حکومت کرتے تھے۔ تحائف کو خراج مان کر مسلم حکمران اور ان کے قاضی ''عہد'' کے دائرے کو وسیع کر دیتے۔ اس میں کئی قسم کے سیاسی، فوجی اور تجارتی بندوبست شامل تھے۔ دارالحرب کا باشندہ مسلم علاقے میں جاسکتا تھا اور امان حاصل کرسکتا تھا۔ یہ امان ایک یا کئی غیر مسلم باشندوں کو بھی مل جاتی تھی۔ یہ امان ان کے جان و مال کا تحفظ فراہم کرتی تھی۔ مسلمان حکومت کا سربراہ پورے شہر کو یا کسی دوسرے حکمران کی رعایا کو یا کسی کاروباری ادارے کو بھی یہ امان فراہم کر دیتا تھا۔ امان دینے کے طریقہ کار نے مسلم اور عیسائی ملکوں کے درمیان تجارتی اور سفارتی تعلقات کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ اور ایسا اسلامی شرعی نظام ظہور میں آیا جس کی رو سے مسلم شہروں میں یورپی تاجروں کو قیام کی سہولت حاصل ہوگئی۔ لیکن عیسائی ملکوں میں مسلمانوں کے لیے یہ سہولت نہیں تھی۔ انہیں وہاں ''امان'' نہیں مل سکتی تھی۔ وہاں قیام کرنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ امان دینا خالص مسلم فارمولا تھا جس کا مقصد پرامن تعلقات رکھنا تھا۔ بہر حال اصل طاقت کے توازن میں پیدا ہونے والی تبدیلی کے ساتھ یہ تعلقات اب اسلامی قانون کے مطابق قائم نہیں ہوتے تھے بلکہ یورپ کے سفارتی اور تجارتی آداب ان کا تعین کرتے تھے۔ بہر حال نظری اور قانونی دونوں کی اصطلاح میں دارالامان (اسلام) ایک وحدت تھی اور فرقوں علاقوں قوموں اور دیگر اختلافات کے باوجود ان کے درمیان ہمیشہ ایک مشترک شناخت کا شعور برقرار رہا اور آج بھی ہے۔ اسی لیے یہ قدرتی بات تھی کہ مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ دارالحرب کے تمام ملکوں کے درمیان بھی اسی قسم کی وحدت اور تشخص قائم ہوگا۔ یہ رویہ مسلمانوں کی تحریروں اور ان کے عمل میں بھی نظر آتا ہے۔ ان کے نزدیک نوع انسانی کی اصل تفریق مسلمانوں اور منکرین اسلام کے درمیان ہے۔ چنانچہ اگر مسلمانوں کی اندرونی تفریق ثانوی اہمیت رکھتی تھی تو ظاہر ہے کہ غیر مسلموں کی فرقہ وارانہ اور علاقائی تفریق بالخصوص ان لوگوں کے درمیان تفریق جو اسلامی سرحدوں سے دور رہتے تھے اس سے بھی کم اہمیت رکھتی تھی۔ اور اس سے مسلمانوں کو دلچسپی بھی نہیں تھی۔

لیکن مسلمان عام کافروں کے اندر بعض اہم اختلافات کو تسلیم بھی کرتے تھے۔ان میں سے ایک فرق تو اہل کتاب اور غیر اہل کتاب کے درمیان تھا۔ ملحدوں اور بت پرستوں کے لیے تو ایک ہی حکم تھا۔ قبولِ اسلام یا موت۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے لیے‘ جن کے بارے میں تسلیم کیا جاتا تھا کہ وہ الہامی مذاہب کے ماننے والے ہیں خواہ اسلام کی آمد کے بعد ان کے مذاہب ختم ہی ہو گئے ہیں‘ تین شرائط تھیں۔ قبول اسلام‘ موت یا اطاعت۔ اطاعت کا مطلب تھا خراج ادا کرنا اور مسلمانوں کی بالادستی تسلیم کرنا۔ موت کی جگہ غلامی کو قبول کر لیا جاتا تھا۔ جو لوگ اطاعت قبول کر لیتے تھے انہیں شریعت کے مطابق مسلمان حکومت کی حفظ و امان مل جاتی تھی۔ یہ تعلق ایک معاہدہ کے تحت قائم ہوتا تھا جسے ''ذمہ'' کہا جاتا تھا۔ اس معاہدے سے جو لوگ فائدہ اٹھاتے تھے انہیں ''اہل الذمہ'' کہا جاتا تھا۔ ایسے لوگوں کو مختصراً ذمی کہتے تھے۔ اس اصطلاح کا اطلاق عام طور پر یہودیوں‘ عیسائیوں اور ان دوسرے لوگوں پر ہوتا تھا جو مسلم حکومت کی رعایا بن جاتے تھے۔ ''ذمہ'' کے قواعد کی رو سے ان لوگوں کو اپنے مذہبی عبادات اور رسوم ادا کرنے کی اجازت تھی‘ وہ اپنی عبادت گاہیں برقرار رکھ سکتے تھے اور کئی لحاظ سے اپنے معاملات خود ہی چلا سکتے تھے بشرطیکہ وہ اسلام کی بالادستی کو بلا شرط تسلیم کر لیں اور مسلمانوں کی حاکمیت کو قبول کریں۔ اس اطاعت کا اظہار اس طرح ہوتا تھا کہ وہ اسلامی قوانین کے مطابق بعض پابندیاں قبول کریں۔ جیسے خاص قسم کا لباس پہننا‘ خاص جانور کی سواری کرنا‘ خاص قسم کے ہتھیار لے کر چلنا اور اسی قسم کی دوسری پابندیاں۔ اس طرح کی پابندیاں دراصل عملاً تو کم ہی تھیں صرف معاشرتی یا علامتی طور پر زیادہ تھیں۔ غیر مسلموں پر جو اصل بوجھ تھا وہ مالی تھا۔ انہیں زیادہ محصولات ادا کرنا پڑتے تھے۔ محصولات کا یہ نظام ایران اور بازنطین کی قدیم سلطنتوں سے حاصل کیا گیا تھا۔ سب سے زیادہ تو ہر فرد پر فی کس ٹیکس تھا۔ جسے جزیہ کہتے تھے۔ یہ جزیہ ہر غیر مسلم بالغ پر نافذ ہوتا تھا۔

ذمی کی اصطلاح صرف ان یہودیوں اور عیسائیوں کے لیے استعمال ہوتی تھی جو مسلم حدود میں رہتے تھے اور مسلم ریاست کی رعایا تھے‘ مسلم حدود سے باہر رہنے والے عیسائی حربی کہلاتے تھے۔ یعنی دارالحرب کے رہنے والے۔ دارالحرب سے آنے والے مسافر یا عارضی طور پر مقیم لوگ ''مستامین'' کہلاتے تھے۔ یعنی امان طلب کرنے والے یا جنہوں نے امان کے لیے درخواست کی ہے۔ عالم اسلام میں غیر مسلموں یعنی ذمیوں کے بارے میں تو معلومات مکمل اور درست تھیں‘ جبکہ مستامین لوگوں کے بارے میں بہت کم اور دارالحرب کے رہنے والوں کے

بارے میں بہت ہی محدود تھیں اور جو تھیں بھی وہ بھی نا قابل اعتبار۔

بہر حال ایک وسیع خاکہ ضرور پیش کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے اصل زمرہ بندی مذہب کے حوالے سے تھی۔ یہودی اور عیسائی بالکل مسلمانوں کی طرح مذہبی وسیاسی گروہ مانے جاتے تھے' لیکن مسلمانوں سے کم تر۔ یقیناً یہ استدلال پیش کیا جاتا رہا ہے' خواہ وہ مبالغہ کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو کہ ایک تنظیم یا جماعت کی حیثیت سے مذہب کا تصور اسلام کے ورود کے بعد ہی سامنے آیا۔ ان مذاہب میں یہودی' عیسائی مذہب اور اسلام شامل تھے اور یہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے اسلام کو اپنے پیش رو مذاہب کا تسلسل قرار دیا اور انہیں بھی الہامی مذاہب تسلیم کیا۔ (2) یہودیوں یا عیسائیوں میں ایسا کوئی احساس یا تصور نہیں ملتا۔ اسی طرح قدیم دنیا کے دوسرے عقائد میں بھی ایسی کوئی مثال نہیں ملتی۔ مسلمانوں کے نزدیک حضرت محمد ﷺ کی بعثت اور نزول قرآن اس قسم کے الہامی مذاہب کے سلسلے کی آخری کڑی ہے۔ اس سے پہلے کئی پیغمبر دنیا میں آئے جنہوں نے بنی نوع انسان تک احکام الٰہی پہنچائے۔ ان پر خدا نے اپنے صحیفے نازل کیے۔ حضرت محمد ﷺ خاتم النبیین ہیں اور قرآن خدا کی آخری الہامی کتاب ہے۔ اسلام پر آ کر دین مکمل ہو جاتا ہے۔ اس سے پہلے نازل ہونے والے صحائف میں جو قابل قدر احکام الٰہی تھے وہ سب قرآن میں موجود ہیں۔ قرآن میں جو چیزیں نہیں ہیں اور ان صحیفوں میں ہیں وہ دراصل ان صحیفوں کی تحریف ہے۔

یہودی اور عیسائی دونوں اسلام کے لیے اجنبی نہیں تھے۔ دونوں مذہب قبل اسلام کے عرب میں موجود تھے۔ حضرت محمد ﷺ دونوں سے واقف تھے اور قرآن میں دونوں کا ذکر موجود ہے۔ اکثر قدیم روایات میں بھی ان کا ذکر آتا ہے۔ اسلام نے قدیم عقائد کے حوالے سے ہی اپنے آپ کو ممیز کیا۔ ان عقائد اور مذاہب میں یہودیت اور عیسائیت بھی تھی اور وہ مشرکانہ مسلک بھی جن کے خلاف حضرت محمد ﷺ نے اصل جنگیں لڑیں۔ جب قرآن (سورۃ 112) کہتا ہے "کہو کہ وہ اللہ ہے' یکتا' اللہ سب سے بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج ہیں نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد۔ اور اس کا کوئی ہمسر نہیں ہے۔" (3) تو وہ عیسائی عقائد کی تردید کرتا ہے۔ جب وہ کہتا ہے (سورۃ 16:114 "اللہ نے جو کچھ حلال اور پاک رزق تم کو بخشا ہے اسے کھاؤ اور اللہ کے احسان کا شکر ادا کرو۔" تو وہ غذاؤں کے سلسلے میں یہودیوں کے بعض قوانین کو رد کرتا ہے۔ (4) دوسرے ادیان سے علیحدگی اور اشتراک کے اصولوں کے لیے سورۃ (109) سے

دلیل لائی جاتی ہے کہ ''کہہ دو کہ اے کافرو میں ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی عبادت تم کرتے ہو۔ نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔ اور نہ میں ان کی عبادت کرنے والا ہوں جن کی عبادت تم نے کی ہے اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔ تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین۔'' (5) یہ مذہب کا ایک نیا تصور تھا جس کی مثال نہ عیسائی عقیدے اور عمل میں ملتی تھی اور نہ یہودی عقیدے اور فعل میں۔

مسلم فتوحات کے بعد مسلمانوں نے میسوپوٹیمیا سے لے کر اسپین تک عیسائیوں کی اکثریت والے علاقوں میں اپنے آپ کو اقلیت میں پایا۔ ایسی اقلیت جو حکمران تھی۔ چنانچہ انہیں عیسائی دنیا کا ہر اعتبار سے مشاہدہ کرنے کا موقع ملا۔ وہ انہیں کام کاج کرتے بھی دیکھتے تھے۔ عبادت میں مشغول بھی دیکھتے تھے اور کھیل کود میں مصروف بھی۔ عیسائی عقائد اور رسوم و رواج کے متعلق بعض معلومات تعلیم یافتہ مسلمانوں کے علم کا حصہ بھی تھیں۔ چنانچہ مسلمانوں کے نظریات اور ان کے رسوم و رواج پر عیسائی اثرات بھی پڑے۔ بعض مسلمان علما نے عیسائی اور یہودی مذہب اور ان کی مقدس کتابوں کا مطالعہ بھی کیا۔ لیکن یہ کام عام طور پر وہ لوگ کرتے تھے جو ان مذاہب کو ترک کر کے مشرف با سلام ہوئے تھے۔ کبھی کبھی اس کا مقصد مناظرے کے لیے اسے استعمال کرنے کے بجائے محض علمی مطالعہ بھی ہوتا تھا۔ عیسائی اور یہودی عقائد اور ان کی مقدس کتابوں پر بعض مباحث مسلمانوں کی کتابوں میں ملتے ہیں جو مذہب اور نظریات کی زمرہ بندی سے متعلق ہیں۔ یہ موضوع پہلی بار قرون وسطیٰ کی مسلم کتابوں میں داخل ہوا۔

چونکہ عیسائی اور یہودی اسلامی حکومتوں میں رہتے تھے اس لیے آہستہ آہستہ انہوں نے اپنی زبان چھوڑ کر عربی زبان اختیار کر لی اور اپنے مذاہب پر عربی میں کتابیں لکھنا شروع کر دیں، جس میں اپنی مقدس کتابوں کے تراجم بھی شامل تھے۔ اکثر و بیشتر عیسائیوں اور یہودیوں کی یہ کتابیں عربی کے بجائے دوسرے رسم الخط میں ہوتی تھیں۔ جیسے عیسائیوں کی سریانی رسم الخط میں اور یہودیوں کی عبرانی میں۔ اس لیے مسلم قاری انہیں نہیں پڑھ سکتا تھا۔ حتیٰ کہ اگر وہ عربی رسم الخط میں بھی ہوتیں تب بھی مسلمان علماء ان کی طرف کم ہی توجہ دیتے تھے۔ عام طور پر عیسائیوں اور یہودیوں کے ساتھ رواداری کا سلوک کیا جاتا تھا لیکن ان کی عزت کم ہی کی جاتی تھی۔ مسلمانوں کا ایمان تو یہ تھا کہ اسلام نے تمام ادیان کی تکمیل کر دی ہے اور پھر وہ اپنی بالادستی پر بھی یقین رکھتے تھے۔ اس لیے ان کے نزدیک یہ لوگ منسوخ مذاہب کے ماننے والے تھے اور مفتوحہ لوگ بھی

تھے۔ چنانچہ ان کے ساتھ دلچسپی لینے کا سوال ہی نہیں تھا۔

اسی طرح کے بعض خیالات نے مسلمان ملکوں کی سرحدوں سے باہر رہنے والے کافروں کے بارے میں بھی مسلمانوں کا رویہ بنایا۔ لیکن اس معاملے میں چند اور عوامل بھی کارفرما تھے۔ ابتدائی صدیوں کے دوران میں مسلم سلطنت اور مسلم برادری خاص طور سے مشرق اور مغرب کی جانب پھیلی۔ مسلمان علاقوں کے شمال اور جنوب میں یوریشیا کے چٹیل میدان تھے یا پھر افریقہ کے جنگل اور ریگستان۔ ان علاقوں نے مسلمانوں کو اپنی طرف متوجہ نہیں کیا۔ ان علاقوں کی طرف مسلمانوں کی پیش قدمی بہت سست رفتار اور بہت تاخیر سے ہوئی۔ فتوحات اور مسلمان بنانے کا اصل نشانہ زیادہ آبادی والے اور زیادہ خوش حال علاقے تھے۔ یہ علاقے تھے مغرب کی طرف شمالی افریقہ اور پھر اس کے آگے یورپ اور مشرق کی طرف ایران، وسط ایشیا اور ہندوستان اور چین کی سرحد۔ دونوں جانب مسلمانوں کو طاقت ور دشمنوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مشرق میں ایران کی سلطنت تھی اس سے آگے جنگلوں اور گھاس کے میدانوں کے جنگ جو قبائل تھے پھر ہندوستان اور چین کی عظیم طاقتیں تھیں۔ مغرب میں بازنطین کی سلطنت اور اس سے آگے عیسائیوں کی دور افتادہ حکومتیں تھیں۔

مسلمانوں کے نقطہ نظر سے عیسائیوں اور دوسری طاقتوں کے ساتھ جنگ میں بہت بڑا فرق تھا۔ میدانوں اور جنگلوں والے قبائل اور چین اور ہندوستان میں بظاہر انہیں اسلام کا متبادل کوئی مذہب نظر نہیں آتا تھا۔ دوسرے وہ ہندوستان اور چین کے بارے میں زیادہ جانتے بھی نہیں تھے۔ چنانچہ ان علاقوں کی طرف مسلمانوں کی پیش قدمی بت پرستوں کو مسلمان بنانے کے مذہبی فریضے کا ایک حصہ بھی تھی۔ وہاں انہیں زیادہ مقابلے کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور وہاں ایسا کوئی مذہب بھی نہیں تھا جو ان کے مذہب کا مدمقابل ہوتا۔ اس کے برعکس مغرب میں انہیں اپنے مدمقابل ایسے مذہبی اور سیاسی نظام کا سامنا کرنا پڑا جو اسلام کی عالم گیر دعوت کی بنیاد سے ہی انکار کرتا تھا۔ اور یہ انکار بھی اس انداز میں تھا جس سے مسلمان واقف تھے اور اسے سمجھتے بھی تھے۔ مسلمانوں کا ایمان تو یہ تھا کہ عالم گیر فتح ان کا مقدر ہے لیکن اس ایمان کے باوجود دو عقیدوں اور دو معاشروں کے درمیان جاری وسیع اور طویل جنگ وجدل کی اہمیت اور غیر متعین صورت حال سے مسلمانوں نے اپنی آنکھیں بند نہیں کرلی تھیں۔ مسلمانوں کی تحریروں میں عیسائی دنیا ایک مثالی دارالحرب بن گئی ہے اور عیسائیوں کے خلاف جنگ جہاد کا بہترین اور مثالی نمونہ نظر آتی ہے۔

گیارھویں اور پندرھویں صدی کے درمیان اٹلی، پرتگال اور ہسپانیہ سے مسلمانوں کی پسپائی اور عیسائیوں کی فتح سے مسلمانوں کی وسیع آبادی عیسائی حکومت کے ماتحت آ گئی۔ یہ آبادی ایک زمانے سے وہاں موجود تھی۔ ان تمام ملکوں میں عیسائیوں نے اپنی فتح کے بعد ایک منصوبے کے تحت مسلمانوں کو عیسائی بنانا شروع کیا اور جو عیسائی نہیں بنے انہیں ترک وطن پر مجبور کیا یا مار ڈالا۔ وقفے وقفے سے ایسے زمانے بھی آئے جب مسلمانوں کو کسی حد تک برداشت کیا گیا لیکن عام طور پر عیسائیوں کی پالیسی یہی تھی۔ اس کوشش میں آخر کار عیسائی کامیاب ہو گئے۔

عام طور پر صورت حال یہ تھی کہ عیسائی مسلمان رعایا کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے تو مسلمان بھی عیسائی حکمرانوں کے ماتحت رہنے پر آمادہ نہیں تھے۔ اکثر علماء کی رائے تھی کہ کسی غیر مسلم حکومت میں مسلمانوں کے لیے رہنا ناممکن ہے۔ اگر کافروں کے ملک میں کوئی کافر مسلمان ہو جاتا ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ ملک چھوڑ دے اور ایسے ملک چلا جائے جہاں مسلمان حکومت ہو اور جہاں اسلامی شریعت نافذ ہو۔ اس کی سند حضرت محمد ﷺ کی مکہ سے مدینہ ہجرت سے لی جاتی تھی۔ اس ہجرت سے مسلمانوں کے سال ہجری کا آغاز ہوتا ہے اور اس ہجرت کے بعد ہی مسلم ریاست قائم ہوئی تھی۔

جب مسلمان علاقے عیسائیوں کے قبضے میں آ گئے تو یہ سوال بڑی شدت کے ساتھ سامنے آیا۔ اس مسئلے کو سب سے پہلے مالکی مسلک نے حل کیا جو شمالی افریقہ، مسلم ہسپانیہ اور سسلی میں رائج تھا۔ مسلمانوں کی سرزمین کافروں کے ہاتھ میں چلے جانے سے جو سوال پیدا ہوئے تھے ان پر مالکی فقہاء کے درمیان اختلاف موجود تھا۔ بعض کا خیال تھا کہ اگر کوئی عیسائی حکمران مسلمانوں کو آزادی کے ساتھ عبادت کرنے اور اپنے دین کے مطابق زندگی گزارنے کی اجازت دیتا ہے تو مسلمانوں کو وہاں رہنے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ بعض فقہاء تو یہاں تک کہتے تھے کہ اگر کافر حکمران ظالم ہوں اور انہیں برداشت نہ کرتے ہوں تو وہ زندہ رہنے کے لیے اپنا ایمان اور اپنا عقیدہ چھپا سکتے ہیں۔ لیکن عام رائے یہی تھی کہ بہتر یہی ہے کہ تمام مسلمان ہی دارالحرب سے ہجرت کر جائیں۔ اگر سب ایسا نہ کر سکیں تو کم سے کم کچھ مسلمان ضرور ہجرت کریں۔ تاہم اس سلسلے میں مسلم الثبوت فتویٰ مراکش کے قاضی الونشریسی کا ہے۔ انہوں نے فتویٰ دیا کہ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ کافر کی حکمرانی میں رہنے کے بجائے وہ ہجرت کر جائے۔ اگر حکمران روادار ہے تو ہجرت کی ضرورت اور بھی بڑھ جاتی ہے کیونکہ اس طرح مرتد ہونے کا امکان اور بھی زیادہ ہے۔ الونشریسی

نے کہا کہ ایک ظالم مسلمان بادشاہ عیسائی عدل وانصاف سے بہتر ہے۔(6)

مشرقی یورپ میں بحیرۂ اسود کے شمال اور مشرق میں مسلمان سرزمین پر روس کی فتح اور بلقان میں عثمانی صوبوں کے مسلسل ہاتھ سے نکلنے کے ساتھ یہ مسئلہ ایک بار پھر سامنے آیا۔ مسلمانوں کی نئی آبادیاں عیسائی تسلط میں آ گئی تھیں اور وہاں بھی بعض لوگوں نے اس مسئلے کا حل ہجرت میں ہی تلاش کیا۔لیکن اب یورپ کی سامراجی پیش قدمی شروع ہو چکی تھی۔مغربی سامراج کی توسیع کے زمانے میں ہجرت اس کا حل نہیں تھا۔روسی' برطانوی اور ولندیزی سلطنتوں کے فروغ کے ساتھ عیسائی تسلط عالم اسلام کے اصل مرکزوں تک پہنچ گیا اور مسلمان آبادی کو مجبوراً وہاں رہنا پڑا جہاں وہ تھے'یعنی کافروں کے زیر تسلط۔

اب عیسائی دنیا کی اہمیت کافی زیادہ ہو چکی تھی لیکن پھر بھی مسلمانوں نے اس دنیا کے بارے میں بہت ہی کم دلچسپی ظاہر کی۔گویا دنیا کے جس خطے سے وہ واقف تھے وہی ان کے لیے کافی تھا۔یہ خطہ تھا یونانی عیسائیوں کی بازنطینی سلطنت۔جنگوں کے بارے میں مسلمانوں کی جو تحریریں موجود ہیں ان میں بار بار اس خطے کا ذکر آتا ہے۔خاص طور سے مسلم سرحدوں کے قریب علاقوں کا ذکر مسلمانوں کی جغرافیہ اور تاریخ کی کتابوں میں زیادہ تفصیل سے ملتا ہے۔

1068ء میں جنگ ہیسٹنگز (Hastings) کے دو سال بعد اور فلسطین میں صلیبی عساکر کی آمد سے تیس سال پہلے ہسپانیہ کے شہر طلیطلہ (تولیدو) کے قاضی صاعد ابن احمد نے قوموں کی اقسام پر عربی میں ایک کتاب لکھی۔اس کتاب کے پیش لفظ میں اس نے نوع انسانی کی اقوام کو دو قسموں میں تقسیم کیا۔ایک وہ جنہوں نے سائنس اور تعلیم سے تعلق قائم کیا اور دوسرے وہ جنہوں نے یہ تعلق نہیں رکھا۔وہ قومیں جنہوں نے علم کے فروغ میں حصہ لیا ان کی تعداد آٹھ ہے یہ ہیں' ہندوستان' ایران' شالدلیس' یونان' روما (اس میں بازنطینی اور مشرقی عیسائیوں کو شامل کیا جاتا تھا) مصر' عرب (جس میں عام مسلمان شامل تھے) اور یہودی۔اس کتاب میں انہی قوموں سے بحث کی گئی ہے۔باقی بنی نوع انسان میں سے اس نے چینی اور ترکوں کو قابل ذکر جانا ہے اور "لاعلم قوموں" میں انہیں سب سے زیادہ معزز گردانا ہے اور لکھا ہے کہ دوسرے میدانوں میں اپنی کامرانیوں کی وجہ سے وہ عزت کے قابل ہیں۔چین اپنی دست کاریوں' مصوری اور استقامت کی وجہ سے اور ترک اپنی جرأت' فن حرب میں اپنی مہارت' شہسواری اور نیزہ' تلوار اور تیر کمان میں اپنی چابک دستی کی وجہ سے۔صاعد باقی انسانوں کو نہایت حقارت کے ساتھ شمالی اور جنوبی وحشی قرار

دے کر رد کر دیتا ہے۔ پہلی قسم کے بارے میں وہ لکھتا ہے:

> اس گروہ کے دوسرے لوگ جنہوں نے علوم وفنون میں ترقی نہیں کی' انسان نہیں جانور ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ شمال کے دور دراز خطوں میں رہتے ہیں۔ یہ خطہ جو سات اقلیموں کی آخری اقلیموں میں اور آباد دنیا کی آخری سرحد پر واقع ہے' وہاں سمت الراس کی نسبت سے سورج بہت ہی زیادہ فاصلے پر ہوتا ہے اور ہوا سرد اور آسمان ابر آلود رہتا ہے۔ اس لیے ان لوگوں کا مزاج سرد' ان کی حس مزاح خام' ان کے پیٹ بڑے' ان کا رنگ زرد اور ان کے بال لمبے اور بدنما ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ سمجھ بوجھ کی تیزی اور ذہانت کی طراری سے عاری ہوتے ہیں اور جہالت' بے توجہی' فہم و ادراک کی کمی اور حماقت ان پر حاوی رہتی ہے۔(7)

اپنے ان مشاہدات میں صاعد دراصل اس وقت کے مسلم علماء میں مروّج خیالات کی عکاسی کر رہا ہے۔ اس وقت دنیا کا مرکز سرزمین اسلام تھی جو ہسپانیہ سے شمالی افریقہ اور پھر مشرق وسطیٰ تک پھیلی ہوئی تھی اور اس میں قدیم تہذیبوں کے مراکز کے قریب قریب سارے ہی لوگ شامل تھے۔ شمال میں بازنطین کی عیسائی سلطنت اس روبزوال تہذیب کی نمائندگی کرتی تھی جس کی بنیاد ایک ایسے الہامی مذہب پر تھی جو اپنے عروج پر پہنچ کر دین اسلام میں اپنی تکمیل کر چکا تھا۔ مشرق میں ایران سے ماوراء وہ ملک تھے جہاں مہذب زندگی کی ایک شکل سی موجود تھی۔ یعنی کم تر اور بت پرستانہ شکل۔ اس کے علاوہ ان کے نزدیک شمال اور جنوب کی بیرونی دنیا میں صرف سفید اور سیاہ وحشی بستے تھے۔ ان شمالی وحشیوں میں سے بعض گروہوں کے بارے میں مسلمانوں کے علم میں اضافہ ہی یہاں ہمارا موضوع ہے۔

❀......❀......❀

زبان اور ترجمہ

کائنات کی تاریخ پر چودھویں صدی کی ایک ایرانی کتاب میں مصنف نے یورپ کے بارے میں لکھتے ہوئے اپنی معلومات اس طرح ظاہر کی ہیں۔ ''فرنگی پچپن زبانیں بولتے ہیں اور ایک مقام کے لوگ دوسرے مقام کے لوگوں کی زبان نہیں سمجھتے۔ ان کے درمیان جو چیز مشترک ہے وہ ہے ان کی تقویم، رسم الخط اور اعداد'' (1) قرونِ وسطیٰ کے مسلمان کے لیے ایسا سمجھنا ایک قدرتی سی بات تھی۔ کیونکہ وہ تو مسلم دنیا کی لسانی وحدت سے ہی آگاہ تھے جس میں دو یا کبھی کبھی تین زبانیں ہی نہ صرف علماء وفقہاء کی محدود ضرورت (مغربی یورپ میں لاطینی زبان کی طرح) پوری کرتی تھیں بلکہ عام رابطے کا کام بھی دیتی تھیں۔ مقامی زبانیں اور بولیاں بہت ہی نچلی سطح پر رہ جاتی تھیں۔

شروع میں مسلمانوں کے درمیان صرف ایک ہی زبان مستعمل تھی اور وہ تھی عربی جو قرآن اور عرب فاتحین کی زبان تھی۔ کچھ عرصے کے لیے تو مسلمانوں کی سرزمین میں حکومت، تجارت اور ثقافت کی زبان عملاً عربی ہی تھی جس نے حیرت انگیز تیزی کے ساتھ لاطینی، یونانی، قبطی سریانی اور فارسی جیسی مہذب زبانوں کی جگہ سنبھال لی تھی۔ پہلے یہ زبانیں ہی ان علاقوں میں رائج تھیں جو اسلامی سلطنت کے زیر نگیں آ گئے تھے۔

لاطینی اور یونانی تو بالکل ہی غائب ہو گئی البتہ قبطی اور سریانی زبانیں عیسائی اقلیت کی مذہبی زبان کے طور پر زندہ رہیں لیکن وہ بولی نہیں جاتی تھیں۔ ایران میں اسلام کی آمد کے بعد فارسی زبان نے ایک نئی شکل اختیار کر لی۔ اس میں عربی کے بے شمار الفاظ داخل ہو گئے اور وہ عربی رسم الخط میں لکھی جانے لگی۔ نئی فارسی قبل از اسلام کی زبان سے ویسے ہی مختلف ہو گئی جیسے انگریزی

اینگلوسیکسن زبان سے۔ وقت گزرنے کے ساتھ فارسی عالم اسلام کی دوسری علمی وادبی زبان بن گئی۔ یہ زبان وسط ایشیا' ہندوستان اور ترکی وایران میں عام استعمال کی جانے لگی۔

وسط ایشیا سے مشرق وسطی میں ترکوں کی آمد اور مسلمان ملکوں پر ان کی ایک ہزار سالہ حکمرانی سے ایک تیسری اسلامی زبان کو بھی فروغ ملا۔ اسلامی دنیا میں داخل ہونے سے پہلے ترکوں میں کئی مذاہب کے پیروکار شامل تھے اور وہ بہت سے رسم الخط استعمال کرتے تھے۔ جب وہ غالب تعداد میں مسلمان ہوگئے تو متعدد ترک زبانیں بھی اسی عمل سے گزریں جس سے فارسی گزری تھی۔ اب ایک نئی ترکی زبان وجود میں آ گئی جو عربی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی اور جس نے عربی اور فارسی سے کافی الفاظ مستعار لے لئے تھے۔ بعد میں ایشیا اور افریقہ میں دوسری مسلم زبانیں بھی سامنے آئیں۔ لیکن اسلام کے مرکز میں اور وسطی اور جنوبی ایشیا' شمالی افریقہ اور یورپ میں صرف تین زبانیں عربی' فارسی اور ترکی عام طور پر رائج رہیں۔

عام طور پر عرب حتیٰ کہ بہت عالم فاضل عرب بھی صرف عربی زبان ہی جانتے تھے۔ پڑھے لکھے ایرانی عربی اور فارسی جانتے تھے اور پڑھے لکھے ترک عربی' فارسی اور ترکی جانتے تھے۔ فارسی کلاسیکی زبان بن گئی' عربی کلاسیکی زبان بھی تھی اور مذہبی کتابوں کی زبان بھی۔ پڑھے لکھے مسلمان خواہ کسی بھی علاقے یا لسانی گروہ سے تعلق رکھتے ہوں عربی ان کی تعلیم کا لازمی حصہ تھی۔ فارسی اور ترکی دونوں زبانیں اور مسلمانوں میں بولی جانے والی دوسری زبانیں بھی عربی رسم الخط میں لکھی جانے لگیں۔ ان کا فکری اور علمی محاورہ قریب قریب عربی زبان سے ہی ماخوذ تھا۔

مذہب سے تعلق رکھنے اور رسم الخط اختیار کرنے کے درمیان مکمل ہم آہنگی پیدا ہوگئی تھی۔ یہودی عبرانی رسم الخط استعمال کرتے تھے' صرف عبرانی زبان کے لیے ہی نہیں دوسری زبانوں کے لیے بھی جو وہ بولتے تھے۔ عیسائی سریانی رسم الخط استعمال کرتے تھے حتیٰ کہ عربی بھی اسی رسم الخط میں لکھتے تھے۔ مسلمان صرف عربی رسم الخط استعمال کرتے تھے دوسرے تمام رسم الخط انہوں نے ترک کردیئے تھے۔ مسلمانوں کے لیے کافروں کی زبان کا رسم الخط سیکھنا ایک قسم کا غیر متبرک بلکہ ناپاک فعل سمجھا جاتا تھا اور بہت ہی کم مسلمان انہیں سیکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ غیر اسلامی زبانیں صرف وہی نومسلم جانتے تھے جو اپنے پرانے مذاہب سے اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ باقی کوئی نہیں جانتا تھا۔

یہ صورت حال یورپ سے بالکل ہی مختلف تھی جو کئی قوموں اور ملکوں میں بٹا ہوا تھا اور

ہر ایک کی اپنی زبان تھی۔ ابتدائی زمانے میں ہی یورپی قوموں نے اپنی زبان کے علاوہ دوسری زبانیں سیکھنے کو بھی ضروری سمجھا اور اس کے لیے راستے تلاش کیے اور طریقہ کار وضع کیے۔ اسلامی دنیا میں کافی عرصے تک صرف ونحو اور فرہنگ نویسی صرف عربی زبان تک ہی محدود رہی۔

غیر ملکی زبانوں سے دلچسپی کا فقدان سرحدی علاقوں میں یعنی ہسپانیہ تک بھی موجود تھا' جہاں مسلمان حکمرانی کے کئی سو سال کے دوران میں بھی رومی بول چال' جو بعد میں ہسپانوی زبان بنی' موجود تھی اور اسے عام لوگ بولتے تھے۔ لیکن مسلمانوں نے اس پر توجہ نہیں دی۔ ظاہر ہے یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح مسلمان بھی اسے ضرور جانتے ہوں گے۔ اس کی شہادت مسلمان اور یہودی شعراء کے اشعار سے ملتی ہے جہاں عربی یا عبرانی قصیدے اور گائی جانے والی نظموں میں رومن بول چال ٹیپ کے مصرع کے طور پر استعمال کی گئی ہے۔ اس قسم کے ٹیپ کے مصرع جنہیں خارجہ کہا جاتا تھا اور جو عربی یا عبرانی رسم الخط میں لکھے جاتے تھے ہسپانوی زبان اور ادب کا ارتقاء جاننے کے لیے ایک نہایت اہم ذریعہ ثابت ہوئے ہیں۔ اس کے باوجود اس بول چال نے مسلمانوں کے اندر اس معاشرہ کو جاننے کے لیے گہری دلچسپی پیدا نہیں کی جس سے یہ خارجہ زبان ابھری تھی۔ خارجہ زبان کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں تھی کہ اسے استعمال کر کے نظم یا گانے کو عوامی رنگ دے دیا جائے۔ اسے شاعری کی بعض اصناف میں بھی برتا جاتا تھا لیکن اس سے زیادہ نہیں۔ عربی میں ایسا ادب موجود ہے جس میں ہسپانوی عرب شاعر اور ادیب مسلم مشرقی علاقوں کے مقابلے میں اندلس کی شان وشوکت کے قصیدے گاتے ہیں۔ وہ ہسپانوی سبزہ زاروں کے گیت گاتے ہیں' شہروں کی خوش حالی کی تعریف کرتے ہیں اور مسلمانوں کے کارنامے سناتے ہیں۔ تاہم وہ اپنی تحریروں میں اس علاقے کے قدیم باشندوں کو اس قابل ہی نہیں سمجھتے کہ ان کا ذکر کیا جائے۔ ہسپانیہ میں مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ موجودگی میں صرف ایک دستاویز ایسی ملی ہے جس میں ایک یورپی زبان سے کسی قسم کی دلچسپی کے اشارے ملتے ہیں۔ یہ دستاویز ایک کاغذ کے ٹکڑے سے زیادہ نہیں ہے۔ اس میں جرمن زبان کے چند الفاظ ہیں اور ان کے عربی متبادل (2) مسلم ہسپانیہ میں بے شمار علماء وفضلاء اور ماہر لسانیات تھے لیکن صرف ایک شخص کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے اجنبی زبانوں سے دلچسپی تھی۔ اور وہ تھا غرناطہ کا ابوحیان جس کا انتقال 1344ء میں ہوا۔ اس نے ترکی اور حبشہ کی زبانیں سیکھی تھیں۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ قرون وسطی کے مسلمانوں کو ترجمے کا فن نہیں آتا تھا۔

جدید دور سے پہلے کے زمانے میں عربی زبان میں اور عربی زبان سے دوسری زبانوں میں ترجمہ کا جتنا کام ہوا غالباً وہ کسی اور زبان میں نہیں ہوا۔ مسلمانوں کی ہدایت کے لیے دینی قانون اور بعد میں بعض دوسری کتابیں فارسی' ترکی اور دوسری مسلم زبانوں میں ترجمہ کی گئیں۔ یہودیوں اور عیسائیوں کی ہدایت کے لیے سائنس اور فلسفے کی کتابیں عبرانی اور لاطینی میں ترجمہ کی گئیں۔ بعد میں یہ کتابیں مغربی دنیا کو بھی دستیاب ہوئیں۔(3)

بعد کے زمانوں میں قدیم تحریروں کے ترجمے عربی میں کیے گئے۔ ایک عرب روایت کے مطابق یہ تحریک ساتویں صدی کے آخر اور آٹھویں صدی کے اوائل میں شروع ہوئی جب بنو امیہ کے ایک شہزادے نے کیمیا پر چند یونانی تحریریں ترجمہ کرانے کا انتظام کیا۔ ترجمہ کرنے والا کوئی سٹیفن تھا جو نام سے ہی عیسائی لگتا ہے۔ ابتدا میں یہ ترجمے ذاتی ضرورت کے لیے کرائے گئے تھے جن کا مشکل سے ہی کوئی نمونہ باقی بچا ہوگا۔ یہ کام ضرورت کے تحت ہی کیا گیا تھا اور اس کے لیے صرف دو شعبوں کا انتخاب کیا گیا تھا' ایک طب دوسرے کیمیا۔ بعض مذہبی تحریریں بھی ترجمہ کرائی گئیں کیونکہ قرآن کو سمجھنے کے لیے یہودی اور عیسائی مذہب کا علم بھی ضروری سمجھا گیا۔

ترجمہ کی تحریک نے اپنی وسعت کے اعتبار سے عباسی خلافت کے دور میں فروغ حاصل کیا۔ خلافت عباسیہ بنوامیہ کے بعد آٹھویں صدی کے وسط میں قائم ہوئی تھی۔ دارالخلافہ کے شام سے بغداد منتقل ہو جانے سے بحیرۂ روم کے اثرات کمزور ہوئے اور مشرق وسطی کے اثرات نے تقویت حاصل کی۔ نظام حکومت اور درباری آداب سے متعلق کتابیں وسطی دور کی فارسی سے اور ریاضی کی کتابیں ہندوستانی زبانوں سے عربی میں ترجمہ کرائی گئیں۔ ترجمہ کرنے والے بلا استثنا غیر مسلم یا نو مسلم تھے۔ ان میں بیشتر عیسائی تھے۔ چند یہودی اور باقی سبائی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔

ترجمہ کے لیے انتخاب کی جانے والی کتابیں علمی اور تدریسی نوعیت کی تھیں۔ یونانی سے جو کتابیں ترجمہ کرائی گئیں وہ دو شعبوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ ایک فلسفہ اور دوسرے سائنس۔ پہلی صنف میں افلاطون' ارسطو اور ان کے ساتھ دوسرے متعدد قدیم فلاسفر شامل تھے جن میں مخفی علوم کے ماہرین' غناسطی اور نوفلاطونی بھی تھے۔ دوسرے مضامین میں طب' علم نجوم' علم الافلاک' کیمیا گری اور کیمسٹری' طبیعیات اور ریاضی شامل تھے۔ ٹیکنیکل مضامین پر بھی تھوڑی بہت توجہ دی گئی خاص طور سے زراعت پر کتابیں ترجمہ کرائی گئیں۔ اس موضوع پر دو تحقیقی رسالے دسویں صدی

میں ترجمہ کرائے گئے جن میں سے ایک یونانی سے اور دوسرا آرامی زبان سے ترجمہ کیا گیا۔

جس زمانے میں مسلمان مشرقی بحیرہ روم کے علاقوں میں آئے اس وقت تک یہ علاقے بھاری تعداد میں عیسائی ہو چکے تھے۔ اور یونان سے ورثے میں ملنے والی تہذیب جس وقت مسلمانوں تک پہنچی اس وقت تک وہ مشرقی عیسائی کلیسا کی چھلنی میں چھن چکی تھی۔ اس سے بلاشبہ یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں نے یونانی زبان سے ترجمہ کے لیے چند کتابوں کا انتخاب کیا اور ان کا ترجمہ کرنے والوں نے جن کتابوں کا مشورہ دیا اس میں یہ حقیقت ان کے پیش نظر ضرور تھی۔ لیکن یہ وجہ جزوی ہے کلی نہیں۔ بعض تحریریں جو مشرقی عیسائی بہت پسند کرتے تھے انہیں ایک طرف رکھ دیا گیا اور بعض دوسری تحریریں جنہیں مشرقی کلیسا نے نظر انداز کر دیا تھا انہیں پرانے نسخوں سے یا قدیم بازنطینی علماء کے حوالوں کے ذریعہ دریافت کیا گیا۔

ترجمہ کا اصل معیار کتاب اور موضوع کا سود مند ہونا تھا۔ بعد میں کیمیا گری سے کیمسٹری تک پہنچتے پہنچتے یہ دلچسپی خالصتاً علمی اور سائنسی تجسس کی شکل اختیار کر گئی۔ سود مند ہونے کی کسوٹی جہاں فلسفہ تھا وہاں سائنسی علوم بھی تھے۔ یہاں سود مند ہونے سے ضرورت کے تحت کام کرنے کا محدود مفہوم نہ لیا جائے۔ ان مضامین میں ایسی بھی تھے جن کا مقصد ذہنی انبساط اور ترفع حاصل کرنا تھا' جسے مسلم فلاسفہ سعادۃ کہتے تھے اور یونانی میں Eudaimonia کہا جاتا تھا۔ اگرچہ اس کا اظہار تجریدی اصطلاحوں میں کیا جاتا اور اس کا تعلق بھی تجریدی تصور سے ہے لیکن فلسفے کے ترجمہ کا یہ جواز چند خاص مقاصد کے حصول پر مبنی تھا جس میں روحانی انبساط کے ساتھ مادی فوائد بھی شامل تھے۔ سائنس اس دنیا میں انسان کی صحت اور فلاح و بہبود سے تعلق رکھتی تھی تو فلسفہ دوسری دنیا کے لیے آدمی کو تیار کرتا تھا۔ فلسفے کی تحریروں کا ترجمہ ایک قسم کا مذہبی فعل بھی تھا چنانچہ مسلم افکار و خیالات پر یونانی فکر کے کافی اثرات نظر آتے ہیں۔

لیکن یونانی شاعری' ڈرامہ یا یونانی تاریخ کا ترجمہ کرنے کی کہیں کوشش دکھائی نہیں دیتی۔ ادب کا تعلق انسان کے ذاتی اور ثقافتی تجربات و مشاہدات سے ہوتا ہے۔ اسی طرح ادب ذات اور کلچر کے ساتھ منسلک ہوتا ہے۔ اجنبی اور بیگانہ جمالیات کی تحسین و ادراک خاصا مشکل کام ہے۔ اسی لیے ماضی میں ادبی ترجمے شاذ و نادر ہی کیے جاتے تھے۔ اور وہ بھی وہاں سے جہاں قریبی علاقائی اور تہذیبی تعلق ہوتا تھا۔ جہاں یہ تعلق اور یہ رشتہ نہیں تھا وہاں فلسفہ اور سائنس تو ترجمہ ہوئے ادب پر کسی نے اتفاق سے ہی توجہ دی۔ یونانی سے لاطینی میں' عربی سے فارسی میں

اور چینی سے جاپانی میں ادبی ترجمے ملتے ہیں لیکن دور افتادہ تہذیبوں میں یہ رابطہ نہیں ملتا۔ جدید دور کے اوائل میں ہی یورپ میں ایک تہذیب سے دوسری تہذیب کے درمیان شعر و ادب کا تبادلہ شروع ہو چکا تھا۔ قرون وسطی کے مسلمانوں کے لیے غیر مسلموں اور کافروں کے معاشرہ کا ادب جمالیات اور اخلاقی رہنمائی دونوں لحاظ سے کوئی کشش نہیں رکھتا تھا۔ ان دور افتادہ ملکوں کی جن میں نہ کوئی پیغمبر اترا اور نہ کوئی الہامی صحیفہ نازل ہوا' تاریخ محض واقعات کے تسلسل کا نام ہی تھی۔ مسلمانوں کے لیے اس کے کوئی معنی نہیں تھے۔ ان کے نزدیک ادب کا مطلب تھا شاعری' زور خطابت اور اپنی زرخیز تہذیب کی قصیدہ خوانی۔ وہاں تاریخ بنی نوع انسان کے لیے اللہ کے مقرر کردہ نظام عمل کی بارآوری کا نام ہے۔ جس کا نمونہ اس کے اپنے اسلامی معاشرہ میں نظر آتا ہے۔ اسلام سے قبل کی تاریخ صرف اس حد تک ہی اہمیت رکھتی تھی جہاں تک اس میں ظہور اسلام کی پیش بینی ملتی ہے اور جس سے اسلامی معاشرہ قائم کرنے میں مدد ملی۔ نشاۃ ثانیہ اور بعد از نشاۃ ثانیہ کا یورپ ظہور میں ہوا تو اس کے بعد ہی ایسا ہوا کہ انسانی معاشرہ نے پہلی بار وہ شائستگی اور اس سے بھی زیادہ وہ تجسس پیدا کیا جس نے بیگانہ حتیٰ کہ دشمن معاشروں کے ادبی کارناموں کے مطالعہ اور ان کی غیر شخصی تحسین کو مہمیز کیا۔

دوسری دو اصناف اور تھیں جن کی محدود قدر و قیمت تھی لیکن ان کا بھی کم تعداد میں ترجمہ کیا گیا۔ وہ تھیں جغرافیہ اور سیاست۔ جغرافیہ پر یونانی تحریروں کے ترجمے سے ہی مسلمانوں نے اس دنیا کی جغرافیائی ہیئت معلوم کی جس میں وہ رہتے تھے۔ اور یہ یونانی تحریریں ہی تھیں جن سے ان کے ہاں ریاست کی ہیئت اور حاکم و محکوم کے تعلق کے بارے میں بنیادی تصور پیدا ہوا۔ تاہم سیاست پر لکھنے والے مسلمانوں پر یونان کے سیاسی افکار کا اثر بہت محدود رہا۔ چنانچہ اسلام کے اصل دھارے میں شامل یہ مصنفین بہت کم یونانی سیاسی اصطلاح میں بات کرتے ہیں۔ کیونکہ وہاں غالب اثر قرآن کا ہے یا ابتدائی مسلمانوں کی روایات کا۔

دسویں صدی کے آخر تک ترجمہ کی تحریک دم توڑ گئی۔ اس وقت تک ترجمہ کا کام خاصہ ہو چکا تھا۔ اس کے بعد کئی وجوہ کی بنا پر یہ تحریک ختم ہو گئی۔ اس کی وجہ محض کتابوں کی کمی نہیں تھی کیونکہ بہت سی کتابیں ان کی دسترس میں تھیں اور ان کا ترجمہ بھی نہیں ہوا تھا۔ بازنطینی سلطنت میں اب بھی یونانی کتابوں کا بڑا ذخیرہ موجود تھا جن کی موجودگی کا علم مسلمانوں کو تھا۔ ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ مسلمان حکمرانوں نے اپنے خاص نمائندے بازنطین بھیجے تاکہ وہ ان یونانی کتابوں

کے نسخے تلاش کر کے لائیں جن کا ترجمہ مسلمان کرانا چاہتے تھے۔ اس تحریک کے خاتمے کا سبب ترجمہ کرنے والوں کی کمی کو بھی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ درست ہے کہ عرب معاشرے میں عیسائی اقلیت کے گھل مل جانے سے یونانی زبان جاننے والے لوگوں کا ملنا بہت مشکل ہوگیا تھا لیکن ابھی ایسے لوگ موجود تھے اور عیسائی برادری کے اپنے اندر بھی اپنی ضرورت کے لیے ترجمے کیے جارہے تھے۔ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ترجمے عام عربی کلچر سے خارج ہورہے تھے۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت تک بیرونی اثرات کے خلاف عرب کلچر میں شدید مزاحمت پیدا ہوچکی تھی۔

یونانی زبان سے ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی تعداد بہر حال اتنی تھی کہ مسلمان قاری کو یونانی فلسفے، طب اور سائنس اور قدیم یونانی تصورات سے بخوبی آگاہی ہوسکتی تھی۔ اس میدان میں خاصہ کام ہوا تھا۔ اس کے مقابلے میں لاطینی سے صرف ایک کتاب ہی ترجمہ کی گئی۔ وہ کتاب تھی اروسیس (Orosius) کا روزنامچہ۔ اس کا ترجمہ محض اس لیے ہی خصوصی اہمیت نہیں رکھتا کہ وہ لاطینی زبان میں تھا بلکہ اس کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ وہ تاریخ ہے۔ سلطنت روما کی تاریخ کا یہ مختصر سا رسالہ ہسپانیہ میں ترجمہ کیا گیا اور اس نے روما کی تاریخ پر لکھنے والے مسلمان مورخوں کے لیے بنیاد کا کام دیا۔(4)

اگر قدیم روم سے مسلمانوں کی دلچسپی کم تھی تو قرون وسطی کے یورپ اور اس کی زبانوں سے دلچسپی اور بھی کم تھی۔ 906ء میں اٹلی کا ایک سفیر جب بغداد آیا تو اس کے پاس ایک خط تھا جو غالباً لاطینی میں تھا۔ اس خط کو پڑھنا ہی مشکل ہوگیا تھا۔ اس زمانے کے ایک عرب مصنف کے بیان کے مطابق۔

> خط سفید ریشمی کپڑے پر لکھا ہوا تھا اور اس رسم الخط میں تھا جو یونانی سے مشابہہ تھا لیکن خط مستقیم میں تھا...... حکام نے اس کا ترجمہ کرانے کے لیے کسی شخص کو تلاش کیا تو پتہ چلا کہ کپڑے کی دکان میں خواجہ سرا بشر کے ساتھ ایک فرنگی ہے جو ان لوگوں کی تحریر پڑھ سکتا ہے۔ خواجہ سرا اسے خلیفہ کے دربار میں لے آیا۔ اس نے خط پڑھا اور یونانی میں اس کا ترجمہ کردیا۔ پھر اسحٰق ابن حنین (سائنسی کتابوں کا عظیم مترجم) کو بلایا گیا۔ اس نے یونانی سے عربی میں ترجمہ کیا۔(5)

اس واقعہ سے واضح ہوجاتا ہے کہ بغداد کا دربار لاطینی مغرب سے کتنا دور اور کتنا لاعلم تھا۔ اسی صدی میں عظیم عرب عالم ابن الندیم نے علمی کتابوں کی فرہنگ تیار کی جس میں عرب اور

غیر عرب دونوں مصنفین کی کتابیں تھیں، تو اس نے سولہ زبانوں کا حوالہ دیا جن میں سے بعض زبانوں کا تذکرہ زیادہ تفصیل کے ساتھ کیا گیا تھا۔ ان میں سے صرف تین زبانیں ایسی تھیں جنہیں یورپی کہا جا سکتا ہے سوائے روسی زبان کے۔ پہلی زبان تھی یونانی جس کے بارے میں اسے کافی معلومات تھیں۔ دوسری زبان کے بارے میں اس نے لکھا اور وہ لومبارڈ اور سیکسن لوگوں کی زبان ہے جو رُوم و فرنجا کے درمیان اور اندلس کی سرحد کے قریب بولی جاتی ہے۔ اس رسم الخط کے بائیس حروف ہیں۔ اسے اپوسٹولک (عربی میں یہ لفظ ابوستولک لکھا ہے) کہا جاتا ہے اور اسے وہ بائیں سے دائیں لکھتے ہیں۔'' تیسری تھی فرنگی یا فرنجی زبان۔ اس کے بارے میں ابن الندیم نے صرف اتنا ہی لکھا ہے جتنا 906 میں آنے والے سفیر کے خط سے معلوم ہوا تھا (جس کا پہلے ذکر آ چکا ہے) یہاں لاطینی کا نام نہیں لکھا گیا۔ ''لومبارڈ یکسین'' رسم الخط غالباً اس مہم کی بازگشت ہے جو شہنشاہ اوٹو نے اٹلی میں چلائی تھی۔(6)

اگرچہ مسلم دنیا نے غیر مسلم زبانوں کے مطالعے اور ان کی تحریروں میں دلچسپی لینے سے انکار کر دیا تھا پھر بھی بہت سی غیر ثقافتی وجوہ کی بنا پر وہ مغربی لوگوں سے ربط و ضبط رکھنے پر مجبور تھے۔ صلیبی جنگوں سے پہلے ہی مسلمانوں اور مغربی عیسائیوں کے درمیان بحیرۂ روم کے راستے تجارت بحال ہو چکی تھی۔ صلیبی جنگوں کے بعد اس میں وسعت پیدا ہوتی چلی گئی۔ یقیناً یورپی تاجروں اور مشرق وسطیٰ کے خریداروں، فروخت کرنے والوں یا بیچ کے آدمیوں کے درمیان بات چیت کا کوئی نہ کوئی وسیلہ ضرور ہوگا۔ سفارتی تعلقات میں بھی وقتاً فوقتاً گفت و شنید اور خط و کتابت کی ضرورت ہوتی ہوگی۔ دستاویزوں کا تبادلہ بھی ہوتا ہوگا۔ اٹھارہویں صدی کے آخری برسوں تک مسلم دنیا نے سفارتی میدان میں یورپی ملکوں کا طریقہ کار اختیار نہیں کیا تھا کہ جن ملکوں کے ساتھ تعلقات ہیں وہاں ایسے سفیر مقرر کیے جائیں جو وہیں قیام کریں۔ البتہ شروع سے ہی سفارتی رابطے کے بعض دوسرے طریقے رائج تھے۔

اٹھارہویں صدی میں ایک تیسرا اور اہم وسیلہ اختیار کیا گیا جو تجارت اور سفارت کے علاوہ تھا۔ یہ تھا تعلیم و تربیت کا وسیلہ، خاص طور سے بری اور بحری افواج کی تربیت کا۔ عثمانی عساکر کو جدید خطوط پر ڈھالنے کے لیے یورپ کے ایسے بری اور بحری فوجی افسروں کی ضرورت تھی جو ترکی کے فوجی اداروں میں تربیت دیں۔ بعض اوقات یہ افسر ترک افواج کے ساتھ بھی کام کرتے تھے۔ ظاہر ہے ان کے درمیان کوئی مشترک زبان تو ہوگی۔

ان تمام سرگرمیوں کے لیے مترجموں اور ترجمانوں کی ضرورت تھی جو باقاعدہ ملازم رکھے جاتے تھے۔ مترجم یا ترجمان بننے کے لیے کسی نہ کسی کو تو دوسری زبان سیکھنا پڑتی ہوگی۔ یہ کام زیادہ تر بلکہ غالب تعداد میں یورپ کے لوگوں نے کیا۔ مسلمانوں نے کوشش نہیں کی۔ یورپ کے باشندوں کو سیاسی حالات کی وجہ سے یا پیشہ ورانہ ضرورت کی وجہ سے' پہلے ہسپانیہ میں' پھر اٹلی میں اور بعد میں زیادہ تر شمالی ملکوں میں عربی اور ترکی بولنے والوں کے ماحول میں رہنے کا موقع ملا تو انہوں نے ضرورت کے مطابق بول چال کی عربی یا ترکی سیکھ لی۔ یورپی تاجر تو بڑی تعداد میں مسلمان ملکوں میں رہتے تھے لیکن بہت ہی کم ایسے مسلمان تھے جو اپنی خوشی سے یورپ میں رہتے ہوں۔ اس لیے انہیں یورپ کی زبانیں سیکھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اس کے علاوہ انہیں یہ زبانیں سیکھنے کا شوق بھی نہیں تھا۔ سلطنت عثمانیہ کی سرحدوں پر واقع ملکوں میں زبانوں کا تنوع اور ان کی تعداد غالباً سب سے زیادہ تھی۔ اس زمانے کی تحریروں میں ان ترجمانوں کا حوالہ ملتا ہے جو سولہویں اور سترھویں صدی کی جنگوں کے دوران میں دونوں فریقوں کے درمیان ہونے والی گفت وشنید' تفتیش اور مذاکرات میں مدد کرتے تھے۔ وہ غالباً مقامی زبانیں استعمال کرتے ہوں گے۔ یقیناً یہ زبانیں بلقان کے وہ بے شمار عیسائی اور مسلمان بھی جانتے ہوں گے جو کسی نہ کسی وجہ سے استنبول چلے گئے تھے۔ عثمانی ترکوں کی زبان میں جو خاص طور پر مالی اور سرکاری امور میں کام آتی تھی' بلقان حتیٰ کہ ہنگری کی زبانوں کے بہت سے الفاظ بھی شامل ہوگئے تھے۔ لیکن مغرب کے بارے میں ترکی کے ادراک وتصور پر اس سے بہت کم اثر پڑا بلکہ بالکل ہی اثر نہیں پڑا۔

مسلمانوں کی خدمت پر مامور ترجمانوں کے بارے میں ہم تک جو معلومات پہنچی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ یا تو اپنے ملکوں سے فرار ہونے والے لوگ تھے جو مسلمان ملک میں آباد ہوگئے تھے اور اسلام قبول کرلیا تھا یا پھر وہ ذمی تھے جو جزیہ ادا کرتے تھے۔ ان میں عیسائی اور یہودی دونوں شامل تھے۔ یہودی تازہ تازہ یورپ سے ترک سکونت کرکے آئے تھے اس لیے یورپی زبانوں اور وہاں کے حالات کے بارے میں ان کا علم زیادہ تھا۔

پیدائشی مسلمان کے ترجمان ہونے کا تذکرہ کہیں اتفاق سے ہی ملتا ہے۔ ایسے مسلمان اس وقت ترجمان بنتے تھے جب خوش قسمتی یا بدقسمتی سے انہیں ایسا موقع ملتا تھا۔ ایسا ہی ایک ترجمان عثمان آغا تھا جو عثمانی ہنگری کے مقام تیمسور کا رہنے والا تھا اور گھوڑ سوار فوج میں ملازم تھا۔ وہ جنگی قیدی کی حیثیت سے گیارہ سال آسٹریا میں رہا۔ اس لیے وہ جرمن زبان سے اچھی طرح

واقف ہو گیا۔ اس نے جو یادداشت لکھی ہے اس میں اس نے لکھا ہے کہ وہ سربیا اور ہنگری کی زبان بھی جانتا تھا جن کے اقتباس اس نے ترکوں والے عربی رسم الخط میں دیئے ہیں۔ آسٹریا کی قید سے فرار ہونے کے بعد وہ تیمسور کے پاشا کا ترجمان بن گیا اور اس نے وسطی یورپ کی سرحد پر ہیسبرگ اور عثمانی سلطنتوں کے درمیان ترجمانی کے فرائض ادا کیے۔(7)

سرحدی سفارت کاری کے علاوہ تجارت کے لیے بھی ترجمان رکھے جاتے تھے۔ طرابلس سے ملنے والے ایک ٹیکس رجسٹر میں ''ترجمان محصول'' کا حوالہ بھی ملتا ہے جسے ''ترجمانیہ'' کہا جاتا تھا۔ یہ عربی لفظ ہے جو ترجمان سے نکلا ہے۔ مغربی اصطلاح ڈریگومین (Dragoman) ان ترجمانوں کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ دراصل عربی کا یہ ترجمان ہی ہے جو ڈریگومین بن گیا ہے۔

سب سے اہم ترجمان وہ ہوتے تھے جو براہ راست مسلمان حکمراں کی خدمت پر مامور ہوتے تھے۔

مصر کے مملوک سلطانوں یا قرون وسطی کے دوسرے مسلم حکمرانوں کے ترجمانوں کے متعلق بہت ہی کم معلومات موجود ہیں لیکن ان کی موجودگی کی جو بھی شہادت ملتی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اکثر و بیشتر وہ یورپ سے فرار ہونے والے لوگ تھے۔ ایک دلچسپ واقعہ ایک ترجمان تغری بردی کا ہے جو پہلے ترجمان کی حیثیت سے کام کرتا رہا پھر وینس میں مملوک سلطان کا سفیر بن گیا۔ وہ 1506ء میں وہاں پہنچا۔ اس کا نام ترکی ہے جس کا مطلب ہے ''خدا کا دیا ہوا'' اس کی کنیت ابن عبداللہ تھی جو ان نومسلموں کی رکھی جاتی تھی جن کے باپ کا نام مسلم ناموں کی نسبت سے بہت ہی اجنبی ہوتا تھا۔

تغری بردی یقیناً یورپ نژاد تھا لیکن اس کے سابق مذہب کے بارے میں وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کیا تھا اور نہ معلوم ہو سکا کہ وہ کس قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ اس زمانے کے بعض مصنفین اسے عیسائی کہتے ہیں لیکن کچھ لوگ اسے سابق یہودی لکھتے ہیں۔ ایک عیسائی سیاح کا بیان ہے کہ پہلے وہ یہودی تھا' اس کے بعد وہ عیسائی ہوا پھر مسلمان ہو گیا۔ اٹلی کا ایک یہودی سیاح میشولم دا ولتیرا کہتا ہے کہ تغری برادی پیدائشی یہودی تھا لیکن وہ عیسائیوں میں عیسائی اور یہودیوں میں یہودی ہو جاتا تھا۔ اس بات پر بیشتر مورخوں کا اتفاق ہے کہ ''وہ ہسپانیہ میں پیدا ہوا تھا اگرچہ کچھ کہتے ہیں وہ سسلی کا تھا۔''

سلطنت عثمانیہ کا ایک ابتدائی ترجمان جس کے بارے میں ہم کچھ جانتے ہیں وہ ہنگری کا تھا اور اسلام قبول کرنے کے بعد اس کا نام مراد رکھا گیا تھا۔ 1526ء میں جنگ موہاک میں ترکوں نے اسے گرفتار کیا تو اس کی عمر سترہ برس تھی لیکن اس عمر میں ہی وہ بہت اچھی لاطینی جانتا تھا جس کی وجہ سے اس نے ترجمان کی حیثیت سے ترک ملازمت میں بہت ترقی کی۔ اپنے نئے مذہب پر اس نے ترکی زبان میں ایک تحقیقی رسالہ لکھا۔ بعد میں اسے لاطینی میں منتقل کیا۔ اور 1559-1560ء میں اس نے وینس کے افسر کی فرمائش پر سیسرو کی کتاب **De Senectute** کا ترکی میں ترجمہ کیا جسے سلطان سلیمان ذی شان کو پیش کیا گیا۔ ہم بعد میں اس کا ذکر اس وقت پڑھتے ہیں جب مسلسل شراب نوشی پر اسے باب عالی کے ترجمان کے عہدے سے برطرف کیا گیا۔ کوڑی کوڑی کا محتاج ہونے کی وجہ سے اس نے ایک یورپی آدمی سے معاوضہ لے کر عثمانی تاریخ کی بعض کتابوں کا لاطینی میں ترجمہ کیا۔

سلطنت عثمانیہ میں سرکاری ترجمان کا عہدہ روزمرہ کے سرکاری کاموں اور امور خارجہ کے لیے لازمی تصور کیا جاتا تھا۔ ترجمان چیف سیکرٹری یا رئیس الکتاب (جسے رئیس آفندی کہتے تھے) کے عملے میں شامل ہوتا تھا۔ رئیس آفندی بیرونی ملکوں کے ساتھ رابطوں کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ سولہویں صدی کے بعد ترجمانوں کے ناموں کی ایک پوری فہرست ہمیں ملتی ہے۔ شروع کے ترجمان سارے ہی نومسلم تھے جن میں زیادہ تعداد یورپ نژاد لوگوں کی تھی۔ ان میں پولینڈ' آسٹریا' ہنگری اور یونان کے رہنے والے شامل تھے۔ سترہویں صدی میں ترجمانوں کا محکمہ ترجمان اعلیٰ یا "ترجمان باشی" کے تحت باقاعدہ ایک ادارہ بن گیا۔ یہ ادارہ کافی عرصے تک استنبول کے نواح میں رہنے والے ایک یونانی خاندان کے قبضے میں رہا۔ یہ لوگ مسلمان نہیں ہوئے تھے لیکن اس عہدے کے باعث اور سلطان کی قربت کی وجہ سے سلطنت عثمانیہ کے نظام حکومت میں بہت بااثر ہو گئے تھے۔ اٹھارہویں صدی کے آخری برسوں میں عثمانی حکومت نے جب پہلی بار یورپی ملکوں میں باقاعدہ سفارت خانے قائم کیے تو ان ترجمانوں کی سرگرمیاں اور بھی بڑھ گئیں۔ ہر ترک سفیر کے لیے عملاً ایک یونانی نژاد ترک ترجمان ضرور ہوتا تھا۔ سفارت خانہ کا اکثر و بیشتر کام وہی کرتا تھا اور استنبول میں موجود "ترجمان باشی" کو رپورٹ دیتا تھا۔

دوسری مسلم ریاستیں اس معاملے میں کسی اصول کے تحت کام نہیں کرتی تھیں اور زیادہ تر غیر مسلموں پر انحصار کرتی تھیں حتیٰ کہ ان میں بہت سے ان کے اپنے باشندے بھی نہیں ہوتے

تھے۔ چنانچہ سترھویں صدی میں ہسپانیہ میں مراکش کے سفیر کو ایک شامی عیسائی سے یہ کام لینا پڑا جو ہسپانوی حکومت کی ملازمت میں تھا۔ انیسویں صدی جیسے جدید دور میں بھی یورپ میں ایک ایرانی سفیر کے ساتھ ایک عیسائی ترجمان تھا جو ایران کا آرمینیائی باشندہ تھا۔ یورپ کے ساتھ ایرانی سفیر کا واحد وسیلہ وہی تھا۔

یورپی ملکوں کا مفاد عملی طور پر صرف تجارت یا سفارتی امور تک محدود نہیں تھا۔ ان کا یہ مفاد صرف ایسے ترجمان پورے نہیں کر سکتے تھے جنہوں نے اس میدان میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ چنانچہ یورپ میں عربی زبان کی باقاعدہ تعلیم اور اس مقصد کے لیے ضروری وسائل حاصل کرنے کی کوشش بہت پہلے ہی شروع کر دی گئی تھی۔ لاطینی اور عربی کی پہلی فرہنگ بارہویں صدی میں تیار کر لی گئی تھی۔ تیرہویں صدی تک یورپ کے متعدد اسکالر عربی پڑھنے میں مصروف تھے۔ حتیٰ کہ لاطینی میں قرآن کا ترجمہ کرنے کی بھی کئی کوششیں کی جا چکی تھیں۔ اس کے بعد کئی فرہنگیں اور لغات چھاپی گئیں اور 1538ء میں عربی صرف ونحو پر پہلی کتاب شائع کی گئی۔

اس کے ساتھ ہی سولہویں صدی اور سترہویں صدی میں یورپ کی یونیورسٹیوں میں عربی ادب وفنون کے مطالعہ کی زبردست تحریک شروع ہوگئی۔ یہ زمانہ یورپ میں علمی وفکری فروغ کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں فارسی اور ترکی صرف ونحو اور لغات کی کتابیں بھی شائع ہو رہی تھیں اور ان زبانوں کے علم وفن پر تنقید بھی لکھی جا رہی تھی اور ان زبانوں کے مخطوطے بھی چھاپے جا رہے تھے۔ ان کا ایک مقصد تجارت اور سفارت کے میدان میں ان سے کام لینا تھا۔ لیکن ایک اور مقصد علمی اور فکری پیاس بجھانا بھی تھا جو نشاۃ ثانیہ اور احیائے علوم کی تحریک نے بھڑکائی تھی۔ اس سلسلے میں ولیم بیڈول (1561-1632ء) کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے جو پہلا ممتاز عربی داں تھا۔ عربی سیکھنے کی ضرورت کا ذکر کرتے ہوئے اس نے ایک مضمون میں لکھا۔ ''(عربی) خوش قسمت جزائر سے چینی سمندروں تک مذہب کی واحد زبان اور سفارت اور تجارت کی سب سے بڑی زبان ہے۔'' اس نے ادب اور سائنس کے لیے اس زبان کی اہمیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

تاہم یورپی یونیورسٹیوں میں عربی کے متعدد شعبے قائم ہو جانے اور عالمانہ کتابوں کی تعداد میں اضافہ ہو جانے کے باوجود ان اداروں سے فارغ التحصیل ہونے والے لوگ اور چھپنے والی کتابیں پھر بھی کم تھیں۔ مشرق وسطیٰ میں مغرب کی سفارتی ضرورت پوری کرنے کے لیے یہ کافی نہیں تھا۔ کافی عرصے مغربی طاقتیں اپنے سفارت خانوں میں مقامی عیسائیوں کو ترجمان کی

حیثیت سے بھرتی کرتی رہیں۔ اٹھارہویں صدی میں فرانسیسیوں نے نیا طریقہ اختیار کیا۔ وہ فرانس کے نوجوانوں کو اوائل عمر میں ہی منتخب کر لیتے اور انہیں متعلقہ زبانیں سیکھنے کی تربیت دیتے۔ ایک صدی سے زیادہ عرصے تک بحیرۂ روم کے مشرقی ساحلوں پر فرانسیسی ترجمانوں کی اسی طرح تعلیم و تربیت ہوتی رہی۔ اس طرح حکومت فرانس اس قابل ہوگئی کہ اس کے پاس ایسے افسروں کی تعداد کافی ہوگئی جو ایک طرف فرانسیسی زبان جانتے تھے اور دوسری طرف مشرق وسطی اور اس کی زبانوں کا علم بھی رکھتے تھے۔ انقلاب فرانس اور نپولین کی جنگوں کے دوران میں ان کا کردار نہایت اہم رہا۔

اس کے مقابلے میں اس وقت مسلمانوں کے اندر ایسا ذوق وشوق نہیں تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ بعض مسلمانوں، بالخصوص شمالی افریقہ کے مسلمانوں نے عام بول چال کی فرانسیسی، ہسپانوی یا اطالوی زبان سیکھ لی تھی لیکن یہ محض چھوٹے موٹے ضروری کاموں کے لیے تھی اور معاشرہ کی نچلی سطح پر ہی تھی اس کا ثقافتی اثر بالکل ہی نہیں تھا یا اگر تھا بھی تو بہت ہی کم۔ غیر ملکی زبان کے علم کو کوئی خاص وقعت حاصل نہیں تھی۔ اسے کوئی مہارت تسلیم نہیں کیا جاتا تھا بلکہ اس کے برعکس معاملہ تھا۔ غیر ملکی زبان کی مہارت سے کوئی بڑا عہدہ ملنے کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔ یہ مہارت غیر مسلموں کے لیے مخصوص تھی اور اس جیسے دوسرے پیشوں کی طرح اسے معاشرہ میں زیادہ عزت نہیں دی جاتی تھی۔ تاجروں کو غیر ملکی لوگوں کے ساتھ گفت وشنید کی ضرورت ہوتی تھی لیکن اس کے لیے وہ ترجمان رکھ سکتے تھے۔ یا پھر یہ کام غیر ملکی اور غیر مسلم لوگ خود ہی کر لیتے تھے۔ جہاز رانوں کو بھی دوسرے غیر ملکی جہاز رانوں کے ساتھ بات کرنا ہوتی تھی۔ لیکن اس کے لیے بحیرۂ روم کے سارے علاقوں میں ایک مشترک سی زبان بن گئی تھی۔ اس زبان کا نام ہی لنگوا فرانکا پڑ گیا تھا۔ اسے قریب قریب سب ہی سمجھ لیتے تھے۔ بہر حال عثمانی سلطنت اور اس کے ہمسایہ ملکوں کے جہاز رانوں نے ثقافتی اثرات کے لیے وسیلے کا کام نہیں کیا۔

ایسی کوئی شہادت بھی نہیں ملتی کہ مغربی زبانوں یا ان کے ادب سے مسلمانوں کو کوئی علمی اور فکری دلچسپی رہی ہو۔ اٹھارہویں صدی سے پہلے ہمیں ایسا کوئی مسلمان عالم یا دانشور نہیں ملتا جس نے مغربی زبانیں سیکھنے کی کوشش کی ہو۔ ان زبانوں کی گریمر، لغات یا زبان سیکھنے کے دوسرے طریقوں پر تحقیق کرنے اور مقالے لکھنے کی کوشش تو اور بھی کم تھی۔ تراجم شاذ و نادر ہی تھے۔ جو تراجم کیے گئے وہ روزمرہ کے ضروری کاموں سے متعلق ہی تھے اور وہ بھی نومسلموں یا غیر

مسلموں نے کیے تھے۔

صرف ایک عثمانی مسلمان مصنف ایسا ملتا ہے جسے ہمیشہ علم حاصل کرنے کی جستجو رہتی تھی اس کا نام تھا اولیا چلبی۔ اس نے یورپی زبانوں پر خاص توجہ دی تھی اور اپنے قارئین کے سامنے ان زبانوں کے چند نمونے بھی پیش کیے تھے۔ اپنے ویانا کے سفر کی تفصیل بیان کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے ''سلطنت آسٹریا کے باشندے دو زبانیں بولتے ہیں ایک ہنگرین اور دوسری جرمن''۔ ترکی میں جرمن زبان کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ اسے ترکی میں ''نیمچے'' کہتے تھے۔ اولیا لکھتا ہے ''نیمچے بہت مشکل زبان ہے اس میں فارسی کے بہت سے الفاظ ہیں۔'' اس عجیب وغریب انکشاف کی وجہ یہ تھی کہ اولیا کے خیال میں یہ لوگ ''مینوچہر کی اولاد کے ساتھ ایران سے یہاں آئے ہیں۔'' اولیا کو یہ شبہ اس لیے ہوا کہ اسے دونوں زبانوں کے بعض الفاظ میں صوتی مماثلت نظر آئی جیسے جرمن لفظ توختر (Tochter) اور فارسی کا دختر۔ جرمن برودر (Boruder) اور فارسی کا برادر۔ حالانکہ یہ مماثلت اس وجہ سے ہے کہ یہ دونوں زبانیں انڈو یورپین زبانوں کے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ اولیاء نے جرمن زبان کے چند نمونے بھی لکھے ہیں جن میں چند دعائیں ہیں جو عربی رسم الخط میں اس نے لکھی ہیں۔ اس کے علاوہ چند الفاظ کی فہرست ہے اور بعض محاورے ہیں۔ اولیاء لکھتا ہے کہ اگرچہ نیمچے کیتھولک ہیں اور پاپائے روم کے احکام کی پیروی کرتے ہیں لیکن ان کی زبان پاپائے روم کی زبان سے مختلف ہے جو ہسپانوی ہے (11) عثمانی مصنفوں کے ہاں عام طور پر آسٹریا اور آسٹریا کے باشندوں کو جو نیمچے نام دیا گیا تھا وہ سلاوی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے گونگے لوگ۔ اکثر سلاوی زبانوں میں جرمنی باشندوں کے لیے یہی لفظ استعمال کیا جاتا تھا۔ تاہم اولیا نے اس کی وجہ اور بتائی ہے۔ ہنگری زبان میں لفظ نیم (Nem) کا مطلب ہے ''میں نہیں ہوں'' چنانچہ نیمچے کے معنی ہیں۔ میں چیک نہیں ہوں' میں جرمن ہوں۔'' (12) اولیاء نے ایک اور زبان کے کچھ نمونے پیش کیے ہیں جسے وہ یہودی زبان کہتا ہے۔ یہ زبان اس نے سلطنت عثمانیہ کے زیر تسلط فلسطین میں مقامی یہودیوں سے سنی تھی۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ ہسپانوی زبان ہے۔ (13)

عام طور پر مسلم دنیا نے عیسائی دنیا کی زبانیں سیکھنا تو کجا ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی بھی بہت کم زحمت گوارا کی۔ اسی لیے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ یورپ میں جو اتنی بڑی تعداد میں زبانیں بولی جاتی تھیں انہوں نے مسلمانوں کو نہ صرف اُلجھن میں ڈالا بلکہ

انہیں پریشان بھی کر دیا تھا۔ اولیا سے چند برس پہلے اپنے زمانے کے سب سے عظیم ترک عالم کاتب چلپی نے یورپ کے لسانی نقشے کا یہ خاکہ اپنے قارئین کے سامنے پیش کیا۔ "پہلے زمانے میں یہ ملعون گروہ یونانی بولتا تھا جو قدیم زبان بھی تھی اور عالم فاضل لوگوں کی زبان ہونے کے ساتھ عام بول چال میں بھی رائج تھی۔ لیکن بعد میں یہ زبان بولنے والوں کی تعداد کم ہو گئی اور لاطینی زبان ظہور میں آئی۔ یہ زبان جس کا مآخذ یونانی تھا ترک زبان بن گئی۔ لیکن یہ لوگ بھی تعداد میں کم ہو گئے۔ یہ دونوں زبانیں یورپ کے علماء کی زبانیں رہیں اور بیشتر عالمانہ کتابیں ان میں ہی لکھی جاتی رہیں۔ بعد میں ہر علاقے کے لوگوں نے انہی مقامی زبان بولنا شروع کر دی۔ (اس بدقسمتی سے مسلمان دنیا محفوظ رہی) اور مختلف زبانوں کی بڑی تعداد عام استعمال میں آ گئی۔ چنانچہ انگلستان میں اب تین زبانیں ہیں' ہیبر یا (Hibrernia) اینگلیا' اور اسکوشیا'۔ ہسپانیہ اور پرتگال میں بھی بہت سی زبانیں ہیں اور فرانس میں بھی یہی حال ہے۔ مثال کے طور پر بحر اوقیانوس کے ساحل پر برطین بولی جاتی ہے لیکن اندرون ملک فرانسیسی زبان ہے۔ اسی طرح آسٹریا میں لوگ چیک' ہنگیر بن اور آسٹرین (نیمچے) زبان بولتے ہیں۔ کاتب چلپی لکھتا ہے کہ اسی طرح اور زبانیں بھی ہی جیسے ماسکوی اور ولندیزی۔ وسطی اٹلی میں لوگ سوئس اور اطالوی زبان بولتے ہیں جو اٹلی کے علاوہ ترکی کے یہودی بھی بولتے ہیں۔ اطالوی کو فرنگی زبان بھی کہتے ہیں۔ مشرقی یورپ میں لوگ سلاوی' البانوی' بوسنیاوی یونانی (رومی) بلغارین اور سرب زبانیں بھی بولتے ہیں۔ یہ تمام زبانیں نہ صرف ایک دوسرے سے مختلف ہیں بلکہ اپنے اندر بھی اختلاف رکھتی ہیں۔ چنانچہ بہترین اور صاف اطالوی زبان تساں کہلاتی ہے۔ وینس کی زبان کو برا سمجھا جاتا ہے۔ فرانس میں سب سے پاکیزہ زبان جو بولی جاتی ہے وہ فرانسیسی ہے۔ کاتب کہتا ہے کہ لاطینی آج بھی تعلیم و تعلم کی زبان ہے اور عیسائی دنیا میں اس کا ایک مقام ہے جیسے مسلمانوں میں عربی کا مقام ہے۔ ایسی ہی رائے سترہویں صدی کے ایک مراکشی سفیر نے بھی ظاہر کی تھی۔ اس نے ہسپانیہ کی تعلیم میں لاطینی زبان کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے اسے کلاسیکی عربی سے تشبیہ دی تھی۔ (14) یورپ کی زبانوں کے بارے میں کاتب چلپی جہاں بہت زیادہ تفصیل پیش کرتا ہے وہیں حیرت انگیز طور پر اپنی لاعلمی کا مظاہرہ بھی کرتا ہے۔ اس نے برطین اور باسک جیسی مقامی زبانوں کے بارے میں صرف سن رکھا تھا اسی لیے وہ ان کے اور فرانسیسی اور جرمن جیسی بڑی زبانوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتا۔ اولیا کے مقابلے میں اس کا علم زیادہ تھا وہ جانتا تھا کہ ترکی میں یہودی جو زبان بولتے

ہیں وہ یہودی زبان نہیں ہے بلکہ یورپی زبان ہے۔ وہ اسے ہسپانوی کے بجائے اطالوی کے قریب قرار دیتا ہے۔ البتہ لاطینی سے مشتق زبانوں (فرانسیسی، ہسپانوی، پرتگالی، اطالوی رومانین وغیرہ) کے بارے میں اس کا علم واضح نہیں ہے۔ ان وحشی اور غیر اہم زبانوں پر بات کرتے ہوئے اس کا لہجہ ایسا ہی ہے جیسے بعد کے زمانے میں یورپ والے تاریک براعظم (افریقہ) کی بول چال کے بارے میں اختیار کرتے تھے۔(15)

تاہم چند مسلمان ایسے بھی تھے جنھوں نے یورپی زبانیں سیکھنے کی زحمت گوارا کی اور سلطنت عثمانیہ کے آخری دور میں ان کی تعداد میں اضافہ بھی ہوا۔ اوائل اٹھارویں صدی میں پرنٹنگ پریس رائج ہونے اور عثمانی اور بعد میں دوسرے ملکوں کے فوجی تربیتی اداروں میں یورپی استادوں کی آمد نے نئے مواقع اور نیا شوق پیدا کیا۔

مسلمانوں نے کونسی زبانیں سیکھیں؟ اس کی غالباً سب سے پہلی شہادت صلیبی جنگوں کے ایک جرمن وقائع نگار لے بیک کے آرنلڈ کی تحریر سے ملتی ہے۔ اس نے ایک جرمن سفیر کا حوالہ دیا ہے جو 1175ء میں شام اور فلسطین ہو کر آیا تھا۔ پراسرار اساسین کا ذکر کرتے ہوئے اس نے بتایا کہ اساسین کا سردار نوعمر لڑکوں کو پکڑ لیتا ہے اور بچپن سے ہی ہولناک کاموں کے لیے ان کو تربیت دیتا ہے۔ دوسرے کاموں کے علاوہ وہ ''انہیں مختلف زبانیں سکھاتا ہے جیسے لاطینی، یونانی، رومن، سارسین وغیرہ (16) یہاں رومن سے مراد غالباً لاطینی زبانوں سے مشتق وہ زبانیں ہیں جو صلیبی فوجیوں میں بولی جاتی تھیں۔ نوجوانوں کو ہولناک کاموں کی تربیت دینے کی بات تو محض خیالی کہانی معلوم ہوتی ہے البتہ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں کونسی زبانوں کو کارآمد سمجھا جاتا تھا۔ عام طور پر قرون وسطی کے مسلمانوں میں جو غیر ملکی زبانیں بولنے کے اشارے ملتے ہیں وہ نومسلموں کی مادری زبانیں ہی تھیں۔

عثمانیوں کے زمانے تک ہمیں اس سے زیادہ کوئی ٹھوس شہادت نہیں ملتی۔ وینس کے ایک باشندے نے جو ترکی گیا تھا سلطان محمد دوئم فاتح قسطنطنیہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ترکی کے علاوہ یونانی اور اطالوی زبان بھی بولتا تھا۔ اس کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے ادب وفن کے اطالوی ماہرین کی بھی مہمانداری کی تھی۔ اس کے یونانی سوانح نگار نے اسے Philhellene (پیار کرنے والا، دوست دار، یونان کا خیر خواہ) کا خطاب دیا ہے۔ یہ مشکل ہی ہے کہ سلطان کسی غیر مسلم زبان کا علم رکھتا ہو لیکن ایسا ضرور ہے کہ اس زمانے میں عام عثمانیوں کے

اندر یونانی زبان کا استعمال عام تھا اور سلاوی زبانیں ان نومسلموں میں عام تھیں جو عثمانی حکومت کا حصہ تھے یا عثمانی فوج میں تھے۔ یونانی زبان میں ایسے فرمان بھی موجود ہیں جو سلطان فاتح کے دربار سے جاری کیے گئے اور جن میں سلطان نے اپنے آپ کو Megas Authentes یعنی آقائے والا تبار لکھا ہے۔(17) اطالوی لقب Ill Gran Signor اور ترکی لفظ آفندی غالباً اسی سے نکلے ہیں۔ اطالوی زبان کی مختلف قسمیں، جن میں عوامی زبان لنگوا فرانکا بھی شامل تھی جو وسطی اور مشرقی بحیرۂ روم کے علاقوں میں عام تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ترک جہازی جن میں بہت سے مقامی عیسائی بھی ہوں گے ان زبانوں سے واقف تھے۔(18)

سولھویں صدی تک ترک جہاز رانوں کی عام بول چال میں اطالوی زبان کے کافی الفاظ شامل ہو چکے تھے۔ ان میں سے کچھ براہ راست آئے تھے اور کچھ یونانی زبان کے واسطے سے۔ ان میں ایسے لفظ بھی تھے جیسے کپودان جو بحری کپتان کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ ترکی میں وہ کپودان پاشا بن گیا جو عثمانی بیڑے کا امیر البحر ہوتا تھا۔ بحیرۂ روم کے علاقہ کا ایک اور عام لفظ تھا۔ لوسترومو (Lostromo) یا نوسترومو (Noslromo) جو ہسپانوی یا پرتگالی سے نکلا تھا اور جہازی غلاموں کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ یہاں اس کے معنی تھے ہمارا آقا۔ پھر لفظ فورتونا جو ترکی میں طوفان کے لیے استعمال ہوا اور مانجیو (Mangio) جو ترکی جہازوں کی اصطلاح تھی جسے کھانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا یہ لفظ اطالوی سے آئے تھے۔ ان میں سے بیشتر الفاظ اطالوی کے لیے گئے تھے خاص طور پر وینس کی زبان سے' البتہ چند ہسپانوی سے یا شمال مشرقی ہسپانیہ سے یا پھر پرتگالی سے آئے تھے۔ عام بول چال کی ترکی زبان میں یہ جو مستعار الفاظ آئے ان کا تعلق زیادہ تر سمندر سے یا جہاز رانی اور ماہی گیری وغیرہ سے تھا۔ اس سے مغربی اثر کا اندازہ ہوتا ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ الفاظ مستعار لینے کا یہ سلسلہ اصل ترکی زبان میں نظر نہیں آتا حتیٰ کہ قدیم عربی اور فارسی میں بھی عملاً یہ اثر دکھائی نہیں دیتا۔ یہ اثر نسبتاً جدید دور میں آیا۔

ترکوں میں سب سے زیادہ جو یورپی زبان معروف تھی وہ تھی اطالوی۔ انیسویں صدی تک جن یورپی زبانوں سے ترکی میں الفاظ آئے وہ اکثر و بیشتر اطالوی ہی تھے۔ ان میں سیاسی' مشینی اور خیاطی کے الفاظ تھے جو لباسوں اوزار اور ان اداروں سے مختلف تھے جو ترکی نے یورپ کی تقلید میں قائم کیے تھے (19) ترکی اور یورپی فریقوں کے درمیان جو معاہدے لکھے جاتے تھے وہ اس وقت تک جب تک لاطینی یورپ کی قانونی اور سفارتی زبان تھی لاطینی میں ہی ہوتے تھے۔

چنانچہ 1699ء میں کارڈنو کا معاہدہ اور 1718ء میں پسارووٹز کا معاہدہ لاطینی میں بھی لکھا گیا اور ترکی میں بھی۔ تاہم اطالوی زبان اہمیت حاصل کرتی جارہی تھی اور اٹھارہویں صدی کے آخر میں کئے جانے والے معاہدے جیسے 1774ء میں کچک کینارکا کا معاہدہ' اطالوی زبان میں لکھے گئے۔

اٹھارویں صدی میں پہلی بار ہم ایک ترک سفارت کار کو فرانسیسی بولتے سنتے ہیں۔ یہ شخصیت تھی سعید آفندی کی جو اپنے والد کے ساتھ پیرس گیا تھا۔ اس کے والد 1721ء میں پیرس میں ترک سفیر تھے۔ سعید آفندی نے بعد میں خود بھی کئی ملکوں میں سفارتی ذمہ داری نبھائی۔ اس زمانے کا ایک ترک وقائع نگار کہتا ہے ''سعید نے لاطینی پڑھی تھی اور وہ یہ زبان جانتا تھا۔ تاہم یہ بات کسی طرح بھی قرین قیاس نہیں لگتی کہ اٹھارویں صدی کا ایک ترک افسر کافروں کی ایک مردہ زبان پڑھنے میں اپنا وقت ضائع کرے۔ اس دور کا ایک فرانسیسی مبصر لکھتا ہے کہ مذکورہ سفارت کار مقامی فرانسیسی کی طرح نہایت شاندار فرانسیسی بولتا تھا۔ اس لیے غالباً ترک وقائع نگار اس کی جانب اشارہ کر رہا ہوگا۔ یعنی لاطینی نہیں فرانسیسی۔ (20) اس زمانے تک بھی یورپ کی زبانوں کے بارے میں عثمانیوں کا علم خاصہ ناقص سا تھا۔

اٹھارویں صدی میں ترکی کی فوجی تربیت گاہوں میں فرانسیسی بولنے والوں کی ملازمت کے ساتھ فرانسیسی زبان کا اثر بڑھنا شروع ہوا۔ اس وقت اس زبان نے اپنی جگہ خوب بنالی جب اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع میں فرانس سلطنت عثمانیہ کے داخلی معاملات میں حصہ لینے لگا۔ آسٹریا اور روس کا اثر بڑھنے کے ساتھ ہی فرانسیسی زبان کا دخل زیادہ ہوا کیونکہ ترکی میں روس اور آسٹریا کے سفارت خانوں کی طرف سے خط و کتابت فرانسیسی میں ہوتی تھی۔ آسٹریا نے یہ کام انیسویں صدی میں شروع کیا۔ انیسویں صدی سے آگے ترکی میں جو الفاظ مستعار لیے گئے وہ اب اطالوی نہیں فرانسیسی تھے۔ سیناتو اور پارلامنتو جیسے الفاظ جو آج بھی ترکی میں ہیں وہ ابتدائی زمانے کے ہیں کیونکہ وہ اطالوی ہیں۔ ترکوں نے یورپ کے دور دراز علاقوں میں سینٹ اور پارلیمنٹ کی موجودگی کے بارے میں صرف سنا تھا کسی سینٹر سے ان کی ملاقات بہت بعد میں ہوئی۔ ترکی میں انہیں سیناتور کہا گیا۔ کبھی کبھی اطالوی لفظ کی جگہ فرانسیسی لفظ بھی استعمال کیا گیا۔ چنانچہ ترکی کی رومانی داستانوں میں ہیروئن روبادی کیمیرا **(Roba di Camera)** پہنتی ہے جو بعد میں **(Roba de Chamber)** بن گیا۔ انگریزی وہاں بہت بعد میں آئی۔ 1809ء میں قسطنطنیہ میں متعین برطانوی سفیر لارڈ کیننگ کے سامنے وضاحت پیش کرتا ہے کہ اس

نے ترکی کے ساتھ جو معاہدہ کیا ہے وہ فرانسیسی زبان میں کیوں تحریر کیا گیا ہے وہ لکھتا ہے ''اگر مذاکرات قسطنطنیہ میں ہوتے تب بھی میرے لیے کسی ایسے ترجمان کا حصول ممکن نہ ہوتا جو دربار عالی کا ملازم ہوتا اور انگریزی زبان پر اتنی قدرت بھی رکھتا کہ ان اہم دستاویز پر ترک سفارتی نمائندے کی طرف سے دستخط کرنے کی ذمہ داری قبول کر لیتا(21) یہ تو کھیلوں' ٹیکنالوجی اور ہوائی سفر کا فروغ اور سہولت ہے جس نے بعد میں انگریزی زبان کا اثر قائم کیا۔

ایسا ہی عمل شمالی افریقہ کے ملکوں میں بھی دیکھا جا سکتا ہے جہاں پہلے اطالوی اور ہسپانوی زبانیں عام تھیں لیکن بعد میں فرانسیسی نے ان کی جگہ لی۔ ایران اور ہندوستان میں اطالوی زبان کا اثر نہیں ہوا۔ پرتگالی کا تو کوئی بھی اثر نظر نہیں آتا۔ ایرانی اور ہندوستانی مسلمانوں میں مغرب کا اثر انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کے واسطے سے ہوا۔ اور یورپ کا یہی غالب اثر تھا۔ ایران میں فرانسیسی کا اثر امریکہ کے فارسی نام میں دیکھا جا سکتا ہے جو وہاں امریکہ کو **Etazuni** کہا جاتا ہے۔

مغربی طرز کے فوجی ٹریننگ سکول جو اصلاح پسند سلطانوں اور پاشاؤں نے قائم کیے اور سفارتی خدمات کے لیے اسی طرز پر نوجوانوں کی تربیت شروع کی تو مسلم معاشروں میں ایک نیا عنصر داخل ہوا۔ اس طرح نوجوان افسروں کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جو مغربی زبانوں بالخصوص فرانسیسی سے واقف تھا اور پیشہ ورانہ طور پر مغربی تہذیب کے بعض پہلوؤں کا مطالعہ کرنا چاہتا تھا۔ اس طبقہ کی تربیت اس انداز سے ہوئی تھی کہ وہ بہتر راستے تلاش کرنے کے لیے عیسائی ماہرین کو اپنا استاد مانتا اور ان کی رہنمائی حاصل کرتا۔ 1803ء میں جو ایک مضمون اسکووار میں لکھا گیا تھا اس میں درج ذیل الفاظ ایک نوجوان ترک انجینئر کی زبان سے ادا کرائے گئے ہیں:

> یورپی سائنس کے عجائبات کے بارے میں علم ہونے کے بعد میں نے ان سے رابطہ کرنے کا سوچا۔ ذرا سا بھی وقت ضائع کیے بغیر میں نے فرانسیسی زبان پڑھنے کا تہیہ کیا' جو ایک عالمی زبان ہے اور سائنس پر لکھنے والے مصنفین تک میری رہنمائی کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ یہ سوچ کر میں خوشی سے جھوم اٹھا کہ میری اپنی سرزمین میں وہ حالات پیدا ہو جائیں گے مجھے جن کی زبردست خواہش ہے (یہ سرزمین) سائنس اور فنون کی روشنی سے روز بروز منور ہوتی چلی جائے گی۔(22)

لیکن کافروں کی وحشیانہ زبانوں کے بارے میں جو حقارت کا رویہ تھا اسے ان زبانوں کے لیے عزت اور احترام میں تبدیل کرنے کا مرحلہ اتنا آسان نہیں تھا۔ حالانکہ اب یہ احساس عام ہو چکا تھا کہ یہ زبانیں ہی اعلیٰ ہنر اور اعلیٰ علم تک پہنچنے کا وسیلہ ہیں۔ انیسویں صدی کے ابتدائی برسوں تک عثمانی سلطنت اپنے یونانی ملازموں پر ہی انحصار کرتی تھی کہ وہ مغربی زبانیں جانتے تھے اور اسی لیے محدود پیمانے پر ہی سہی' مغرب میں پیش آنے والے واقعات کی اطلاع بھی انہی کے ذریعہ حاصل ہوتی تھی۔ اس وسیلے کی کمزوری اور اس کے خطرناک ہونے کا اس وقت احساس ہوا جب 1821ء میں ترکی اور یونان میں جنگ چھڑ گئی۔ چنانچہ یونانی نژاد ترجمان اعلیٰ کو اس لئے سولی پر چڑھا دیا گیا کہ اس پر غداری کا شبہ تھا اور خیال تھا کہ اس پر مزید اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے آغاز میں جو اصلاحات کی گئی تھیں اور انہوں نے مغربی زبانوں کے جو ترک ماہرین پیدا کیے تھے وہ اس وقت تک مر چکے تھے یا پھر روپوش ہو گئے تھے اور وہ زبانیں بھول بھال گئے تھے۔ اس زمانے کا ایک ترک مورخ لکھتا ہے کہ دربار عالیہ کے شعبہ ترجمہ میں دو تین ہفتے تک یونانی یا فرنگی زبان کے کاغذات کا انبار لگا رہا تھا۔ اس ہنگامی صورت حال سے نبٹنے کے لیے سلطان نے ایک دوسرے شعبے کا رخ کیا وہ تھا فوجی ٹریننگ کا اسکول۔ فوری حکم جاری کیا گیا اور یحییٰ آفندی کا جو اس وقت انجینئرنگ اسکول کا استاد تھا شعبہ ترجمہ میں تبادلہ کر دیا گیا۔ اس دور کا مورخ شانی زادے اس تبادلے کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس طرح ترجمانی اور ترجمہ کا شعبہ اور غیر ملکی امور پہلی بار مسلمانوں کے ہاتھ میں آئے۔ اسی اقدام نے غیر ملکی زبانوں کے علم اور ان کے استعمال کو مسلمانوں کے لیے ایک معزز پیشہ بنا دیا۔ یحییٰ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ نو مسلم تھا۔ اسے بلغاریہ کا باشندہ' یونانی یا یہودی نژاد کہا جاتا تھا۔ یحییٰ آفندی سے ترجمانوں اور سفیروں کی پوری ایک نسل چلی جنہوں نے انیسویں صدی کے ترکی میں نہایت اہم کارنامے انجام دیئے۔ 1823ء یا 1824ء میں یحییٰ کی موت کے بعد انجینئرنگ اسکول کے ایک اور استاد نے اس کی جگہ لی۔ یہ تھا خواجہ اسحٰق جو یہودی سے مسلمان ہوا تھا۔ وہ 1830ء تک اس عہدہ پر رہا اور پھر دوبارہ تعلیم کے شعبے میں چلا گیا۔ (24)

نئے مسلمانوں پر انحصار کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملے میں ابھی تک کافی مشکلات اور خاصی مزاحمت موجود تھی۔ 1838ء میں اصلاح پسند سلطان محمد دوئم نے نئے طبیہ اسکول کے افتتاح کے موقع پر طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے اس پر معذرت خواہانہ انداز اختیار کیا

کہ نصاب میں فرانسیسی زبان شامل ہے:

''آپ طب فرانسیسی زبان میں پڑھیں گے...... آپ کو فرانسیسی زبان پڑھانے سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ آپ فرانسیسی زبان سیکھیں بلکہ اس کا مقصد فن طب پڑھانا ہے اور اسے آہستہ آہستہ اپنی زبان میں منتقل کرنا ہے...... اس لئے محنت سے کام کرو اور اپنے استادوں سے طب کا علم حاصل کرو اور بتدریج اسے ترکی زبان میں منتقل کرو اور اسے ہماری زبان میں عام کرو...... (25)

اپنے اس بیان میں سلطان نے مغربی طرز اختیار کرنے اور پھر اسے عمل میں لانے کے راستے میں پیش آنے والے اصل مسائل کی طرف اشارہ کیا ہے۔ 1838ء تک جس سال سلطان نے طلبہ سے یہ خطاب کیا' ایسے ترکوں کی تعداد بہت ہی کم تھی جو واقعی مغربی زبانوں کا صحیح علم رکھتے تھے۔ مکتبوں میں جو تعلیم دی جاتی تھی حتیٰ کہ فوج میں فنی ماہروں کی طرف سے جو تربیت دی جاتی تھی وہ ترجے کی وساطت سے ہی ہوتی تھی۔ ان میں بیشتر مترجم مقامی عیسائی تھے۔ ان کی موجودگی سے مغربی تعلیم کی راہ میں رکاوٹ دور ہونے کے بجائے اور بھی بڑھ رہی تھی یہ خاصی افسوسناک بات تھی کہ مکتبوں اور فوجی تربیت گاہوں میں فرنگی استاد تعلیم دیں۔ اور یہ تو اس سے بھی زیادہ بری بات تھی کہ یہ تعلیم اور یہ تربیت یونانی یا آرمینیائی ترجمانوں کی وساطت سے ہو جن کی موجودگی اور جن کا لہجہ ترکوں کے لیے ناپسندیدہ تھا۔

بہرحال مسلم طلبہ کے لیے غیر ملکی زبانیں سیکھنا کئی وجوہ سے ضروری تھا۔ اس کا مقصد واقعی یہ تھا کہ کارآمد علم حاصل کیا جائے۔ جیسے طبی وفنی تعلیم اور سائنس اور فوجی علوم۔

لیکن کارآمد علوم اور غیر کارآمد علوم کے درمیان دیوار کھڑی کرنا مشکل تھا کیونکہ زیر تربیت فوجی نوجوان اور بعد میں عام طلبہ بھی' جو فرانسیسی زبان پڑھتے تھے وہ فرانسیسی اور دیگر یورپی استادوں کو اپنا معلم تسلیم کرتے تھے۔ انیسویں صدی کے وسط تک ان ترک نوجوانوں کے لیے یورپی زبان جاننا ضروری ہو چکا تھا جو سرکاری ملازمت میں ترقی کرنا چاہتے تھے یا فوج میں جانا چاہتے تھے۔

❁......❁......❁

ذرائع ابلاغ اور واسطے

مسلمان یورپ والوں کے بہت ہی قریبی ہمسائے تھے۔ ان کے ساتھ اور بحیرۂ روم کے طاس میں حصہ دار تھے۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ یہ طاس انہیں جدا کرتا تھا۔ قدیم اسلامی سرزمین کافی عرصے سلطنت روما کا حصہ رہ چکی تھی اور یورپ کی طرح یونان و روما اور یہودی و عیسائی ماضی کے ورثہ سے وہ اچھی طرح واقف تھی۔ ثقافتی' نسلی اور حتی کے مذہبی طور پر بھی یہ مسلمان یورپ کی عیسائی دنیا سے زیادہ قریب تھے بہ نسبت ایشیاء اور افریقہ کی دور افتادہ تہذیبوں کے۔ ان سے توقع بھی یہی کی جاتی تھی کہ یورپ کے بارے میں وہ زیادہ جانتے ہوں گے۔ لیکن اصل میں اسلام اور عیسائی دنیا کے درمیان قرون وسطےٰ کی آہنی دیوار نے ان دنوں کے درمیان ثقافتی رسل و رسائل کو بڑی حد تک محدود کر دیا تھا حتی کہ تجارتی اور سفارتی رابطے بھی بہت ہی کم تھے۔ مسلم دنیا کے اپنے ہی اندرونی بری اور بحری مواصلاتی وسیلے تھے۔ اس لیے وہ مذہبی واسطوں کے محتاج نہیں تھے۔ مسلم تہذیب اپنی برتری پر نازاں تھی اور پر اعتماد بھی تھی۔ اس لیے وہ سرد اور خستہ حال شمالی علاقوں کے وحشی کافروں کی تحقیر کرنے کی متحمل ہو سکتی تھی۔ قرون وسطیٰ کے کسی مسلمان کے لیے جو بحیرۂ روم کے نواح میں رہتا تھا یورپ کے باشندے' کم سے کم شمال اور مغرب کے باشندے خاص طور پر بہت ہی دور رہنے والے اور بہت ہی پر اسرار لوگ تھے بہ نسبت ہندوستانیوں' چینیوں حتی کہ استوائی افریقہ کے لوگوں کے۔

یوں تو مسلمانوں کا کافروں کی سرزمین کا سفر اختیار کرنا پسند نہیں کیا جاتا تھا لیکن بعض موقع پر ایسی آمد و رفت ضروری بھی ہو جاتی تھی۔ دسویں صدی کا مسلم جغرافیہ دان جب روم کا تذکرہ کرتا تھا تو نام لیے بغیر چند سیاحوں کے حوالے دیتا تھا جنہیں وہ کبھی یہودی اور کبھی عیسائی پادری کہتا تھا۔ یا پھر ایسے ہی کسی سوداگر کا حوالہ ہوتا تھا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ یہی تین طبقے ایسے

تھے جو عیسائی اور مسلم علاقوں کے درمیان آتے جاتے رہتے تھے۔(2) عیسائی اور یہودی زائرین بیت المقدس جاتے تھے اور عیسائی پادری مشرق سے روم کی طرف سفر کرتے تھے۔ رومن کیتھولک کلیسا اور مشرق کے متعدد یونانی کلیساؤں کے درمیان قریبی تعلقات قائم ہو جانے کے بعد روم جانے والے مشرقی عیسائیوں کی تعداد میں اور اضافہ ہو گیا۔ کچھ ایسے بے خوف مسلمان بھی تھے جو تاریک ترین یورپ جانے کی جرأت کر لیتے تھے۔ بعض اوقات یہ سفر غیر ارادی طور پر ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں ابتدائی زمانے کے جو تذکرے ملتے ہیں ان میں سب سے دلچسپ نویں صدی کے ایک جنگی قیدی کا تذکرہ ہے جس کا نام تھا ہارون بن یحیٰی۔ وہ مشرق میں گرفتار ہوا تھا اور اسے کانسٹینٹی نوپل لے جایا گیا تھا۔ جہاں وہ کچھ عرصے رہا اور اسے خشکی کے راستے روم بھیج دیا گیا(3)

عثمانی دور میں ایسے جنگی قیدی خاصی تعداد میں تھے اور ان کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھا بھی گیا۔ عثمانیوں اور جنوب مشرقی اور وسطی یورپ میں ان کے دشمنوں کے درمیان اور بحیرۂ روم کے علاقے میں شمالی افریقہ کے بربر مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان صدیوں جاری رہنے والی جنگوں میں دونوں جانب سے عیسائی اور مسلمان جنگی قیدی بنائے گئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان قیدیوں کو چھڑانے کے لیے مسلمانوں کے وفود وقتاً فوقتاً اسپین اور دوسرے ملکوں کو جاتے تھے۔ تاہم جو عیسائی قیدی ترکی یا شمالی افریقہ سے اپنے وطن واپس آئے انہوں نے کافی تعداد میں ایسی داستانیں رقم کیں جن میں اپنے تجربات بیان کیے اور ان لوگوں کے بارے میں بھی لکھا جن کے درمیان انہوں نے وہ زمانہ گزارا۔ لیکن یورپ سے واپس آنے والے مسلمان قیدیوں نے عملاً کوئی ایسا ریکارڈ نہیں چھوڑا۔ محض دو واقعات ایسے سامنے آئے ہیں جب مسلمان قیدیوں نے اپنی قید کے بارے میں کچھ لکھا۔ یہ واقعے اٹھارویں صدی کے آخری دور میں سامنے آئے۔ ایک ترک قاضی تھا جسے 1597ء میں سینٹ جیمز کے سورماؤں نے گرفتار کر لیا تھا۔ قاضی اپنے فرائض کے سلسلے میں قبرص جا رہا تھا۔ اسے دو سال مالٹا میں قید رکھا گیا۔ اس نے اپنی قید کی جو سرگزشت لکھی ہے وہ ایک نادر مسودہ کے طور پر شائع کی گئی۔(4) دوسرا شخص تھا عثمان آغا جو جنگی قیدی بنا اور بعد میں سلطنت عثمانیہ میں ترجمان بن گیا۔ عثمان آغا دو سوانحی کتابوں کا مصنف ہے جن میں اس نے اپنی قید اور بعد میں ترجمان کی حیثیت سے اپنے پیشے کی کہانی بیان کی ہے۔ یہ کتابیں 1724 اور 1725ء میں لکھی گئیں۔ یہ کتابیں دلچسپ بھی ہیں اور معلوماتی بھی لیکن اس کے معاصرین نے انہیں زیادہ اہمیت نہیں دی۔ عثمانی دور کے مصنف ان کا ذکر تک نہیں کرتے حتیٰ کے

کتابیات یا کتابوں کی فہرست میں بھی ان کا ذکر نہیں آتا۔ یہ دونوں کتابیں نایاب مخطوطوں کی شکل میں محفوظ ہیں۔ ایک لندن میں ہے اور دوسری ویانا میں۔ عملاً اس وقت تک ان سے کوئی واقف نہیں تھا جب تک جدید محققین نے انہیں دریافت نہیں کیا(5) اس لیے ایسا لگتا ہے کہ واپس آنے والے جنگی قیدیوں کی لائی ہوئی اطلاع نئی معلومات کا ذریعہ نہیں بنتی تھی۔

غالباً اس قسم کے مسافروں کے سب سے اہم گروہ تاجر اور سفارت کار رہتے تھے۔ یہ دونوں گروہ زیادہ تفصیل کے مستحق ہیں۔ اپنے ابتدائی تشکیلی دور میں مسلمان عیسائی یورپ کا سفر کرنے میں۔ بہت ہی ہچکچاہٹ محسوس کرتے تھے۔ یہ شاید ان کے قانون اور روایات کا تقاضہ بھی تھا۔ اس کے برعکس ایشیا اور افریقہ کے غیر مسلم ملکوں کے بارے میں ان کا رویہ بالکل مختلف تھا حالانکہ اصولی طور پر وہ بھی دارالحرب ہی تھے' لیکن وہاں جانے پر ایسی پابندی نہیں تھی۔ ان ملکوں کا مسلمانوں نے خوب سفر کیا حتی کے کچھ ملکوں میں وہ رہنے بھی لگے۔ اس کی وجہ تلاش کرنا مشکل نہیں ہے۔ ایک ظاہری فرق تو یہ تھا کہ ہندوستان اور افریقہ کے مقابلے میں مغربی یورپ سے مسلمانوں کو کچھ بھی حاصل نہیں ہوسکتا تھا۔ وہاں دوسری بھی کوئی کشش نہیں آئی۔ ہندوستان' جنوب مشرقی ایشیا اور چین سے مسلم دنیا کئی قسم کی چیزیں درآمد کررہی تھی۔ جیسے ریشمی اور سوتی کپڑا' گرم مسالے' خوشبوئیں' عمارتی لکڑی' دھاتیں اور چینی کے برتن وغیرہ۔ افریقہ سے دو نہایت اہم چیزیں درآمد کی جاتی تھی ایک سونا اور دوسرے غلام۔ اس طرح دور دراز علاقوں تک یہ کاروبار پھیلا ہوا تھا۔ بازنطینی سلطنت کے ساتھ محدود پیمانے پر تجارت ہوتی تھی۔ البتہ مشرقی اور شمالی یورپ سے کچھ عرصے کے لیے پوستین' عنبر اور مچھلی وغیرہ منگائی جاتی تھیں۔ یورپ سے منگائی جانے والی اشیا میں غلام بھی شامل تھے لیکن وہ زیادہ تر وسطی اور مشرقی یورپ سے آتے تھے اور ایشیا اور افریقہ کے مقابلے میں ان کی تعداد بہت ہی کم تھی۔ بہرحال حقیقت یہ ہے کہ مغربی یورپ کے پاس اپنے لوگوں کے سوا فروخت کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ قرون وسطے کی مسلم دستاویزوں میں کہیں کہیں چند چیزوں کا ذکر ملتا ہے۔ وہ بھی چھوٹی چھوٹی چیزوں کا۔ مغربی یورپ کی اہم اشیاء میں ہتھیاروں اور غلاموں کے علاوہ انگلستانی اون بھی تھی۔ ورنہ قرون وسطے کے خاتمے اور جدید دور کے آغاز تک جب تک مغربی یورپ نے نوآبادیوں پر قبضہ نہیں کیا تھا اور برآمد کے لیے بہت سی مصنوعات تیار کرنا شروع نہیں کی تھیں اس وقت تک اس کے پاس مسلمانوں کو دینے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔

دوسری وجہ جو مسلمانوں کے لیے یورپ کا سفر اختیار کرنے کی راہ میں رکاوٹ تھی وہ یورپ کے حکمرانوں اور اس کے عوام کی کٹر ناروا داری اور ان میں برداشت کی کمی تھی۔ انہوں نے جس علاقے کو بھی فتح کیا خواہ وہ بت پرستوں کا علاقہ تھا یا مسلمانوں سے دوبارہ واپس لیا ہوا علاقہ وہاں زبردستی عیسائی مذہب نافذ کرنے کی کوشش کی اور جلد ہی مسلمانوں کو مجبور ہونا پڑا کہ وہ عیسائی ہو جائیں، ملک چھوڑ دیں یا پھر موت قبول کر لیں۔ عیسائیوں نے یہودیوں کے ساتھ جو ہولناک سلوک کیا تھا اس کے بعد کسی غیر عیسائی نے ان ملکوں میں آباد ہونے کی جرأت نہیں کی۔ چنانچہ عیسائی یورپ میں آپ کو کوئی مسلمان آبادی نظر نہیں آتی۔ اس لیے عیسائی ملکوں میں مسلمانوں کا رہنا بہت ہی مشکل تھا کیونکہ انہیں مسجد تو دور کی بات ہے غسل خانے اور حلال خوراک تک نہیں ملتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ اپنے انداز کی زندگی بھی وہاں نہیں گزار سکتے تھے۔

ان علاقوں میں مسلمانوں کو جن دہشت ناک حالات کا سامنا کرنا پڑتا تھا ان کی صحیح تصویر بارہویں صدی کے ایک شامی مسلمان اسامہ ابن منقض نے اپنی سرگزشت میں کھینچی ہے۔ شام میں اس کا پڑوسی ایک فرنگی سورما یا نائٹ تھا جس کے ساتھ اس نے دوستی کا رشتہ پیدا کر لیا تھا۔ وہ سورما جب یورپ واپس جانے لگا تو اس نے (نیک نیت کے ساتھ) اسامہ سے کہا کہ وہ اپنے چودہ سال کے بیٹے کو اس کے ساتھ بھیج دے۔ وہ وہاں عیسائی سورماؤں کے ساتھ رہے گا اور ان سے بہادری اور دانش مندی کی باتیں سیکھے گا۔ فرنگی کے لیے یہ بات دوستی اور خیر سگالی کے جذبہ کا اظہار تھا۔ لیکن اسامہ کے لیے یہ نہایت ہی خطرناک اور بیہودہ بات تھی۔ ''ان الفاظ سے میرے کانوں پر چوٹ سی لگی۔ بھلا کسی عقل مند کی زبان سے ایسی بات کیسے نکل سکتی ہے؟ میرے بیٹے کے لیے اس سے زیادہ بدقسمتی کی بات اور کیا ہوگی کہ وہ فرنگی سرزمین پر چلا جائے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ وہ جنگی قیدی بن جائے''۔ اسامہ نے اپنے دوست کے دماغ سے یہ بات نکالنے کا ایک بہت ہی شائستہ طریقہ اختیار کیا۔ ''میں نے اس سے کہا۔ تمہاری جان کی قسم میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ لیکن جو چیز مجھے (تمہاری دعوت قبول کرنے سے) روک رہی ہے وہ یہ ہے کہ اس کی دادی اس سے بہت محبت کرتی ہیں حتیٰ کہ میرے ساتھ بھی وہ کہیں جاتا ہے تو وہ مجھ سے قسم لیتی ہیں کہ میں اسے جلد ہی ان کے پاس واپس لے آؤں گا۔ عیسائی نے سوال کیا ''تمہاری والدہ حیات ہیں؟''۔

میں نے کہا ''جی'' اس نے کہا ''پھر تم ان کی نافرمانی نہ کرو'' (5)

ان حالات میں یہ بات حیرت انگیز نہیں ہے کہ اگر تجارتی یا سفارتی مقاصد کے لیے یورپ کے سفر کی ضرورت پیش آتی تھی تو مسلمان حکمراں اپنے کسی عیسائی یا یہودی ملازم کو وہاں بھیجتے تھے جو وہاں اپنے ہم مذہب لوگوں کی برادری سے رابطہ کرتا تھا اور اس طرح اپنا سفر آسان بنا کر اپنا کام پورا کرتا تھا۔ یہی وہ عوامل تھے جن کی بنا پر عیسائیوں اور یہودیوں کے لیے یورپ سے مسلمان ملکوں میں آنا جانا آسان ہو گیا تھا۔

فرنگی دستاویزوں میں ایک مشہور دستاویز ملتی ہے کہ کس طرح 797 اور 807 میں شارلمین اور ہارون الرشید کی حکومتوں کے درمیان سفارت کاروں کا تبادلہ ہوا۔ ان دستاویزوں کے مطابق شارلمین نے 797 اور 802 میں دو سفارتی وفد ہارون الرشید کے دربار میں بھیجے اور ہارون الرشید نے دو وفد 801 اور 807 میں شارلیمین کے دربار بھیجے۔ اسکے علاوہ کہا جاتا ہے کہ فرنگی بادشاہ نے ایک یا دو وفد 799 ہیں بیت المقدس کے بشپ کے پاس بھیجے تھے۔ اور غالباً 802 میں بھی ایک وفد بھیجا تھا اور اس کے جواب میں بشپ کی طرف سے 799 اور 807 میں چار وفد آئے تھے۔ (7)

لیکن اس بارے میں شک وشبہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ ایسے وفود گئے بھی تھے یا نہیں۔ اگر گئے تھے تو وہ اتنے غیر اہم ہوں گے کہ عرب وقائع نگاروں نے ان کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں دی۔ ان کے ہاں اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ البتہ وہ بہت بعد کی ایک سفارت کا ذکر ضرور کرتے ہیں۔ یہ سفارت فرنگی ملکہ برتھا کی طرف سے 906 میں بغداد میں خلیفہ المکتفی کے دربار میں آئی تھی۔ عرب وقائع نگار نے اس کا تذکرہ اس طرح کیا ہے۔

> برتھا نیت لوتھر ملکہ فرنجا اور اس کے باج گزاروں نے علی خواجہ سرا کے ہاتھ 293 ہجری (مطابق 906) میں تحائف بھیجے۔ علی خواجہ سرا زیادۃ اللہ ابن اغلب کے خواجہ سراؤں میں سے تھا (تحائف میں) یہ چیزیں شامل تھیں۔
>
> پچاس تلواریں، پچاس ڈھالیں اور پچاس فرنگی نیزے، طلائی دھاگوں سے بنے ہوئے بیس لباس، بیس سلاوی خواجہ سرا، اور بیس سلاوی لڑکیاں، خوبصورت اور دل نواز، دس کتے اتنے بڑے کہ جنگی درندے یا کوئی اور جانور ان پر قابو نہیں پا سکتا، سات عقاب اور سات شکرے، ایک ریشمی خیمہ۔ تمام ضروری لوازمات

کے ساتھ بیس اونی لباس' اور ایسے موتی جو اس سیپی سے نکالے جاتے ہیں جو ان علاقوں کے سمندر کی تہہ سے نکلتی ہے اور جو قوس قزح کی طرح رنگ بدلتی ہے' ان پر ہر گھنٹے رنگ بدلتا ہے' تین پرندے جو فرنگی ملکوں میں پائے جاتے ہیں' یہ ایسے پرندے ہیں جو زہریلی غذا کو دیکھ کر چیخنے لگتے ہیں اور اس وقت تک اپنے پر پھڑپھڑاتے ہیں جب تک یہ حقیقت سب جان نہ جائیں کہ یہ غذا زہریلی ہے' اور ایسے منکے جو تیر اور نیزے کی نوک جسم سے کسی تکلیف کے بغیر نکال لیں خواہ وہ گوشت کے اندر ہی کیوں نہ گھس گئے ہوں۔

خواجہ سرا علی تحائف لایا۔ ان کے ساتھ فرنجا کی ملکہ کا ایک خط بھی تھا جو مکتفی باللہ کے نام تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور پیغام بھی تھا جو خط میں درج نہیں تھا کہ کہیں خلیفہ کے سوا کسی اور کو اس کا علم ہو جائے...... یہ پیغام شادی اور دوستی کی درخواست تھی......(8)

اس سفارت کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ نہ شادی ہوئی نہ دوستی۔ مسلمانوں کی جانب سے سب سے پہلی جو سفارتی اطلاع ملتی ہے وہ اس سفارت کی ہے جو ہسپانیہ سے شمال بعید بھیجی گئی تھی۔ یہ نویں صدی کے آغاز کا واقعہ ہے جب وائکنگ اندلس اور مشرقی یورپ کے دوسرے ملکوں پر حملے کر رہے تھے اور جگہ جگہ تباہی مچا رہے تھے۔ ایک موقع پر صلح نامہ ہو گیا اور وائکنگ کے سفارتی نمائندے قرطبہ کے امیر عبدالرحمٰن ثانی کے پاس آئے اور اس کے جواب میں ایک مسلم سفارت بھیجی گئی۔ سفارت کار تھا کوئی یحییٰ ابن الحکم البکری۔ اس کی خوبصورتی کی وجہ سے اسے الغزال کہا جاتا تھا۔ اس نے اپنی داستان اپنے دوست تمام ابن علقمہ کو سنائی۔ یہ روایت نقل کی ہے تیرہویں صدی کے وقائع نگار ابن ضیا نے۔ یہ سفارت 845 میں بھیجی گئی ہوگی اور وہ گئی ہوگی آئرلینڈ یا ڈنمارک کے وائکنگ دربار میں۔ جدید مورخین اس اطلاع کی صحت پر شک کرتے ہیں کہ ایسا واقعی ہوا بھی تھا یا یہ محض خیال آرائی ہے۔

الغزال نے اس سفارت کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے ہمیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ جن لوگوں سے ملا وہ کیسے تھے۔ تاہم وہ وائکنگ کے دربار کے بارے میں ضرور بتاتا ہے جہاں وہ گیا تھا۔ وہ بڑی تفصیل کے ساتھ یہ بتانے کی کوشش کرتا ہے کہ اس نے وہاں اپنی عزت اور اسلام کی حرمت کس طرح محفوظ رکھی۔

دو روز کے بعد بادشاہ نے اسے دربار میں طلب کیا۔ الغزال نے تہیہ کیا تھا کہ وہ بادشاہ کے سامنے دوزانو نہیں ہوگا۔ اور وہ اور اس کے رفقا ایسا کوئی کام نہیں کریں گے جو ان کی روایات کے مطابق نہ ہو۔ بادشاہ نے بھی اس سے اتفاق کیا۔ لیکن جب وہ بادشاہ کے پاس گئے تو وہ سامنے شاہانہ جاہ وجلال کے ساتھ لباس فاخرہ پہنے بیٹھا تھا۔ اس نے انہیں ایسے دروازے سے اندر آنے کی دعوت دی جو اتنا نیچا تھا کہ گھٹنوں کے بل چلے بغیر اندر جایا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ الغزال نے یہ دیکھا تو وہ زمین پر بیٹھ گیا' اپنے دونوں پاؤں آگے پھیلائے اور اپنے کولہوں پر گھسٹتا ہوا آگے بڑھا۔ اور جب وہ دروازے سے نکل گیا تو کھڑا ہو گیا۔ بادشاہ نہایت تزک و احتشام کے ساتھ ہتھیاروں سے لیس اس کا استقبال کرنے کے لیے تیار تھا۔ لیکن الغزال اس سے مرعوب نہیں ہوا۔ وہ بادشاہ کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا اور بولا "آپ پر سلامتی ہو اے بادشاہ اور سلامتی ہو ان پر جو اس ایوان میں موجود ہیں۔ آپ اقتدار کی مسرت و شادمانی سے کبھی محروم نہ ہوں' آپ کی عمر دراز ہو اور آپ کو وہ عزت و وقار نصیب ہو جو اس دنیا اور دوسری دنیا میں آپ کو سرخرو کرے۔" ترجمان نے الغزال کے یہ الفاظ بادشاہ کے گوش گزار کیے اور بادشاہ خوش ہوا۔ اس نے کہا "یہ اپنے ملک کے دانش منداور ذہین و فطین لوگوں میں سے ہے" وہ الغزال کے زمین پر بیٹھنے اور گھسٹتے ہوئے اندر داخل ہونے پر حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ اس نے کہا "ہم نے اس کی اہانت کرنے کی کوشش کی اور اس نے اپنے جوتوں کے تلووں سے ہمیں سلام کیا (یہ دکھانے کے لیے کہ یہ اہانت آمیز عمل ہے) اگر یہ سفیر نہ ہوتا تو ہم اس سے ناخوش ہوتے۔"

یہ تحریر اس طرح کے اور واقعات کی یاد تازہ کرتی ہے جو مشرق کے وحشی علاقوں میں جانے والے یورپی سفارت کاروں نے بیان کیے ہیں۔ الغزال کی سفارت کے مورخ نے مزید لکھا۔ سفیر کا جب ان کے عالموں کے ساتھ آمنا سامنا ہوا اور ان کے ساتھ بحث مباحثہ ہوا تو اس نے ان سب کو خاموش کرا دیا۔ ان کے بڑے بڑے علماء و فضلا کے سامنے وہ ڈٹ کر کھڑا ہو گیا اور ان پر بازی لے گیا۔"

وائکنگ لوگوں کے درمیان الغزال کو پیش آنے واقعات کے بارے میں سرسری اور خلاف عقل باتوں کے بعد الغزال کا واضح مقصد بیان کیا گیا ہے' یعنی وائکنگ ملکہ کے ساتھ عشق بازی۔

الغزال کی سفارت' اگر وہ واقعی پیش آئی تھی' ہسپانیہ میں مسلمان اور عیسائی ملکوں کے درمیان بھیجی جانے والی سفارتوں میں سے ایک تھی۔ ان سفارتوں کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے سوائے چند وقائع نگاروں کے جنہوں نے اتفاق سے ہی ان کا ذکر کیا ہے۔ قرون وسطی کی صرف ایک سفارت ایسی تھی جس کا ذکر تفصیل کے ساتھ دستاویزوں میں ملتا ہے۔ وہ سفارت قرطبہ کے خلیفہ کی جانب سے دسویں صدی کے وسط میں روما کے مقدس شہنشاہ کے دربار میں بھیجی گئی تھی۔ مسلمان قزاقوں کے ایک گروہ نے الپائن کے دروں میں ڈیرے ڈال لیے تھے اور وہ اٹلی سے آنے جانے والے لوگوں پر حملے کرتے تھے۔ اس سے زبردست مشکلات پیدا ہو رہی تھیں 953 میں شہنشاہ اوٹو نے ایک سفارت قرطبہ بھیجی اور خلیفہ سے درخواست کی کہ ان لوگوں کو واپس بلا لیا جائے۔ کہا جاتا ہے کہ اس سلسلے میں کئی سال مذاکرات ہوتے رہے۔ پھر نامعلوم وجوہ کی بنا پر خلیفہ نے ایک سفارت جرمنی بھیجی۔

اس سفارت کا ایک رکن ایک شخص ابراہیم ابن یعقوب الاسرائیلی الطرطوشی یا ابراہیم ابن جیکب تھا جو کیٹالونیا کے ساحل پر بارسلونا کے نزدیک ایک قصبے کا رہنے والا تھا۔ (10) یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ سفیر تھا یا محض سفارت کا ایک رکن یہ بھی نہیں معلوم کہ اس کا پیشہ کیا تھا۔ ایک داخلی شہادت ایسی ملتی ہے کہ وہ طبیب تھا۔ اس نے فرانس' ہالینڈ اور شمالی جرمنی کا سفر کیا تھا اور بوہیمیا اور پولینڈ بھی گیا تھا اور غالباً شمالی اٹلی کی سیر بھی کی تھی۔ خیال ہے کہ اس نے اپنے اس سفر کی روداد لکھی تھی جو بدقسمتی سے کھو گئی۔ البتہ گیارہویں صدی کے دو عرب جغرافیہ دانوں نے اس کے طویل اقتباسات اپنی کتابوں میں نقل کئے ہیں۔ یہ جغرافیہ داں ہیں بکری اور عذری۔ بکری نے ان علاقوں کے سلاوی باشندوں کی تاریخ مرتب کی ہے جو آج چیکوسلاوکیہ اور مشرقی جرمنی کہلاتے ہیں۔ اس کی کتاب ان علاقوں کی ابتدائی تاریخ شمار کی جاتی ہے۔ عذری کی تحریریں کھو گئی ہیں لیکن ان میں جرمنی اور مشرقی یورپ کا بیان تھا۔ اس کتاب کا ذکر بعد میں آنے والے تیرہویں صدی کے ایرانی جغرافیہ دان قزوینی نے کہا ہے جسے محض عجائب و غرائب سے دلچسپی تھی۔ بکری نے ابراہیم ابن یعقوب الاسرائیلی کا نام لکھا ہے لیکن قزوینی نے صرف الطرطوش ہی لکھا ہے۔ چنانچہ

کافی زمانے تک یہی سمجھا جاتا رہا کہ یہ ایک نہیں دو آدمی تھے۔ ایک یہودی اور دوسرا مسلمان۔ جرمن محقق جیورگ جیکب نے ان تحریروں کا مطالعہ کیا اور اس نے ان دونوں کے پیشوں اور قومیتوں کا فرق بھی معلوم کرلیا ہے۔ چونکہ ایک دستاویز دوسری دستاویز سے زیادہ طویل ہے اور اس میں اپنی معلومات کا ذریعہ شہنشاہ کو بتایا گیا ہے اس لئے وہ عرب سفارت کاروں کی کم گوئی اور اختصار پسندی اور یہودی تاجر کی جزئیات پسندی کے درمیان فرق تلاش کرلیتا ہے (11) لیکن بعد میں ٹیڈلیس کوالسکی (Tadeous Kowalski) پورے یقین کے ساتھ یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ وہ دونوں ایک ہی فرد تھے اور بکری اور قزوینی کی کتابوں میں ایک ہی ذریعہ سے اقتباسات نقل کیے گئے ہیں۔

تاہم اس بارے میں شک وشبہ موجود ہے کہ ابراہیم ابن یعقوب ایک باعمل یہودی تھا یا مسلمان یا یہودی نژاد تھا۔ اس کے نام سے دونوں ہی صحیح معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے اوٹو کے پاس جانے کی صحیح تاریخ بھی معلوم نہیں اور یہ بھی علم نہیں ہوتا کہ وہ وہاں کیوں گیا تھا۔ زیادہ قرین قیاس تاریخ 965 عیسوی ہوسکتی ہے اور اغلب یہ ہے کہ وہ اس سفارت کے ساتھ گیا تھا جو خلیفہ قرطبہ نے اوٹو اول کے پاس بھیجی تھی۔ اور غالباً اس کا تعلق اس شہنشاہ کی اس سفارت سے تھا جو 953 میں ہسپانیہ بھیجی گئی تھی۔ (12)

مغربی یورپ کے بارے میں ابراہیم کی معلومات اپنی تمام خامیوں کے باوجود اس کے پیش رو لکھنے والوں کے مقابلے میں کہیں بہتر ہیں۔ اگر وہ ساری کی ساری معلومات محفوظ رہ جاتیں اور محض ان اقتباسات کی شکل میں ہی ہم تک نہ پہنچتیں جو دلچسپ اور رنگین داستانوں کے شوقین پیشہ ور مصنفوں نے اپنی کتابوں میں نقل کیے ہیں تو اور بھی زیادہ مفید مطلب ہوتیں۔

خیر، اگر مسلمان یورپ نہیں پہنچ رہے تھے تو یورپ مسلمانوں تک خود ہی پہنچنے کی تیاریاں کررہا تھا۔ جنگ بازیافت اور صلیبی جنگوں کے زمانے میں عیسائی افواج نے ہسپانیہ سے فلسطین تک مسلم علاقے فتح کرلیے تھے اور وہ ان پر حکومت کررہی تھیں۔ اس وقت مسلمانوں کو اپنے گھروں سے باہر نکلے بغیر ہی فرنگی کلچر اور فرنگی طرز زندگی دیکھنے اور پرکھنے کا موقع مل گیا۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کے نتیجے میں کچھ زیادہ حاصل نہیں کیا گیا حالانکہ عرب تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ صلیبی بادشاہوں اور شہزادوں کے پاس وفد روانہ کیے گئے تھے۔ حتیٰ کہ سسلی اور جنوبی اٹلی جیسے دور افتادہ ملکوں تک بھی سفارت بھیجی گئی۔ ایسی ہی ایک سفارت مصر کے سلطان نے

سسلی کے حکمراں کے پاس 1261 میں بھیجی تھی۔ یہ سفارت مشہور شامی مورخ جمال الدین ابن واصل (1298-1207) لے کر گیا تھا جس کا ذکر اس نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔

ابن واصل برلیتا میں مینفرڈ کے پاس گیا تھا۔ برلیتا شہر اٹلی کے اس علاقے میں تھا جو مسلمانوں کے قبضے میں رہ چکا تھا اور حال ہی میں اس پر عیسائیوں نے دوبارہ قبضہ کیا تھا۔ اس نے سیفرڈ کے بارے میں لکھا کہ وہ ''منفرد شخصیت کا حامل ہے' قیاسی علوم کا متوالا ہے'' اسے جیومیٹری میں اقلیدس کے دس قضیے زبانی یاد ہیں۔'' اس نے اپنے زیر تسلط رہنے والے مسلمانوں کے ساتھ اس کے بہتر سلوک کی بھی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ اسی وجہ سے پوپ اس سے ناخوش ہے۔ (13)

یہ مختصر تحریر کیوں محفوظ رہ گئی؟ اس کی ایک وجہ تو یہ سمجھ میں آتی ہے کہ سفیر خود ایک ممتاز مورخ تھا اس لیے اسے ان باتوں سے ذاتی دلچسپی تھی۔ دوسرے ان باتوں کا وہ عینی شاہد تھا۔ لیکن یہ وجہ کافی نہیں ہے کیونکہ دوسرے مورخ بھی سفارت پر بھیجے گئے تھے۔ ابن خلدون جیسا عظیم مورخ 1363-1364ء میں کاستیل کے پیدرو اول کے پاس سفارت کے لیے گیا تھا۔ ایک یادداشت میں اس نے اس سفارت کا صرف مختصر سا ذکر ہی کیا ہے (14) سب سے زیادہ قرین قیاس جو بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ابن واصل نے اپنے اس سفر کی روداد زیادہ تفصیل سے اس لیے لکھی ہے کہ وہ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل جانے والے اطالوی علاقوں میں مسلمانوں کی موجودگی اور اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی کے بارے میں لکھنا چاہتا تھا۔

اس عدم دلچسپی کے باوجود بعض مستثنیات بھی ہیں۔ ان میں سے انتہائی اہم اسامہ ابن منقض کے سوانح ہیں جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ یہ ان چند دستاویزوں میں سے ایک ہے جس میں مشرق وسطے کے مسلمانوں اور مسلم علاقوں پر صلیبی افواج کے اثرات کی نقشہ کشی کی گئی ہے۔ اسامہ اپنے طویل اور دلچسپ قیام کا ذکر کرتے ہوئے اپنے فرنگی ہمسایوں کا تذکرہ بھی کرتا ہے۔ فرنگیوں کی بربریت کو وہ بالکل پسند نہیں کرتا اور اس سے اپنی حقارت کا اظہار کرتا ہے لیکن وہ ان کی اصلاح سے مایوس نہیں ہے۔ اس کا خیال ہے کہ مشرق میں مسلمانوں کے ساتھ میل جول کے بعد ان کے اندر بھی تہذیب کی رمق آجائے گی۔ اس نے اپنے ایک آدمی کو عیسائیوں کے مفتوحہ مقام انیٹوک بھیجا تھا! اس نے وہاں جو دیکھا اس سے اس کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

فرنگیوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو اس ملک میں آباد ہو گئے ہیں اور مسلمانوں

کے ساتھ میل جول رکھتے ہیں۔ یہ لوگ نئے آنے والوں سے بہتر ہیں لیکن یہ مستثنیات میں سے ہیں اس لیے ان سے دوسروں پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک بار میں نے اپنا ایک آدمی کسی کام سے انیٹوک بھیجا۔ ان دنوں سردار تھیڈورسوفیانوس (ایک مشرقی عیسائی) وہاں تھا اور میں اور وہ دوست تھے۔ اس وقت وہ اینٹوک کا حاکم تھا ایک دن اس نے میرے آدمی سے کہا "میرے ایک فرنگی دوست نے مجھے دعوت دی ہے۔ تم بھی میرے ساتھ چلو اور دیکھو کہ وہ کیسے رہتے ہیں۔" میرے آدمی نے مجھے بتایا کہ "میں اس کے ساتھ گیا۔ ہم ان قدیم عیسائی سورماؤں میں سے ایک کے گھر پہنچے، جو پہلی فرنگی جنگی مہم میں وہاں آئے تھے۔ وہ شخص فوجی خدمات سے سبکدوش ہو چکا تھا۔ انٹیوک میں اس کی جائیداد تھی جس کی آمدنی پر وہ گزارا کر رہا تھا۔ اس نے نہایت صاف ستھرا اور مزیدار کھانا پیش کیا۔ اس نے دیکھا کہ میں کھانے میں ہچکچا رہا ہوں تو اس نے کہا "جی بھر کے کھاؤ کیونکہ میں فرنگی کھانے نہیں کھاتا۔ میرے پاس مصری عورت ہے جو کھانا پکاتی ہے۔ میں صرف وہی کھاتا ہوں جو وہ پکاتی ہے۔ اس گھر میں کبھی خنزیر داخل نہیں ہوا۔ چنانچہ میں نے کھایا مگر احتیاط کے ساتھ اور پھر میں نے اجازت لی۔

بعد میں (ایک دن) میں بازار میں گھوم رہا تھا تو اچانک ایک فرنگی عورت میرے پاس آئی اور اپنی زبان میں الم غلم بولنے لگی۔ میں بالکل نہیں سمجھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ بہت سے فرنگی وہاں جمع ہو گئے۔ میں نے سوچا کہ میرا آخری وقت آ گیا ہے۔ اس وقت اچانک وہی سورما وہاں آ پہنچا۔ اس نے مجھے دیکھا اور اس عورت کے پاس جا کر اس سے پوچھا "تم اس مسلمان سے کیا چاہتی ہو۔" اس نے جواب دیا "اس نے میرے بھائی کو قتل کیا ہے" وہ ہرسو عفابیہ کا سورما تھا جسے حما کی فوج کے کسی آدمی نے قتل کر دیا تھا۔ اس پر وہ سورما غصے میں آ گیا اور چیخا "یہ شخص برجسی (بورژوا) ہے یعنی تاجر ہے۔ یہ لڑتا نہیں اور جنگ پر نہیں جاتا۔" اس نے ہجوم کو بھی ڈانٹا اور میرا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے چل دیا۔ میں نے جو کھانا کھایا تھا اس نے مجھے موت سے بچا لیا۔" (15)

اسامہ کی سرگزشت ایسی تحریروں میں سے ہے جو بدقسمتی سے اسلامی دنیا میں نایاب ہیں۔ البتہ چند اور تحریریں بھی ایسی ہیں جن میں یورپی عیسائیوں کے ساتھ رابطوں کے بارے میں ذاتی تاثرات ملتے ہیں۔ ان میں سے ایک تحریر ٹھیک اسامہ کے زمانے کی ہی ہے' لیکن اسلامی دنیا کے دوسرے کونے کی۔ ابوحامد (1081-1171) ایک عالم اور جغرافیہ دان تھا جو ہسپانیہ میں مسلم علاقے غرناطہ کا رہنے والا تھا۔ وہ شمالی افریقہ کے راستے مشرق وسطی کے طویل سفر پر روانہ ہوا۔ جہاں سے وہ شمال کی جانب روس پہنچا۔ روس سے وہ یورپ میں داخل ہوا اور ہنگری تک پہنچا جہاں اس نے تین سال قیام کیا۔(16)

ابوحامد نے جو کچھ لکھا ہے وہ زیادہ تر مشرقی جرمنی کے بارے میں ہے۔ اس نے یورپ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ اگرچہ بہت طویل طویل ہے لیکن زیادہ دلچسپی کا حامل نہیں ہے اور لگتا ہے کہ وہ پرانی معلومات اور قدیم کتابوں پر ہی مبنی ہے۔ اگرچہ وہ اندلسی تھا لیکن وہ مشرق سے وسطی یورپ میں داخل ہوا اور ہنگری کے میدانوں سے زیادہ آگے نہ جا سکا۔ لیکن اس کمی کے باوجود یورپ کے بارے میں مسلمانوں کی معلوماتی تاریخ میں اس کی تحریریں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ کیونکہ وہ یورپ کا سفر کرنے والا اسلامی دنیا کا وہ واحد سیاح تھا جس کا نام اب تک مشہور ہے اور جس کی تحریریں آج بھی محفوظ ہیں۔ ابوحامد دسویں صدی کے سفارت کار ابراہیم ابن یعقوب اور انیسویں صدی کے آخر میں عثمانیوں کو ملنے والی پہلی اطلاعات کے درمیانی عرصے میں واحد سیاح ہے جس نے تفصیل سے لکھا۔

صلیبی جنگجو عیسائیوں کے بارے میں تاثرات مسلم دنیا میں مغرب بعید کے ایک اور سیاح کی کتاب سے بھی ملتے ہیں۔ ویلنشیا کے رہنے والے ابن جبیر نے فرنگی اور مسلم مفتوحہ علاقوں کا سفر کیا۔ دوسرے شہروں کے علاوہ وہ صلیبی جنگجوؤں کی بندرگاہ سے بھی گزرا۔ وہ لکھتا ہے۔

> خدا عکہ شہر کو غارت کرے اور اسے دوبارہ مسلمانوں کے حوالے کرے۔ شام میں فرنگیوں کا یہ سب سے بڑا شہر ہے۔ کاروانوں اور جہازوں کے اکٹھے ہونے کا مقام۔ تمام علاقوں سے آنے والے مسلمانوں اور عیسائیوں کے ملنے کی جگہ۔ گلیوں اور سڑکوں پر لوگوں کا وہ اژدہام ہوتا ہے کہ چلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ ایمان سے عاری اور ناپاک لوگوں کی جگہ ہے جو خنزیروں اور صلیبوں سے بھری پڑی ہے۔ غلاظت اور جانوروں کے بول و براز کی بھرمار ہے۔ پورا شہر

گندگی اور غلاظت سے لبریز ہے......(17)

معلوم ہوتا ہے کہ ابن جبیر جیسے اصلی گندگی کے بجائے شراب کے مٹکوں' خنزیروں' موسیقی کے آلات' کلیساؤں اور دوسری ان چیزوں کا ذکر کر رہا ہے جو مسلمانوں کی نظر میں غلیظ ہیں۔ حالانکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس زمانے میں یورپی باشندوں کے مقابلے میں مسلمانوں کا پاکیزگی اور صفائی کا معیار بہت بلند تھا۔ انیسویں صدی کے اوائل میں جو مسلمان یورپ جاتے تھے وہ یورپی عیسائیوں کو نہانے دھونے اور جسمانی صفائی کا خیال رکھنے کے معاملے میں بہت برا بھلا کہتے تھے۔

تاہم فرنگی شہروں تک اس نے جو کچھ دیکھا وہ سب ایسا نہیں تھا جو اسے برا لگتا۔ طائر میں اس نے عیسائیوں کی ایک شادی میں شرکت کی تو وہاں وہ ان کی رسمیں اور ناچ گانے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ بالخصوص دلہن کی خوبصورتی سے وہ بہت ہی متاثر ہوا۔

> نہایت متانت اور وقار کے ساتھ وہ اپنے زیور اور عروسی لباس لہراتی چل رہی تھی۔ جیسے کبوتری یا اڑتا بادل...... خدا مجھے ان شیطانی خیالات سے محفوظ رکھے جو یہ نظارہ دیکھ کر میرے دل میں پیدا ہوئے۔(18)

ابن جبیر کی فکرمندی کے لیے اس دلہن کی خوبصورتی سے زیادہ اہم چیزیں وہاں اور بھی موجود تھیں۔ اس کے لیے یہ پریشان کن بات تھی کہ فرنگی اپنے مسلمان کاشت کاروں کے ساتھ شرافت کا سلوک کرتے تھے اور کاشت کار اس کے ان ہمسایوں سے بہتر زندگی گزار رہے تھے جو ابھی تک مسلمانوں کی رعایا تھے۔

> مسلم علاقوں میں اور مسلمان حکومت میں اپنے بھائیوں کی حالت زار دیکھ کر اور یہ دیکھ کر کہ اس کے برعکس ان کے فرنگی آقا ان کے ساتھ مہربانی اور مروت کا سلوک کرتے ہیں بہت سے مسلمانوں کے دلوں میں باغیانہ خیالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ عام مسلمان اپنے حکمرانوں کے ظلم کی شکایت کرتے ہیں اور اپنے فرنگی مخالفوں اور دشمنوں کی تعریف کرتے ہیں جنہوں نے انہیں فتح کر لیا ہے اور اپنے انصاف سے ان کے دل جیت لیے ہیں۔ اس کی شکایت تو انہیں خدا سے کرنا چاہیے۔ ہم قرآن کے الفاظ سے اپنے دل کو تسکین دے سکتے ہیں۔ یہ واقعہ آپ کی طرف سے ایک امتحان ہے۔

ایسے امتحانات سے جس کو آپ چاہیں گمراہی میں ڈال دیں اور جس کو چاہیں ہدایت پر قائم رکھیں۔ (19)

ابن جبیر کے مشاہدات اسامہ اور ابو حامد کی طرح انفرادی خیالات ہی ہیں کیونکہ ایسا لگتا ہے کہ مغرب کے بارے میں مسلمان کے علم پر ان مشاہدات اور آرا کا کوئی خاص اثر نہیں پڑا۔

زیادہ اہم اور دیرپا اثرات یورپ' بالخصوص مغربی یورپ اور مشرقی وسطی نیز شمالی افریقہ کے درمیان بڑھتے ہوئے سفارتی تعلقات نے مرتب کئے۔ دو اہم عوامل نے ان تعلقات کی توسیع میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ ان میں سے ایک یورپ کی تجارت کا فروغ تھا۔ یورپ کے تاجروں نے جن میں اول و بیشتر اطالوی ریاستوں سے اور بعد میں اسپین' فرانس' ہالینڈ اور انگلستان سے تعلق رکھنے والے تاجر شامل تھے' نے اسلامی بندرگاہوں کی طرف زیادہ سے زیادہ آمدورفت شروع کر دی۔ ان کی سرگرمیاں اندرون ملک کے شہروں تک پھیل گئی تھیں۔ فرنگی تاجر ان علاقوں میں اچھی طرح پہنچانے جانے لگے تھے۔ ان میں سے بعض تو وہاں زیادہ عرصے قیام بھی کرتے تھے۔ یورپ کی تجارتی سرگرمیاں بڑھنے کے ساتھ سفارتی تعلقات بڑھانے کی ضرورت بھی پیش آئی۔ ابتدائی زمانے میں تاجر برادری نے مسلمان شہروں میں اپنے نمائندے مقرر کرنے کے اختیارات بھی حاصل کر لئے۔ مغربی ملکوں کے نقطۂ نظر سے یہ نمائندے ایک قسم کی سفارتی نمائندگی بھی کرتے تھے اور میزبان حکومتوں اور دوسرے عمال حکومت کے ساتھ لین دین بھی کرتے تھے۔ مسلمان حکومتوں کی نظر میں وہ اپنی تاجر برادری کے سربراہ تسلیم کئے جاتے تھے اور مسلم حکام کے سامنے وہی ذمہ دار ہوتے تھے۔ پندرہویں صدی کے ایک مصنف نے یہ بات اس طرح واضح کی ہے۔ یہ نمائندے فرنگیوں کے سربراہ ہیں اور اپنی برادری کی طرف سے (مسلمانوں کے پاس) یرغمال ہیں۔ اگر کسی برادری کی طرف سے اسلام کی بے حرمتی ہوتی ہے تو یہ لوگ جواب دہ ہیں۔" (20)

تجارتی ضرورت نے یورپ اور مسلمانوں کے درمیان سفارتی مذاکرات کو جنم دیا۔ ان نمائندوں کو مراعات دی گئیں اور وہ ملکوں کے درمیان مذاکرات میں واسطہ بنے۔ یہ مذاکرات عام طور پر یورپ کے ہی نمائندے اور سفارت کار مسلم ملکوں میں کیا کرتے تھے۔ مذاکرات کے لیے مسلم ملکوں سے شاذ و نادر ہی کوئی یورپ جاتا تھا۔

قریبی سفارتی تعلقات کی تحریک ایک اور مختلف ذریعہ سے ہوئی۔ جب سے اسلامی دنیا میں ایک آزاد طاقت کی حیثیت سے مصر کا ظہور ہوا تھا اس وقت سے مشرق وسطی کے مشرقی اور مغربی حصوں کے درمیان مسلسل چپقلش چلی آ رہی تھی۔ وادیٔ نیل پر یکے بعد دیگرے حکمرانی کرنے والے والوں اور عراق اور ایران سے حمایت حاصل کرنے والے حاکموں کے درمیان مسلسل مخاصمت رہتی تھی۔ مصر کا تسلط شام اور فلسطین پر بھی تھا۔ تیرہویں صدی میں منگولوں کی آمد کے بعد اس مخاصمت میں اور بھی شدت آ گئی۔ مسلمانوں کے روایتی دشمن عیسائی دنیا کے مشرق میں ایک اور حکومت قائم ہو جانے سے یورپ میں یہ امید پیدا ہوئی کہ اس کے ساتھ اتحاد کیا جا سکتا ہے اور اس طرح دوسرا محاذ کھولا جا سکتا ہے۔ یہ امید منگول خوانین کے مسلمان ہو جانے کے بعد بھی کسی نہ کسی طرح باقی رہی۔ چنانچہ بڑی تیزی کے ساتھ سفارتی سرگرمیاں شروع ہو گئیں۔(21) ان کا سرسری ساذکر مسلمانوں کی کتابوں میں بھی ملتا ہے۔

یورپ اور ایران کے منگول حکمرانوں کے درمیان مذاکرات کا کوئی خاص نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ البتہ اس سے مصر کے مملوک حکمرانوں کو یہ حوصلہ ہوا کہ وہ یورپ کے ساتھ زیادہ تعلقات استوار کریں اور عیسائی دنیا کے مختلف ملکوں کے ساتھ روابط پیدا کریں۔ 1340ء کے قریب ایک مصری اہل کار شہاب الدین عمری نے مصری سفارت خانوں میں کام کرنے والوں کی رہنمائی کے لیے سفارتی خط و کتابت کا ایک کتابچہ لکھا۔(22) اس میں ان حکمرانوں کی فہرست تھی جن کے ساتھ سلطان مصر کی مراسلت تھی۔ ان حاکموں کے القاب بھی تھے اور یہ بھی لکھا تھا کہ کس طرح انہیں مخاطب کیا جائے۔ اکثر حکمران مسلمان تھے لیکن ایک حصہ ''کافر بادشاہوں'' کے بارے میں بھی تھا۔ ان میں بازنطین کا شہنشاہ' جارجیا کا بادشاہ اور آرمیدیا' سربیا اور اھوڈز کے حکمران بھی شامل تھے۔ جنوب کے حکمرانوں میں دو شامل تھے ایک اندلس کا بادشاہ الفونس اور دوسرا فرانس کا رید۔ رومن زبان میں فرانس کے بادشاہ کو رید کہتے تھے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کتابچہ لکھنے والے کو رومن نام کیسے معلوم ہوا۔ اس کتاب کا بعد میں اضافہ شدہ جو ایڈیشن شائع ہوا اس میں چند نام اور بھی تھے۔ اس کتاب کا نام تھا ''تثقیف''۔ بعد میں نصف صدی کے بعد ایک اور سفارتی نمائندے کاتب قلقشندی نے اسی قسم کی ایک اور کتاب لکھی جو زیادہ جامع تھی اس میں زیادہ نام دیئے گئے تھے جن میں پوپ' جے نیوا' وینس اور ٹیلیز کے حاکم اور عیسائی ہسپانیہ کی چند نسبتاً چھوٹی ریاستوں کے حکمران بھی شامل تھے۔

''باب دوم:۔ بابت مسلمہ سفارتی آداب کے مطابق کافروں کے بادشاہوں کے نام مصری علاقوں سے بھیجے جانے والے مراسلات۔ جان لو کہ اس مملکت سے کافر بادشاہ جنہیں مکتوب بھیجے جاتے ہیں وہ سب حکمران عیسائی ہیں' جیسے یونان' فرنگی' جارجی' حبشی اور دوسرے۔(23)

قلقشندی بلقان اور ہسپانیہ کے عیسائی بادشاہوں کا تذکرہ کرتا ہے جس کے بعد وہ لکھتا ہے۔

باب چہارم:۔ بابت روما اور فرنجہ کے شمال میں موجود کافروں کے بادشاہوں سے مراسلت۔ ان کے مراتب کے لحاظ سے۔ ان سب کا مذہب نصرانی ہے۔

1۔ پوپ کے لیے طرز تخاطب

2۔ رومی بادشاہوں' قسطنطنیہ کے بادشاہ کے لیے طرز تخاطب۔

3۔ جے نیوا کے حکمرانوں کے لیے طرز تخاطب

4۔ وینس کے حکمران کے لیے طرز تخاطب

5۔ نیپلز کی خاتون حکمران کے لیے طرز تخاطب......(24)

قلقشندی کی تحریروں اور بعض وقائع نگاروں کے حوالوں سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یورپی بادشاہوں کے ساتھ خط و کتابت شاذ و نادر ہی کی جاتی تھی۔ جہاں تک یورپ کچھ وفود بھیجنے کا تعلق ہے۔ مسلمان بھی غالباً منگولوں کے ہی ہم خیال تھے۔ منگولوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اگر وہ کسی کو ایسی سزا دینا چاہتے جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے تو اسے کسی ایسے علاقے میں بھیج دیتے تھے جہاں کی آب و ہوا اس کے لیے ناموافق ہوتی تھی تاکہ وہاں سے اس کی واپسی دشوار ہو جائے۔(25)

احیائے علوم کے دور اور بڑی بڑی دریافتوں کے ساتھ اسلامی دنیا کے ساتھ یورپ کی دلچسپی میں بھی اضافہ ہوا۔ اب اسلام کے بارے میں تو یہ تصور کیا جانے لگا تھا کہ وہ عیسائی مذہب کے لیے کوئی بڑا خطرہ نہیں ہے لیکن سلطنت عثمانیہ بہر حال ایک خطرناک دشمن تھی۔ اور یورپ کے قلب میں اس کی پیش قدمی عیسائی دنیا کی بقا کے لیے بہت بڑا خطرہ تصور کی جاتی تھی۔ سولہویں صدی کے اوائل میں ایران میں صفوی خاندان کی شیعہ حکومت قائم ہو جانے سے ایک بار پھر یورپ میں یہ امید پیدا ہوئی کہ مسلمانوں کے خلاف ایک دوسرا محاذ قائم کیا جا سکتا ہے' یا سلطنت

عثمانیہ کی توجہ یورپ سے ہٹائی جا سکتی ہے (عثمانی سلطنت سنی تھی) اس بنا پر یورپی طاقتوں کے لیے عثمانی اور ایرانی سلطنتوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ چنانچہ مختلف مراتب کے مستند یورپی عالموں نے معلومات حاصل کرنے کے لیے ان ملکوں کا سفر کیا۔

لیکن صرف یہی ایک وجہ نہیں تھی۔ دوسرے مقاصد بھی تھے جن کے سبب یورپی لوگ زیادہ سے زیادہ مشرق کی طرف سفر کرنے لگے۔ حتی کہ وہاں زیادہ عرصے قیام بھی کرنے لگے۔ عظیم دریافتوں کے دور میں جہاں یورپ کے مہم جو ایشیا افریقہ اور امریکہ کے دور افتادہ علاقوں تک پہنچے وہاں وہ اسلامی دنیا کی ایشیائی، افریقی اور یورپی سرحدوں تک بھی پہنچ گئے۔ اس طرح وہاں تلاش و دریافت کے لیے نئی تحریک ملی اور نئے مواقع بھی پیدا ہوئے۔ احیائے علوم کی علمی جستجو بہت جلد یورپ کے عیسائی ملکوں کے ہمسایوں تک بھی پھیل گئی۔ یورپ کی نو آبادیات میں پیدا ہونے والی مصنوعات میں اضافہ ہوا اور باہر برآمد کرنے کے لیے اشیا کی رسد بڑھی تو یورپی تاجروں کو اسلامی مشرق کی منڈیوں کی ضرورت پیش آئی۔ اس کے ساتھ ہی یورپی طاقتوں کے درمیان تجارتی اور معاشی مقابلے شروع ہو گئے۔ اس سے یورپی طاقتوں کی مشرق وسطے کے ملکوں میں براہ راست دخل اندازی اور تجارتی سرگرمیاں تیز ہو گئیں۔

اس کے ساتھ ہی یورپ میں جو سفارتی سرگرمیاں تیز ہو رہی تھیں اور مختلف ملکوں میں جو سفارتی دفاتر قائم کیے جا رہے تھے ان کی توسیع عثمانی دارالحکومت استنبول تک کر دی گئی تھی۔ یہ بھی اپنی جگہ کوئی کم اہم بات نہیں تھی۔ سولہویں صدی کے آخر تک مشرق اور مغرب کے بیشتر ملک اپنے سفارتی نمائندے مسلسل استنبول بھیج رہے تھے۔ ان میں سے کئی ممالک نے جیسے وینس، فرانس، انگلستان اور سلطنت روما نے اپنے مستقل سفارتی دفاتر قائم کر لیے تھے۔ سترہویں اور اٹھارویں صدی میں دوسرے ملکوں نے بھی یہ راستہ اپنایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ کے متوسط اور بالائی طبقے کی افراد کی ایک قابل لحاظ تعداد عثمانی دارالحکومت میں قیام پذیر ہو گئی۔ ان کے ساتھ مقامی افراد میں تھے جو شہر کے غیر مسلم باشندے تھے اور جو یورپی سفارت کاروں کی مدد کرتے تھے۔ یہ مقامی باشندے یونانی، آرمینیائی اور یہودی تھے اور مختلف قومیتوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ ایک اور طبقہ بھی پیدا ہو گیا۔ یہ طبقہ زیادہ تر کیتھولک فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس میں مختلف قومیں شامل تھیں جو کئی زبانیں بولتی تھیں۔ لیکن عام طور پر ان کی زبان اطالوی یا یونانی تھی۔

یہ طبقہ اپنے آپ کو کسی نہ کسی یورپی ملک کا باشندہ قرار دیتا حالانکہ ان کا یہ تعلق واجبی سا ہی تھا۔ ان لوگوں کو یورپ میں لیونٹائنیز Leventines اور ترکی میں تات سوفرنگی کہا جاتا تھا۔ جس کا مطلب تھا زیادہ میٹھے فرنگی۔ یعنی انہیں ان نمکین پانی والے فرنگیوں سے ممیز کیا جاتا تھا جو اصل یورپ سے آئے تھے۔

ایران اور مراکش کے ساتھ سفارتی تعلقات کے فروغ میں کسی حد تک دشواریاں پیش آئیں۔ ان ملکوں میں یورپ کے سفارتی نمائندوں کی آمدورفت تو جاری رہی لیکن وہاں مستقل سفارتی دفاتر قائم ہونے میں دیر لگی۔

اسلامی ملکوں سے یورپی ملکوں کی دلچسپی اور وہاں ان کی سرگرمیوں میں اضافہ مسلمانوں کی نظروں سے بھی پوشیدہ نہیں رہا۔ یورپ کی تجارت اور سفارت کے ساتھ مسلم شہروں میں رہنے والے یورپی باشندوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا اور ان کے ساتھ جو مقامی باشندے کام کرتے تھے ان کی تعداد بھی بڑھی۔ پھر کسی نہ کسی طرح مقامی باشندوں کے ساتھ بھی ان کا ربط وضبط بڑھا۔ یہ لوگ اگرچہ بیشتر غیر مسلم ہی ہوتے تھے تاہم بہرحال ان کا تعلق مشرق وسطے کے معاشروں سے بھی ہوتا تھا خواہ وہ کتنے ہی ان سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ یورپ میں مشرقی معاشرہ اور مشرقی علوم پر تحقیق کی جو روایت بڑھی تھی اس کا اثر بھی کچھ نہ کچھ ضرور ہوا ہوگا۔ سولہویں صدی کے بعد یورپ میں مشینی پریس عربی کی کتابیں چھاپ رہے تھے جو ان قلمی نسخوں کے مقابلے میں کم قیمت اور ہاتھ میں اٹھا کر پڑھنے میں زیادہ آسان ہیں جن سے مسلم قاری مانوس تھے اور اس وقت تک جنہیں پڑھنے پر مجبور تھے۔ اگرچہ مسلم ذرائع ان یورپی ایڈیشنوں کی درآمد پر اعتراض بھی کر رہے تھے۔

تاہم مجموعی طور پر ان تمام سرگرمیوں پر مسلمانوں کا ردعمل اور ان کی توجہ کم ہی نظر آتی ہے۔ مسلمان ملکوں میں مقیم یورپی باشندوں' سفارت کاروں اور دیگر لوگوں کی آبادیاں الگ تھلگ ہی ہوتی تھیں۔ ان کے ملنے جلنے والوں کا حلقہ مسلم آبادی سے الگ ہی ہوتا تھا اور مسلمان انہیں اس روشنی میں دیکھتے تھے۔ غیر ملکیوں کے ساتھ میل جول ایک ناپاک اور خطرناک عمل گردانا جاتا تھا اور یہ غیر مسلموں کے لیے ہی چھوڑ دیا جاتا تھا۔

اس رویے کو دیکھتے ہوئے یہ بات حیرت انگیز نظر نہیں آتی کہ دارالحرب کے سفر سے اجتناب کیوں کیا جاتا تھا۔ اگر کا فرد نیا کے ساتھ اس قسم کے کاروبار یا میل جول کی ضرورت پیش

آتی تھی تو بیشتر مسلم حکمران کافروں پر ہی انحصار کرتے تھے اور اپنے ملک کے اندر بھی انہیں ہی وسیلے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ اس طرح وہ کافروں کے ساتھ زیادہ قریبی تعلقات سے محفوظ رہتے تھے۔

ایک طویل عرصے تک یورپ کے ساتھ عثمانی سلطنت کے قریب قریب تمام تعلقات ان وسیلوں کے توسط سے ہی جاری رہے۔ ظاہر ہے اس کام کے لیے ہنر اور مہارت کی ضرورت تھی جو مسلمانوں کے پاس نہیں تھی۔ یا وہ اسے حاصل کرنا ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ اس کے لیے ایسے فرائض بھی ادا کرنا پڑتے تھے جو مسلمانوں کے لیے دلکش نہیں تھے۔ جیسا کہ تمام انسانی معاشروں میں بھی ہوتا ہے کہ غیر دلچسپ یا برے کام بالائی طبقوں کی طرف سے دوسروں کے لیے چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ چنانچہ ان کاموں میں جنہیں ہم ''گندے کام'' کہہ سکتے ہیں غیر مسلموں کی نمائندگی بہت زیادہ تھی خاص طور سے بعد کی صدیوں میں۔ ان میں خالصتاً مسلم نقطۂ نظر سے جو کام سب سے زیادہ گندہ اور ناپاک تھا وہ تھا کافروں کے ساتھ روابط رکھنا۔ اس وجہ سے کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ سفارت' مالی لین دین (بینکنگ) اور جاسوسی جیسے شعبوں میں یہودیوں اور عیسائیوں کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی۔ عام طور پر استنبول میں غیر ملکی نمائندوں کے ساتھ گفت و شنید کے فرائض دوبار عالیہ کے غیر مسلم ملازم ہی انجام دیتے تھے۔ سفارت یا تجارت کے لیے بیرون ملک سفر کا فریضہ بھی غیر مسلموں پر ہی چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اتفاق سے ہی کوئی عثمانی اعلیٰ عہدیدار ایسے کاموں کے لیے بیرون ملک جاتا تھا اور اگر جاتا بھی تھا تو اس کے ساتھ غیر مسلم ترجمان ضرور ہوتا تھا۔

سولہویں صدی میں ترک رویہ میں نمایاں تبدیلی پیدا ہوئی۔ مسلمانوں کے ابتدائی زمانے میں جنوب مشرقی یورپ کے ملکوں جیسے یونان' سلاف اور البانیہ کو زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ صرف مشرف باسلام ہونے کے بعد ہی نہیں بلکہ عیسائی رہتے ہوئے بھی وہ لوگ عثمانی دوبار کے لیے بہت اہم تھے۔ عثمانی شہزادوں نے عیسائی شہزادیوں سے شادیاں کیں اور متعدد قدیم اور ممتاز شاہی خاندان بازنطینی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ عثمانی محافظ خانوں میں جن جاگیرداروں کی فہرستیں محفوظ ہیں ان میں کئی عیسائی نام ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ عثمانی فوجی حکمران طبقے میں عیسائی اشرافیہ کو بھی شامل کیا جاتا تھا۔ عثمانی ریاست کے ایک چھوٹی سی سرحدی حکومت سے ایک اسلامی سلطنت میں تبدیل ہوجانے سے لازمی طور پر حکومت اور معاشرہ دونوں نے نئی شکل اختیار

کر لی تھی۔ عرب سرزمین کے مرکزی خطے بالخصوص عرب کے مقدس مقامات عثمانی سلطنت کے زیر نگیں آ جانے سے تبدیلی کا یہ عمل اور تیز ہو گیا۔ اس کے نتیجے میں سلطنت عثمانیہ میں مشرقی علاقوں، وہاں کی آبادی اور وہاں کی روایات کا وزن بھی زیادہ ہو گیا۔ بلقان اور دوسری نسلوں کے نومسلم باشندے ایک اور صدی تک اہم کردار ادا کرتے رہے لیکن بتدریج ان کی اہمیت کم ہوتی جا رہی تھی اور قدیم مسلمان خاندانوں کا اثر بڑھ رہا تھا۔ اسلام قبول کرنے والے عیسائی آہستہ آہستہ اقتدار کے ایوانوں سے دور کیے جا رہے تھے اور قانونی طور پر اپنی اصل حیثیت یعنی ذمّی کے درجہ پر آتے جا رہے تھے۔

البتہ ان عیسائی ملکوں کے ساتھ ربط و ضبط برابر جاری تھا جنہیں فتح نہیں کیا گیا تھا۔ اس میں ترک سب سے آگے تھے۔ سولہویں صدی سے انیسویں صدی کے اوائل تک مشرقی عرب یورپ کے ساتھ اپنے سیاسی رابطوں کے لیے عثمانیوں پر ہی انحصار کرتے تھے۔ حتی کہ ایران جو مشرق میں بہت آگے تھا اس تک بھی جو اطلاعات پہنچتی تھیں وہ عثمانی ذرائع سے ہی پہنچتی تھیں۔

یورپ کے ساتھ عثمانیوں کے تعلقات کا ارتقا اور اس میں واسطے کی حیثیت سے بیچ کے لوگوں کے کردار کے دو مرحلے نظر آتے ہیں۔ پہلے مرحلے پر وہ لوگ ہیں جو اکثر و بیشتر یورپ سے آئے تھے' دوسرے مرحلے پر وہ لوگ ہیں جو مقامی باشندے تھے اور یورپ کی طرف جا رہے تھے۔ پہلے مرحلے میں یہ واسطے ان لوگوں پر مشتمل تھے جو یورپ سے فرار ہو کر آئے تھے اور انہوں نے وہاں پناہ لی تھی۔ ہسپانوی عرب تو جلد ہی مسلم آبادی میں مل جل گئے ان کے علاوہ جو پناہ گزیں آئے ان میں سارے تو نہیں زیادہ تر یہودی تھے۔ ہسپانیہ' پرتگال اور عیسائی ہسپانیہ کے زیر اثر ملکوں میں یہودیوں پر جو ظلم و ستم ہوئے وہ ترکوں کے لیے بہت ہی فائدہ مند ثابت ہوئے۔

پندرہویں صدی کے آخر اور سولہویں صدی کے دوران میں یہودیوں کی بہت بڑی تعداد بھاگ کر عثمانی علاقوں میں آ گئی۔ وہ اپنے ساتھ کچھ کارآمد ہنر بھی لائے۔ ان کے ساتھ یورپی زبانوں کا بھی علم آیا اور یورپ کے بارے میں معلومات بھی آئیں۔ اس کے علاوہ ان کے ساتھ بعض فنون اور صنعت و حرفت بھی آئی۔

مغربی سیاح نکولس دی نکولے نے جس نے 1551ء میں ترکی کا سفر کیا ہسپانیوں اور پرتگالی یہودیوں کے کردار کے بارے میں نہایت دلچسپ مشاہدات پیش کیے ہیں۔ جن لوگوں کو زبردستی عیسائی بنا لیا گیا تھا وہ لوگ وہاں سے بھاگ کر ترکی پہنچے تا کہ وہاں اپنے یہودی مذہب پر

دوبارہ واپس آ سکیں۔ انہیں مرانو کہا جاتا تھا۔

''وہ (ترک) بھی اپنے ہاں تمام فنون اور صنعت وحرفت کے بہترین ماہر رکھتے تھے۔ بالخصوص وہاں مرانو تھے جنہیں ہسپانیہ اور پرتگال سے حال ہی میں جلاوطن کیا گیا تھا اور جنہوں نے عیسائیت کو نقصان پہنچاتے ہوئے اور (اس کے مفادات کو) مجروح کرتے ہوئے ترکوں کو بہت سی ایجادات' مصنوعات اور حربی آلات کی تیاری سکھائی اور بتایا کہ توپ خانہ کے سامان' توڑے دار بندوقیں' بارود' گولے اور دوسرے ہتھیار کیسے بنائے جاتے ہیں۔ ایسے ہی انہوں نے پرنٹنگ پریس لگائے جو پہلے اس علاقے میں موجود نہیں تھے۔ لیکن ان لوگوں کو یہ اجازت نہیں تھی کہ وہ ترکی اور عربی کی کتابیں چھاپیں۔(26)

مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے یہودی عیسائیوں پر فوقیت رکھتے تھے۔ ان کے بارے میں یہ شک نہیں کیا جاتا تھا کہ وہ اسلام کے دشمن یورپی ملکوں سے ملے ہوئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حساس سیاسی اور اقتصادی امور میں انہیں عیسائیوں پر ترجیح دی جاتی تھی۔ چنانچہ قبرص پر ترکی کے قبضے کے بعد یہ فرمان جاری کیا گیا کہ فوراً یہودی خاندانوں کو وہاں آباد کیا جائے۔ یہ فرمان ترک محافظ خانے میں موجود ہے۔ قبرص پر ترکی کی فتح کے وقت وہاں کثیر تعداد میں آرتھوڈوکس یونانی عیسائی آباد تھے۔ ایک چھوٹی سی تعداد اطالوی کیتھولک فرقے کی بھی تھی۔ ایک فرمان میں پانچ سو اور ایک اور فرمان میں ایک ہزار خوش حال چھوٹے خاندانوں کو وہاں بھیجنے کا حکم دیا گیا اور اسے ''مذکورہ جزیرہ کے مفاد'' (27) میں قرار دیا گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ عثمانی وہاں پیداواری' صنعتی اور تجارتی عناصر کو آباد کرنا چاہتے تھے جو یونانی اور اطالوی یا ایسے عیسائی نہ ہوں جو یورپی عیسائیوں کے ہمدرد ہو سکتے تھے۔ مغرب کے ساتھ لین دین میں وہ یہودیوں پر بھروسہ کر سکتے تھے۔ یونانیوں یا آرمینیا والوں پر اعتبار نہیں کرتے تھے۔ یہی پالیسی تھی جس کی وجہ سے عثمانی فتح کے بعد سلونیکا میں ایک بڑی آبادی یہودیوں کی پیدا ہوئی اور اس نے ترقی کی۔ عثمانی سلطنت کی پالیسی یہ تھی کہ جنگی اعتبار سے اہم بندرگاہوں پر معاشی طور پر کارآمد اور سیاسی طور پر قابل اعتماد لوگ آباد کیے جائیں۔

سولہویں صدی میں یورپی یہودی عثمانی سلطنت کے مختلف اہم محکموں میں اور اہم عہدوں پر متعین نظر آتے ہیں۔ وہ محاصل جمع کرنے والے محکموں میں تھے جہاں غیر ملکی زبانوں

میں ان کی مہارت زیادہ کارآمد ثابت ہوتی تھی۔ مصر کی مملوک حکومت میں وہ پہلے ہی اس محکمے میں کام کر رہے تھے۔ ہم انہیں سفارتی سرگرمیوں میں بھی مصروف عمل دیکھتے ہیں۔ بعض مقامات پر تو وہ اعلیٰ عہدوں پر نظر آتے ہیں۔ وہ تاجر بھی ہیں جو عثمانی سلطنت کی حفاظت میں مختلف ملکوں کے سفر کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ ہسپانوی محافظ خانوں کی دستاویزوں سے پتہ چلتا ہے کہ عیسائی یورپ میں جاسوسی کے لیے بھی کسی حد تک یہودی ایجنٹوں پر انحصار کیا جاتا تھا۔ (28)

یونانی اگرچہ مغرب کے دوست تو نہیں تھے تاہم ان کی خواہش تھی کہ بازنطینی سلطنت بحال ہو جائے۔ آرمینیا والے جو زیادہ تر جنوبی اور مشرقی ایشیائے کوچک میں تھے مغرب سے ایسے ہی الگ تھلگ تھے جیسے ترک، اس لیے یہودی ہی ایسے تھے جو ترکوں کے لیے کام آ سکتے تھے اور وہ انہی کو ترجیح دیتے تھے۔

یہودیوں کے علاوہ دوسرے پناہ گزیں بھی تھے جن کا تعلق ان عیسائی فرقوں سے تھا جن پر ظلم و ستم کیا گیا تھا۔ جیسے یونی ٹیرین (Unitarians) اور خاصی بڑی تعداد میں اپنا مذہب ترک کرنے والے لوگ جنہیں مسلم تاریخ میں ''مہتدی'' کہا جاتا ہے۔ مہتدی یعنی وہ لوگ جنہوں نے صحیح راستہ پا لیا یا جنہیں ہدایت مل گئی۔

سترہویں صدی کے آتے آتے مہتدیوں اور پناہ گزینوں کی آمد کم ہوتی چلی گئی۔ اس کی ایک وجہ تھی کہ یورپ میں حالات بہتر ہو رہے تھے۔ مذہبی جنگوں کے بعد یورپ نے آخرکار مذہبی معاملات میں برداشت اور رواداری سیکھ لی تھی اور بدعتی عیسائی حتیٰ کہ یہودی بھی اب اپنے آپ کو محفوظ سمجھنے لگے تھے اور اب ان کے لیے دوسرے ملکوں کو فرار ہونے کی ایسی کوئی وجہ نہیں رہی تھی۔ ان مہم جو لوگوں کے لیے جو دولت اور شہرت کی تلاش میں سلطنت عثمانیہ کا رخ کرتے تھے اب یورپ میں بہتر مواقع تھے کیونکہ یہاں کئی اختراعات اور دریافتیں ہو رہی تھیں اور کئی کئی دنیائیں تلاش کی جا رہی تھیں۔ اب بہت سے لوگ جو عثمانیوں کے پاس ملازمتیں اور عہدے حاصل کرتے تھے امریکہ اور دوسری مغربی نوآبادیوں کا رخ کر رہے تھے۔ وہاں انہیں زیادہ اچھے مواقع مل رہے تھے۔

یورپ اور روس کے سمندر پار مقبوضات زیادہ سے زیادہ دلکش بنتے جا رہے تھے تو مشرق وسطیٰ اور اسلامی دنیا کم دلچسپی کی حامل بنتی جا رہی تھی۔ وہاں اقتصادی اور سیاسی انحطاط بھی شروع ہو چکا تھا اس لیے وہاں مواقع کم سے کم ہوتے جا رہے تھے۔ تاہم یورپ سے فرار ہونے

والوں کی آمد ابھی جاری تھی۔ان میں جو آخری گروہ تھا وہ بحری قزاقوں کا تھا جو یورپ سے شمالی افریقہ پہنچے اور جہاز رانی اور قزاقی کے لیے مقامی قزاقوں کو اپنی خدمات پیش کر دیں۔

یہودی جو کبھی بہت ہی اہم تھے اب یورپ سے آنا بند ہو گئے۔ابھی تک جو ترکی میں مقیم تھے وہ اپنے ہنر اور اپنے روابط ختم کر بیٹھے تھے۔تھوڑے بہت پناہ گزیں اور مہم جو آتے رہے لیکن ان میں سے صرف ایک گروہ نے کسی حد تک اہم خدمات انجام دیں۔ یہ ہنگری کے باشندے تھے جن میں پولینڈ کے لوگ بھی شامل تھے۔ یہ لوگ 1848ء کی ناکام بغاوت کے بعد اپنی جان بچانے کے لیے ترکی آئے تھے۔1848ء میں جو پناہ گزیں آئے ان میں سے کچھ مسلمان ہو گئے۔ یہ لوگ ترکی میں اعلیٰ عہدوں تک پہنچے اور انیسویں صدی کے وسط میں ترکی کی انتظامیہ اور فوج کو جدید تقاضوں کے مطابق ڈھالنے میں انہوں نے نہایت اہم کردار ادا کیا۔

جیسے جیسے پناہ گزینوں اور فرار ہونے والوں کی آمد کم ہوئی اور وہاں رہنے والے غیر ملکیوں کی کارکردگی کا معیار خراب ہوا تو ان کی جگہ دوسرے لوگ لینے لگے۔اب یورپ سے آنے والے کم ہو رہے تھے تو کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو یورپ جا رہے تھے۔خاص طور سے یونانی۔ سترہویں صدی کے وسط تک بازنطینی سلطنت بحال کرنے کی ان کی امید دم توڑنے لگی تھی اور مغربی عیسائی دنیا کے ساتھ دشمنی کا جذبہ بھی کم ہو رہا تھا۔عثمانی علاقوں کے یونانی عیسائیوں نے اپنے بچوں کو تعلیم حاصل کرنے کے لیے یورپ بھیجنا شروع کر دیا تھا یہ بچے بالعموم اٹلی جا رہے تھے۔اطالوی یونیورسٹیوں سے فارغ ہونے والے یونانی لڑکے' خاص طور سے طب کی تعلیم حاصل کرنے والے لڑکے نہایت اہم خدمات انجام دے رہے تھے۔یونانیوں کے علاوہ دوسرے عیسائی فرقوں کے لڑکے بھی وہاں جانے لگے تھے۔سولہویں صدی کے آخر سے ویٹکن نے مشرق وسطے کے عیسائیوں میں بہت زیادہ دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ راہبوں کے وفد لبنان اور دوسرے مقامات کو بھیجے گئے اور مشرقی عیسائیوں کے لیے روم میں تعلیمی ادارے کھولے گئے۔کیتھولک' یونانی یونی ٹیرین' آرمینین' قبطی' میرونی' اور شامی عیسائی فرقوں کی مذہبی رسوم پر یورپ کے اثرات زیادہ سے زیادہ پڑ رہے تھے حتی کے ان کا اثر ان کے مسلمان ہمسایوں پر بھی ہو رہا تھا۔کیتھولک آرمینیا کے پادریوں نے وینس میں جو تعلیمی ادارے قائم کیے وہ کچھ عرصے تک آرمینیائی عیسائیوں کے لیے سارے مشرق میں علمی اور فکری مرکز بنے رہے۔جبل لبنان کے عربی بولنے والے میرونی عیسائیوں پر جو مغرب کا اثر ہوا اس کے اثرات کم وبیش سارے شام اور اس سے بھی

آگے تک پڑے۔ یہودیوں کے برعکس یونانیوں نے یورپ میں اپنے رابطے بڑھائے اور انہوں نے عثمانی ریاست میں اپنے اثرات اور اپنی طاقت بڑھانے کے لیے اپنا علم استعمال کیا۔ پہلے مغرب سے آنے والے یہودی طبیب ترک سلطان اور ان کے وزرا کی خدمت انجام دیتے تھے اب ان کی جگہ ان عثمانی یونانیوں نے لے لی جو اٹلی کے سند یافتہ تھے۔ وہ ہر لحاظ سے یہودیوں کے مقابلے میں بہتر مناصب پر تھے۔ چونکہ وہ اسی علاقے کے رہنے والے تھے اس لیے وہ ترکی زبان اور ترکوں سے زیادہ واقف تھے۔ ادھر عیسائی ہونے کی بنا پر یورپ کے ساتھ بھی ان کے اچھے تعلقات تھے اور انہیں عیسائی حکومتوں اور ان کے تجارتی اداروں کا تحفظ بھی حاصل تھا جو قدرتی طور پر یہودیوں کے مقابلے میں مقامی عیسائیوں کو ترجیح دیتے تھے۔ اس زمانے میں اس بات کی اہمیت زیادہ تھی کہ ترک مسلمانوں کے مقابلے میں یورپی عیسائیوں کو ترجیح دی جا رہی تھی۔

عیسائی اور مسلم ملکوں کے درمیان سفارتی روابط مسلم درباروں میں جانے والے عیسائی سفارتی نمائندوں کے ذریعہ ہی زیادہ قائم تھے۔ لیکن مسلمان کافروں کے علاقے میں جانے سے ہمیشہ پرہیز بھی نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ سولہویں صدی میں تین مسلم ملکوں نے جن کا یورپ کے ساتھ زیادہ قریبی تعلق تھا، تسلسل کے ساتھ اپنے سفارتی نمائندے اور تاجر یورپ کے مختلف ملکوں کو بھیجنا شروع کیے ان ملکوں میں ترکی، ایران اور مراکش شامل تھے۔

شروع میں یہ لوگ زیادہ تر غیر مسلم آبادی یا یورپ کے مفرور اور مہم جو گروہوں میں سے لئے جاتے تھے۔ بعد میں جب اس مقصد کے لیے مسلمانوں کو بھیجا گیا تو وہ بھی بیشتر نومسلم ہوتے تھے کیونکہ یہ لوگ یورپ، اس کے باشندوں، اس کی حکومتوں اور ان کی زبانوں کے بارے میں زیادہ کارآمد معلومات رکھتے تھے۔ مسلم دنیا کے لیے یورپ کے سفارتی انداز اتنے نئے اور اجنبی تھے کہ کبھی کبھی تو مسلم حکمران ان غیر ملکی نمائندوں کو ہی اپنے پیغامات کے ساتھ ان کے ملک واپس بھیج دیتے تھے جو ان کے پاس آتے تھے۔ ایسا ہی ایک واقعہ انٹونی اور رابرٹ شرلی برادران کے ساتھ پیش آیا جو 1598ء میں انگلستان سے ایران گئے تھے۔ انٹونی شرلی کو ارل آف ایسیکس نے بھیجا تھا تاکہ یونانیوں کے خلاف ایران کی حمایت حاصل کی جائے۔ وہ ایران میں کافی عرصے رہا اور اس نے ایرانی افواج کو یورپ کے جنگی فنون کی تربیت دی۔ 1598ء میں شاہ ایران نے انٹونی کو اپنا نمائندہ بنا کر یورپ بھیجا جس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس کا بھائی رابرٹ شرلی ایران میں ہی رہا۔ 1607ء میں شاہ نے سرکیشیاں کے ایک سردار کی بیٹی سے اس کی شادی کرا دی اور پھر

1608ء میں اسے ایک اور سفارتی مشن پر یورپ بھیجا جس کے نتیجے میں ایران اور انگلستان کے درمیان سفارتی اور تجارتی تعلقات استوار ہو گئے۔ ایسے سفارتی فرائض کی ذمہ داریاں غیر ملکیوں اور کافروں کو سونپ دینے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کاموں کو کتنی کم اہمیت دی جاتی تھی۔

لیکن کبھی کبھی مسلم حکام بھی ایسے کاموں پر یورپ بھیج دیئے جاتے تھے۔ ترک سلطان بایزید ثانی نے اپنے ایک نمائندے اسمٰعیل کو اپنے خط اور تحائف کے ساتھ مختلف یورپی درباروں میں بھیجا۔ ان درباروں میں فلورنس، ملان اور سیوائے کے دربار شامل تھے۔ شیکسپیئر کے زمانے میں ہم ایک مراکشی نمائندے کی انگلستان آمد کے بارے میں بھی پڑھتے ہیں۔ غالباً شیکسپیئر نے اسے دیکھ کر ہی اوتھیلو کا کردار تخلیق کیا۔ اس کے علاوہ سولہویں صدی کے آخر اور سترہویں صدی کے اوائل میں ترکی کے وفود نے ویانا، پیرس اور دوسرے ملکوں کا سفر بھی کیا۔ 1581ء میں دو ترک سفارتی نمائندے پیرس پہنچتے ہیں۔ پہلے وفد کو یہ ہدایات دی گئی تھیں کہ وہ فرانس کے بادشاہ ہنری سوئم کو ترک سلطان مراد ثالث کے بیٹے محمد کے ختنہ کی رسم میں شرکت کی دعوت دے۔ اس وفد میں چار چاشنی گیر بھی شامل تھے۔ چاشنی گیر وہ لوگ ہوتے تھے جو سلطان کا کھانا چکھ کر بتاتے تھے کہ وہ زہر آلود تو نہیں۔ یہ بہت بڑا منصب تھا جو مسلمان درباروں میں عام طور پر ہوتا تھا۔ دوسرا وفد علی چلبی کی سرکردگی میں گیا تھا جو اپنے ساتھ تجارتی مراعات کی دستاویز لایا تھا۔ اس معاہدہ کی حال ہی میں تجدید کی گئی تھی۔ ان کے ساتھ ہنری سوئم کے نام ایک خط بھی تھا۔ اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ شروع میں فرانس کی طرف سے اس وفد کو قبول کرنے میں ہچکچاہٹ دکھائی گئی تھی۔ ترک باشندے فرانس روانہ ہونے سے پہلے وینس میں تین مہینے اجازت ملنے کا انتظار کرتے رہے تھے۔ حتی کہ وینس میں فرانس کا سفیر بھی انہیں اجازت دینے کے حق میں نہیں تھا" اس نے فرانس کے بادشاہ کو لکھا۔ "اس سفارت کا مقصد عیسائی مذہب کے خلاف ہے۔" مسلمان حکمرانوں کے پاس عیسائی وفود کو بھیجنا تو عیسائیوں کے لیے پسندیدہ بات تھی لیکن مسلمانوں کے وفد کا عیسائی دارالحکومت میں استقبال کرنا پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ بہرحال بعد میں فرانسیسی سفیر نے اپنے بادشاہ کو رضامند کر لیا کہ مسلم وفد کو پیرس آنے کی اجازت دیدی جائے۔ اس وفد کا گرم جوشی سے استقبال کیا گیا۔ ایک اور ترک وفد 1607ء میں فرانس گیا۔ ایک چاؤش (چھوٹا نقیب) ترک سلطان کا خط لے کر ہنری چہارم کے پاس گیا۔ یہ محض تقریباتی مشن تھا۔(28)

چاؤش عام پیغامبر سے ذرا اونچے عہدے کے ہوتے تھے۔ یہ چاؤش صوبائی حاکموں

کے پاس بھیجے جاتے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہنری چہارم کو بھیجا جانے والا خط سفارتی درجہ بندی میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ ایسا کچھ عرصے بعد ہوا کہ ترک سلطانوں نے اعلیٰ منصب کے ایلچی بھیجنا شروع کیے۔ پہلا ایلچی ویانا گیا تھا اس کے بعد دوسرے یورپی دارالحکومتوں کو ایلچی بھیجے گئے۔

عام طریقہ کار یہ تھا کہ ترک اور یورپ کے بادشاہ دونوں ہی اپنے معاملات یورپی ملکوں کے بجائے استنبول میں طے کرنا پسند کرتے تھے۔ استنبول میں یہ مذاکرات خفیہ طور پر ہوتے تھے اور یورپ کے نمائندوں کو یہ ظاہر کیا جاتا تھا کہ وہ کاروباری لوگ ہیں۔ ترک سفارتی نمائندوں کی یورپ میں آمد سے شکوک وشبہات پیدا ہوتے تھے کہ ایک یورپی ملک دوسرے یورپی ملک کے خلاف ترکی سے اتحاد کر رہا ہے۔ اگرچہ بیشتر ملک ترکوں کے ساتھ تعلقات استوار کرنا چاہتے تھے لیکن وہ اسے ظاہر نہیں کرتے تھے۔ دونوں جانب سے ہچکچاہٹ کی بنا پر بہت کم وفد یورپ گئے۔ 1640ء اور 1669ء میں ترک وفد کے فرانس جانے کی اطلاع ہمیں ملتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس نمائندے کو دیکھ کر ہی مولیئر نے اپنا ڈرامہ Bourgeois Gentilhomme لکھا تھا۔

دوسرے مسلم ملکوں سے آنے والے وفود کی تعداد اس سے بھی کم تھی۔ لوئی چہاردہم کے زمانے میں ایک ایرانی سفارتی نمائندہ کی آمد خاصی توجہ کا مرکز بنی تھی (30) مراکش کی سفارتیں بھی کئی مواقع پر آئیں۔ بعض سفارتیں اس لیے آئی تھیں کہ بحیرہ روم میں جو لوگ قید کر لیے گئے تھے انہیں رہائی دلائی جائے۔ ایسی ہی ایک ترک سفارت 1614ء میں گئی تھی۔ اس میں ایک نمائندہ مخص عمر آغا تھا جس کا عہدہ چاؤش اور متفرقہ دونوں کا تھا۔ اس کے ساتھ دو ترجمان تھے۔ ان میں سے ایک نیکسوس کا رومن کیتھولک تھا جس کا نام جیان جیا کوموبیلیگرو تھا اور دوسرا ہسپانوی یہودی تھا۔ اس کا نام تھا ابراہیم ابن سانچیو۔ اس نام سے آئبیریا کے جزیرنما کی ثقافت جھلکتی ہے۔ بلاشبہ دو ترجمان ایک عیسائی اور دوسرا یہودی ایک دوسرے پر نظر رکھنے کے لیے بھیجے گئے ہوں گے۔ (31)

قابل ذکر بات یہ ہے کہ اسلامی ملکوں سے یورپ جانے والے تمام سفارتی وفود کی اطلاع ہیں یورپی ذرائع سے ہی ملتی ہے۔ ان وفود کا جانا اور ان کے جانے کے مقاصد ایسے نہیں تھے کہ مسلمان وقائع نگار انہیں کوئی اہمیت دیتے۔ پہلی سفارت جس کا ذکر مسلم دستاویزوں میں آتا

ہے ''ترک سفیر محمد پاشا کی تھی جو 1665ء میں ویانا گئی تھی۔(32) یہ موقع تھا عثمانی سلطنت اور ویانا کے درمیان معاہدہ یا صلح نامہ پر دستخط کرنے کا۔ مقصد دونوں کے درمیان دوستانہ تعلقات استوار کرنا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ پہلی سفارت تھی جسے اعلیٰ پیمانہ پر بھیجا گیا تھا۔ سفیر کے ساتھ ڈیڑھ سو افراد تھے جن میں سے ایک تہائی ایسے تھے جو اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ ترجمان تھا مشہور یورپی عالم فرانسوا دی مینین مینسکی اس وقت وہ آسٹریا کے شہنشاہ کا ترجمان اعلیٰ تھا۔ مینسکی کی ایک مفصل رپورٹ' جو اطالوی زبان میں لکھی ہے ویانا کے محافظ خانے میں محفوظ ہے۔ اس کا نام ہے۔

Releazione di cio, chie passateo cira L,ambasiate solenne Turchesca Mellano 1665 1666.

یہ رپورٹ اس کے بعد اس شہر میں آنے والے ترک سفارتی نمائندوں کے استقبال اور تعظیم و تکریم کے لیے آسٹریا کے حکمرانوں کی رہنمائی کا کام دیتی رہی۔ اس سفارت کے سلسلے میں ترکوں کی دو دستاویز محفوظ رہ گئی ہیں۔ ان میں سے ایک خود سفیر کی اپنی رپورٹ بھی ہے۔(33)

اگرچہ وفد ویانا میں نو مہینے قیام پذیر رہا لیکن محمد پاشا کی لکھی روداد بہت ہی مختصر اور خشک ہے۔ اس میں صرف اپنی سرکاری ضروریات کا احوال ہی بیان کیا گیا ہے اس ملک کے بارے میں بہت کم یا بالکل ہی نہیں لکھا گیا جہاں وہ گئے ہوئے تھے۔ تاہم اس وفد کے دورے نے ایک اور مشہور ترک سیاح کو آسٹریا کے دارالحکومت کے بارے میں لکھنے کا موقع فراہم کیا۔ یہ سیاح تھا اولیا چلبی۔ اولیا چلبی ایک عظیم سیاح تھا لیکن بدقسمتی سے اتنا ہی بڑا رومانٹک انسان بھی تھا۔ وہ اپنے قاری سے یہ حقیقت نہیں چھپاتا کہ سفرنامہ لکھنے سے اس کا مقصد تفریح بہم پہنچانا ہے' معلومات فراہم کرنا نہیں۔ اگر کسی داستان میں اسے دلچسپی نظر آتی تھی تو وہ یہ بھول جاتا تھا کہ واقعہ صحیح ہے یا غلط۔ اس نے دس جلدوں پر مشتمل اپنی کتاب ''سیاحت نامہ'' میں بہت سے ان ملکوں کے ساتھ جہاں وہ گیا تھا ان ملکوں کا سفرنامہ بھی لکھ دیا ہے جہاں اس نے کبھی قدم بھی نہیں رکھا۔ اس کے علاوہ اس نے بہت سی ایسی چیزوں کے بارے میں بھی لکھا ہے جو اس نے خود نہیں دیکھیں بلکہ دوسروں سے سنیں۔ اس سلسلے میں اس نے یہ تصدیق بھی نہیں کی کہ وہ صحیح ہیں یا غلط۔ سیاحت نامہ کی چھٹی جلد میں اس نے ایک ایسی مہم کا تذکرہ کر دیا ہے جو محض داستانی ہی معلوم ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس نے چالیس ہزار تاتار شہسواروں کے ساتھ آسٹریا' جرمنی اور ہالینڈ کے راستے شمالی

سمندر تک سفر کیا۔ کتاب کی ساتویں جلد میں اس نے ویانا اور آسٹریا کا سفر بیان کیا ہے جو اس نے محمد پاشا کے ساتھ کیا تھا۔ اولیا چلپی جو داستان طرازی کرتا ہے اس سے اس کے بیان کی صداقت پر یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایک بار تو یہاں تک کہا گیا کہ اس نے کبھی ویانا کا سفر ہی نہیں کیا تھا بلکہ وہاں سے آنے والوں سے سن سن کر اس نے اپنا سفرنامہ مرتب کر لیا تھا۔ لیکن یہ الزام غلط ثابت ہو چکا ہے۔ اس زمانے کی ایک دستاویز سے ویانا میں اولیا کی موجودگی ثابت ہوتی ہے۔(34) وہ جو کچھ کہتا ہے اس میں سے زیادہ ایسی باتیں ہیں جن سے اس کا عینی شاہد ہونا ثابت ہوتا ہے اگرچہ اس کا انداز بیان ہمیشہ سنجیدہ نہیں ہوتا۔

اس نے آسٹریا کے شہنشاہ کا جو سراپا بیان کیا ہے وہ اس کے داستانی طرز بیان کی ایک مثال ہے۔

''اسے دیکھنے والے کو شبہ ہونے لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کیا واقعی اس شخص کو انسان ہی بنانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ جوان ہے' اوسط قد ہے' داڑھی کے بغیر ہے' اس کے کولہے تنگ ہیں' موٹا اور فربہ نہیں ہے اسے بھدا بھی نہیں کہا جا سکتا۔
خدا کے حکم سے اس کا سر بوتل کی شکل کا ہے' اوپر کو اٹھا ہوا رقص کرنے والے درویش کی ٹوپی یا کدو کی طرح۔ اس کا ماتھا تختے کی طرح چپٹا ہے۔ اس کی گھنی اور سیاہ بھنویں ہیں جو ایک دوسرے سے فاصلے پر ہیں' ان کے نیچے ہلکی کتھئی آنکھیں ہیں گول گول جیسے دائرہ' اور سیاہ پلکوں سے ڈھکی ہوئی الو کی گول گول آنکھوں کی طرح چمکتی ہوئی۔ اس کا چہرہ لمبوترا اور تیکھا ہے لومڑی کی طرح' کان بچوں کے جوتوں کی طرح بڑے بڑے ہیں' ناک سرخ ہے اور ادھ پکے انگور کی طرح چمکتی ہے اور موریا کے بینگن کی طرح بڑی ہے۔ اس کے نتھنے اتنے چوڑے ہیں کہ ایک نتھنے میں وہ بیک وقت تین انگلیاں ڈال سکتا ہے۔ اتنے لمبے لمبے لٹکے ہوئے بال ہیں جیسے تیس سالہ سورما کی مونچھیں اور اوپر والے ہونٹ کے بالوں اور گل مچھوں کے ساتھ الجھے ہوئے ہیں جو کانوں کے برابر پہنچ جاتے ہیں۔ اس کے ہونٹ ایسے سوجے ہوئے ہیں جیسے اونٹ کے اور اس کا منہ بیک وقت پوری روٹی بھر سکتا ہے۔ اس کے کان بھی اتنے بڑے اور اتنے چوڑے ہیں جیسے اونٹ کے۔ جب وہ بولتا ہے تو اس کے منہ سے اور

اونٹ جیسے ہونٹوں سے لعاب کے چھینٹے اڑتے ہیں جو اس کے اوپر گرتے ہیں جیسے اس نے قے کر دی ہو۔ نہایت خوبصورت' کمسن چھوکرے جو وہاں کھڑے ہوتے ہیں اسی وقت بہت بڑے سرخ رومالوں سے وہ لعاب صاف کر دیتے ہیں۔ وہ خود بھی ہر وقت اپنی زلفوں میں انگلیاں پھیرتا رہتا ہے اور کنگھی سے ان میں لچھے ڈالتا رہتا ہے۔ اس کی انگلیاں لنجا کے کھیرے کی طرح لگتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کے گھرانے کے سارے ہی شہنشاہ مکروہ شکل کے ہیں۔ اوران کے تمام کلیساؤں' گھروں اوران کے سکوں پر شہنشاہ اپنی مکروہ شکل کے ساتھ نظر آتا ہے۔ بے شک اگر کوئی مصور اسے خوبصورت شکل کے ساتھ ظاہر کردے تو وہ اسے قتل کر دے گا کیونکہ وہ سمجھے گا کہ اس نے اس کی شکل بگاڑ دی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ شہنشاہ اپنی بدصورتی پر فخر کرتا ہے۔ (35)

اپنی اس کھلم کھلا افسانہ طرازی کے باوجود اولیا چلپی پہلا شخص ہے جس نے نادانستہ طور پر نفرت کے اظہار اور اہانت آمیزی کی روایت کو توڑا ہے۔ اس نے آسٹریا کا جو خاکہ پیش کیا ہے وہ اس معاشرے کی جھلکیاں دکھاتا ہے جو عثمانیوں سے مختلف ہی نہیں کئی اعتبار سے ان سے بہتر بھی ہے۔ ایک دو چیزوں کے سوا اولیا ان چیزوں کے درمیان موازنہ کرنے میں احتیاط ہی برتتا ہے جو اس نے آسٹریا میں دیکھیں اور جو وہ اور اس کے قاری اپنے وطن میں دیکھتے رہے ہیں۔ وہ جن چیزوں کا موازنہ کرتا ہے وہ ہیں یورپ کے ٹائم پیس اور عثمانیوں کے ہاں استعمال ہونے والے ٹائم پیس یا پھر جب وہ ویانا میں سینٹ سٹیفن کیتھڈرل کی وسیع اور عمدگی سے رکھی کتابوں والی لائبریری کا ذکر کرتا ہے۔ اس کی جھوٹی سچی کہانیوں سے بھی قاری ایک منظم فوج' نظم وضبط کے حامل عدالتی نظام' پھلتی پھولتی زراعت' خوش حال آبادی اور بہترین نقشے پر بنے شہر' قانون قاعدے کے پابند اور امیر کبیر دارالحکومت کی تصویر دیکھ ہی لیتا ہے۔

بعد میں آنے والے سیاحوں کے ہاں بھی اسی قسم کی فکر مندی نظر آتی ہے۔ وہ بھی کافروں کے ساتھ بظاہر اپنا موازنہ تو نہیں کرتے لیکن دبی زبان سے ان کے رسوم ورواج کی تعریف کئے بغیر بھی نہیں رہ سکتے۔ اس کے بعد یورپ جانے والے ترک سفیروں نے یہ اپنا وطیرہ بنا لیا کہ وہاں سے واپس جانے کے بعد وہ اپنے سفر کی روداد ضرور لکھتے تھے جس میں وہ یہ بتاتے کہ

انہوں نے وہاں کیا دیکھا۔ خاص طور سے یہ ذکر کیا جاتا کہ انہوں نے وہاں کیا کیا۔ ان رپورٹوں کو سفارت نامہ کہا جاتا تھا۔ سترہویں اور اٹھارویں صدی کے یہ سفارت نامے آج بھی محفوظ ہیں۔ اب تک جو سفارت نامے شائع ہوئے ہیں ان میں سب سے زیادہ دلچسپ سفارت نامہ محمد المعروف یری سیکیز چلبی کا ہے۔ یری سیکز کا مطلب ہے محترم اٹھائیس (وہ جان نثاروں کے اٹھائیسویں دستے میں افسر رہ چکا تھا) وہ 1720-1721ء میں ترک سفیر کی حیثیت سے فرانس کے نوعمر بادشاہ لوئی پنج دہم کے دربار میں پیرس گیا تھا۔ محمد ایک ممتاز شخصیت تھا کیونکہ وہ اس گفت و شنید میں بھی عثمانیوں کا نمائندہ تھا جس کے نتیجے میں 1718 میں پسارووٹز کا معاہدہ ہوا تھا۔ وہ ویانا میں ترکی کا سفیر بھی رہ چکا تھا اور ترک سلطنت کے خزانہ کا منصرم اعلیٰ بھی رہ چکا تھا۔ پیرس جانے کا اس کا مقصد نوعمر فرانسیسی بادشاہ کے اتالیق کو یہ اطلاع دینا تھا کہ ترک سلطان نے تبرکات کی عمارت کے لیے کلیسا کی ضروری مرمت کی اجازت دے دی ہے۔ اس نے مالٹا کے سورماؤں کی غارت گری اپنے قیدیوں کے لیے تاوان اور بعض دوسرے سفارتی امور پر بھی بات چیت کی۔ اس کے علاوہ اسے جو فوری اور ضروری فریضہ سونپا گیا تھا وہ یہ تھا کہ ان کے تہذیب وتمدن کے اسباب اوران کی تعلیم کا بغور مطالعہ کرے اوران سرگرمیوں کے بارے میں اطلاع دے جنہیں ترکی میں اختیار کیا جاسکتا تھا۔ اس نے فریضے کی ادائیگی کا عکس اس کے سفارت نامے میں بخوبی نظر آتا ہے اس لیے کہ وہ زیادہ مفصل اور زیادہ دلچسپ ہے۔ (36) محمد چلبی پہلا ترک سفیر تھا جو پیرس میں طویل عرصے ٹھہرا جہاں بھی جاتا تھا حکومت اور لوگ اس میں بہت زیادہ دلچسپی لیتے تھے اور انہیں کے بارے میں متجسس رہتے تھے۔ وہ پیرس میں نہروں کے کنارے کنارے جا رہا تھا تو اسے دیکھنے کے لیے لوگوں کا ہجوم ہوگیا۔ کچھ لوگ نہر میں بھی گر گئے۔ بعض لوگوں پر سپاہیوں نے گولی بھی چلادی۔ بوردیو میں اس نے ایک عجیب وغریب نظارہ دیکھا۔ ایسا منظر اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

> اس مقام پر ہم نے موجوں کا وہ مدوجزر دیکھا جس کے متعلق صرف سنا تھا۔ موجیں چوبیس گھنٹے میں دوبارا ابھرتیں اور گر جاتیں...... میں نے ذاتی طور پر اپنی آنکھوں سے دریا کا پانی کئی کئی ہاتھ اونچا اچھلتے اور نیچے گرتے دیکھا...... جس نے اپنی آنکھوں سے (یہ نظارہ) نہ دیکھا ہو وہ اس پر اعتبار نہیں کر سکتا۔ (37)

پیرس میں بادشاہ اور درباریوں نے اس کا شایان شان خیر مقدم کیا۔ شہر کے لوگوں کے تجسس نے وہاں کے سوقیانہ اور مہذب دونوں آداب پر اسے پریشان کیا۔

وہ سردی اور بارش میں رات کے تین یا چار بجے تک کھڑے کانپ رہے تھے اور وہاں سے نہیں جا رہے تھے۔ ان کے اس تجسس پر ہم حیران تھے۔ (38)

آخر مقررہ تاریخ پر سفیر نے اپنے اسناد و سفارت نائب السلطنت کو پیش کیے۔

میں نے اس سے کہا کہ آپ جیسی ممتاز شخصیت کے ساتھ مل کر اتنی مسرت ہوئی ہے کہ میں سفر کی ساری تکالیف بھول گیا ہوں۔ لیکن یہ میں نے محض اخلاقاً کہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ تولون سے پیرس تک کے سفر میں ہمیں جن تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا اگر مجھے وہ سب بیان کرنا پڑ جاتیں تو سارے آسمان بھی انہیں اپنے اندر نہ سمیٹ سکتے...... (39)

فرانس میں محمد نے جو کچھ دیکھا اس کی طویل اور دلچسپ روداد میں کہیں بھی اس نے فرانسیسی اور عثمانی معاشرہ کے درمیان براہ راست موازنہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ لیکن وہ گہری نظر رکھنے والا آدمی نہیں تھا۔ اس لیے یہ موازنہ اس کے بیان ہی سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس نے رصدگاہ اور اس کے سائنسی آلات، ہسپتال اور اس کے آپریشن کے کمرے، تھیٹر اور اوپیرا جیسی ثقافتی سرگرمیوں، فرانس کے کارخانوں اور صنعت و حرفت، محلات اور باغوں کے طرز تعمیر اور نقشوں، سڑکوں اور نہروں، پلوں اور پلوں کے ان پھاٹکوں کے بارے میں جن پر سے گزرا، جو کچھ لکھا ہے اس سے ایک بھرپور اور پرعزم نئی دنیا کی تصویر کشی ہو جاتی ہے۔ ایک جدید ترک مورخ نے لکھا ہے کہ محمد 1720ء میں جب پیرس گیا تو اس نے اس شہر کو ایسے نہیں دیکھا جیسے اولیا چلپی نے ویانا دیکھا تھا۔ اولیا نے ویانا کو "ایک سرحدی سپاہی کی تکبر و نخوت سے بھری آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اولیا کے خیالات پر ابھی تک سلمان ذی شان کی فتوحات کی شاندار یادیں چھائی ہوئی تھیں۔ محمد کا تجربہ شکست و ذلت کا تجربہ تھا۔ ویانا میں دوسری ناکامی، ہنگری سے پسپائی، کارلووٹز اور پساروٹز کے صلح نامے کی یاد بھی ابھی تازہ تھی۔ یورپ سے عثمانیوں کی پسپائی ہی نہیں ہو رہی تھی بلکہ انہیں ایک اور ہولناک خطرہ کا سامنا بھی تھا۔ ایسا خطرہ جس کا پہلے کبھی تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ خطرہ تھا روس کی پیش قدمی سے۔

ڈیوک ڈی سینٹ سیمون جس کی شاید ترک سفیر سے پیرس میں ملاقات ہوئی تھی، لکھتا

ہے" پیرس نے اس کے سامنے جو کچھ پیش کیا اس کا اس نے خوش ذوقی اور بصیرت وفراست کے ساتھ مشاہدہ کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت کچھ جانتا ہے اور وہ تاریخ اور کتابوں کا بہت علم رکھتا ہے (40) سینٹ سیمون نے یہ بھی لکھا کہ ترک سفیر کا ارادہ تھا کہ واپس جا کر وہاں پرنٹنگ پریس قائم کرے اور لائبریری بنائے اور اس مقصد میں وہ کامیاب رہا۔ اصل میں یہ آخری کام اس کے بیٹے سعید آفندی نے پورا کیا جو اس کے ساتھ پیرس گیا تھا اور بعد میں خود بھی سفیر رہا حتیٰ کہ وہ مختصر عرصے کے لیے وزیراعظم بھی رہا۔

دوسرے سفارتی نمائندوں نے بھی لندن، پیرس، برلن، ویانا، میڈرڈ اور سینٹ پیٹرس برگ کا دورہ کیا اور بعد میں اپنے سفر کی روداد لکھی۔ یہ سیاحت نامے ایک قسم کی ادبی تخلیق تھے۔ ترک ادب میں سفرناموں یا سیاحت ناموں نے ایک ادبی صنف کی شکل بھی اختیار کر لی تھی، لیکن ان کی سیاسی حیثیت خاصی مایوس کن ہے۔ یہ سیاحت نامے ہمیں ان سفیروں کی سرکاری سرگرمیوں کے بارے میں بہت کم بتاتے ہیں اور یورپ کے سیاسی حالات کی بھی زیادہ خبر نہیں دیتے۔ اس کے بجائے وہ عام سی باتوں پر توجہ دیتے ہیں اور روزمرہ کی سرگرمیوں کو موضوع بناتے ہیں۔ سیاسی تبصروں سے گریز کی ایک وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ یہ دستاویز خفیہ نہیں ہوتی تھیں۔ محمد آفندی 1721 میں جب پیرس سے واپس آیا تو اس نے اخلاقی طور پر اپنے سفر کی روداد کی ایک نقل استنبول میں فرانسیسی سفیر کو بھی بھیجی۔ فرانسیسی سفیر نے اپنی زبان میں اس کا ترجمہ کرا کے دونوں دارالحکومتوں میں چھپوا دیا۔ ظاہر ہے اس قسم کی رپورٹ میں عثمانی سفیر کوئی اہم سیاسی بات تو نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عثمانی سفیر ان رپورٹوں کے علاوہ بھی اپنے کارناموں کے بارے میں کوئی اور رپورٹ بھی پیش کرتے ہوں گے۔ تاہم اٹھارویں اور اوائل انیسویں صدی میں عثمانی سفارت خانوں کی معلومات کا جو عالم تھا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان خصوصی رپورٹوں میں بھی کچھ زیادہ معلومات نہیں ہوتی ہوں گی۔

تاہم اٹھارویں صدی کے وسط سے کچھ تبدیلی نظر آتی ہے۔ اب جو رپورٹیں بھیجی جاتی تھیں ان کا معیار پہلے سے بہتر تھا۔ اب عثمانی سفیر زیادہ گہری نظر رکھتے تھے اور ان کی معلومات زیادہ تھیں۔ اب وہ یورپ کی سیاست سے زیادہ آگاہی رکھتے تھے اور بعض اوقات سفارتی اقدام اور کبھی کبھی تاریخی رجحانات کا تجزیہ بھی کرتے تھے۔ کم سے کم دو ترک سفیر ایسے نظر آتے ہیں جنہوں نے مقدمہ ابن خلدون سے سیکھ کر سیاسی و تاریخی تجزیہ کی طرز اختیار کی۔ ترک میں اس مقدمہ سے

لوگ کافی عرصے سے واقف تھے اور حال ہی میں اس کے بڑے حصہ کا ترکی میں ترجمہ ہوا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مذکورہ سفیروں نے ابن خلدون کی اصطلاحات میں یورپ کے واقعات کا تجزیہ کیا۔ رزمی آفندی جو 1757ء میں ویانا اور 1763ء میں برلن میں سفیر کی حیثیت سے رہا تھا سفارتی انقلاب کے بعد یورپ میں پیش آنے والی تبدیلیوں اور پروشیا کے عروج اور اپنے دشمنوں پر اس کی فتح پر اس طرح تبصرہ کرتا ہے ''ابن خلدون کے الفاظ میں ایک نئی ابھرتی ہوئی طاقت کی ایک قدیم مملکت پر مکمل فتح کا دارومدار گزرتے زمانے اور پیش آنے والے واقعات کے سلسلے پر ہوتا ہے۔'' (41) چند عشروں کے بعد 1790ء میں برلن میں متعین دوسرے عثمانی سفیر عزمی آفندی یورپی باشندوں کی عیش وعشرت پسندی اور سکون کی تلاش کو ان میں مردانگی کی کمی سے تعبیر کرتا ہے جسے ابن خلدون نے زوال کے زمانے کی علامت قرار دیا ہے۔ ان دونوں کی روداد یں جن میں جرمنی کی سیاست پر تبصرہ ہے' ان کا علم' ان کی معلومات اور ذہانت ظاہر کرتی ہیں۔ لیکن برلن کے لوگوں کے بارے میں رزمی کا یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ وہ جلد ہی اسلام قبول کرنے والے ہیں۔ (42)

اواخر اٹھارویں صدی کے عثمانی سفارتی نمائندوں میں سب سے زیادہ مشہور واصف آفندی تھا جو 1787ء سے 1789ء تک میڈرڈ میں رہا۔ وہ اپنے دور کا نہایت ممتاز ادیب تھا اور کئی سال وہ شاہی مورخ کے عہدے پر فائز رہا تھا۔ بعد میں وہ وزیر اعظم کا رئیس آفندی (چیف سیکرٹری) بنا دیا گیا کہ یہ عہدہ ایسا تھا جس میں خارجہ امور سے بھی واسطہ پڑتا تھا۔ ہسپانیہ کے قیام میں اس کی شناسائی انگریز ادیب ولیم بیکفرڈ سے ہوئی جس نے اپنی ڈائری میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اپنی تحریروں میں وہ ہسپانوی لوگوں کے بارے میں مایوسی کا اظہار کرتا ہے کہ وہ اس کی توقعات کے خلاف نکلے۔ سب سے پہلے تو اسے قرنطینہ کی مشکلات سے گزرنا پڑا۔ تمام یورپی ملکوں نے بیماریوں سے بچنے کے لیے مشرق سے آنے والے مسافروں پر یہ پابندی لگائی تھی۔ وہ بارسلونا میں اترا اور وہاں سے ویلنشیا پہنچا جہاں ہسپانوی کماندان کے ساتھ تحائف کے تبادلے میں اسے بے عزتی کا سامنا کرنا پڑا جس پر اسے بہت غصہ آیا۔ اس نے بارسلونا میں ''جنرل'' کو ''ایک مرصع بٹوا پیش کیا۔ اس نے یہی تحفہ کماندان کو بھی پیش کیا جس کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ وہ وزیر اعظم کا دست راست ہے۔ لیکن جو نتیجہ برآمد ہوا واصف اس سے بالکل خوش نہیں ہوا۔ اس تحفے کے جواب میں اسے زیتون کے تیل کی دو شیشیاں ملیں۔ ''صرف اس سے ہی ہسپانیہ کے

لوگوں کے خسیس اور ذلیل کردار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔" (44)

ایک اور نہایت اہم شخصیت ابوبکر راتب آفندی کی تھی جسے سفیر بنا کر ویانا بھیجا گیا تھا اور وہاں 1791 اور 1792 میں اس نے قیام کیا۔ اس کی سفارتی رپورٹیں شائع نہیں ہوئی ہیں لیکن ان کا حوالہ بہت دیا جاتا ہے۔ بعد میں آنے والے مصنفین نے اس کا ذکر بہت کیا ہے۔ اس نے سیاسی اور فوجی امور پر بہت لکھا۔ اس نے تفصیل کے ساتھ آسٹریا کی حکومت کی ہیئت' آسٹریا کی فوج کی تنظیم حتیٰ کہ آسٹریا کے معاشرہ پر تبصرہ کیا۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں بہت سے عثمانی مصنفوں میں سے وہ بھی ایک ایسا لکھنے والا تھا جس نے عثمانی سلطنت کی پسماندگی اور کمزوری پر روشنی ڈالی۔ وہ پہلے مصنفوں میں سے ہے جس نے بتایا کہ اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ چونکہ عیسائی آگے بڑھ گئے ہیں اس لیے عثمانی پیچھے رہ گئے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں عیسائی یورپ کے طریق و اطوار کا گہرا مطالعہ کرنا چاہیے اور ان کی تقلید کرنے کے امکانات کا جائزہ لینا چاہیے۔ (45)

یہ صرف عثمانی سلطان ہی نہیں تھے جنہوں نے یورپ کو نمائندے بھیجنے کی ضرورت محسوس کی بلکہ سلطان مراکش نے بھی وقتاً فوقتاً اپنے نمائندے یورپ بھیجے جن میں سے چند نے واپس آ کر وہاں کے احوال لکھے۔ ان کے سفر کا مقصد عیسائی علاقوں میں محبوس مسلمان قیدیوں کا تاوان ادا کرنا تھا۔ ویسے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ محض قانونی بہانہ ہو اور مالکی مسلک کے مطابق اپنے سفر کا جواز تلاش کیا گیا ہو۔ (46) ان میں سے سب سے پہلا شخص جس نے کوئی تحریر چھوڑی ہے وہ تھا ہسپانیہ کے بادشاہ چارلس دوئم کے دربار میں مراکشی سفیر وزیر الغسان جو 1690-1691ء میں میڈرڈ گیا۔ مراکشی سلطان نے انہی دنوں شمالی افریقہ میں ہسپانوی مقبوضہ علاقے لاراشے پر قبضہ کیا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ اگر ہسپانیہ میں محبوس پانچ سو مسلم قیدی رہا کر دیئے جائیں اور ایسکوریل لائبریری میں جو پانچ ہزار عربی کے نسخے موجود ہیں انہیں واپس کر دیا جائے تو وہ فوجی چھاؤنی خالی کر دے گا۔ آخر کار سفیر اپنے بادشاہ کے مشورے سے عربی کتابوں کے نسخے چھوڑنے پر رضامند ہو گیا اور پانچ سو قیدی رہا کرا لئے گویا اس طرح ایک قیدی دس نسخوں کے برابر ٹھہرا۔

غسان ذہن و فطین آدمی تھا۔ اس نے ہسپانیہ کے بارے میں جو لکھا ہے وہ عیسائیوں کی جنگ بازیافت کے بعد کسی مراکشی مسافر کی پہلی تحریر ہے۔ وہ انتہائی دلچسپی کی حامل ہے۔ اس کے پاس مسلم ہسپانیہ کی عظمت رفتہ اور غرناطہ کے الم ناک سقوط کے بارے میں کہنے کو کچھ زیادہ نہیں ہے۔ وہ اپنے زمانے کے حالات و واقعات پر زیادہ توجہ دیتا ہے۔ یہ حالات و واقعات

صرف اسپین کے ہی نہیں ہیں بلکہ پورے یورپ کے ہیں۔

غسان کے بعد دوسرے مراکشی سفیر یورپ بالخصوص اسپین گئے۔ یہ وہ ملک تھا جس کے بارے میں وہ زیادہ فکر مند تھے۔ ان کی روودادیں عام طور پر بہت دلچسپ ہیں حالانکہ ترکی کی طرح مراکش میں بھی یہ سفارت نامے یا سفرنامے کسی حد تک ادب کی ایک صنف بن چکے تھے۔ وہی واقعات اور مقامات کا آنکھوں دیکھا حال جو ایسے سفرناموں میں ہوتا تھا۔ تاہم یورپ سے متعلق مراکش میں لکھے جانے والے ان سفارت ناموں کا معیار ترکی کی سفارت ناموں سے زیادہ بلند ہے۔ یہ سفارت نامے بھی سترہویں اور اٹھارویں صدی میں لکھے گئے ہیں۔ مراکشی نمائندے شخصیات اور واقعات کی سطحی روداد کے بجائے یورپ کے معاملات پر گہری نظر ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ لوگ سیاسی اور مذہبی امور کے علاوہ فوجی اور تجارتی معاملات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس میں کامیاب بھی ہوتے ہیں۔ یہ معلومات صرف ان ملکوں کے بارے میں ہی نہیں ہیں جہاں وہ بھیجے گئے ہیں بلکہ دوسرے یورپی ملکوں کی معلومات بھی وہ حاصل کرتے ہیں۔ وہ صرف زمانہ حال کے واقعات پر ہی نظر نہیں کرتے بلکہ گزشتہ صدی کی تاریخ کو بھی سامنے رکھتے ہیں۔ عثمانی نمائندے ان باتوں سے زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے۔ یورپی سیاست کے بارے میں ان کے مشاہدات بہت کم ہیں اور جو ہیں وہ سرسری اور اکثر غلط ہیں۔ ان کی رپورٹ صرف مقامات تک یا ان لوگوں تک محدود ہیں جن سے ان کی ملاقات ہوئی۔ وہ شاذ و نادر ہی ایسی کوشش کرتے ہیں کہ زمانے اور مقامات کو وسیع تر تناظر میں دیکھیں۔ تاہم اٹھارویں صدی کے آخر میں برسوں میں ایسا نظر آتا ہے کہ عثمانی نمائندے یورپ کے امور پر سنجیدہ تبصرے کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

یہ فرق کیوں ہے؟ اس کی وجہ جاننا مشکل نہیں ہے۔ مراکش جسے عرب المغرب الاقصی کہتے تھے عالم اسلام میں ایک دور افتادہ مقام اور نسبتاً چھوٹا اور کمزور ملک تھا۔ نیز مراکش کو یورپ کا خطرہ بھی رہتا تھا۔ اس نے ہسپانیہ اور پرتگال کو' جو صدیوں عالم اسلام کا حصہ رہے' مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلتے دیکھا تھا اور اس نے وہاں آنے والے لٹے پٹے مسلمانوں کو پناہ دی تھی۔ اس سے زیادہ خطرناک بات یہ تھی کہ وہ اسپین اور پرتگال کی طرف سے جنگ بازیافت کے دوبارہ شروع ہونے کا کھیل دیکھ رہا تھا کہ وہ عیسائیت کا پرچم لہراتے شمالی افریقہ کی سرزمین پر چڑھے آ رہے تھے۔ ایک لحاظ سے وہ سولہویں صدی میں ان حالات کا سامنا کر رہے تھے جن کا مقابلہ ترکوں اور

مصریوں نے انیسویں صدی میں کیا۔ وہ یورپ کی توسیع پسندی سے واقف تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ یورپ کی اقتصادی اور فوجی طاقت نے یہ توسیع ممکن بنائی ہے۔ اس لیے یہ قدرتی بات تھی کہ مراکش کو ان ملکوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی ضرورت تھی جن سے اسے خطرہ تھا۔

عثمانیوں کی صورت حال بالکل مختلف تھی۔ مراکش کے برعکس سلطنت عثمانیہ صرف ایک ملک نہیں تھی بلکہ پوری دنیا تھی۔ دوسرے وہ کوئی دور افتادہ سرحدی ملک نہیں تھے بلکہ عالم اسلام کے قلب میں تھے۔ جن یورپی ملکوں کو عثمانی جانتے تھے وہ وہی تھے جن پر انہوں نے قبضہ کیا تھا۔ قریب تر زمانے میں جو دوسرے یورپی نمائندے ان کے پاس آئے وہ تھے ان کے دوبار میں آ کر اپنے سفارتی اور تجارتی مفادات کے لئے درخواستیں گزارنے والے۔ عثمانی دنیا بہت وسیع تھی، متنوع تھی اور اکثر و بیشتر معاملات میں خودکفیل بھی تھی۔ یورپ بالخصوص مغربی یورپ کے ملک ایسے تھے جن سے کوئی فائدہ یا کسی خطرے کا امکان نہیں تھا اس لیے وہ توجہ کے لائق ہی نہیں تھے۔ صرف اٹھارویں صدی کے آخری حصے میں جب عثمانیوں کو پے در پے شکستوں کا سامنا کرنا پڑا تو انہیں خیال آیا کہ طاقت کا توازن بدل ہو گیا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے بیرونی دنیا کے بارے میں معلومات حاصل کرنا شروع کیں۔ یہ دنیا ابھی تک ان کے لیے پراسرار اور قابل نفرت تھی لیکن اب وہ خطرناک بھی بن گئی تھی۔

ترکی اور مراکش کے مقابلے میں شاہ ایران کو تو بالکل ہی دلچسپی نہیں تھی کہ اپنے سفارتی نمائندے یورپ بھیجتے۔ سب سے پہلا ایرانی نمائندہ جو انگلستان گیا وہ تھا نقد علی بیگ جو غالباً سر رابرٹ شرلی کی معیت میں 1626ء میں وہاں گیا تھا۔ سب سے پہلا شخص جس پر کوئی توجہ دی گئی وہ محمد رضا بیگ تھا جسے شاہ ایران نے 1714ء میں پیرس بھیجا۔ اس کی کوشش سے اگلے سال فرانس اور ایران کے درمیان ایک معاہدہ پر دستخط ہوئے۔ اس کی شخصیت اور سرگرمیوں نے فرانس میں خاصی ہلچل پیدا کی اور اس کے بعد اس سے متعلق مذہبی تصویر نگاری اور ادب کی تخلیق ہوئی۔ اور اس سے متاثر ہو کر ہی مونٹے کیو نے ''مکتوبات فارس'' لکھے (49) اس بات کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ ایران میں بھی اس سے کوئی ہلچل مچی ہو۔

یورپ میں ایران کی سفارتی سرگرمیاں حقیقتاً انیسویں صدی کے آغاز تک شروع نہیں ہوئی تھیں۔ ایک طرف نپولین کی جنگیں پھیلنا شروع ہوئیں اور دوسری طرف روس کی پیش قدمی

تیز ہوئی تو ایران کے دروں بیں بادشاہوں کو باہر مغرب کی جانب دیکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔
مغرب جانے والے قابل ذکر لوگوں میں سب سے ممتاز شخص تھا حاجی مرزا ابوالحسن خاں ابن مرزا احمد علی شیرازی جو ابوالحسن شیرازی کے نام سے مشہور ہے۔ وہ سابق وزیر اعظم کا بھانجا (یا بھتیجا) اور داماد تھا۔ وہ ''حاجی بابا اصفہانی'' کے مشہور مصنف جیمز موریئے کے ساتھ 7 مئی 1809ء کو تہران سے لندن روانہ ہوا تھا۔ اس کے سفر کا مقصد اس امر کی یقین دہانی حاصل کرنا تھی کہ ابتدائی سمجھوتہ کے مطابق برطانیہ ایران کو جو امداد دے رہا ہے وہ کب ملے گی اور ادائیگی کا طریقہ کار کیا ہو گا۔ وہ لندن سے واپس تہران 18 جولائی 1819ء کو روانہ ہوا۔ اس کے ساتھ جیمز موریئے اور مستشرق سر گور ڈز لی تھے۔ 1815ء میں وہ خصوصی ایلچی کی حیثیت سے سینٹ پیٹرس برگ گیا اور 1818ء میں ایک خاص مشن پر دوبارہ لندن پہنچا۔ بعد میں اسے غیر ملکی طاقتوں کے ساتھ تعلقات کے امور کا سربراہ بنا دیا گیا۔ یہ عہدہ 1834ء تک اس کے پاس رہا۔ اسی سال فتح علی شاہ کا انتقال ہوا۔ اس کے دوروں کے بارے میں متعدد انگریزی دستاویزیں موجود ہیں لیکن اس میں ایک نامکمل اور غیر مطبوعہ ڈائری بھی موجود ہے جو شیرازی نے خود لکھی۔ یہ ڈائری 1809-1810ء میں اس کے سفر انگلستان سے متعلق ہے۔ (50)

مغرب جانے والا دوسرا ایرانی ایلچی حسین خاں مقدم آجودان باشی تھا۔ وہ فوجی افسر تھا جو ترقی کر کے ایڈجوٹنٹ جنرل بن گیا۔ اسی وجہ سے اس کا عہدہ آجودان باشی کہلایا۔ 1838ء میں محمد شاہ نے اسے ایک مشن پر یورپ بھیجا۔ بظاہر اس کا مقصد تہران میں متعین برطانوی نمائندے سر جان میک نیل کو واپس بلانے کی درخواست کرنا تھا۔ وہ استنبول کے راستے ویانا اور پیرس پہنچا۔ وہاں سے لندن گیا جہاں وہ اپریل 1839ء میں پہنچا۔ معلوم ہوتا ہے کہ حسین خاں نے خود کوئی تحریر نہیں چھوڑی لیکن اس کے عملے کے ایک رکن نے اس سفر کی کہانی لکھی ہے۔ (51)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایران میں یہ احساس پیدا ہو گیا تھا کہ مغربی دنیا سے تعلقات استوار کرنے کے لیے تیاری کی ضرورت ہے۔

> ہم پیرس میں تھے تو میں نے کوئی ایسی کتاب حاصل کرنے کی کوشش کی جس میں آباد دنیا کے ممالک اور ان کے صحیح احوال موجود ہوں تاکہ ان صفحات پر ہر ملک کے بارے میں اس کا اقتباس پیش کیا جائے۔ ہم پیرس سے ایران روانہ ہو رہے تھے تو فرانسیسی حکومت کے ترجمان موسیو ژوانن تحفے کے طور پر جغرافیہ کی

ایک کتاب لائے جس میں ساری دنیا کا حال تھا...... میں نے جناب جبرئیل سے جو ہمارے وفد کے ترجمان اول تھے (کتاب کا) ابتدائی ترجمہ کرالیا...... درحقیقت چونکہ یورپی لوگ ہمیشہ دنیا کے تمام ملکوں کے حالات سے اپنے آپ کو باخبر رکھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اس لیے کافی عرصے سے وہ اپنے ماہرین دنیا کے تمام حصوں میں بھیج رہے ہیں تا کہ اصل حالات معلوم کریں (اس طرح) انہوں نے جو معلومات اکٹھی کی ہیں انہیں جغرافیہ کی اس کتاب میں جمع کر دیا ہے۔ اگر شہنشاہ معظم...... اس کتاب کے فارسی میں ترجمہ کا حکم صادر فرمائیں تو سلطنت ایران اور باشندگان اسلام کے لیے دائمی قدر و قیمت کا کام ہو جائے گا۔ (53)

یہ مسلم سفارتی نمائندے ہی یقیناً تنہا مسافر نہیں تھے جو اسلامی دنیا سے مغرب جاتے تھے۔ ازمنۂ وسطی کی طرح عیسائی اور یہودی آبادی کے لوگ مذہبی یا تجارتی مقاصد سے اس وقت بھی یورپ کا سفر کرتے رہتے تھے۔ ان میں سے موصل کا شالدی فرقہ کا ایک یہودی الیاس ابن حنا تھا جو 1668ء میں اٹلی، فرانس اور اسپین گیا اور وہاں سے امریکی نو آبادیات جانے کے لیے اس نے جہاز پکڑا۔ یقینی طور پر وہ مشرق وسطی کا پہلا آدمی تھا جو نئی دنیا پہنچا اور جس نے پیرو، پنامہ اور میکسکو کی سیر کی اور ان کے بارے میں لکھا۔ (53)

توقع کے عین مطابق یہودی ان معاشروں کی روایات ہی اپناتے تھے جہاں وہ رہتے تھے۔ قرون وسطے میں اور جدید دور کے سارے عرصے میں عیسائی دنیا میں رہنے والے یہودی اسلامی سرزمینوں میں بسنے والے یہودیوں کے مقابلے میں تعداد میں کم، ثقافتی لحاظ سے کمتر اور اہمیت کے اعتبار سے نچلے درجہ پر ہی رہے۔ یورپ سے یہودیوں کے مشرقی وسطے جانے کے بارے میں تحریریں تو ملتی ہیں لیکن مشرق وسطے سے یورپ کا سفر کرنے والے کسی یہودی کی داستان مشکل سے ہی ملتی ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ مقدس مقامات کی کشش ایسی تھی جس کی وجہ سے یہودی مغرب سے مشرق کی جانب جاتے ہوں۔ یہ لوگ سفارتی نمائندوں اور تاجروں کے مقابلے میں اپنے سفر کی داستانیں زیادہ لکھتے تھے۔ پھر بھی مشرقی یہودیوں کے یورپ جانے کے بارے میں کتابوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ ابن راقم ابن یعقوب، جو غالباً یہودی سے مسلمان ہوا تھا کی کتاب کے علاوہ صرف ایک ہی قابل ذکر کتاب اور ملتی ہے جو بیت المقدس کے

یہودی ربائی ہائم ڈیوڈا زولے کی ہے جس نے مغرب کا طویل سفر کیا تا کہ یہودی مدرسے کے لیے چندہ جمع کیا جائے۔ اس نے تین سفر کئے۔ پہلا سفر 1753 اور 1758ء کے درمیان کیا۔ یہ سفر اٹلی، جرمنی، ہالینڈ، انگلستان اور فرانس کا تھا۔ دوسرا سفر 1764ء میں انہی ممالک کا تھا۔ تیسرا سفر جو 1781ء میں کیا صرف اٹلی کا تھا۔ جہاں وہ لودنو کے مقام پر 1806ء تک رہا۔ اس نے اپنے پہلے سفر کے بارے میں ایک کتاب لکھی تھی جو ابھی چند سال قبل شائع ہوئی ہے یہ نادر نسخہ نیویارک میں جیوش تھیولوجیکل سمینری میں محفوظ ہے۔ (54)

ایسے تاجر بھی تھے اور ان مین مسلمان تاجر بھی شامل تھے، جو اسلامی دنیا سے یورپ گئے۔ اگرچہ اسلامی ملکوں میں یورپی باشندوں کی تعداد سے وہ کم ہی تھے۔ کم سے کم وینس میں ان کی کچھ اہمیت بھی تھی اور انہوں نے وہ مقام بھی حاصل کیا جو مسلمان یورپ میں شاذ و نادر ہی حاصل کرتے تھے۔ یعنی انہوں نے وہاں مستقل قیام کی اجازت حاصل کر لی۔ اسلامی دنیا میں یونانی زبان کا معرب لفظ فندق ان مکانوں یا سرائے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا جہاں انسانون کی رہائش ہوتی تھی، مویشی بھی باندھے جاتے تھے اور تجارتی سامان بھی رکھا جاتا تھا۔ قرون وسطے کے آخری برسون میں یورپی ملکوں کے مختلف تجارتی گروہوں کو اجازت دیدی گئی تھی کہ وہ مسلم ملکوں میں اپنے فندق قائم کرلیں۔ یہ فندق اپنے قومی اور علاقائی ناموں سے پکارے جاتے تھے۔ چنانچہ وہاں وینس، جے نیوا، فرانس اور دوسرے ملکوں کے الگ الگ فندق تھے۔

یورپ میں اس کا متبادل صرف ایک تھا۔ وہ تھا وینس میں (Fondaco dei Turchi) اس سے پتہ چلتا ہے کہ وینس میں ترک تاجروں کی ایک چھوٹی سی آبادی تھی۔ 1571ء میں ترکی اور وینس کے درمیان جنگ چھڑی تو وینس کی سینٹ نے یہ اطلاع ملنے پر کہ اس کے سفیر مرکانتونیو بر باور اور چند تاجروں کو استنبول میں گرفتار کرلیا گیا ہے فیصلہ کیا کہ ''وینس میں ترک باشندوں اور ان کے مال واسباب کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جائے تا کہ اپنے آدمی اور ان کا مال واسباب چھڑانے میں آسانی ہوجائے (55) یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ وہ آدمی کتنے تھے اور ان کا مال اسباب کتنا تھا۔ خیال ہے کہ ان کی تعداد اور سامان زیادہ ہی ہوگا کیونکہ 1571ء کے موسم بہار میں محمد پاشا نے وینس پیغام بھیجا کہ استنبول میں جو آدمی اور سامان ہے وہ اس سے اپنے آدمیون اور سامان کا تبادلہ کرنے کو تیار ہے۔ ترک تاجر جو وینس میں قید کئے گئے تھے ان میں سے چند یہودی بھی ہوں گے۔ وینس کی اطلاع کے مطابق مئی 1571ء میں قیدی رہا کر دیئے گئے اور

انہیں ریالتو میں کاروبار کرنے کی اجازت دیدی گئی۔ غالباً یہ رہائی اس سمجھوتہ کا حصہ تھی جس کے مطابق وینس کے باشندوں کو استنبول میں کام کرنے کی اجازت دیدی گئی تھی۔

وینس میں ترکوں کی موجودگی کی اطلاع اس وقت بھی ملتی ہے جب مغرب نے لیپانتو کے مقام پر ترکوں کے خلاف فتح حاصل کی تھی۔ اطالوی مورخوں کے مطابق ترک آبادی نے شور شرابہ شروع کر دیا تھا "غم واندوہ کے اس شور شرابہ میں وہی ڈرامائی انداز تھا جو مشرق والوں کا خاصہ ہے۔" اطالوی تاریخ میں لکھا ہے "ترک تاجر بھاگ کر اپنے گھروں میں چھپ گئے تھے۔ وہ چار دن گھر سے باہر نہیں نکلے۔ انہیں ڈر تھا کہ بچے انہیں پتھر ماریں گے۔"(56)

مارچ میں ترکی اور وینس کے درمیان سمجھوتہ طے پا جانے کے بعد کاروبار دوبارہ شروع ہو گیا۔ وینس میں عثمانی تاجروں کی تعداد بڑھ گئی اور اب ان میں مسلمانوں کی بھی خاصی تعداد تھی۔ 1587ء میں وینس کی سینٹ نے فیصلہ کیا کہ ترکی زبان کے ترجمانوں کی تعداد ایک سے بڑھا کر دو کر دی جائے۔ مسلم آبادی کی ضرورت پوری کرنے کے لیے وینس کے حکام نے ترکوں کو ویسا ہی فندق کھولنے کی اجازت دیدی جیسے مسلمان ملکوں میں تھے۔ اس کی مثال پہلے سے موجود تھی کہ جرمن تاجروں کو وینس میں "فونداکو دی تیدیشی" کھولنے کی اجازت دیدی گئی تھی۔ ایک اطالوی ذریعہ کے مطابق اگست 1573ء میں یعنی صلح نامہ کے فوراً بعد ترکوں نے درخواست کی کہ "کاروباری سہولت کے لیے انہیں بھی ایسی ہی اپنی کوئی جگہ بنانے کی اجازت دی جائے جیسے یہودی اپنی بستیوں میں بناتے ہیں۔" اگلے سال وینس میں رہنے والے یونانیوں نے چیف مجسٹریٹ کو لکھا کہ پورے شہر میں ترکوں کے پھیلنے سے ہنگامہ کا خطرہ ہے۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ وہ ترکوں کی عادات واطوار کو جانتے ہیں۔ انہوں نے لکھا کہ ترکی تاجر چوری کرنے، لڑکوں کو ورغلانے اور عورتوں کے ساتھ بیہودگی کرنے سے باز نہیں آئیں گے۔" اس لیے انہوں نے سفارش کی کہ جس طرح مشرق میں انہیں سہولتیں حاصل ہیں ترکوں کو بھی اپنی جگہ فراہم کر دی جائے۔"

وینس کی سینٹ نے 16 اگست 1575ء کو یہ سفارش منظور کر لی۔ 4 اگست 1579ء کو اینجل اور ستیزیا ویل انجلیو کو چند سال کے لیے فندق بنا دیا گیا۔ کچھ ہی عرصے بعد محسوس کیا گیا کہ تاجروں کی زیادہ تعداد اور زیادہ مال واسباب کے لیے وہ جگہ چھوٹی ہے۔ ایک ذریعہ نے لکھا ہے کہ یہ مکان صرف بوسنیا اور البانیہ کے تاجروں کے لیے کافی تھے ایشیائی ترک جو تعداد میں کم تھے

اپنی رہائش کے لیے دوسرے مقام اور نجی گھر تلاش کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک عام لوگ ترکوں کو بہت تنگ کرتے تھے کیونکہ اگست 1594ء میں حکام نے فرمان جاری کیا کہ جو بھی ترکوں کو زبانی یا عملی طور پر تنگ کرے گا اسے شہر سے نکال دیا جائے گا' قید کر لیا جائے گا یا غلام بنا کر بحری جہاز پر بھیج دیا جائے گا۔''

ادھر مسلمانوں کے فندق بنانے کی مخالفت بھی کی جا رہی تھی۔ فرانس کی حکومت کو اپریل 1602ء میں ایک گم نام درخواست ملی جس میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ اس کے خلاف دلائل دیئے گئے تھے۔ اس کے لیے مذہبی' سیاسی اور معاشی وجوہ بیان کی گئی تھیں۔ لکھا گیا تھا کہ ایک ہی مقام پر ترکوں کا اجتماع خطرناک ہے۔ اس سے مسجد بنانے اور محمد ﷺ کی عبادت'' (نعوذ باللہ) کرنے کا راستہ کھل جائے گا اور اس سے بھی بڑا ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا جو یہودیوں اور جرمن پروٹسٹنٹ لوگوں کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ ترکوں کی عیاشی والی عادتوں کی وجہ سے وہ علاقہ گناہوں کا گڑھ بن جائے گا اور سیہ کاریوں میں غرق ہو جائے گا۔'' ان کی موجودگی ترکوں کے سیاسی عزائم پورے کرنے کے کام بھی آئے گی کیونکہ ترکوں کے پاس زبردست بحری طاقت ہے اور ان کا طاقت ور سلطان ہے۔ وہ ملعون اور رہنماؤں سے عاری یہودیوں کے مقابلے میں وہ زیادہ بڑا خطرہ بن سکتے ہیں۔ اس سے کوئی تجارتی فائدہ بھی نہیں ہے کیونکہ ترکوں کے ذریعے جو اشیا استنبول سے آتی ہیں وہ بہت ہی کم قدر و قیمت کی ہوتی ہیں۔'' لیکن ان اعتراضات اور احتجاجوں کے باوجود فندق برقرار رہا بلکہ اسے مارچ 1612ء میں زیادہ بڑی جگہ پر منتقل کر دیا گیا۔ کشادہ مقام مل جانے کے بعد ایشیائی ترکوں کو بھی نجی گھروں سے وہاں پہنچا دیا گیا۔ لگتا ہے کہ ایشیائی ترکوں کی طرف سے اس کے خلاف تھوڑی بہت مزاحمت کی گئی تھی۔ چنانچہ بوسنیا اور البانیہ کے ترکوں اور قسطنطنیہ کے ترکوں کے درمیان امتیاز قائم رہا۔

سترھویں اور اٹھارویں صدی کے دوران میں فندق کی سرگرمیاں ماند پڑتی نظر آتی ہیں۔ کبھی کبھی تو وہ بالکل ہی بند ہو جاتے ہیں کیونکہ وینس اور ترکی کے درمیان معاندانہ سرگرمیاں تیز ہو جاتی ہیں۔ پھر جب انہیں دوبارہ کھولا جاتا ہے تو اس میں کافی تاخیر ہو جاتی ہے اور عثمانی تاجر بہت دیر سے اور کم تعداد میں واپس آتے ہیں۔ مالکوں کے پاس یہ شکایت بھی جاتی ہے کہ ان کی عمارتیں گرائی جا رہی ہیں۔ وہ مرمت کرانے سے اس لیے انکار کر دیتے ہیں کہ مسافروں کی کم تعداد کی وجہ سے یہ کاروبار منافع بخش نہیں رہا۔ 1740ء میں کہیں جا کر ان کی مرمت کی گئی۔

پچاس مسافروں کی طرف سے ایک درخواست گزاری گئی کہ فندق کے کرائے بہت زیادہ اور سہولتیں بہت کم ہوگئی ہیں۔ آخر بہت بحث وتمحیص اور سرکاری معائنہ کے بعد یہ شکایت دور کی گئی۔

اس بات کی شہادت بھی ملتی ہے کہ سترہویں صدی کے آخر میں وینس میں ترک تاجروں کی آبادی بتدریج کم ہوگئی تھی۔ یقیناً اس کی وجہ وہ اقتصادی بحران تھا جس نے سترہویں اور اٹھارویں صدی میں عثمانی معیشت کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ عثمانی تجارت صرف خام مال تک محدود ہوکر رہ گئی تھی۔ 1699ء میں کارلوٹز کے معاہدے کے بعد ترک تاجر آہستہ آہستہ وینس واپس پہنچے۔ وہ اپنا مال ایجنٹ کے ذریعہ بھیجنا پسند کرتے تھے۔ اس طرح وہ کافروں کی سرزمین پر قیام کرنے سے بچ جاتے تھے۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں جب عثمانی تاجر واپس پہنچے تو ان کی شکل بدل چکی تھی۔ جنہیں ایشیائی ترک کہا جاتا تھا اور جن کی تعداد ویسے ہی کم تھی اب بالکل ہی معدوم ہوگئے۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں جن تاجروں کا ذکر آتا ہے وہ بلقان کے تھے۔ اب ان مہمانوں کے معیار میں بھی فرق پڑ گیا۔ 1750ء میں فندقوں کے مالک دیکھ رہے تھے کہ نئے آنے والے ترکوں میں زیادہ تعداد مالکوں سے زیادہ ملازموں کی ہے۔ (58)

وینس کے انتہا پسندوں سے ان مہمانوں کے جان و مال کو بچانا مسلسل پریشانی کا باعث رہا۔ 1612ء میں ایک قانون بنایا گیا جس میں ان مہمانوں کو زبانی یا عملی طور پر نقصان پہنچانے والوں کو سخت سزائیں دینے کا اعلان کیا گیا۔ مختلف دستاویزوں میں تواتر کے ساتھ ایسے حوالے ملتے ہیں کہ ان مہمانوں کو وہاں کے باشندوں کی گالی گلوچ سے بچانا آسان کام نہیں تھا۔ وینس کی تجارت کا دارومدار مشرقی علاقون اور شمالی افریقہ کے مال پر تھا۔ اگر اسے مسلمانوں کی موجودگی برداشت کرنے میں دشواری پیش آ رہی تھی تو قیاس کیا جاسکتا ہے کہ دوسرے ملکوں کا کیا حال ہوگا۔ وہاں تو ان کی حفاظت ممکن ہی نہیں تھی۔ اسپین سے سویڈن تک شاہی یا مقامی فرمان کے ذریعہ مسلمانوں اور یہودیوں کا داخلہ ممنوع قرار دیدیا گیا تھا اور انہیں اپنی بستی بسانے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ 1713ء میں الریشٹ کے معاہدہ کے تحت اسپین جبرالٹر سے انگلستان کے حق میں دستبردار ہوگیا تھا لیکن اس معاہدہ میں یہ شرط رکھی گئی تھی کہ ”ملکہ برطانیہ کیتھولک بادشاہ کی درخواست پر اس امر سے اتفاق کرتی ہیں کہ کسی بھی بہانے یہودیوں اور موروں (مسلمانوں) کو مذکورہ جبرالٹر شہر میں رہائش رکھنے کی اجازت نہیں دی جائے گی“، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ملکہ برطانیہ کے گورنر نے شروع سے ہی اس عہد کی پاسداری نہیں کی۔ (59)

دوسرے علاقوں میں یہ تھا کہ یورپی ممالک اسی طرح مسلمانوں کا استقبال کرنے سے گریز کرتے تھے جیسے مسلمان یورپی ممالک جانے سے کتراتے تھے۔ حتیٰ کہ مشرقی وسطیٰ کے دوسرے مذاہب کے لوگ بھی یورپ جانے سے گھبراتے تھے۔ شمالی افریقہ کے یہودیوں کی ایک معمولی تعداد اٹلی یا ویانا میں آباد ہو گئی تھی لیکن وہ لوگ اپنے عثمانی وطن سے رابطہ ضرور رکھتے تھے۔ وینس میں فندق میں رہنے والے ترکوں کے علاوہ بعد میں ترکوں کے ایک چھوٹے سے گروہ کا مارسیلز اور ویانا میں بھی پتہ ملتا ہے۔ چند مسلمان تجارت یا دوسری وجوہ کی بنا پر وہاں زیادہ عرصے قیام پذیر رہے۔ دونوں علاقوں کی صورت حال کا اندازہ پناہ گزینوں کی نقل و حرکت سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ عیسائی ملکوں سے یہودی اور مخالف فرقے کے عیسائی فرار ہو کر مسلم علاقوں میں پہنچے لیکن ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ مسلم علاقوں سے اس طرح کا کوئی انخلا ہوا ہو۔ اگر کچھ لوگ یورپ گئے بھی ہوں تو ان کی تعداد بہت ہی کم تھی۔ بازنطینی سلطنت کے زوال کے بعد یونانی عیسائیوں کی ایک مختصر سی تعداد یونان سے ترک وطن کر کے اٹلی گئی۔ بعد میں لبنان کے مارونی عیسائیوں کے چند گروہ، چند آرمینائی اور یونانی عیسائی روم، وینس اور دوسرے یورپی شہریوں میں آباد ہو گئے۔ مشرقی عیسائیوں کے لیے مسلمانوں کے ملک میں آباد ہونا زیادہ آرام دہ تھا بہ نسبت عیسائی ملکوں کے، جہاں کی آبادی متحارب فرقوں میں بٹی ہوئی تھی۔

مشرق سے مغرب کی طرف جانے والا صرف ایک گروہ کسی حد تک قابل ذکر ہے۔ یہ تھے چند عثمانی شہزادے جو خاندانی چپقلش کے باعث پناہ لینے یا امداد حاصل کرنے یورپ پہنچے لیکن انہیں ہمیشہ ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔(60) ان میں سے سب سے زیادہ مشہور سلطان محمد فاتح کا بیٹا شہزادہ جم تھا جو بایزید ثانی کا بھائی تھا(61) تخت نشینی کی جنگ میں ناکام ہونے کے بعد شہزادہ جم نے جزیرہ رہوڈز میں پناہ لی جہاں اس وقت سینٹ جان کے سورما حکومت کر رہے تھے۔ شہزادہ کے ہمراہ اس کے رفقا کا ایک چھوٹی سا گروہ تھا جس میں غالباً ایک شخص حیدر بھی تھا۔ اس شخص نے اپنی سرگزشت بھی چھوڑی ہے جو ممکن ہے عیسائی ملک جانے والے کسی ترک باشندے کی پہلی تحریر ہو۔ اس نے فرانس اور اٹلی کے لوگوں اور مقامات کے بارے میں مختصر طور پر جو لکھا ہے اس میں حیرت، بدمزگی اور بے اعتنائی کے ملے جلے تاثرات ملتے ہیں۔

شہزادہ نیس کے شہر میں چار مہینے رہا اور لگتا ہے کہ اس نے وہاں خاصہ لطف اٹھایا۔ اس کی تفریح میں رقص کی محفلیں بھی شامل تھیں جہاں مذکورہ سرگزشت کا مصنف بھی موجود ہوتا تھا۔

بعد میں آنے والے مسلمان سیاحوں کی طرح یورپ کے اس عجیب و غریب شوق پر اسے شدید صدمہ ہوتا ہے۔

وہ شہر کی دو شہزادوں کو لے آئے اور مرغوں کی طرح ان کے گرد چکر لگانے لگے۔ ان کی رسم کے مطابق عورتیں شائستگی کے ساتھ اپنے آپ کو ڈھانپ کر نہیں رکھتیں بلکہ اس کے برعکس وہ پیار کرنے اور بغل گیر ہونے میں فخر محسوس کرتی ہیں۔ جب وہ اپنے اس کھیل سے تھک جاتی ہیں اور انہیں آرام کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو وہ کسی اجنبی مرد کے زانو پر بیٹھ جاتی ہیں۔ ان کی گردن اور کان ننگے ہوتے ہیں۔ ان میں سے بہت سی خوبصورت لڑکیوں کے ساتھ شہزادے کے تعلقات بھی تھے۔ نیس میں ہی شہزادے نے یہ شعر کہا۔

کیسا شاندار شہر ہے نیس

جو انسان وہاں قیام کرتا ہے وہ جو جی چاہے کر سکتا ہے (62)

بعد میں پوپ انوسینٹ ہشتم کے سورماؤں نے یہ مناسب سمجھا کہ "عیسائی دنیا کی بھلائی کے لیے شہزادہ کو روم بھیج دیا جائے۔ وہاں وہ 4 مارچ 1489ء کو پہنچا۔ دس دن بعد پوپ نے اس کا شایان شان استقبال کیا۔ لیکن بعد میں وہ اپنے عیسائی نگرانوں کے درمیان انسان کے بجائے سودے بازی کا مال بن گیا۔ 1494ء میں فرانسیسی بادشاہ چارلس ہشتم روم گیا اور شہزادے کو پوپ سے اپنی تحویل میں لے لیا۔ نیپلز کے خلاف جنگ میں وہ بادشاہ کے ساتھ تھا لیکن راستے میں ہی بیمار پڑ گیا اور 25 فروری 1495ء کو نیپلز میں اس کا انتقال ہو گیا۔ یہ افواہ بھی تھی کہ اسے پوپ کے حکم سے زہر دے دیا گیا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ زہر ترک سلطان کے حکم سے دیا گیا۔ جلاوطن شہزادے نے ایک وصیت بھی چھوڑی جس میں اس نے لکھا کہ اس کی طبعی موت کا اعلان کر دیا جائے تاکہ اسلام پر حملہ کرنے کے لیے کافر اس کا نام استعمال نہ کریں۔ اس نے یہ بھی درخواست کی تھی کہ اس کا بھائی اس کی میت عثمانی سرزمین پر لے جائے، اس کے قرضے ادا کرے اور اس کی ماں، بیٹی اور دوسرے گھر والوں کی نگہداشت کرے۔" اس کی خواہش پوری کر دی گئی۔

فرنگیوں میں شہزادہ جم کی مہمات کی چند یادداشتیں ترکوں کے پاس موجود ہیں۔ بہرحال وہ ایک ترک شہزادہ تھا۔ وہ شاعر بھی تھا۔ اس کی شاعری کے دو دیوان موجود ہیں۔ ایک فارسی میں اور ایک ترکی میں۔ مذکورہ یادداشتوں کے علاوہ چند اور دستاویزیں بھی شہزادے نے

چھوڑیں ان میں اس کے چند خط بھی ہیں جو ترکی کے محافظ خانے ہیں محفوظ ہیں۔ وہیں ایک عثمانی جاسوس کی مختصر رپورٹ بھی ہے جسے شہزادہ کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے کے لیے استنبول سے بھیجا گیا تھا۔

ایک اور کم مشہور شخص لبنان کا شہزادہ فخر الدین معین تھا۔ وہ حالات کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لینے والا انسان تھا۔ کبھی اسے مسلم کہا جاتا ہے کبھی دروز اور کبھی عیسائی۔ اس نے عثمانی احکام کی خلاف ورزی کی تو اسے جبراً جلاوطن کر دیا گیا۔ اس نے 1613ء سے 1618ء تک دو سال اٹلی میں بسر کیے۔ پہلے وہ لورنیو پہنچا اس کے بعد اس نے اپنا زیادہ وقت فلورنس میں گزارا جہاں سے وہ سسلی گیا اور آخر میں نیپلز گیا اور پھر وطن چلا گیا۔ اس کے سوانح نگار نے اس کے سفر اور تاثرات ایک کتاب میں لکھے ہیں۔ یہ تاثرات غالباً اس کی زبانی سن کر لکھے گئے ہیں۔ یورپ میں اس کے قیام سے اس پر جو اثرات پڑے ان کا اظہار کئی طرح سامنے آتا ہے۔ اس نے بیروت میں اطالوی طرز کا محل تعمیر کیا۔ مختلف شعبوں میں کام کرنے والے اطالوی ماہرین وہ اپنے ساتھ لایا۔ اور سب سے دلچسپ اختراع اس نے یہ کی کہ اپنے بچوں کے لیے فلورنس میں رقم جمع کرائی۔ (63)

لیکن سفارتی نمائندوں کے علاوہ یورپ کا سفر کرنے والے دوسرے عثمانی باشندوں کا بس یہی ریکارڈ ملتا ہے۔ وینس میں رہنے والی ترک آبادی کے بارے میں وینس کی دستاویزیں ہماری مدد کرتی ہیں۔ جو ترک ذرائع ہمارے سامنے آئے ہیں۔ ان کا ذکر نہ ہونے کے برابر ہے۔ ظاہر ہے ترک روزنامچے لکھنے والے جن حلقوں سے تعلق رکھتے تھے ان کے لیے بلقان کے تاجروں کی نقل و حرکت کوئی دلچسپی نہیں رکھتی تھی۔ صرف اس وقت ان کا ذکر آجاتا تھا جب عثمانی حکومت اپنے باشندوں کی حفاظت کے لیے کوئی اقدام کرتی تھی۔

سفارتی نمائندوں، تاجروں اور زائرین کے علاوہ ایک طبقہ ایسا بھی ضرور ہوگا جو مغرب کی معلومات یہاں پہنچاتا ہوگا۔ وہ تھا جاسوسوں کا طبقہ لیکن ان کی سرگرمیوں کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔ ظاہر ہے وہ جاسوس ہی کیا ہوئے جن کی سرگرمیاں ظاہر ہو جائیں۔ اس لیے جاسوس اداروں کی سرگرمیوں کی دستاویزیں عام طور پر ظاہر نہیں کی گئیں۔ تاہم چند اشارے ایسے ملتے ہیں کہ مسلم ممالک عیسائی ملکوں میں کچھ نہ کچھ جاسوسی ضرور کراتے تھے۔ لیکن یہ کام مسلم ملکوں میں عیسائیوں کی جاسوسی کے مقابلے میں بہت محدود اور غیر موثر تھا۔

کہیں کہیں خوش قسمتی سے ان جاسوسوں کی سرگرمیاں ہمارے سامنے آ جاتی ہیں جو مغرب بھیجے گئے اور انہوں نے کوئی کام کیئے۔ ایک جاسوس کی مثال تو پیش کی جا چکی ہے کہ اسے 1484ء میں شہزادہ جم کی نگرانی کے لیے بھیجا گیا تھا اور اس نے اس بارے میں رپورٹ دی تھی۔ سلطان کے بھائی (جو ناکام باغی تھا) کی آمد نے عیسائی ممالک کو ایک بہترین واقع فراہم کیا تھا۔ یورپ میں شہزادہ کے بارہ سالہ قیام کے دوران میں وہ متعدد سازشوں کا مرکز بنا رہا۔ ان سازشوں کا مقصد یہ تھا کہ عثمانی سلطنت کے خلاف اسے استعمال کیا جائے۔ قدرتی بات ہے کہ سلطان کو شہزادے پر نظر رکھنے کی ضرورت تھی۔ ایسے حوالے بھی ملتے ہیں کہ ترک سلطان نے سفارتی اور جاسوسی ذرائع سے یہ کوشش کی کہ شہزادے کو تلاش کیا جائے' اسے گرفتار کیا جائے یا اسے ختم کر دیا جائے۔ توپ کاپی کے عجائب گھر میں شہزادہ جم سے متعلق جو دستاویزیں موجود ہیں ان میں ایک ترک بحری کپتان بارک کی رپورٹ بھی ہے۔ اسے اٹلی اور پھر فرانس بھیجا گیا تھا جہاں اس نے گمشدہ شہزادہ کو تلاش کر لیا۔ عثمانی حکومت کے تمام محکموں میں بحری کپتان ہی یقیناً ایسا شخص ہو سکتا ہے جو یورپی زبانیں جانتا ہو گا اور یورپ کے حالات سے واقف ہو گا۔ اس کے لیے یورپی شہروں کا سفر بھی آسان ہو گا کیونکہ اس کی طرف کسی کی توجہ ہی نہیں ہو گی۔ اس کی رپورٹ ایک قسم کی سرگزشت معلوم ہوتی ہے جو اس کے سفر اور اس کی منزل کا احوال ہے۔ ممکن ہے اس نے زبانی طور پر ہی سارے واقعات بیان کر دیئے ہوں۔ (64)

ایک اور دلچسپ شخصیت پہلے ترک ایلچی کی ہے جو انگلستان گیا۔ اس کا نام مختلف انداز میں سامنے آتا ہے لیکن زیادہ تر اسے گیبریل دی فرنز کہا گیا ہے۔ وہ فرانس کا باشندہ تھا لیکن اس کا تعلق مشرق وسطے سے بھی تھا کیونکہ اس کے والد اسکندریہ میں فرانسیسی قنصل رہ چکے تھے۔ وہ لڑکا ہی تھا کہ اسے ڈالمیشیا (یوگوسلاویہ کا شہر) کے قزاقوں نے گرفتار کر لیا اور ترکوں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ وہاں اس نے اسلام قبول کر لیا اور اپنا نام محمود عبداللہ رکھا۔ اس نے سلطان کی ملازمت کی۔ وہ جاسوسی کے کاموں کے لیے زیادہ کارآمد تھا۔ (65)

لیکن عیسائی ممالک اس معاملے میں بہت آگے تھے۔ ان کے پاس ایسے افراد تھے۔ جو مشرق وسطے کی زبانیں جانتے تھے۔ ابتدائی زمانوں سے ہی مشرق وسطے میں ان کی مستقل آبادی تھی۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ اسلامی ملکوں میں ایک بڑی تعداد ان مقامی عیسائیوں کی تھی جو ان کے ہمدرد بن سکتے تھے۔ جو معلومات چھن چھن تک ہم تک پہنچی ہیں ان سے

پتہ چلتا ہے کہ بازنطین شہنشاہوں سے جدید عیسائی مملکتوں تک اسلامی سلطنت کے یورپی مخالف وسیع پیمانے پر جاسوسی کی سرگرمیوں میں ملوث رہے ہیں۔

مسلمانوں کو بھی اس کی اتنی ہی ضرورت تھی لیکن انہیں اتنے مواقع نصیب نہیں تھے۔ عیسائی یورپ میں مسلمان آبادیاں نہیں تھیں۔ مسلمانوں کے ہاتھ سے چھن جانے والے ملکوں جیسے اسپین اور پرتگال میں جو مسلمان رہ گئے تھے ان کا جلد ہی صفایا کر دیا گیا۔ بعض شہادتیں ایسی ملتی ہیں کہ سولہویں صدی میں عثمانیوں کو اسپین میں چند یہودی ہمدرد مل گئے تھے لیکن وہ کس حد تک کام آئے؟ یہ پتہ نہیں چلتا۔ ترکوں کے مستقبل قیام پذیر لوگ یورپ میں نہیں تھے اور وہاں جانے والے ان کے مسافر بھی بہت کم تھے اس لیے انہیں یورپی لوگوں اور یورپ کے حالات کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں تھیں۔ ان کے پاس جو معلومات تھیں ان کے ذرائع دو تھے۔ وہ یہودی جو تازہ تازہ یورپ سے آئے تھے یا پھر وہ غدار اور مہم جو عیسائی جو کسی نہ کسی مسلمان حکمرانوں کی ملازمت میں آ گئے تھے۔

جو دستاویز محفوظ رہ گئی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کس قسم کے لوگ تھے اور ان کا علم کتنا تھا جو وہ پیش کر سکتے تھے۔ چودہویں صدی کے مصری مصنف عمری کی کتاب میں یورپ کی ان مملکتوں کا احوال موجود ہے جو اس کے بقول اس نے جے نیوا کے ایک باشندے نے سنا۔ اس کا نام اس نے بلبن لکھا ہے۔ بلبن کو اس نے آزاد کیا ہوا غلام بتایا ہے۔ بلبن اپنے آپ کو دومنی چنیوا اور تاربو کا بیٹا (تحریر پڑھی نہیں جاتی) کہتا ہے جو جے نیوا کے ممتاز گھرانے دوریا سے تعلق رکھتا تھا۔ عمری کا بیان شہنشاہ اور شاہ فرانس کے ذکر سے شروع ہوتا ہے' پھر فرانس کے علاوہ پراونس اور اٹلی کی ریاستوں کا تذکرہ کرتا ہے' شام میں فرنگیوں کی آمد و رفت کا حوالہ دیتا ہے اور آخر میں معذرت کرتا ہے کہ اسے یہ سب کچھ لکھنا پڑا۔

> ہم نے فرنگیوں کے حالات کا مختصر تذکرہ محض اس لیے کیا ہے کہ وہ اس موضوع کے دائرہ میں آتا ہے جس کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے اور جو فرنگیوں کی سرزمین کی اقلیم سے تعلق رکھتا ہے ورنہ وہ اس کتاب کے دائرہ سے خارج ہے اگرچہ وہ بالکل ہی بے کار بھی نہیں ہے۔(66)

مسلمانوں کے یورپ جانے کے راستے میں عملی کے ساتھ نظریاتی رکاوٹیں بھی تھیں۔ چودہویں صدی میں ہی پہلے وینس اور راگوسا نے اور بعد میں مارسیلز اور دوسرے عیسائی ملکوں نے

اپنی بندرگاہوں پر طاعون سے حفاظت کے انتظامات شروع کر دیئے تھے۔ بعد میں یہ ایک قاعدہ ہی بن گیا۔ اس کے تحت عثمانی ملکوں سے آنے والوں کو بندرگاہوں پر چالیس دن قرنطینے میں رہنا پڑتا تھا۔ پندرھویں صدی میں وینس کے حکام نے یہ پابندی سخت کر دی تھی۔ چونکہ یورپ اور مشرق میں حفظان صحت کے انتظامات میں بہت فرق تھا اس لیے یورپ نے اپنے آپ کو بیماریوں سے بچانے کے لیے یہ بندوبست کیا تھا۔ اس کا اطلاق مذہب قومیت یا حیثیت کے امتیاز کے بغیر سب پر ہوتا تھا۔ سفیر ہوں یا بڑے تاجر، مسکین زائرین ہوں یا وطن واپس آنے والے معززین یا مسلمان سب کو اس کی پابندی کرنا پڑتی تھی۔ اکثر مسلم سفیروں نے اس بارے میں لکھا ہے کیونکہ یہ اقدام یقیناً توہین آمیز بھی تھا اور پریشان کن بھی۔ سب سے زیادہ بے عزتی کی بات یہ تھی کہ جب یہ لوگ قرنطینہ میں بند ہوتے تھے تو مقامی لوگ وہاں آ کر ان کا تماشہ دیکھتے تھے۔ محمد کچھ دنوں کے لیے جنوبی فرانس کے مقام سیتے میں بند رہا۔ وہ کہتا ہے جب میں نے چہل قدمی شروع کی تو مردوں اور خاص طور سے عورتوں کا ہجوم مجھے دیکھنے کھڑا ہو گیا...... عورتیں دس دس کے گروہ میں آئیں اور سورج غروب ہونے کے پانچ گھنٹے بعد تک کھڑی رہیں...... آس پڑوس کی تمام معزز خواتین...... سیتے میں آ گئیں، مجھے ایک نظر دیکھنے" (67) واصف آفندی لکھتا ہے کہ کس طرح "لزاریتو کے ہجوم نے اسے گھیر لیا۔ تماشبین جو آس پاس سے آئے تھے ہمیں دور سے سلام کرتے رہے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں ہمارے جیسے لوگ اور ہمارے جیسے لباس نہیں دیکھے تھے اس لیے وہ حیران ہو رہے تھے۔' (68) بعض اوقات سفیروں سے اس بے عزتی کی معافی بھی مانگی جاتی تھی۔ چنانچہ 1790ء میں عزمی نے برلن سے لکھا "جنرل بذات خود ہمارے گھر آیا اور کہا۔ آپ کے لیے قرنطینہ میں رہنا ضروری نہیں تھا لیکن اگر ہم آپ کو قرنطینے میں نہ رکھتے تو عام لوگ باتیں بناتے۔ ان الفاظ کے ساتھ اس نے جانے کی اجازت چاہی" (69) کچھ عرصے کے لیے یہ قرنطینہ عیسائی اور مسلم دنیا کے قریبی تعلقات کی راہ میں بڑی رکاوٹ بن گیا۔ اس قرنطینے کا جو نفسیاتی اثر ہوا اس کا بیان مشرق جانے والے اوائل انیسویں صدی کے ایک انگریز سیاح نے اس طرح کیا ہے۔

> "دو سرحدی شہر تو توپ کے گولے کی مسافت سے بھی کم فاصلے پر ہیں لیکن ان کے لوگوں کے درمیان میل جول نہیں ہے۔ شمال میں ہنگری والے اور ترک اور سرد کے جنوب کے سروین ایک دوسرے سے ایسے جدا ہیں جیسے ان دونوں کی

راہ میں پچاس وسیع صوبے حائل ہو گئے ہوں۔ سیملن کی سڑکوں پر میرے اردگرد جو لوگ چل پھر رہے تھے۔ ان میں سے غالباً ایک بھی ایسا نہیں تھا جو کبھی اس اجنبی نسل کو دیکھنے گیا ہو جو سامنے قلعہ میں رہائش پذیر ہے۔ یہ طاعون اور طاعون کا خوف ہے جس نے لوگوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہے۔ زرد پرچم کی دہشت نے سارا آنا جانا ممنوع کر دیا ہے۔ اگر آپ قرنطینے کا قانون توڑنے کی جرأت کریں گے تو فوجی سرعت کے ساتھ آپ پر مقدمہ چلایا جائے گا۔ اور عدالت پچاس گز دور منبر سے چیخ چیخ کر آپ کو سزا سنائے گی۔ پادری آپ کے کانوں میں زیرِ لب مذہب کی شیریں خوش خبری ڈالنے کے بجائے عاشقوں کی تلوار بازی (Duelling) کے فاصلے سے آپ کو تسلی کے بول سنائے گا۔ اور اس کے بعد آپ اپنے آپ کو احتیاط کے ساتھ گولی کا نشانہ بنا ہوا اور بے احتیاطی کے ساتھ لزاریتو کی زمین میں دفن کیا ہوا پائیں گے۔

جب ہماری روانگی کے تمام انتظامات مکمل ہو گئے تو ہم قرنطینہ کی جگہ کے قریب گئے وہاں آسٹریا کی حکومت کا ''اپنی جان خطرے میں ڈالنے والا ایک افسر'' ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ اس کا منصبی فریضہ یہ تھا کہ سرحدی راستے کی نگرانی کرے۔ وہ اس وجہ سے مستقل ''ملک بدری'' کی حالت میں رہتا تھا۔ ''جان خطرے میں ڈالنے والے ملاحوں' کے ساتھ کشتیاں بھی تیار کھڑی تھیں۔''

عثمانی سلطنت سے تعلق رکھنے والی کسی بھی مخلوق سے ملنے کے بعد آسٹریا کے علاقے کی طرف واپسی اس وقت تک ناممکن ہے جب تک لزاریتو میں چودہ دن کی قید نہ بھگت لی جائے۔ اس لیے ہم نے محسوس کیا کہ روانگی سے قبل یہ احتیاط لازمی ہے کہ سفر کی تیاری میں کوئی بھی ضروری انتظام فراموش نہ کیا جائے۔ چنانچہ اس قسم کی کسی بھی بدمزگی سے بچنے کے لیے ہم سیملن سے اس سنجیدگی اور بردباری کے ساتھ رخصت ہوئے جیسے زندگی سے رخصت ہو رہے ہوں۔ چند مہربان لوگ جن سے ہمیں اپنے مختصر قیام کے دوران میں محبت و شفقت ملی وہ دریا تک ہمیں الوداع کہنے آئے۔ جس وقت ہم ''جان خطرے میں ڈالنے والے' افسر کے پاس تین یا چار گز کے فاصلے پر کھڑے تھے تو انہوں

نے ہم سے دریافت کیا کہ کیا ہمیں یقین ہے کہ ہم نے عیسائی ملک میں اپنے تمام معاملات نبٹا لیے ہیں اور کیا بوقت رخصت ہماری کوئی خواہش اور نہیں ہے؟ ہم نے اپنے خدام سے بھی اس بارے میں دریافت کیا اور مضطرب دماغ کے ساتھ سوچا کہ کہیں ہم سے کوئی بھول چوک نہ ہو جائے کہ ہم ان کی مہربانی سے محروم ہو جائیں۔ ہم نے خدام سے پوچھا کہ کیا تمہیں پورا یقین ہے کہ ہم کوئی چیز نہیں بھولے؟ کیا کوئی ایسا معطر صندوقچہ تو نہیں ہے جس میں سنہری حروف والا لیٹر آف کریڈٹ ہوا اور ہم اس سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہے ہوں؟ نہیں ہمارے خزانہ کا ایک ایک حصہ حفاظت کے ساتھ کشتی میں رکھ دیا گیا تھا اور ہم۔ ہم سوار ہونے کو تیار تھے۔ اب ہم نے اپنے دوستوں سے ہاتھ ملایا اور وہ فوراً تین چار قدم پیچھے ہٹ گئے تاکہ ان کے اور اپنی جان خطرے میں ڈالنے والے افسر کے بیچ محتاط مقام پر کھڑے ہو جائیں۔ اب موخر الذکر (شخص) آگے بڑھا اور ایک بار پھر دریافت کیا کہ آیا ہم نے مہذب دنیا کو خیر باد کہہ دیا؟ پھر اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اپنا ہاتھ اس سے ملایا اور وہ عمل ہمارے لیے آنے والے کئی دنوں تک عیسائی دنیا کا خاتمہ تھا۔ (70)

اپنی جان خطرے میں ڈالنے والا (Compromised) افسر وہ ہوتا تھا جو ان افراد یا اشیا کے ساتھ رابطہ رکھتا تھا جن کے بارے میں شبہ ہوتا تھا کہ ان میں بیماری کے جراثیم ہوں گے عام قاعدہ کی رو سے ساری عثمانی سلطنت مستقل اس ہولناک پابندی کی زد میں آتی تھی۔ زرد پرچم قرنطینہ کی نشانی تھا۔

عجیب بات ہے کسی بھی مسلمان سیاح کی طرف سے یورپ کے بارے میں پہلی مفصل روداد مشرق وسطےٰ یا شمالی افریقہ کے کسی ملک سے نہیں آئی بلکہ بہت دور ہندوستان سے آئی۔ ادھر ترکی اور ایران کے حکمراں مشرق وسطےٰ میں سرزمین اسلام میں یورپ کی پیش قدمی روکنے کی سر توڑ اور کسی حد تک کامیاب کوشش کر رہے تھے تو دور افتادہ اسلامی سرزمین (ہندوستان) اپنی جنگ ہار چکی تھی اور غیر ملکی حکومت کے زیر تسلط آ چکی تھی۔ روسی اور برطانوی سلطنتوں کی پیش قدمی سے شمالی اور جنوبی ایشیا کے لاکھوں مسلمان ان کے تسلط میں آ گئے تھے۔ پہلی بار یورپی لوگوں کے ساتھ مسلمانوں کی ملاقات محض ہمسایہ یا مہمان کی حیثیت سے نہیں بلکہ آقا کی حیثیت سے ہو رہی تھا۔

مسلمانوں کے لیے یہ اپنا نفس مارنے والا تجربہ تھا لیکن ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جو ان نئے اور اجنبی لوگوں کا وطن دریافت کرنے نکل کھڑے ہوئے جو مغرب سے ان کے پاس آئے تھے۔

ہندوستان سے برطانیہ جانے والے دو ہندوستانی مسلمان مہمان خاص طور سے بہت دلچسپ ہیں۔ ان میں سے پہلے شیخ اعتصام الدین تھے۔ یہ بنگالی مسلمان تھے جو 1765ء میں انگلستان گئے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ پہلے ہندوستانی تھے جو لندن گئے تھے۔ انہوں نے اپنے سفر کی روداد فارسی میں لکھی۔ اس میں ان مقامات کا احوال ہے جو انگلستان اور سکاٹ لینڈ میں انہوں نے دیکھے۔ اور مذہبی اور معاشرتی اداروں اور رسوم ورواج، تعلیم، قانون، فوجی امور اور تفریحی مقامات کے بارے میں بھی ان کے تبصرے موجود ہیں۔ اس میں سینٹ جیمز کا محل اور ایوان پارلیمنٹ کا تذکرہ بھی ہے۔ شیخ اعتصام الدین فرانس کے راستے انگلستان پہنچے تھے۔ انہوں نے فرانسیسی لوگوں کی عادات اور رسوم ورواج پر بھی اپنے سفرنامے میں لکھا۔

دوسرے سیاح جو پہلے سے بھی زیادہ دلچسپ ثابت ہوئے وہ تھے مرزا ابوطالب خاں وہ 1752ء میں لکھنو کے ایرانی ترک گھرانے میں پیدا ہوئے۔ وہ انگریزوں کے افسر مال تھے۔ 1799ء اور 1803ء کے دوران میں انہوں نے یورپ کی خوب سیر کی اور واپسی پر اپنے اس سفر پر ایک کتاب لکھی۔ کتاب تو فارسی میں لکھی گئی ہے لیکن چونکہ ان کے مدنظر یورپی قاری بھی تھے۔ اس لیے یورپی حکومت کی رعایا اور یورپی حکومت کے ایک ملازم کی حیثیت سے انہوں نے یورپ کو جس نظر سے دیکھا دوسرے مسلمان لکھنے والے اس نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ ابوطالب خاں نے اپنا سفر آئرلینڈ سے شروع کیا اور اپنا زیادہ وقت لندن میں گزارا۔ وہ فرانس، اٹلی اور مشرق وسطیٰ کے راستے واپس آئے۔ سرزمین اسلام کے دوسرے مسافروں کے برعکس انہوں نے ان ملکوں اور قوموں کے بارے میں زیادہ تفصیل سے لکھا ہے۔ (72)

سلطان سلیم ثالث نے جو اصلاحات شروع کیں ان کے نتیجے میں مسلمانوں کے سفر کا ایک نیا دور شروع ہو۔ 1792ء میں سلطان نے ترکی کو عام یورپی آداب کے قریب لانے کے لیے جو لائحہ عمل اختیار کیا اس کے تحت بڑے یورپی ملکوں کے دارالحکومتوں میں مستقل سفارتی دفاتر کھولنے کا فیصلہ کیا گیا۔ پہلا عثمانی سفارت خانہ 1793ء میں لندن میں کھولا گیا۔ اس کے بعد ویانا، برلن اور پیرس میں سفارت خانے قائم ہوئے۔ 1796ء میں سید علی آفندی عثمانی سلطان کے پہلے سفیر کی حیثیت سے جمہوریہ فرانس گئے۔ ان سفیروں کو ہدایت تھی کہ ''سفارتی فرائض کے علاوہ

جن ملکوں میں متعین ہیں وہاں کے اداروں کا مطالعہ بھی کریں تا کہ وہاں کی زبان اور ان علوم وفنون سے واقفیت حاصل ہو سکے جو سلطنت عثمانیہ کے خدام کے لیے کار آمد ہیں۔"(73)

یورپ میں متعین عثمانی سفارت کاروں میں سے بیشتر سلطان کے محل یا سفارتی محکمے کے ملازم تھے۔ ان کی تعلیم وتربیت پرانے انداز سے ہوئی تھی۔ وہ مغربی زبانوں اور وہاں کے حالات سے نابلد تھے اور زیادہ تر قدامت پسند تھے۔ انہوں نے جو رپورٹ لکھیں انہیں پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے ان ملکوں سے بہت کم سیکھا جہاں انہیں بھیجا گیا تھا اور جو کچھ انہوں نے دیکھا اس سے وہ کچھ زیادہ متاثر بھی معلوم نہیں ہوتے۔

لیکن ان میں چند مستثنیات بھی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ دلچسپ سفارت کار علی عزیز آفندی تھا۔ وہ کریٹ کا رہنے والا تھا اور ایک اعلیٰ عثمانی افسر کا بیٹا تھا۔ وہ عثمانی انتظامیہ میں کئی اعلیٰ عہدوں پر متمکن رہا اور آخر کار اسے پروشیا میں سفیر مقرر کیا گیا۔ وہ جون 1797ء میں برلن پہنچا اور دوسرے سال اکتوبر میں اس کا انتقال ہو گیا۔ علی عزیز فرانسیسی اور تھوڑی بہت جرمن زبان جانتا تھا اور اسے مغربی ادب کی بھی شد بد تھی۔ برلن میں قیام کے دوران میں وہ جرمن مستشرق فریڈرک فان ڈیز سے بھی ملا۔ اس کے ساتھ سائنسی اور فلسفیانہ اور موضوعات پر اس کی خط و کتابت بھی رہی۔ اگرچہ اس کی خط وکتابت کا بہت کم حصہ محفوظ رہا ہے لیکن وہ یہ جاننے کے لیے کافی ہے کہ وہ تجربی سائنس یا روشن خیالی کے دور کے استدلالی فلسفے سے بالکل واقف نہیں تھا۔ البتہ وہ مغربی ادب کی ایک اور صنف سے واقف تھا۔ اس کی صوفیانہ تحریروں کے علاوہ جو کتاب سب سے زیادہ مشہور ہوئی وہ جنوں اور پریوں کی کہانیاں ہیں جو اس نے اپنی زندگی کے آخری سال لکھیں۔ یہ کہانیاں پیٹی دی لاکروئے کی فرانسیسی کتاب **Le Mille et un Jours** کا کچھ ترجمہ ہے اور کچھ اس سے ماخوذ ہے۔ فرانسیسی کتاب جو **1710** اور **1712**ء کے درمیان شائع ہوئی تھی وہ بھی ایک طرح سے الف لیلیٰ کی نقل ہے (جو اس وقت تک فرانسیسی زبان میں ترجمہ ہو چکی تھی) اس کا کم سے کم کچھ حصہ فارسی اور دوسرے اسلامی ذرائع پر مبنی ہے۔ اس لیے وہ کسی دوسری مغربی کتاب کے مقابلے میں مشرق وسطے کے قاری کے لیے زیادہ دلچسپی کا باعث تھی۔ (74)

یہ سفیر تنہا سفر نہیں کرتے تھے۔ یونانی ترجمان تو ساتھ ہوتے ہی تھے جو رابطوں کا وسیلہ بنتے تھے ان کے علاوہ نوجوان ترک سیکرٹری بھی ہوتے تھے جن کے فرائض میں شامل تھا کہ وہ

مغربی زبانیں بالخصوص فرانسیسی سیکھیں اور مغربی معاشرہ کے بارے میں کچھ دریافت کریں۔ چنانچہ ان سفارتوں نے معزز خاندانوں کے ترک نوجوانوں کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ یورپی دارالحکومتوں میں کچھ وقت گزاریں' مغربی زبانوں کی مہارت حاصل کرلیں اور یورپی تہذیب سے شناسائی پیدا کریں۔ ترکی واپس پہنچ کر وہ سرکاری افسر بن گئے اور انہوں نے مل کر ترک افسر شاہی میں ایک نیا اور خاصہ اہم گروپ قائم کرلیا۔ اس گروپ کی مغربی تربیت بھی تھی اور ان میں مغربی ذوق بھی تھا۔ چنانچہ یہ لوگ کئی اعتبار سے ان فوجی افسروں کے سویلین متبادل افسر تھے جو بری اور بحری فوجی اکادمیوں سے مغربی تعلیم و تربیت حاصل کر کے آرہے تھے۔ (75)

ان میں سے ایک محمود رائف تھا جو عثمانی سفیر یوسف آغا آفندی کے سیکرٹری کی حیثیت سے لندن گیا اور جس نے وزیر اعظم کے چیف سیکرٹری (رئیس الکتب) کی حیثیت سے بھی 1800 سے 1805ء تک فرائض ادا کیے۔ یہ شخص انگلستان کے بارے میں اتنا ماہر مانا جاتا تھا کہ وہ ترکی میں انگلیز (انگریز) محمود مشہور ہو گیا۔ اس نے انگلستان اور اس کے اداروں کے بارے میں جو کچھ لکھا اس کا ایک نسخہ سرائے لائبریری استنبول میں محفوظ ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ فرانسیسی زبان میں ہے۔ اس کی دوسری کتاب بھی اسی زبان میں ہے۔ یہ کتاب اس نے مجوزہ عثمانی اصلاحات کے بارے میں لکھی تھی جو 1797ء میں اسکودر میں شائع ہوئی۔ اس کی مغرب پسندی اس کے کام نہیں آئی اور 1808ء میں باغی جان نثاروں نے اسے قتل کر دیا۔ (76)

فوجی کیڈٹ اور زیر تربیت سفارت کار دونوں ہی یورپی استادوں کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کر رہے تھے۔ کچھ ہی عرصے بعد مسلمان حکمران ایک قدم آگے بڑھانے پر تیار ہو گئے اور طلبہ کو یورپ بھیجنے لگے تا کہ وہاں وہ ضروری تعلیمی سہولتوں سے فائدہ اٹھا سکیں۔ پہلا شخص مصر کا حاکم محمد علی پاشا تھا جس نے پہلے مصری طالب علم کو 1809ء میں اٹلی بھیجا۔ 1818ء تک اٹھائیس کے قریب طلبہ یورپ جا چکے تھے اور 1826ء میں طلبہ کا جو پہلا بڑا گروپ فرانس بھیجا گیا ان کی تعداد چوالیس تھی۔ ان کے ساتھ الازہر کے ایک شیخ بھی گئے تھے تا کہ ان طلبہ کی راہنمائی کر سکیں۔ مصر سے جو طلبہ بھیجے گئے ان میں سے اکثر ترک یا دوسرے عثمانی باشندے تھے لیکن چند عربی بولنے والے طلبہ بھی تھے۔ طلبہ کے نگران شیخ رفاعہ رافع الطہطاوی (1801-1873) نے پیرس میں قریب پانچ برس قیام کیا اور فرانسیسی زبان میں مہارت حاصل کی۔ لگتا ہے کہ انہوں نے طلبہ سے کہیں زیادہ خود علم حاصل کر لیا۔ اپنی کتابوں اور خطبات کی بنا پر وہ اس فکری تحریک کے

کلیدی رکن بن گئے جس کے تحت مغرب کے ساتھ ربط وضبط بڑھایا جاسکتا تھا۔ یہ تحریک انیسویں صدی میں شروع ہوئی تھی۔(77) عثمانی سلطان محمود ثانی نے اس معاملے میں اپنے گورنر کی تقلید کی اور 1827ء میں 150 ترک طلبہ کو مختلف مغربی ممالک بھیجا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ ترکی میں وہ جو نئے مدارس قائم کر رہا ہے ان میں استاد کی حیثیت سے کام کرنے کے لیے ان کی تربیت کی جائے۔ ایران سے بھی طلبہ کی ایک چھوٹی سی جماعت 1811 اور 1815ء میں یورپ بھیجی گئی۔ ان میں سے ایک طالب علم مرزا محمد صالح شیرازی نے اس پر ایک کتاب لکھی جو خاصی معلومات افزا ہے۔(78)

یہ بتانے کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ قدامت پسند مذہبی حلقوں کی طرف سے ان اقدامات کی شدید مخالفت کی گئی۔ تاہم یہ تحریک بڑھتی چلی گئی اور انیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں مشرق وسطے کی مسلم سرزمین سے طلبہ کی زیادہ سے زیادہ تعداد یورپ کے اسٹاف کالجوں حتیٰ کہ یونیورسٹیوں میں بھی نظر آنے لگی۔ ان میں سے بہت سے طلبہ کے لیے یہ جلاوطنی اور تنہائی کے سال تھے جن سے وہ خوشی خوشی واپس آئے اور اپنے روایتی طور طریقوں میں زیادہ داخل ہو گئے۔ لیکن سب ایسے نہیں تھے۔ اور جیسا کہ طلبہ کا وطیرہ ہے انہوں نے استادوں سے زیادہ اپنے ساتھی طلبہ سے بہت کچھ سیکھا۔ ان طلبہ نے جو بعض سبق حاصل کئے انہوں نے مشرق وسطے کی تاریخ ہی بدل دی۔

مغرب کے بارے میں مسلمانوں کا علم

1655ء میں عثمانی جغرافیہ داں اور ہر فن مولا ادیب کاتب چلبی کو ایک مختصر سی کتاب لکھنے کی تحریک ہوئی جس کا نام اس نے ''رہنمائے شوریدہ ذہن' بابت تاریخ یونان وردما و نصرانیان'' (1) رکھا۔ اس نے پیش لفظ میں کتاب لکھنے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ عیسائیوں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے اور اب وہ آباد دنیا کے اس حصے تک محدود نہیں ہیں جہاں وہ پہلے رہتے تھے۔ اگرچہ عیسائی فرقے ایک ہی ''ملت'' کا حصہ ہیں لیکن وہ دور دور پھیل گئے ہیں اور تعداد میں اتنے زیادہ ہوگئے ہیں کہ وہ دنیا کے بہت حصوں تک پہنچ گئے ہیں۔ اپنے جہازوں پر مشرقی اور مغربی سمندروں میں سفر کرتے ہوئے وہ متعدد ملکوں کے آقا بن گئے ہیں۔ سلطنت عثمانیہ میں تو وہ دخل اندازی نہیں کر پاتے لیکن نئی دنیا میں انہوں نے فتوحات حاصل کر لی ہیں اور ہندوستان کی بندرگاہوں پر ان کا قبضہ ہوگیا ہے۔ اس طرح وہ عثمانی سلطنت کے قریب پہنچ رہے ہیں۔ اس بڑھتے ہوئے خطرے کے سامنے ان لوگوں کے بارے میں اسلامی تواریخ جو کچھ پیش کر رہی ہے وہ کھلا جھوٹ اور جنوں پرانی کی کہانیاں ہی ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ بہتر معلومات فراہم کی جائیں تاکہ ان جہنمی لوگوں سے متعلق معاملات کے بارے میں عالم اسلام کے لوگ بالکل لاعلم نہ رہیں۔ نہ صرف یہ کہ ان دشمن ہمسایوں سے بے خبر نہ رہیں بلکہ اس خواب غفلت سے بھی بیدار ہو جائیں جس نے ان ملعون لوگوں کو مسلمانوں کے بعض ممالک غصب کرنے کا موقع فراہم کیا ہے اور اس طرح مسلم سرزمین کو دارالحرب میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔

یہ معلومات فراہم کرنے کے لیے کاتب چلبی کہتا ہے کہ اس نے فرنگی اٹیلس مائنر (Atlas Minar) اور دوسری کتابوں سے مدد لی ہے جن کا اس نے ترجمہ بھی کر دیا ہے۔

کتاب کا پہلا حصہ تعارف ہے اور اس کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ عیسائی مذہب کا خلاصہ ہے جو قرون وسطیٰ میں اسلام قبول کرنے والے عیسائیوں کی عربی کتابوں پر مبنی ہے۔ یہ کتابیں کھلم کھلا عیسائیت کے خلاف ہیں اور ان کا انداز مناظروں والا ہے۔ تعارف کے دوسرے حصے میں یورپ کے نظام حکومت کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں یورپ کی سیاسی اصطلاحوں کی تعریف اور تشریح کی گئی ہے اور نئے الفاظ وضع کیے گئے ہیں جیسے امپررکا امپراطور اور کنگ کا قرل وغیرہ۔ پھر کلیسا اور ریاست کے مناصب کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس میں وہ بڑی احتیاط کے ساتھ امتیاز کرتا ہے۔ یہ منصب ہیں پوپ' کارڈینل اور پیٹریارک۔ ریاستی عہدوں میں کاؤنٹ وغیرہ۔ تعارف کے آخر میں ''اس مردود جماعت'' کی زبانوں پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ کاتب چلبی یورپ میں بولی جانے والی زبانوں کی اتنی بڑی تعداد اور ان کے ایک دوسرے کے لیے ناقابل فہم ہونے پر تنقید بھی کرتا ہے۔

اصل کتاب کے نو باب ہیں جن میں پاپائیت' سلطنت' فرانس' اسپین' ڈنمارک' ٹرانسلوینیا' ہنگری' وینس اور مالڈیویا کا ذکر کیا گیا ہے۔ غالباً یہ ملک وہ تھے جن کی طرف کاتب چلبی اپنے لوگوں کی توجہ مبذول کرانا ضروری سمجھتا تھا۔ ان معلومات میں پاپائے روم اور حکمرانوں کی فہرست پیش کرنے سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے۔ بیچ بیچ میں مختلف مآخذوں سے حاصل ہونے والی عجیب وغریب معلومات ہیں۔ جس نظام حکومت پر تفصیل سے بحث کی گئی وہ وینس کا نظام ہے۔ فرانس اور اسپین کے بارے میں بھی اس نے کسی حد تک تاریخی اور جغرافیائی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔

کاتب چلبی کی نیت صاف تھی۔ جغرافیہ اور نقشہ نویسی پر اس کی تحریریں اس کا ثبوت ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ان متعلقہ لوگوں سے معلومات حاصل کرتا تھا جو اسے دستیاب تھے۔ بلاشبہ وہ ان ابتدائی کتابوں پر تنقید کرنے میں بالکل حق بجانب ہے جن پر اس نے اپنے بیان کی بنیاد رکھی بلکہ معلومات میں کچھ اضافہ ہی کیا۔ یہ بات بھی درست ہے کہ انیسویں صدی تک عربی اور فارسی میں مغربی کتابوں کے معیار کی کوئی کتاب نہیں تھی۔ اس نے 1655ء میں یورپ کی تاریخ اور حالات حاضرہ کے بارے میں جو کچھ لکھا وہ عثمانیوں کے متعلق یورپ کی کتابوں کے مقابلے میں بہت ہی کم تر ہے اور نہایت سادہ لوحی پر مبنی ہے۔ کاتب چلبی کی کتاب سے ایک سو سال سے بھی پہلے یورپ کے قاری کے پاس عثمانی سلطان کی تاریخ اور اس کے اداروں کے

بارے میں زیادہ معلوماتی کتابیں موجود تھیں۔ ان میں اہم عثمانی روزناموں کے تراجم بھی شامل تھے۔ یورپ کی زیادہ دلچسپی عثمانی ترکوں سے تھی کیونکہ وہ ان کے لیے تازہ اور فوری مسئلہ بنے ہوئے تھے۔ انہیں کچھ عرصے اسلام کی ابتدائی تاریخ اور اسلامی تہذیب سے بھی دلچسپی رہی تھی اور اس پر کافی تعداد میں کتابیں لکھی گئیں تھیں۔ ان میں عربی نسخوں کے ترجمے اور مسلم افکار اور ادب کی تاریخ بھی شامل تھی۔ کاتب چلپی کے زمانے تک مغربی یورپ کی کئی یونیورسٹیوں میں عربی کے شعبے قائم ہو چکے تھے اور ہالینڈ میں جیکب گولیس (Jacob Goliub) انگلستان میں ایڈورڈ پوکوک جیسے عربی کے عالم کلاسیکی مستشرقیت کی بنیاد رکھ رہے تھے۔ اور جب سترھویں صدی کے آخر میں فرانسیسی مستشرق بارتلمی دی ہربار (Barthelmi Dherblot) نے مشرقی تہذیب پر حروف تہجی کے حساب سے کتاب (Bibliotheque Orientale) لکھی تھی تو اس نے لاطینی کے علاوہ دوسری یورپی زبانوں میں لکھی ہوئی بہت سی کتابوں سے بھی استفادہ کیا تھا۔ چند معلومات تو بھاگے ہوئے یا رہا شدہ قیدیوں سے ملی تھیں اور چند سفارتی اور تجارتی ذرائع سے حاصل ہوئی تھیں۔ لیکن اب زیادہ سے زیادہ نئی قسم کے محقق پیدا ہو رہے تھے جو اسلامی ملکوں کی زبان اور ادب کی تحقیق کے لیے وہی طریقہ کار اختیار کر رہے تھے جو کلاسیکی اور مذہبی کتابوں کی بازیافت میں استعمال کیا جا رہا تھا اور جس میں یورپ طاق ہو چکا تھا۔ اس کے مقابلے میں مسلمان علماء کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ خواہ وہ فلسفہ ہو یا دوسرے مضامین۔ وہ محض اپنے عقائد، اپنے قوانین اور اپنے ادب تک ہی محدود رہتے تھے۔ ہاں' مغرب کے بارے میں کچھ چیزیں جانی جاتی تھیں جنہیں کاتب چلپی جھوٹا اور جنوں پریوں کی کہانیاں کہتا ہے اور جس کی مذمت کرتا ہے۔

یورپ کے بارے میں پہلی عربی رپورٹ جو محفوظ رہ گئی ہے وہ نویں صدی کی ہے۔ وہ یونانی ذرائع پر زیادہ انحصار کرتی ہے' خاص طور سے پٹولمی کے جغرافیہ پر۔ معلوم ہوتا ہے کہ عربی میں اس کا کئی بار ترجمہ کیا گیا تھا۔ اس کا جدید ترین نسخہ اس سے ماخوذ وہ کتاب ہے جو وسط ایشیا کے مشہور ریاضی داں اور فلسفی محمد ابن خوارزمی نے نویں صدی کے اوائل میں لکھی۔ یہ وہی شخص ہے جس نے الگورزم کو اپنا نام دیا جو اعشاری نظام کی قدیم یورپی اصطلاح ہے۔ الخوارزمی نے صرف پٹولمی کا ترجمہ ہی نہیں کیا بلکہ اپنی کتاب میں اس کی چند باتوں کی تصحیح بھی کی اور ایرانیوں اور عربوں کو جو زیادہ معلومات تھیں ان کا اضافہ بھی کیا۔ یہ اضافہ مغربی یورپ کے بارے میں تھا حالانکہ دنیا کے دوسرے حصوں کے مقابلے میں یہ علم کم تھا۔ بدقسمتی سے جو نسخہ محفوظ رہ گیا ہے اس میں یورپ

کے مقامات کے نام بری طرح مسخ ہوگئے ہیں حتیٰ کہ بعض تو پہچانے بھی نہیں جاتے۔

اس کتاب سے اور غالباً بعض ترجمہ کی ہوئی دوسری کتابوں سے، جن میں قدیم سریانی اور یونانی تحریریں بھی شامل ہیں، مسلمان عالموں نے مغربی یورپ کی جغرافیائی ساخت اور بعض مقامات کے نام معلوم کیے۔ اس کے فوراً بعد جغرافیہ پر ان کی اپنی کتابیں سامنے آنا شروع ہوگئیں۔ اگرچہ ان میں عام طور پر مغربی یورپ جیسے دور افتادہ اور غیر اہم مقام کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ پھر بھی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بتدریج علم کی توسیع ہو رہی تھی۔

پہلا مسلم جغرافیہ داں جس کی تحریریں ہم تک پہنچی ہیں کوئی ابن خورہ دار بہ تھا۔ جو ایرانی تھا اور عربی میں لکھتا تھا۔ اس کا زمانہ نویں صدی کا وسط ہے۔ وہ پیغام رسانی کے محکمہ کا ملازم تھا اور ہرکاروں، گھوڑ سواروں اور جاسوسی کے نظام کا نگراں تھا۔ اس کی کتاب قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی دیگر کتابوں کی طرح فرائض کار کی ضروریات کے تحت لکھی گئی تھی۔ وہ زیادہ تر اسلامی علاقوں سے متعلق ہے جو ایک قدرتی بات ہے۔ تاہم اس میں بازنطینی محکمہ پیغام رسانی پر بھی کچھ توجہ دی گئی ہے جس کا رابطہ خلافت اسلامیہ کے ساتھ تھا۔ حتیٰ کہ کتاب میں یورپ کے دور افتادہ علاقوں کا بھی ذکر ہے۔

خورہ داد کہتا ہے "آباد دنیا چار حصوں میں بٹی ہوئی ہے، یورپ، لیبیا، حبشہ اور سیتھیا۔ یہ تقسیم عربی کی چند دوسری کتابوں میں بھی پائی جاتی ہے، اس کا ماخذ یونانی ذرائع تھے لیکن بہت جلد مسلمانوں کی جغرافیہ کی کتابوں میں یہ تقسیم غائب ہوگئی۔ ابن خورہ داد بہ یورپ کو "یوروفا" لکھتا ہے اس میں اندلس (یعنی مسلم اسپین) سلاف سرزمین، روما اور فرنگی اور طنجہ سے مصر تک کے علاقے شامل ہیں۔

مسلم اسپین کے بارے میں خورداد بہ کی معلومات بہت اچھی ہیں۔ مسلم سرحدوں سے باہر کے ملکوں کے بارے میں وہ یہ کہتا ہے۔

اندلس کے شمال میں روم، برجن (برگنڈی) اور سلاف اور اواروں کی سرزمین ہے۔

مغربی سمندر سے جو اشیا آتی ہیں وہ سلاڈک، یونانی، فرنگی اور لومبارڈ غلام، یونانی اور سلاف کنیزیں، اودبلاڈ کی پوستین اور دیگر کھالیں، عطریات، عود عنبر اور دوائیں اور مصطگی شامل ہیں۔ فرنگیوں کے ساحلوں کے قریب سمندر کی تہہ سے وہ بساذ

> نکالتے ہیں جیسے عام لوگ مرجان کہتے ہیں۔ سلاف کی سرزمین پر سے سمندر کے قریب شہر طلیہ (Thule) واقع ہے۔ ادھر کوئی جہاز یا کشتی نہیں جاتی اور وہاں سے کچھ بھی نہیں آتا۔
>
> وہاں یہودی ہیں، جو عربی، فارسی، یونانی، فرنگی اندلسی اور سلاوک زبانیں بولتے ہیں۔ وہ خشکی اور بحری راستوں سے مغرب سے مشرق اور مشرق سے مغرب تک سفر کرتے ہیں۔ وہ مغرب سے خواجہ سرا، کنیزیں، غلام لڑکے، کمخواب، اود بلاؤ کی پوستین، گوند دریائی بچھڑے اور تلواریں لاتے ہیں۔

ابن خورہ داد بہ کے ہاں یہودی تاجروں کے بارے میں خاصہ بڑا علمی اور تحقیقی مواد ملتا ہے۔ بعض لوگوں نے ان کی شناخت کرنے اور ان کی اہمیت کا اندازہ لگانے کی کوشش بھی کی ہے۔ خیال ہے کہ وہ لوگ مشرق وسطی سے تعلق رکھتے تھے مغرب سے نہیں۔ اس زمانے کے دوسرے دو اور مسلم جغرافیہ دانوں کے پاس ایک ہی قسم کے مضامین ملتے ہیں۔ ان میں سے ایک ابن الفقیہہ (وفات 903) اپنے پیش رو کی تقلید ہی کرتا ہے لیکن وہ مزید یہ بھی لکھتا ہے:

> چھٹی اقلیم میں فرنگی سرزمین اور دوسرے لوگ ہیں۔ وہاں ایسی عورتیں ہیں جو اپنی چھاتیاں کاٹ ڈالتی ہیں اور جب وہ چھوٹی ہوتی ہیں تو انہیں گرم لوہے سے داغتی ہیں تاکہ وہ بڑی ہونے سے رک جائیں۔ دوسرا مصنف ابن رستہ (وفات 910) بھی اسی قسم کی داستان بیان کرتا ہے۔ لیکن وہ مزید دلچسپ اضافے کرتا ہے۔ ''سمندر کے شمالی حصے میں بارہ جزیرے ہیں جنہیں جزائر بار اطیبیہ کہا جاتا ہے۔ اس سے آگے انسان آباد دنیا سے باہر نکل جاتا ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ کیسا علاقہ ہے۔

یہ تینوں روم کا نام لیتے ہیں جس کے بارے میں عجیب وغریب کہانیاں بیان کرتے ہیں۔

آخر بارہویں صدی تک مسلمان قاری کو نسبتاً مکمل معلومات ملنے لگتی ہیں۔ اس زمانے کا سب سے بڑا جغرافیہ داں مسعودی (وفات 956) تھا۔ یورپ کے لوگوں کے بارے میں اس کی رائے یونانی جغرافیہ دانوں کی بازگشت معلوم ہوتی ہے لیکن وہ چند دلچسپ اضافے بھی کرتا ہے۔

جہاں تک شمالی ربع دائرہ کے لوگوں کا تعلق ہے' وہ ایسے لوگ ہیں جن کے لیے سورج راس السمت سے دور ہے۔ جیسے جیسے ہم شمال کی جانب سلاف' فرنگی اور ان قوموں کی جانب بڑھتے ہیں جو ان کی ہمسایہ ہیں تو سورج اور بھی دور ہوتا جاتا ہے۔ سورج کی طاقت زیادہ فاصلے کی بنا پر وہاں کم ہو جاتی ہے سردی اور رطوبت' اور برف یکے بعد دیگرے آتے ہیں اور ان کا لامتناہی سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ان لوگوں میں گرم جوشی کی کمی ہے۔ ان کے جسم بڑے بڑے ہیں۔ ان کے مزاج کھردرے ہیں' ان کے اطوار و آداب تند و تیز ہیں' ان کی فہم کند ہے اور ان کی زبانیں بھاری ہیں۔ ان کا رنگ اتنا سفید ہے کہ وہ نیلے نظر آتے ہیں' ان کی جلد شفاف اور ان کا گوشت خام ہے۔ ان کی آنکھیں بھی نیلی ہیں جو ان کے رنگ سے ملتی ہیں۔ ان کے بال لمبے اور بدنما ہیں اور مرطوب ہوا اور کہر کی وجہ سے سرخ ہیں۔ ان کے دینی عقائد پختگی سے عاری ہیں۔ اس کی وجہ شدید سردی اور حرارت کی کمی ہے۔ جتنے شمال میں آگے جاتے ہیں وہ زیادہ احمق' گنوار اور وحشی ہوتے جاتے ہیں۔ اور آگے شمال میں ان کی یہ صفات اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہیں...... جو لوگ اس عرض البلد سے ساٹھ میل آگے رہتے ہیں وہ یاجوج ماجوج ہیں۔ یہ لوگ چھٹی اقلیم میں ہیں اور مویشیوں میں شمار ہوتے ہیں۔

یہی مصنف ایک اور کتاب میں لکھتا ہے:

فرنگی' سلاف' لومبارڈ' ہسپانوی' یاجوج ماجوج' ترک' خزار' بلغاری' ایلان' جالیسی اور دوسرے لوگ جنہیں ہم نے بتایا ہے کہ وہ برج جدی کے علاقے میں آباد ہیں۔ یعنی شمال میں۔ وہ الہامی قانون کے علما میں سے صاحب الرائے لوگوں کے متفقہ فیصلے کے مطابق حضرت نوح کے بیٹے جافث کی اولاد ہیں......
ان میں فرنگی سب سے زیادہ بہادر لوگ ہیں' سب سے زیادہ محفوظ اور کثیر اسلحہ سے لیس' وسیع و عریض زمینوں اور بے شمار شہروں کے مالک ہیں' منظم اور اپنے بادشاہ کے وفادار۔ سوائے اس کے کہ جالیسی فرنگیوں سے زیادہ نڈر اور سفاک ہیں۔ جالیسی کا ایک آدمی کئی فرنگیوں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

سارے فرنگی بادشاہ کی رعایا ہیں اور اس معاملے میں ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ آج کل ان کے دارالحکومت کا نام بازیزہ ہے جو بہت بڑا شہر ہے۔ ان کے ایک سو پچاس کے قریب شہر ہیں اس کے علاوہ گاؤں اور قصبے ہیں۔

جغرافیہ کی ان عربی اور فارسی کتابوں سے یورپ کی ایک ایسی تصویر تیار کی جاسکتی ہے جو اس زمانے کے مسلمانوں کی نظر میں صحیح تھی۔ مسلم اندلس کی ''مہذب'' دنیا کے شمال میں شمالی اسپین کی پہاڑیاں اور پائرنیز کے دامن کوہ تھے اور وحشی اور قدیم عیسائی آباد تھے جو گیلسین اور باسک یا باسق کہلاتے تھے۔ اٹلی میں، مسلمانوں کے زیر نگین علاقوں کے شمال میں روم یا روما کا علاقہ تھا جس پر مذہبی بادشاہ پوپ کی حکومت تھی۔ اس سے آگے وحشی لوگوں کی آبادی تھی جو لومبارڈ کہلاتے تھے۔ بحیرۂ روم کی مشرقی سرحد پر، یعنی مسلم سرحدوں کے شمال میں روم کی سلطنت یعنی یونانی ورومی حکومت تھی اور اس سے آگے وسیع وعریض سلاف سرزمین تھی۔ سلاف ایک عظیم نسل تھی۔ جو بہت سے لوگوں میں منقسم تھی۔ جن میں سے بعض سے مسلم تاجر اور سیاح بخوبی واقف تھے۔ سلاف کے مغرب میں ایلپس اور پائرنیز تک پھیلے علاقے میں فرنجا کی وسیع سلطنت تھی یعنی فرنگیوں کی سرزمین۔ ان محققین میں سے بعض کچھ اور لوگوں کو بھی الگ کرتے ہیں اور وہ ہیں شمالی بلغاریہ کے لوگ۔ اس سے بھی آگے شمال میں یعنی فرنگیوں سے بھی آگے، آتش پرست مجوسی یا ماجی تھے۔ عربوں نے یہ نام نارو ے وغیرہ کے لوگوں کے لیے قدیم فارسی نام سے زبردستی لے لیا ہے۔ شمال کی جن دور افتادہ شمالی سرزمینوں کے نام مسلم کتابوں میں ملتے ہیں۔ ان میں برطانیہ، کبھی کبھی آئرلینڈ اور حتیٰ کہ اسکینڈے نیویا بھی شامل ہیں۔

بسا اوقات مسلمان مصنف روم کی اصطلاح وسطی اور مغربی یورپ کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں جسے وہ عیسائی دنیا کہتے ہیں۔ لیکن عام طور پر مغربی یورپ کے لیے مختلف اصطلاحات استعمال کی جاتی ہیں ان میں سب سے عام افرنج یا فرنج ہے جو فرینک کا معرب ہے (اردو فارسی میں یہ فرنگ یا افرنگ ہے) یہ نام مسلمانوں تک غالباً بازنطین کے ذریعہ پہنچا اور اصل میں یہ شارلمین کی مغربی سلطنت کے لوگوں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ بعد میں یورپ کے تمام لوگوں کو یہی کہا گیا۔ قرون وسطیٰ میں یہ نام عام طور پر ہسپانوی، سلاوی اور اسکینڈے نیویا کے لوگوں کے لیے استعمال نہیں ہوتا تھا۔ تاہم ایک عام مفہوم میں اسے وسطی یورپ اور جزائر برطانیہ کے لیے

استعمال کیا جاتا تھا۔ فرینک سرزمین کو عربی میں فرنجہ یا افرنجہ اور فارسی میں اور مشرقی ترکی میں فرنگستان کہا جاتا تھا۔

ازمنہ وسطی کی عربی کتابوں میں کبھی کبھی یورپ کے لوگوں کے لیے ایک اور اصطلاح بھی مروج کی۔ وہ تھی ابن الاصفر جس کا مطلب ہے ''زردی کے بچے یا زرد بچے'' پہلے اسے قدیم عربوں نے یونانیوں اور رومنوں کے لیے استعمال کیا۔ پھر بعد میں اسپین اور عام یورپ تک اسے پھیلا دیا گیا۔ علم الانساب کے ماہرین عام طور پر اس نام کا رشتہ ایک ذاتی نام۔ اصفر سے جوڑتے ہیں جو عیساؤ کا پوتا اور روئل کا بیٹا تھا اور یونانیوں اور رومیوں کا جدامجد تھا۔ بعض محققین کہتے ہیں کہ یورپ کے لوگوں کے رنگ کی وجہ سے ان کا یہ نام رکھا گیا جو ایشیا اور افریقہ کے گندمی اور سیاہ رنگ کے مقابلے میں زرد نظر آتا ہے۔ لیکن یہ قرین قیاس نہیں ہے۔ عرب اور ایرانی مصنف عام طور پر سفید کو سفید ہی لکھتے تھے۔ زرد نہیں۔ پھر وہ یورپ کے لوگوں کو نسل یا رنگ کے اعتبار سے شاذونادر ہی یاد کرتے تھے۔ وہ اپنے اور جنوب اور مشرق کے سیاہ فام لوگوں کے درمیان رنگ کے فرق کو تو بہت زیادہ ملحوظ رکھتے تھے اور کبھی اس میں انتہا کو بھی پہنچ جاتے تھے' لیکن اپنے شمال میں آباد ہمسایوں کے نسبتاً ہلکے رنگ کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ کبھی کبھی سلاف' ترک اور دوسرے میدانی لوگوں کا اور فرنگیوں کے سفید براق یا جذامی رنگ کا ذکر اہانت آمیز لہجہ میں ملتا ہے۔ عثمانی زمانے میں بعض اوقات ابن الاصفر کی اصطلاح وسطی اور مشرقی یورپ کے سلاف لوگوں کے لیے بالعموم اور رومیوں کے لیے بالخصوص استعمال کی جاتی تھی۔ روس کے زار کو ''الملک الاصفر'' کہا جاتا تھا یعنی زرد بادشاہ۔

یورپ کے بارے میں مسلمانوں کی معلومات کا ذریعہ کیا تھا؟ انہوں نے علمی ذرائع خاص طور پر یونانی ذرائع پر انحصار کیا۔ اس کے علاوہ کچھ سریانی اور ایرانی ذرائع بھی تھے۔ یقیناً انہوں نے مغربی کتابوں سے زیادہ حاصل نہیں کیا۔ جہاں تک ہم جانتے ہیں قرون وسطی میں صرف ایک مغربی کتاب کا واقعی عربی ترجمہ ہوا۔

ایک دو اور کتابیں بھی بالواسطہ طور پر ان تک پہنچی ہوں گی۔ چنانچہ مسعودی کلووس سے لوئی چہارم تک فرنگی بادشاہوں کا مختصر ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس کا مآخذ ایک فرنگی بشپ کی وہ کتاب ہے جو اس نے 939 میں امیر غرناطہ الحکم کے لیے لکھی تھی۔

مصر میں قسطاط کے مقام پر سال 339 (947 عیسوی) میں مجھے جو دومر

(گوڈمر) بشپ شہر جبرونا' جو فرنگیوں کا ایک شہر ہے' کی کتاب ملی۔ یہ کتاب 328 میں الحکم ابن عبدالرحمٰن ابن محمد' ولی عہد عبدالرحمٰن حاکم اندلس کے لیے لکھی گئی تھی۔ اس کتاب کی رو سے فرنگیوں کا پہلا بادشاہ کلودیہ تھا۔ وہ بت پرست تھا۔ اس کی بیوی نے جس کا نام غرطالہ تھا اسے عیسائی بنا دیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا لدرک آیا پھر اس کا بیٹا داکوشرت پھر اس کا بیٹا لدرک پھر اس کا بھائی کرتان پھر بیٹا کارلا پھر اس کا بیٹا تبین اور اس کا بیٹا کارلا آیا۔ اس نے بیس سال حکومت کی تھی۔ اس کا زمانہ الحکم' حاکم اندلس کا ہے۔ اس کے انتقال کے بعد اس کے بیٹوں میں لڑائی ہو گئی۔ ان کے اختلافات اتنے بڑھے کہ ایک موقع پر ایسا لگتا تھا کہ فرنگی خود ہی ان کی وجہ سے اپنے آپ کو تباہ کر لیں گے۔ اس کے بعد کارلا کا بیٹا حاکم بن گیا جس نے اٹھائیس سال چھ ماہ حکومت کی۔ یہ وہی تھا جس نے طورطوسا کی طرف پیش قدمی کی اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ اس کے بعد کارلا آیا پھر لدرک کا بیٹا یہ وہی تھا جس نے محمد ابن عبدالرحمٰن ابن الحکم تحائف بھیجے اور اسے امام کے لقب سے یاد کیا۔ اس نے 39 سال چھ ماہ حکومت کی۔ اس کے بعد اس کے بیٹے لدرک نے چھ سال حکومت کی۔ پھر فرنگی رئیس نوسا نے اس کے خلاف بغاوت کی اور سلطنت پر قبضہ کر لیا اور آٹھ سال حکومت کی۔ یہی وہ تھا جس نے اپنے ملک کے ناراض لوگوں کو سات سال کے لیے سات سو طلائی رطل اور چھ سو نقرئی رطل کے عوض خرید لیا یہ رطل فرنگیوں کے بادشاہ نے ادا کیے۔ اس کے بعد کارلا پسر تکویرا نے چار سال حکومت کی۔ پھر ایک اور کارلا آیا جو اکتیس سال تین مہینے قابض رہا۔ پھر لدرک پسر کارلا آیا۔ اور یہ آج کے زمانے یعنی 336 ہجری میں فرنگیوں کا بادشاہ ہے۔ ہم تک جو اطلاع پہنچی ہے اس کی رو سے وہ ان پر دس سال سے زیادہ عرصے سے حکمرانی کر رہا ہے۔

مسعودی نے سولہ بادشاہوں کے جو نام گنائے ہیں ان میں سے چارلس مارتیل سے لوئی چہارم تک دس کو کسی حد تک شناخت کیا جا سکتا ہے۔ پہلے چھ ناموں میں سے کلودس' اس کی بلکہ کلوٹلڈ ے اور اس کے پڑپوتے کے بیٹے ڈیگوبرٹ کو پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی اس کے بعد باقیوں کو پہچاننا ناممکن ہے۔

تاہم اس اقتباس کی اہمیت ناموں کی فہرست کی وجہ سے نہیں ہے جس میں بے شمار اغلاط اور تلفظ کی خامیاں ہیں' اس کی اہمیت بذات خود اس فہرست کی موجودگی میں ہے۔ اسلامی دنیا کے بارے میں مغربی کلاسیکی تاریخ نویسی اپنے حجم میں قرون وسطی کے یورپ کی تمام ریاستوں کی تاریخ کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے اور اس کا معیار بھی بہت بلند ہے۔ حیرت تو اس بات پر ہوتی ہے کہ بحیرۂ روم سے اسپین سسلی اور شمالی افریقہ تک مسلمانوں اور عیسائیوں کی چپقلش کے باوجود مسلمان علماء میں اسلامی سرحدوں کے پار یورپ کے بارے میں جاننے کی کوئی خواہش پیدا نہیں ہوئی۔ اسلام کے پہلے ہزاریہ میں صرف تین کتابیں ایسی محفوظ رہی ہیں جو مسلمان قارئین کو مغربی یورپ کی تاریخ کے بارے میں کچھ معلومات فراہم کرتی ہیں' مسعودی کی فہرست ان میں پہلی کوشش ہے۔

اگرچہ یورپ کی تاریخ کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا گیا تھا تاہم اس کے جغرافیہ پر برابر توجہ دی جارہی تھی۔ مسلمان جغرافیہ دانوں نے جغرافیہ پر خاصی توجہ دی اور اس پر کافی کتابیں لکھیں۔ پہلے تو یونانی کتابوں کے خلاصے کیے گئے پھر خود ہی کتابیں تحریر کی گئیں۔ ان میں پہلے تو متعدد سفر نامے تھے پھر با قاعدہ تحقیقی کام کیے گئے۔ چند با قاعدہ کتابیں تھیں اور کچھ حروف تہجی کے حساب سے جغرافیائی لغات تیار کی گئیں۔ ان میں اکثر یورپی نام بھی شامل ہوتے تھے۔

روم کی عظیم سلطنت سے مسلمان اچھی طرح واقف تھے لیکن وہ اسے بازنطین کی سلطنت کے ساتھ گڈمڈ کر دیتے تھے جسے وہ روم کہتے تھے۔ بعض مصنفین اٹلی کے روم سے بھی واقف تھے۔ ایک عرب مصنف' ہارون ابن یحییٰ کا ایک طویل اقتباس پیش کرتا ہے۔ ہارون کے بارے میں خیال ہے کہ 886ء میں جب وہ روم میں تھا تو اس نے کچھ عرصے قید بھی کاٹی تھی۔ ہارون نے روم کے شہر اور کلیساؤں کے بارے میں بڑی رنگ آمیزی کی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

> اس شہر سے آپ جہاز لیتے ہیں اور تین مہینے کا سفر کر کے شاہِ برجان (برگنڈی) کی سلطنت پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں سے آپ پہاڑوں اور وادیوں سے ہوتے ایک مہینے میں سرزمین فرنجہ پہنچ جاتے ہیں۔ اور وہاں سے آپ اور آگے چلتے ہیں اور مزید چار ماہ سفر کرتے ہیں تو براطینیہ (برطانیہ) کے شہر پہنچ جاتے ہیں۔ مغربی سمندر کے ساحل پر یہ عظیم شہر ہے۔ اس پر سات بادشاہ حکومت کرتے ہیں۔ شہر کے دروازے پر ایک مجسمہ ہے۔ جب کوئی مسافر شہر میں داخل ہونے

کی کوشش کرتا ہے تو اسے نیند آ لیتی ہے' وہ اندر داخل نہیں ہو سکتا حتیٰ کہ شہر کے لوگ اسے گرفتار کر لیتے ہیں اور اس کی آمد اور شہر میں داخل ہونے کا مقصد معلوم کرتے ہیں۔ یہ عیسائی ہیں اور روم کی سرزمین ہی ان کی آخری زمین ہے۔ اس سے پرے کوئی آباد علاقہ نہیں ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہارون روم سے آگے گیا ہی نہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس نے برطانیہ اور سات اینگلوسیکسن بادشاہوں کی حکومت کے بارے میں بھی سنا تھا اور ان کے انگریشن قواعد کے متعلق بھی جانتا تھا۔ ان قواعد پر عربی میں غالباً یہ پہلی تحریر ہے۔ لیکن یہ واقعات کچھ پرانے ہیں کیونکہ سات بادشاہوں کی حکومت تیس سال پہلے ختم ہو چکی تھی۔

روم کے بارے میں ہارون کی معلومات اس شہر سے منسوب عجیب وغریب کہانیوں سے ماخوذ معلوم ہوتی ہیں جس کی مثالیں قرون وسطیٰ کی کتابوں میں بہت ملتی ہیں۔ ان میں سے چند کہانیاں ابن الفقیہ نے جمع کی تھیں جن کا ذکر یاقوت نے کیا ہے۔ یاقوت عظیم مسلمان جغرافیہ دانوں میں سے تھا۔ اس کا انتقال 1229ء میں ہوا۔ یاقوت نے جو کہانیاں بیان کی ہیں ان میں سے بعض پر اسے خود بھی شبہ تھا۔ اس کی جغرافیائی لغت میں روم پر یہ لکھا گیا ہے۔

رومیہ' مستند علماء نے اس کا یہ تلفظ بیان کیا ہے۔ الاصماعی (مشہور ماہر لسانیات) کہتا ہے "یہ نام اسی طرز کا ہے جیسے انطاکیہ اور افامیہ اور ناقیہ اور سلوقیہ اور ملاطیہ۔ روم کی زبان اور ملک میں ایسے نام بہت ہیں۔ روم دو ہیں۔ ان میں سے ایک روم میں ہے اور دوسرا مدائن میں' جس کا نام ایک بادشاہ کے نام پر رکھا گیا ہے۔ جو سرزمین روم میں ہے وہ ان کی حاکمیت اور ان کے علم و حکمت کا مرکز ہے۔ رومی فرمان میں یہ نام ہے رومانس (Romanns) اس نام کو عربی شکل دی گئی اور وہاں جو لوگ رہتے ہیں وہ رومی کہلاتے ہیں۔ یہ شہر قسطنطنیہ سے شمال مغرب میں ہے' پچاس دن یا اس سے زیادہ کے فاصلے پر۔ آج کل یہ فرنگیوں کے ہاتھ میں ہے اور اس کا بادشاہ شاہ المان کہلاتا ہے۔ اس میں پوپ رہتا ہے۔ روم اپنی عمارتوں' اپنی وسعت اور آبادی کے لحاظ سے عجائبات عالم میں سے ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے' میں یہ ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہیں ہوں کہ جو بھی میری کتاب پر نظر ڈالے وہ ان باتوں سے کچھ

اور مطلب اخذ کرے جو میں اس شہر کے بارے میں بیان کرنے والا ہوں کیونکہ یقیناً یہ عظیم شہر ہے' عام (شہروں) سے ماورا' اور اس کا کوئی ثانی نہیں ہوسکتا۔ لیکن بہت سے ایسے لوگ دیکھے ہیں جنہوں نے علم و فضل میں شہرت حاصل کی اور انہوں نے وہ بیان کیا ہے جو میں کہنے والا ہوں۔ انہوں نے جو کہا میں اسی کو دہراؤں گا۔ اب خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ سچ کیا ہے۔

اس محتاط بیانی اور اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کے بعد یاقوت قرونِ وسطی کی کتابوں سے طول طویل اقتباسات نقل کرتا ہے۔ ان میں سے اکثر یورپی ہیں جو روم کے عجائب و غرائب کے بارے میں ہیں۔ یاقوت اس طرح اپنا بیان ختم کرتا ہے۔

یہاں میں نے جو کچھ کہا ہے وہ احمد ابن محمد الہمدانی المعروف ابن فقیہہ کی کتاب سے ماخوذ ہے۔ اس داستان کا سب سے مشکل حصہ یہ ہے کہ شہر اتنا وسیع و عریض ہے کہ اس کے دیہات جو کئی مہینے کے فاصلے پر پھیلے ہوئے ہیں اتنی خوراک پیدا نہیں کرتے کہ اس کی آبادی کے لیے کافی ہو۔ تاہم کچھ لوگ اسے بغداد سے ملاتے ہیں کہ اس کی حدود' وسعت' آبادی کے ہجوم اور حماموں کی تعداد بھی اس کے برابر ہے۔ لیکن ایسی باتیں کسی ایسے شخص کے لیے قبول کرنا مشکل ہے جو صرف ان کے بارے میں سنتا ہے لیکن ان جیسا اس نے کبھی دیکھا نہیں اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا سچ ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے' یہ میرا عذر ہے کہ جو کچھ کہا گیا ہے میں نے وہ سب نقل نہیں کیا بلکہ اسے مختصر کر دیا ہے۔

یاقوت کے نقطہ نظر سے ہمدردی ہی کی جا سکتی ہے:

مغربی یورپ پر قرون وسطی کی اکثر مسلم کتابیں براہ راست یا بالواسطہ طور پر مسلم سفیر ابراہیم ابن یعقوب کے بیان پر ہی مبنی ہیں' جو دسویں صدی کے وسط میں تھا۔ ابن یعقوب نے کیا لکھا' اس کے لیے دو مثالیں ہی کافی ہیں:

آئرلینڈ: چھٹی اقلیم کے شمال مغرب میں ایک جزیرہ...... ساری دنیا میں وائکنگ نے اس سے زیادہ اور کہیں اتنی مضبوطی سے پاؤں نہیں جمائے۔ اس کا محیط ایک ہزار میل ہے اور اس کے لوگ اپنے رسوم و رواج اور لباس میں وائکنگ

ہیں۔ وہ جو عبادہ پہنتے ہیں اس کی قیمت ایک سو دینار ہوتی ہے ان کے معززین جو لبادہ پہنتے ہیں اس پر موتی ٹکے ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے ساحلوں پر وہیل (بالنیا) کے بچوں کا شکار کرتے ہیں جو بہت بڑی مچھلی ہے۔ وہ ان کے بچوں کا شکار کرتے ہیں اور اس کا لذیذ گوشت کھاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ بچے ستمبر میں پیدا ہوتے ہیں اور انہیں اکتوبر' نومبر' دسمبر اور جنوری میں پکڑا جاتا ہے۔ اس کے بعد ان کا گوشت سخت ہو جاتا ہے اور کھانے کے قابل نہیں رہتا۔ ان کے شکار کا طریقہ یہ ہے...... شکاری جہازوں پر جمع ہوتے ہیں' وہ اپنے ساتھ لمبے لمبے فولادی کانٹے لے جاتے ہیں جن کے دندانے ہوتے ہیں۔ کانٹے پر بہت بڑا اور مضبوط چھلا ہوتا ہے۔ چھلے میں موٹی سی کوڈ مچھلی ہوتی ہے۔ ننھی وہیل کو تالیاں بجا کر اپنی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔ وہ بڑے دوستانہ انداز میں جہاز کے قریب آ جاتی ہے۔ تب ایک جہازی اس پر چھلانگ لگاتا ہے اور زور زور سے اس کی پیشانی سہلاتا ہے۔ اس سے ننھی وہیل کو مزہ آتا ہے۔ اس پر جہازی فولادی کانٹا وہیل کے سر کے بیچ میں رکھتا ہے' پھر ایک مضبوط ہتھوڑا لیتا ہے اور پوری طاقت سے کانٹے پر تین ضربیں لگاتا ہے۔ پہلی چوٹ پر وہیل کچھ نہیں کہتی' دوسری اور تیسری چوٹ پر وہ بے چین ہو جاتی ہے اور کبھی کبھی جہاز پر اتنی زور سے اپنی دم مارتی ہے کہ جہاز ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ اسی طرح اچھلتی رہتی ہے آخر تھک جاتی ہے۔ پھر جہاز میں بیٹھے آدمی ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور وہیل کو کھینچتے ہوئے ساحل پر لے آتے ہیں۔ بسا اوقات ننھی وہیل کی ماں یہ کشمکش دیکھ لیتی ہے اور اس کا پیچھا کرتی ہے۔ اس کے لیے وہ لوگ لہسن کچلتے ہیں اور اسے پانی میں ملا دیتے ہیں۔ ماں لہسن کی بو سونگھتی ہے تو اسے برا لگتا ہے وہ مڑتی ہے اور واپس چلی جاتی ہے۔ پھر وہ ننھی وہیل کا گوشت کاٹتے ہیں اور اس پر نمک چھڑکتے ہیں۔ اس کا گوشت ایسا سفید ہوتا ہے جیسے برف اور اس کی کھال ایسی کالی ہوتی ہے جیسے سیاہی۔

آئرلینڈ کے سمندر میں وہیل کے شکار کے بارے میں یاقوت کا بیان واقعی حقائق پر مبنی نظر آتا ہے۔ اس سے اس کے علم کا اظہار ہوتا ہے کہ وہیل کی ماں ہوتی ہے اور ہارپون سے ان کا

شکار کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ بات مشکوک معلوم ہوتی ہے کہ وہ کبھی آئرلینڈ گیا تھا۔ اس کا بیان سنی سنائی باتوں پر مبنی ہے۔ البتہ بوہیمیا کے بارے میں اس کا بیان اس کے اپنے تجربے پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔

بوہیمیا: یہ شاہ بوائے سلاف کی سرزمین ہے۔ اس کی لمبائی شہر پراگ سے کراکوو تک تین میل کی مسافت ہے اور اس کی سرحد لمبائی میں ترک سرزمین کے ساتھ ساتھ ہے۔ شہر پراگ پتھر اور چونے سے تعمیر کیا گیا ہے اور تجارت میں ان تمام سرزمینوں میں سب سے زیادہ دولت مند ہے۔ روسی اور سلاف کراکوو سے سامان لے جاتے ہیں' مسلم' یہودی اور ترک' ترکی سرزمین سے مال و اسباب لے جاتے ہیں اور اپنے ساتھ غلام اور کئی اقسام کی پوستین لاتے ہیں۔ ان کا ملک تمام شمالی لوگوں میں سب سے بہتر ہے اور سب سے ثروت مند ہے۔ ایک پائی میں یہاں اتنا زیادہ آٹا خریدا جا سکتا ہے کہ ایک آدمی کو ایک مہینے کے لیے کافی ہو۔ اور اس رقم سے سواری کے جانوروں کے لیے کافی جو خریدے جا سکتے ہیں جو چالیس دن کام آئیں۔ ایک پائی میں یہاں دس مرغیاں ملتی ہیں۔
شہر پراگ میں گھوڑوں کی کاٹھی' لگامیں اور چمڑے کی پیٹیاں تیار کی جاتی ہیں جو ان علاقوں میں استعمال کی جاتی ہیں اور بوہیمیا میں یہ لوگ ہلکے اور نازک ہلالی رومال تیار کرتے ہیں جن پر کشیدہ کاری کی ہوتی ہے اور جو جالی کی طرح ہوتے ہیں۔ ان کی قیمت ہمیشہ ایک پائی کے دس رومال ہوتی ہے۔ اس سے وہ ایک دوسرے کے ساتھ کاروبار اور سودے بازی کرتے ہیں۔ ان کے پاس ان سے بھرے برتن ہوتے ہیں۔ انہیں وہ رقم یا سکہ مانتے ہیں اور سب سے زیادہ قیمتی چیزیں ان سے خریدی جاتی ہیں۔ جیسے گندم' غلام' گھوڑے' سونا' چاندی اور تمام چیزیں۔ حیرت کی بات ہے کہ بوہیمیا کے لوگ بھورے اور سیاہ بالوں والے ہیں' ان میں ہلکے زردی مائل لوگ بہت کم ہیں۔

مسلم علاقوں پر عیسائیوں کی دوبارہ فتح اور صلیبی جنگوں نے مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان خاصہ ربط وضبط قائم کر دیا تھا چنانچہ توقع کی جا سکتی ہے کہ مسلمانوں کے پاس اپنے عیسائی ہمسایوں کے بارے میں زیادہ مفصل اور درست معلومات ہوں گی بلکہ پرانے زمانوں کی مبہم

اطلاعات' افواہوں اور خیال آرائیوں کے مقابلے میں زیادہ ٹھوس معلومات ہوں گی۔ یہ بات درست ہے کہ بارہویں تیسرہویں اور چودھویں صدی کے مسلمان صلیبی جنگوں سے پہلے کے اپنے پیشروؤں کے مقابلے میں مغرب کے بارے میں زیادہ جانتے تھے لیکن تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ پھر بھی وہ بہت کم جانتے تھے اور اس سے بھی زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ اس کی پرواہ بھی بہت کم کرتے تھے۔

اپنے زمانے کا عظیم ترین جغرافیہ داں ایران کا زکریا ابن محمد القزوینی (وفات 1283) بھی یورپ کے بارے میں زیادہ معلومات ابن یاقوت سے ہی حاصل کرتا ہے اور اس کے لیے وہ شکرگزار بھی ہے کہ یاقوت کی تحریریں محفوظ رہیں۔ اپنے زمانے کے فرنگیوں کے متعلق وہ لکھتا ہے۔

> سرزمین فرنگ' ایک طاقتور سرزمین اور عیسائیوں کی اقلیم میں ایک وسیع سلطنت۔ اس میں سردی بہت زیادہ ہے اور سردی کی وجہ سے ہوا بھاری ہے۔ وہ اچھی چیزوں سے معمور ہے پھل اور اجناس بہت ہیں۔ دریا بھی بہت ہیں بے شمار پیداوار ہے' کھیتی باڑی کا سامان مویشی درخت اور شہد وافر ہے بے شمار اقسام کے شکار ہیں اور فرنگی سرزمین کی تلواریں ہندوستان کی تلواروں سے تیز ہیں۔
>
> اس کے لوگ عیسائی ہیں اور ان کا بادشاہ جرأت و حوصلے والا ہے' اور عظیم طاقت کے ساتھ وہ بے شمار لوگوں پر حکومت کرتا ہے۔ سرزمین اسلام میں ساحل سمندر پر اس کے دو یا تین شہر ہیں اور وہ اپنی سمت سے ان کی حفاظت کرتا ہے۔ جب بھی مسلمان وہاں اپنی افواج بھیجتے ہیں تو وہ اپنے شہروں کی حفاظت کے لیے فوج بھیج دیتا ہے۔ اس کے سپاہی بڑی ہمت اور جرأت والے ہیں۔ مقابلے کے وقت وہ فرار ہونے کا نہیں سوچتے' موت کو ترجیح دیتے ہیں۔

اس بیان کا ایک حصہ پہلے مصنفوں کی بازگشت ہے جن میں غالباً یاقوت بھی شامل ہے۔ لیکن دوسرا حصہ جو سرزمین اسلام میں فرنگیوں کے مقبوضہ شہروں اور ان کی سپاہ کی جرأت و بہادری کے بارے میں ہے صلیبی جنگوں کے زمانے کا معلوم ہوتا ہے۔ قزوینی کے مشاہدات سے یہ تاثر ملتا ہے کہ وہ براہ راست رابطوں سے حاصل کیے گئے ہیں' جو سیاحوں کی کہانیوں' روایتوں اور

یونان سے حاصل کیے ہوئے اس علم سے مختلف ہیں جس سے پرانی کتابیں بھری ہوئی تھیں۔

اس سے بہتر معلومات اسلامی مغرب' یعنی شمالی افریقہ اور سپین والوں کو تھیں جہاں جنگ بازیافت میں عیسائیوں کی پیش قدمی نے بادل ناخواستہ ہی سہی لیکن مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان قریبی رابطہ پیدا کر دیا تھا۔ بارہویں صدی کا جغرافیہ داں ظہوری جو غالباً اسپین میں بیٹھا لکھ رہا تھا' وینس' امالفی' پیسا اور جے نوا کے بارے میں لکھتا ہے ان کے تاجروں اور وہاں کی مصنوعات پر بھی لکھتا ہے۔ جے نوا کے بارے میں وہ رائے دیتا ہے کہ وہ رومیوں اور فرنگیوں کے عظیم شہروں میں سے ایک ہے اور اس کے لوگ رومیوں کے قریش ہیں۔" چونکہ قریش حضرت محمد ﷺ کا قبیلہ تھا اور سارے عرب میں معزز مانا جاتا تھا اس لیے جے نوا کے لوگوں کو یہ بہت بڑا اعزاز دیا گیا تھا۔ صرف یہی نہیں ظہوری نے یہاں تک لکھا کہ "کہا جاتا ہے جے نوا کے باشندے عرب قبیلے غسان سے تعلق رکھتے ہیں جو عیسائی ہو گیا تھا۔ یہ قبیلہ اسلام سے قبل شام اور عرب کے سرحدی علاقوں میں رہتا تھا۔" یہ لوگ اپنی شباہت میں رومیوں سے نہیں ملتے۔ اکثر رومی گورے ہیں حالانکہ یہ لوگ گہرے رنگ کے ہیں ان کے گھونگھریالے بال ہیں اور کھڑی ناک ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ عرب نسل کے ہیں۔"

دریں اثناء شمالی افریقہ کا ایک اور مسلمان جو غالباً سسلی میں رہتا تھا ایک کتاب لکھتا ہے۔ یہ کتاب یورپ اور باقی دنیا سے متعلق مسلمانوں کے علم کا اعلیٰ معیار پیش کرتی ہے۔ ابو عبداللہ محمد الشریف الادریسی' کا تعلق مراکش کے سابق حکمران خاندان سے تھا۔ وہ 1099ء میں' مراکش کے شہر سیوتہ میں پیدا ہوا۔ غرناطہ میں تعلیم حاصل کرنے اور افریقہ اور مشرق کی خوب سیر و سیاحت کرنے کے بعد وہ واپس پہنچا تو اسے سسلی کے نارمن بادشاہ روجر دوئم کی دعوت ملی اور وہ پالیرمو میں آباد ہو گیا۔ وہاں اپنی سیاحت کے دوران میں جمع کی ہوئی اور دوسروں سے حاصل ہونے والی معلومات پر مبنی اس نے ایک کتاب لکھی جسے "کتاب روجر" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ کتاب جغرافیہ کی عظیم ترین کتاب مانی جاتی ہے۔ یہ کتاب 1154ء میں مکمل ہوئی۔ اس کتاب میں اٹلی کے بارے میں بہت زیادہ معلومات ہیں اور اس میں مغربی یورپ کے بیشتر حصے پر بھی مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ ادریسی پرانے مسلمان جغرافیہ دانوں پر انحصار نہیں کرتا بلکہ مغربی عیسائی مصنفوں سے استفادہ کرتا ہے اور غالباً شمالی اسپین کے نقشوں سے کام لیتا ہے۔ یہ نقشے اسے آسانی سے سسلی میں مل گئے ہوں گے۔ جزائر برطانیہ کے بارے میں ادریسی اس طرح لکھتا ہے:

ساتویں اقلیم کا پہلا حصہ کلی طور پر سمندر پر مشتمل ہے۔ اس کے جزیرے بے آباد اور سنسان ہیں۔

ساتویں اقلیم کے دوسرے حصے میں سمندر ہے جس میں لاانجلیتسر (انگلینڈ) کا جزیرہ ہے۔ یہ بہت بڑا جزیرہ ہے جس کی شکل شتر مرغ کے سر کی سی ہے' اس میں آباد شہر میں اونچی پہاڑیاں ہیں' بہتے چشمے ہیں اور مسطح زمین ہے۔ وہ بہت زرخیز ہے اور اس کے لوگ مضبوط' جفاکش اور محنتی ہیں۔ وہاں سردی دائمی ہے۔ اس سے قریب ترین زمین وسان ہے جو فرانس میں ہے۔ اس جزیرے اور براعظیم یورپ کے درمیان بارہ میل چوڑی آبنائے ہے۔(21)

اس کے بعد ادریسی مختصر طور پر ڈورچسٹر دیرہم ڈارٹ متھ جزیرہ کا تنگ حصہ جسے کار یوال کہا جاتا ہے اور جو چڑیا کی چونچ کی طرح ہے' سالسبری' ساؤتھمٹن ونچسٹر شورہم ایک شہر جو خاصہ بڑا ہے اور کافی بڑی آبادی والا ہے پر ہجوم بازاروں' دست کاروں اور خوش حال تاجروں سے بھرا ہوا ہے وہ ڈوور' لندن' لنکن اور ڈرہم شہروں کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے آگے اسکاٹ لینڈ ہے جس کے بارے میں ادریسی لکھتا ہے:

یہ جزیرۂ انگلستان سے ملحق ہے اور یہ طویل جزیرہ نما ہے جو بڑے جزیرہ کے شمال میں ہے۔ یہ بے آباد ہے اور اس میں شہر ہیں نہ گاؤں۔ اس کا طول 150 میل ہے۔(22)

ادریسی نے اس سے بھی زیادہ دور دراز مقام کا ذکر سنا ہے۔

بے آباد جزیرہ نما کے آخری سرے کے جزیرہ آئرلینڈ کے آخری سرے تک جہاز کے ذریعہ مغرب کی جانب دو دن کا سفر ہے...... "کتاب العجائب" (اس سے پہلے کی ایک مشرقی کتاب) کا مصنف کہتا ہے کہ وہاں تین شہر ہیں اور یہ کہ وہ کبھی آباد تھے اور یہ کہ جہاز وہاں ٹھہرتے تھے اور وہاں کے لوگوں سے عنبر اور رنگین پتھر خریدتے تھے۔ پھر ایسا ہوا کہ ان میں سے ایک نے اپنے آپ کو بادشاہ بنا لیا۔ اس نے لوگوں سے جنگ کی اور لوگوں نے اس کا مقابلہ کیا۔ پھر ان کے درمیان سے ایک دشمن کھڑا ہوا انہوں نے ایک دوسرے کو نیست و نابود کیا۔ اور ان میں سے کچھ لوگ بڑے جزیرے کی طرف چلے گئے۔ اس طرح

ان کے شہر تباہ ہو گئے اور ان میں کوئی بھی باقی نہیں بچا۔ (23)

جزائر برطانیہ کے بارے میں ادریسی کی معلومات کم ہیں۔ اس کے مقابلے میں براعظم یورپ کے بارے میں وہ بہت زیادہ جانتا ہے حتیٰ کہ اس کے انتہائی شمالی علاقوں سے بھی وہ خوب واقف ہے۔ جزائر برطانیہ کے متعلق اس کا بیان کہ ان کی شکل شتر مرغ کے سر کی سی ہے اور وہ چڑیا کی چونچ نظر آتا ہے صاف ظاہر کرتا ہے کہ اس نے صرف نقشہ دیکھا تھا۔ اور شاید نقشے سے ہی اس نے شہروں کے نام نقل کیے ہیں۔

بعد میں آنے والے عرب جغرافیہ دانوں نے ادریسی کی ہی تقلید کی اور اسی کا جمع کیا ہوا مواد استعمال کیا۔ اسلامی مغرب کے ایک مصنف ابن عبدالمنعم نے جس کا زمانہ معلوم نہیں، ایک جغرافیائی فرہنگ مرتب کی تھی جس میں مغربی یورپ کے چند علاقے بھی شامل تھے۔ ابن سعید (1214-1274) نے جو غرناطہ کے قریب الکالا لاریل شہر کا رہنے والا تھا جغرافیہ عالم لکھا جس کا حوالہ بعد میں آنے والے مشرق اور مغرب کے مسلمان مصنفین نے بہت دیا ہے۔

مغربی یورپ کے بارے میں ابن سعید کی تحریر میں بہت سی دلچسپ باتیں ہیں۔ انگلستان کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے "صلاح الدین کی تاریخ اور عکہ کی جنگ میں اس جزیرہ کے بادشاہ کا نام "الانقطار" بیان کیا گیا ہے (24) صلاح الدین کی تاریخ میں جس حکمران کا ذکر آیا ہے وہ یقیناً رچرڈ کوئر دی لائن (رچرڈ شیر دل) تھا۔ تینوں صلیبی جنگوں سے متعلق مسلمانوں کی تحریروں میں جو انقطار لکھا گیا ہے وہ انگلستان کے عجیب و غریب نام لا انجلستر کی وجہ سے پڑا ہے۔ مسلم وقائع نگار مشرق میں ہونے والی صلیبی جنگوں کے بارے میں تو بہت کچھ لکھتے ہیں لیکن حیرت انگیز طور پر صلیبی جنگوں میں شامل ملکوں کے اندرونی حالات سے کسی قسم کی دلچسپی کا اظہار نہیں کرتے۔ بلکہ ان ملکوں کے فوجی دستوں میں جو اختلافات تھے ان کا ذکر بھی بہت کم کرتے ہیں اور یہ بالکل ہی نہیں بتاتے کہ ان دستوں کے اپنے وطن میں کیا حالات تھے چنانچہ شام و فلسطین کی تاریخ کی بعض شخصیتوں سے ان دور افتادہ جزیروں کے لوگوں کی مماثلت بیان کر کے ابن سعید عجیب سی بات کرتا ہے۔ بیشتر مسلم وقائع نگاروں کے نزدیک تمام کافر جو شمال کی وحشی سرزمینوں سے آئے تھے فرنگی تھے اور جتنی جلدی وہ واپس چلے جاتے اتنا ہی بہتر تھا۔ فرنگی حکمرانوں یا رہنماؤں کے صرف نام کبھی نہیں لکھے جاتے تھے بلکہ ان کے خطاب اور القاب بھی لکھ دیئے جاتے تھے اور آخر میں بددعا لکھ دی جاتی کہ "خدا انہیں جلد سے جلد جہنم کا ایندھن بنائے۔" یا

اسی قسم کی کوئی اور بد دعا۔"

مسلم مورخین نے کبھی یہ تکلیف نہیں اٹھائی کہ شام میں موجود فرنگیوں کا اس معلومات سے موازنہ کرتے جو مورخوں' جغرافیہ دانوں یا سیاحوں نے فراہم کی تھیں۔ یہ خیال کسی کو بھی نہیں آیا کہ فرنگی مذہب' فلسفہ' سائنس یا ادب کسی دلچسپی کا حامل بھی ہوگا۔ تجارتی اور سفارتی رابطوں کے کئی صدی بعد چودھویں صدی کے آخر میں کہیں جا کر ایک ایسا عربی مصنف ملتا ہے جو یہ اشارہ دیتا ہے کہ اس قسم کی چیزیں یورپ میں بھی موجود ہو سکتی ہیں۔ توقع کے عین مطابق یہ اشارہ اس شخص کی طرف سے ملتا ہے جو ان عظیم اور طباع دماغوں میں سے ایک تھا جو مسلم تہذیب نے پیدا کیے۔ اس نے بھی جو کچھ لکھا ہے اس میں اس کے ذہنی شکوک شامل ہیں۔ اپنے مشہور مقدمہ کے جغرافیہ والے باب میں تونس کے اس مورخ اور ماہر عمرانیات ابن خلدون (1406-1332) نے مغربی یورپ کو بھی شامل کیا ہے۔ لیکن وہ بھی ایسی کوئی بات نہیں لکھتا جو ادریسی یا دوسرے مسلم جغرافیہ دانوں نے پہلے بیان نہ کی ہو۔ تاہم مقدمہ کے آخری حصے میں عقلی علوم کے آغاز اور فروغ پر بحث کی گئی ہے جو یقیناً ایک انقلابی قدم ہے۔ یونانیوں' ایرانیوں اور دیگر قدیم لوگوں میں عقلی علوم کی نمود کا ذکر کرتے ہوئے ابن خلدون اسلام کے زیر سایہ ان علوم کی ترقی اور شمالی افریقہ کے راستے اسپین تک اس کے پھیلاؤ پر روشنی ڈالتا ہے اور خاتمہ اس بات پر کرتا ہے:

> ہم نے کافی عرصے سے سن رکھا ہے کہ فرنگیوں کی سرزمین یعنی روم اور شمالی ساحلوں پر اس کی باج گزار ریاستوں میں فلسفیانہ علوم فروغ پذیر ہیں۔ قدیم تحریروں کا احیا ہو رہا ہے' ان کی تعلیم بڑھ رہی ہے' ان کی مجالس پر ہجوم ہیں' ان علوم کے ماہرین کی تعداد بہت ہے اور طالب علم بے شمار ہیں۔ لیکن خدا ہی جانتا ہے کہ ان علاقوں میں اور کیا ہو رہا ہے۔ خدا جو چاہتا ہے وہی تخلیق کرتا ہے۔(25)

ابن خلدون تاریخ عالم کا بھی مصنف ہے۔ اس کا مشہور مقدمہ اس کی کتاب کا دیباچہ ہے۔ اس میں حسب توقع شمالی افریقہ کا احوال بہت زیادہ ہے اور تونس کے ساتھ اس صلیبی جنگ کا ذکر ہے جس کی قیادت فرانس کے بادشاہ لوئی نہم نے کی تھی اور جس میں اسے شکست ہوئی تھی۔ یہ بیان کئی وجوہ سے قابل ذکر ہے۔ اس میں ابن خلدون فرانسیسی بادشاہ کا نام "سانلووس ابن لودس" بیان کرتا ہے اور اس کا لقب "ردا فرانس" بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ "فرنگی زبان میں اس کا مطلب

ہے شاہ فرانس۔'' (26) اس کا مطلب ہے کہ وہ جانتا تھا کہ بادشاہ سینٹ لوئی کے لقب سے جانا جاتا ہے (لیکن یہ معلوم نہیں کہ اس کے لیے اس کا مفہوم کیا تھا۔) اور یہ بھی اسے علم ہے کہ بادشاہ کے باپ کا نام لوئی تھا۔ زیادہ معنی خیز بات یہ ہے کہ دوسرے مسلم مورخین کی طرح ابن خلدون یہاں صلیبی جنگ کا لفظ استعمال نہیں کرتا بلکہ تونس کے خلاف اس جنگ کو عیسائیوں اور مسلمانوں کی تاریخی آویزش قرار دیتا ہے جو قدیم عرب سے بازنطین کی جنگوں اور فلسطینی اور ہسپانویوں کی تازہ چھڑپوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ اپنا بیان حملہ آور ملک کے منبع و ماخذ کے مختصر تذکرے سے شروع کرتا ہے یہ اور بات ہے کہ یہ تذکرہ پہلے سے موجود جغرافیائی معلومات کے محدود ذخیرے سے آگے نہیں جاتا۔

یورپ کے بارے میں اس کے پاس کہنے کو بہت کم ہے۔ کتاب کی دوسری جلد قبل از اسلام اور غیر مسلم لوگوں سے بحث کرتی ہے جن میں قدیم عرب' بابل' مصر اسرائیل' ایران' یونان' روم اور بازنطین شامل ہیں۔ یورپ میں صرف ویسی گوتھ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسپین پر مسلمانوں کی فتح کے ذکر کے لیے ان کا مختصر سا تذکرہ ضروری بھی تھا اور پھر وہ عرب ہسپانوی تاریخ نویسی کی روایت کا حصہ بھی۔ ابن خلدون کی تاریخ عالم اسپین کے شمال اور ایران کے مشرق سے آگے نہیں بڑھتی۔ گویا وہ اس کی اپنی تہذیب تک ہی محدود ہے۔ وہ ان نام نہاد عالمی تاریخوں کی پیش رو ہے جو کچھ عرصے پہلے تک مغربی دنیا میں لکھی جاتی رہی تھیں۔

لیکن قریب ایک صدی قبل بہت دور ایران میں صحیح معنی میں ایک تاریخ عالم لکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ایسی تاریخ جس میں وہ ساری آباد دنیا شامل تھی جو اس وقت تک معلوم تھی۔ یہ ایسی کوشش تھی جس کی مثال پہلے نہیں ملتی اور بعد میں کافی عرصے تک اس کا متبادل پیدا نہیں ہو سکا۔ یہ موقع فراہم کیا تھا منگولوں کی فتوحات نے' جس نے تاریخ میں پہلی بار مغربی اور مشرقی ایشیاء کو ایک واحد نظام سلطنت میں متحد کر دیا تھا اور چین اور ایران کے درمیان قدیم تہذیبوں میں قریبی اور بار آور رشتہ قائم کر دیا تھا۔

چودھویں صدی کے ابتدائی برسوں میں ایران کے منگول شہنشاہ غزن خان نے اپنے طبیب اور مشیر رشید الدین کو' جو یہودی سے مسلمان ہوا تھا' بنی نوع انسان کی تاریخ لکھنے کی ہدایت کی۔ ایسی تاریخ جس میں تمام معلوم سلطنتیں اور انسان شامل ہوں۔ رشید الدین نے جو تاریخ لکھی اس نے اسے عالم اسلام ہی نہیں بلاشبہ ساری بنی نوع انسان کا پہلا عظیم مورخ بنا دیا۔ اس نے

پوری دیانت داری اور جگر سوزی کے ساتھ یہ کتاب لکھی۔ چین کے بارے میں لکھنے کے لیے اس نے ایک چینی عالم سے مشورہ کیا جسے اس مقصد سے ایران بلایا گیا۔ ہندوستان کے لیے اس نے کشمیر سے ایک بدھو بھکشو کو بلایا۔ اتنے وقیع تاریخی کام میں جس کا دائرہ بھی بہت وسیع تھا دور افتادہ مغربی یورپ کے دشمنوں کو بھی مختصراً شامل کرنا ضروری سمجھا گیا۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ ان میں سے بہت سے رشید الدین کے آقا کے ساتھ سفارتی مذاکرات میں مصروف تھے۔ یورپ کے بارے میں اس کی معلومات کا مآخذ غالباً ایک اطالوی باشندہ تھا جو شاید پاپائے روم کے ان نمائندوں میں سے ایک تھا جو منگول درباروں میں آتے رہتے تھے۔ اس کے ذریعہ رشید الدین نے ایک یورپی روزنامچے تک رسائی حاصل کی جو اسی زمانے میں دریافت کیا گیا تھا اور اسے تیرھویں صدی کے مارٹن آف ترو پاؤ نے لکھا تھا۔ اگرچہ وہ شخص چیک تھا لیکن اسے مارٹی نس پولونس بھی کہا جاتا ہے۔ (27)

فرینک کے بارے میں رشید الدین کی کتاب کا حصہ' دو ابواب میں منقسم ہے۔ پہلا باب یورپ کی ریاستوں کا جغرافیائی اور سیاسی جائزہ ہے دوسرا باب بادشاہوں اور پوپ کے بارے میں ہے۔ رشید الدین نے یورپ پر قدیم عربی اور فارسی کتابوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ لیکن بیشتر معلومات اس کی اپنی ہیں اور نئی ہیں۔ بادشاہ اور پوپ کے رشتے کے بارے میں اس نے تفصیل سے اور واضح طور پر لکھا ہے۔ یہ معلومات اس نے پوپ کے نمائندے سے حاصل کی تھیں۔ اسے شاہی تاج پوشی کے بارے میں کافی معلومات تھیں۔ اس نے انگلستان کے اونی اور سرخ کپڑے کے بارے میں بھی سن رکھا تھا۔ پیرس اور بولون کی یونیورسٹیوں' وینس کی نہروں' جمہوریہ اٹلی اور آئرلینڈ میں سانپ نہ ہونے کا علم بھی اسے تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا علم خاصہ وسیع تھا۔ حتیٰ کہ اس کا یہ عجیب بیان کہ دونوں جزیروں (آئرلینڈ اور انگلستان) کا حکمران اسکاٹ لینڈ کہلاتا ہے اور وہ شہنشاہ انگلستان کے باج گزار ہیں' اپنے اندر کچھ نہ کچھ سچائی رکھتا ہے۔ (28)

بادشاہوں اور پوپ سے متعلق اس کا تذکرہ شہنشاہ ایلبرٹ اوّل اور پوپ بینی ڈکٹ یازدہم پر ختم ہوتا ہے۔ ان دونوں کے بارے میں صحیح کہا گیا ہے کہ اس وقت وہ زندہ تھے۔ اس تذکرہ میں مارٹن کے بیان سے زیادہ کچھ نہیں ملتا۔ یورپ سے متعلق اس کا تذکرہ سرسری' حشو زوائد سے معمور اور کہیں کہیں حقائق کے خلاف بھی ہے۔ اس کے مقابلے میں ہندوستان اور چین

کی تہذیب کے بارے میں اس کا تذکرہ زیادہ مفصل اور زیادہ جامع ہے۔ لیکن مسعودی نے فرینک بادشاہوں کی جو فہرست لکھی تھی اس کے بعد قرون وسطی کے کسی مصنف کی طرف سے عیسائی یورپ کی تاریخ کا خاکہ تیار کرنے کی یہ پہلی کوشش ہے۔ پورے قرون وسطی میں مسلمان ان پسماندہ اور کافر لوگوں سے بالکل بے نیاز رہے جو بحیرۂ روم کے شمال میں رہتے تھے۔ سب سے زیادہ حیرت تو اس بات پر ہوتی ہے کہ ابن خلدون جیسا طباع مفکر جو تونس کا رہنے والا تھا اس نے بھی مغرب کے بارے میں بے اعتنائی سے کام لیا حالانکہ تونس کو مغرب کا براہ راست تجربہ تھا۔ مغرب میں صلیبی جنگوں کے بارے میں زبردست بحث مباحثے چلے، جو مغربی تاریخ میں نہایت اہم مانے جاتے ہیں لیکن سرزمین اسلام میں وہ ذرا سی بھی دلچسپی پیدا نہیں کر سکے۔ انہوں نے کسی قسم کی فکری ہلچل پیدا نہیں کی حتی کہ صلیبی جنگوں کے خاتمے کے بعد سفارتی اور تجارتی تعلقات کی سرگرمیاں تیز ہوئیں تو انہوں نے بھی دوسرے فریق کے اسرار معلوم کرنے کا شوق اور جذبہ پیدا نہیں کیا۔

اگرچہ اسپین اور مشرق میں مسلمان حکومتیں زوال پذیر تھیں اور غیر ملکی تسلط میں منتشر ہو رہی تھیں لیکن ایک نئی اور پر جوش ریاست اناطولیہ عروج حاصل کر رہی تھی اور جلد ہی مسلمانوں کی آخری اور عظیم سلطنت کا درجہ حاصل کرنے والی تھی۔ عثمانی مملکت اسلام اور عیسائیت کی سرحد پر پیدا ہوئی۔ اگرچہ عثمانی اپنے پیشرووں سے زیادہ کٹر مسلمان تھے لیکن شروع سے ہی انہوں نے عیسائی یورپ کے کم سے کم ایک حصے کے ساتھ قریبی تعلقات قائم کیے رکھے۔ ترقی پذیر عثمانیوں کے نزدیک اب فرنگی یورپ ایسا دور افتادہ اور پراسرار خطہ نہیں رہا تھا جیسا وہ قرون وسطی کے عربوں اور ایرانیوں کے لیے تھا۔ وہ ان کا قریبی ہمسایہ اور مد مقابل تھا جس نے سابق بازنطینی سلطنت کی جگہ لی تھی اور وہ بھی اس ہزاریہ میں عالم اسلام کا انتہائی بڑا دشمن تھا۔

فن حرب ایک ایسا فن تھا جس کے لیے ترک یورپ کی طرف متوجہ ہوئے بلکہ اس کی رہنمائی حاصل کی۔ بحری اڈے بنانے کے سلسلے میں خاص طور سے انہوں نے یورپ کی تقلید کی حتی کہ اپنی طرف سے انہوں نے اس میں کسی قسم کی ترمیم یا اضافہ تک نہیں کیا۔ بحری جنگ کی تیکنیک انہوں نے یورپ سے حاصل کی تو اس کے ساتھ یورپ کے بنائے ہوئے نقشوں اور بحری راستوں کا ضروری علم بھی حاصل کر لیا اور بہت جلد اس قابل ہو گئے کہ یورپ کے بحری چارٹ کی نقل کر لیں یا ان کے ترجمے کر لیں۔ پھر وہ خود ہی ساحلوں کے چارٹ تیار کرنے لگے۔ پیری رئیس

(وفات 1550) جو بحری راستوں کا پہلا ترک نقشہ نویس تھا غالباً چند مغربی زبانیں بھی جانتا تھا۔ اس نے مغربی حوالوں سے کام لیا۔ 1517ء میں اس نے سلطان سلیم اوّل کو دنیا کا نقشہ پیش کیا۔ اس میں امریکہ کے اس نقشے کی نقل بھی شامل تھی جو کولمبس نے 1498ء میں بنایا تھا کولمبس کا اصل نقشہ تو کھو گیا تھا یہ نقشہ غالباً ہسپانویوں کے ساتھ متعدد لڑائیوں کے دوران میں مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا تھا۔ کولمبس کے نقشے کی یہ واحد نقل ہے جو اب تک محفوظ ہے اور توپ کاپی استنبول کی لائبریری میں موجود ہے۔ (29) اس کے بعد نئی دنیا کی دریافت کے بارے میں ایک تحریر لکھی گئی جو ظاہر ہے کہ مغربی ذرائع کی مدد سے عثمانی جغرافیہ داں محمد ابن مسعودی نے مکمل کی اور سلطان مراد ثالث کو پیش کی تھی۔ (30)

بحیرۂ روم میں جہاز رانی کے لیے ایک ترکی کتاب 1521ء میں مرتب کی گئی جس پر 1525ء میں نظر ثانی کی گئی۔ اس کتاب میں جہاز رانی کے سلسلے میں ہدایات ہیں اور تفصیل کے ساتھ بحیرۂ روم کے ساحلوں کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ 1525ء کی اس مطبوعہ کتاب میں ایک دیباچہ اور ایک ضمیمہ بھی شامل ہے۔ یہ دونوں منظوم ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ترکوں میں کس قسم کی جغرافیائی معلومات اور تصورات موجود تھے۔ ایک اور کتاب تونس کے کسی حاجی احمد نے لکھی تھی۔ حاجی احمد نے مراکش کے مقام فیض کے مدرسے میں تعلیم حاصل کی تھی اور وہ کسی وقت یورپ کے کسی شہر غالباً وینس میں قید رہا تھا۔ وہیں اس نے کتاب لکھی جس میں یورپ' ایشیاء افریقہ' اور امریکہ کے معلوم مقامات شامل ہیں۔ اس نے اپنے بارے میں بھی کچھ تفصیل لکھی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے یہ نقشہ اس وقت تیار کیا جب وہ ایک ''نیک طینت اور عالم فاضل شخص کی قید میں تھا۔'' اپنی کتاب کے بارے میں وہ لکھتا ہے کہ ''میں نے مسلم رسم الخط میں فرنگی زبان اور تحریر کا ترجمہ کیا ہے۔'' انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ میری محنت و مشقت کے صلے میں مجھے رہا کر دیں گے یہ محنت ایسی ہے جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے اسے اپنی استطاعت کے مطابق اور اپنے آقا کے حکم پر ترکی زبان میں لکھا (غالباً املا کرایا) کیونکہ یہ زبان دنیا میں بہت بڑا درجہ رکھتی ہے'' (31)

عام جغرافیہ پر پہلا بڑا عثمانی کام کاتب چلپی کی کتاب ''جہاں نما'' ہے۔ اس نے کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے کہ وہ دنیا کے جغرافیہ کے بارے میں اپنی کتاب مکمل کرنے سے مایوس ہی ہو چکا تھا کہ اسے خیال آیا کہ وہ جزائر برطانیہ اور آئرلینڈ کے بارے میں اس وقت تک

نہیں لکھ سکتا جب تک یورپی کتابوں کا مطالعہ نہ کرے۔ کیونکہ عربی' فارسی اور ترکی کی جو کتابیں اسے دستیاب ہیں وہ نامکمل اور نادرست ہیں۔ اس نے ایک شخص کی مدد سے اورٹی لیس کے جغرافیہ اور مرکیٹر کی اٹیلس (بڑی اور چھوٹی) کا مطالعہ کیا۔ عین اس وقت جب وہ امید کر رہا تھا کہ اسے اورٹی لیس کی کتاب کی جلد مل جائے گی تو خوش قسمتی سے اسے ایٹلس مائنر مل گئی جو اٹیلس میجر کا خلاصہ ہے۔ انہی دنوں اس کی شناسائی شیخ اہلسی سے ہوگئی جو فرانسیسی راہب تھے اور مشرف باسلام ہوگئے تھے۔ ان کی مدد سے اس نے اٹیلس مائنر کا ترجمہ کیا۔ جسے اس نے 1655ء میں مکمل کیا۔(32)

اس صدی کے آخر میں ایک اور مصنف ابوبکر ابن بہرام الدمشقی (وفات 1691) نے جو وزیر اعظم فاضل احمد پاشا کے بہت قریب تھا' کاتب چلبی کی کتاب ''جہاں نما'' پر کام شروع کیا اور اس میں کئی اضافے کیے۔ اس کا اصل کام جون بلو کی کتاب اٹیلس میجر کا ترجمہ ہے(33) معلوم ہوتا ہے کہ دمشقی کو بلو کے جغرافیہ سے زیادہ دلچسپی تھی۔ اس کی جیومیٹری سے دلچسپی کم تھی۔ خاص بات یہ ہے کہ کائنات کے نظریہ ہرٹائیکو براہے اور کوپرنیکس کے خیالات کا اسی نے خلاصہ پیش کیا اور لکھا ''ایک اور نظریہ بھی ہے جس کی رو سے سورج کائنات کا مرکز ہے اور زمین اس کے گرد گھومتی ہے۔(34)

کاتب چلبی اور دمشقی نے جو رجحان پیدا کیا تھا وہ اٹھارویں صدی تک جاری رہا۔ کئی اور کتابیں بھی جغرافیہ پر لکھی گئیں لیکن وہ ''جہاں نما'' کی شرح تھیں یا اس میں تھوڑا بہت اضافہ تھا۔ ان میں کسی قدر دلچسپی کی حامل آرمیںیا کے بیدروس پیرونین کی کتاب ہے۔ یہ شخص ہالینڈ کے سفارت خانے میں ترجمان کے فرائض ادا کرتا رہا تھا اور بعد میں اس نے سسلی کی حکومت کے لیے خدمات انجام دیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے ایک فرانسیسی کتاب کا ترکی ترجمہ کیا تھا۔ ژاک روبس کی اس کتاب کا نام ہے **La Methode Pour apprendre facilement la geographie** (35)

یہ کتابیں اگرچہ کسی حد تک قابل توجہ ہیں لیکن ایسا لگتا ہے کہ ان کا اثر بہت محدود تھا اور یہ بھی مشکوک بات ہے کہ ترک جہازراں یا جغرافیہ داں بحیرۂ روم سے آگے کی دنیا کے بارے میں زیادہ کچھ جانتے تھے۔ 1770ء میں جب ایک روسی بحری بیڑہ مغربی یورپ کا چکر لگاتا ہوا بحیرۂ ایجین میں عثمانیوں کے مقابل جا پہنچا تو عثمانی حکومت نے وینس کے نمائندے سے باقاعدہ

احتجاج کیا کہ اس کی حکومت نے روسی بحری بیڑے کو بالٹک سے ایڈریاٹک سمندر میں جانے کی اجازت دی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ترکوں کو ازمنۂ وسطیٰ کے چند نقشوں کا ہی علم تھا۔ جن میں ان دونوں سمندروں کے درمیان ایک دو بار دکھائی گئی ہے جس کا جنوبی حصہ وینس تھا۔ اگرچہ کاتب چلپی اور اس کے شاگردوں کو اس سے زیادہ علم تھا اور ''جہاں نما'' شائع ہو چکی تھی لیکن دربار عالیہ کے حکام ابھی تک قرون وسطیٰ کے نقشوں سے ہی رہنمائی حاصل کر رہے تھے۔

اٹھارویں صدی کا وقائع نگار واصف لکھتا ہے کہ عثمانی وزراء یہ تصور ہی نہیں کر سکتے تھے کہ روسی بحری بیڑہ کے لیے سینٹ پیٹرس برگ سے بحیرۂ روم جانے کے لیے کوئی اور راستہ بھی ہے (36) آسٹریا کے ترجمان اور مورخ جوزف ہیمبر بھی اسی قسم کا ایک ناقابل یقین واقعہ بیان کرتا ہے ''میری آنکھوں کے سامنے'' 1800 میں وزیر اعظم یوسف ضیا نے یہ یقین کرنے سے انکار کر دیا کہ برطانیہ اپنی فوجی کمک بحیرۂ احمر کے راستے ہندوستان سے یہاں لا سکتا ہے۔ ہیمر کہتا ہے سڈنی اسمتھ کو اس ملاقات میں جن کی میں ترجمانی کر رہا تھا نقشوں کے ذریعہ یہ یقین دلانے میں سخت دشواری پیش آئی کہ بحر ہند اور بحیرۂ احمر کے درمیان دونوں سمندروں کو ملانے والا ایک مقام ہے۔'' (37) یورپ اور شمالی امریکہ کی جدید تاریخ میں ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ ترک سیاست داں اور مدبر جغرافیہ سے بالکل نابلد تھے۔ لیکن یہ لاعلمی جو کبھی کبھی حکمرانوں میں پائی جاتی تھی سیاسی اشرافیہ کا خاصہ نہیں تھی اور تربیت یافتہ اور باخبر انتظامیہ اس کی اصلاح کرتی رہتی تھی۔

یورپ کے انسانی جغرافیہ سے متعلق یعنی ان ملکوں میں رہنے والے لوگوں کے بارے میں جو عثمانی افق پر ابھرتے نظر آتے تھے عثمانی کتابوں میں بہت کم معلومات ملتی ہیں۔ صرف ایک استثناء ہے اور وہ ہے مصطفیٰ علی گال پولی (1541-1600) وہ مشہور مورخ' شاعر اور اپنے زمانے کا ہر فن مولا شخص تھا۔ کم سے کم دو مقامات پر مصطفیٰ علی نے یورپ کی نسلوں کے بارے میں کسی حد تک سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ تاریخ عالم پر اپنی ضخیم کتاب کی پانچویں جلد میں' جس میں یورپ کا ذکر نہیں ہے' وہ ضمناً یورپ کی ان مختلف نسلوں کا ذکر کرتا ہے جن سے عثمانیوں کا اپنی سرحدوں کے اندر اور سرحدوں کے باہر واسطہ پڑا۔ اور یہ بیان خاصہ طویل ہے۔ اس کی ایک اور کتاب میں بھی اسی قسم کا ایک حصہ ملتا ہے جس میں اس نے مختلف اقسام کے غلاموں اور ملازموں کا تذکرہ کیا ہے اور ان ملکوں کی نسلوں کے اوصاف اور رجحانات سے بحث کی ہے جہاں سے یہ لوگ آتے ہیں۔ وہ

قدرتی طور پر سلطنت عثمانیہ کے اندر بسنے والی نسلوں سے بخوبی واقف ہے اور واضح طور پر غلاموں کے ساتھ آقاؤں کے تعصبات کی ترجمانی کرتا ہے "البانیہ کے غلاموں سے عزت نفس اور کردوں سے وفاداری کی توقع کرنا ایسا ہی ہے جیسے بدذات مرغی سے یہ توقع کرنا کہ وہ کڑکڑ کرنا بند کردے۔ اسی طرح روسی کنیز سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ ہرجائی نہ ہو اور کوسک سے یہ توقع کہ وہ شرابی نہ ہو۔" مصطفیٰ علی بلقان کے غلاموں کی توہین کرتا ہے۔ کہتا ہے بوسنیا اور کروشیا کے لوگ شریف ہیں۔ یورپ کے دوسرے لوگوں میں وہ ہنگری والوں' فرینک اور جرمن (المانوی) کا ذکر کرتا ہے لکھتا ہے فرینک اور ہنگری کے لوگ ایک دوسرے سے مشابہ ہیں۔ یہ لوگ کھانے پینے' لباس پہننے اور گھروں کی صفائی وغیرہ میں صاف ستھرے ہیں۔ یہ لوگ فہم وفراست میں تیز ہیں' ان میں حس مزاح بہت ہے اور وہ پھرتیلے ہیں۔ البتہ ان کے اندر چالبازی اور چالاکی کا رجحان بھی ہے اور دولت کے حصول کے لیے وہ بہت عیار ہیں۔ جہاں تک اچھی پرورش اور وقار وتمکنت کا تعلق ہے' اسے مصطفیٰ علی بہت اہمیت دیتا ہے "ان میں یہ چیزیں اوسط درجہ کی بھی ہیں تاہم وہ مربوط اور بامعنی گفتگو کرسکتے ہیں۔" شکل وصورت میں تو وہ اچھے ہوتے ہیں لیکن ان میں سے کم ہی صحت مند ہیں بعض تو مختلف بیماریوں کا شکار رہیں ان کی صحت کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ تجارت وکاروبار میں وہ بہت تیز ہیں' اکٹھے ہوتے ہیں تو خوب شراب پیتے ہیں غل غپاڑو کرتے ہیں۔ وہ بخششیں کرنا جانتے ہیں۔ مجموعی طور پر وہ چست وچالاک لوگ ہیں۔ ان کے برعکس جرمن ضدی اور بدمزاج لوگ ہیں۔ دست کاریوں وغیرہ میں طاق ہیں لیکن ویسے نکمے ہیں۔ ان کی زبان بھاری ہے اور چال بھی سست ہے۔ ان میں سے بہت کم اسلام کی طرف راغب ہوتے ہیں اپنی گمراہیوں اور کفر پر اڑے رہتے ہیں۔ تاہم وہ بہت اچھے جنگ باز ہیں گھڑسواری میں بھی اور پیادہ بھی۔ (38)

ظاہر ہے علی سنی سنائی باتیں لکھ رہا ہے۔ نصف صدی بعد اولیاء چلبی اپنے ذاتی تجربے سے ہنگری اور آسٹریا کے باشندوں کا موازنہ کرتا ہے۔ اولیاء لکھتا ہے کہ ہنگری کے باشندے ترک فتوحات کے بعد کمزور ہوگئے ہیں اور جنہیں ترکی نے فتح نہیں کیا وہ آسٹریا کے تسلط میں چلے گئے ہیں۔ ان کے باوجود وہ انہیں آسٹریا والوں سے بہت بہتر سمجھتا ہے جن کے بارے میں اس کا خیال ہے کہ وہ بالکل جنگجو نہیں ہیں۔ "وہ بالکل یہودیوں کی طرح ہیں۔ ان کا مزاج جنگ والا ہے ہی نہیں۔' ہنگری کے باشندے اعلیٰ لوگ ہیں۔"

"اگرچہ وہ اپنی طاقت کھو چکے ہیں لیکن اب بھی ان کے دسترخوان بہترین ہیں۔ وہ مہمان نواز ہیں اور تاتاریوں کی طرح زرخیز زمینیں کاشت کرنے کے اہل ہیں۔ وہ جہاں بھی جاتے ہیں گھوڑوں کی جوڑی کے ساتھ جاتے ہیں (ان کے پاس) چار پانچ پستول ہوتے ہیں اور کمر میں تلوار بندھی ہوتی ہے۔ وہ ہمارے سرحدی محافظوں کی طرح نظر آتے ہیں۔ وہی لباس پہنے اور ویسے ہی اعلیٰ نسل کے گھوڑوں پر سوار۔ وہ کھانے پینے اور اٹھنے بیٹھنے میں صفائی پسند ہیں اور اپنے مہمانوں کی عزت کرتے ہیں۔ وہ اپنے قیدیوں پر تشدد نہیں کرتے جیسے آسٹریا والے کرتے ہیں۔ وہ عثمانیوں کی طرح تلوار بازی کے کھیل کے شوقین ہیں۔ خلاصہ یہ کہ اگرچہ دونوں ہی کافر ہیں اور ایمان سے محروم ہیں لیکن ہنگری والے زیادہ عزت دار اور پاک باز کافر ہیں۔ وہ آسٹریا والوں کی طرح ہر صبح اپنے چہرے پیشاب سے نہیں دھوتے بلکہ اپنے چہرے عثمانیوں کی طرح پانی سے دھوتے ہیں۔ (39)

اگر کافروں کا زمانۂ حال کوئی وقعت نہیں رکھتا تھا تو ان کا ماضی اس سے بھی کم اہمیت رکھتا تھا اور عثمانی مورخ عام طور پر یورپ کی تاریخ سے سروکار نہیں رکھتے تھے۔

تاہم کہیں کہیں روشنی کی کرن بھی دکھائی دیتی ہے۔ اگر ہم عثمانی روزناموں پر اعتماد کرلیں تو 1453ء میں کونسٹنٹی نوپل (قسطنطنیہ) جیسے عظیم اور تاریخی شہر پر ترکوں کی فتح نے اس شہر کے ماضی کے بارے میں جاننے کا شوق پیدا کیا تھا۔ لیکن وہ جلد ہی ختم ہوگیا۔

سلطان محمد نے قسطنطنیہ فتح کیا تو اس نے آیا صوفیہ دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ اس نے روم کے باشندوں سے اور فرنگستان کے باشندوں سے اور راہبوں سے اور پادریوں سے اور روما کے ان لوگوں سے جو تاریخ جانتے تھے دریافت کیا۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ کس نے شہر قسطنطنیہ تعمیر کیا اور کس نے وہاں حکومت کی اور کون کون اس کے بادشاہ رہے ہیں۔ اس نے راہبوں اور روم کے دوسرے لوگوں اور ان فرنگیوں کو جمع کیا جو تاریخ جانتے تھے اور سوال کیا "قسطنطنیہ کا شہر کس نے تعمیر کیا اور کس نے اس پر حکومت کی؟ انہوں نے سلطان محمد کو اپنے علم اپنی کتابوں اور اپنے روزناموں اور اس علم کے مطابق بتایا جو سینہ بسینہ ان تک

چلا آیا تھا۔(40)

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ سلطان نے جن راہبوں' فرنگیوں اور یونانیوں سے معلومات حاصل کیں وہ کون تھے۔عثمانیوں سے قبل کی اس شہر کی تاریخ جس سے عثمانی وقائع نگار نے یہ حصہ نقل کیا ہے' وہ عجیب وغریب چیز ہے۔اس شہر کی یونانی' رومن یا بازنطینی تاریخ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔اس شہر سے سلطان محمد کی دلچسپی کی تصدیق یونانی اور اطالوی مصنف دونوں کرتے ہیں۔ان میں سے چند کبھی نہ کبھی سلطان کے دربار میں رہ چکے ہیں' تاہم سلطان کی دلچسپی مستثنیات ہی میں سے ہے کیونکہ اس کے بعد عثمانی تاریخ میں اس کی اور کوئی مثال نہیں ملتی۔

مغربی یورپ پر پہلی عثمانی تاریخی کتاب سولہویں صدی کے آخر میں لکھی گئی۔اس میں فرانس کی بنیاد رکھنے والے اساطیری بادشاہ فیرامند سے 1560ء تک کی تاریخ شامل ہے۔کتاب کی وجہ تصنیف کے مطابق وہ کتاب فریدون بے کے حکم پر ترکی میں ترجمہ کی گئی۔فریدون بے 1570ء سے 1573ء تک وزیر اعظم کا چیف سیکریٹری یا رئیس الکتب تھا اور ترجمہ حسن ابن حمزہ اور کاتب علی ابن سنان نے مکمل کیا۔ترجمہ 1572ء میں مکمل ہوا۔اس کتاب کا صرف ایک ہی نسخہ ملا ہے اور وہ بھی جرمن زبان میں۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ترکی کے قارئین میں وہ زیادہ مقبول نہیں تھی۔

سترہویں صدی کے دوران میں تبدیلی کے آثار نظر آتے ہیں اور چند مورخین اور دیگر علماء یورپ سے دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔حتیٰ کہ چند مصنفین کی یورپی مآخذوں سے واقفیت بھی ظاہر ہوتی ہے۔کہا جاتا ہے کہ ایک شخص ابراہیم ملہی (وفات 1650) نے رومن اور فرینک بادشاہوں کی تاریخ لکھی تھی لیکن اس کا ایک بھی نسخہ محفوظ نہیں ہے۔اس کے معاصر کاتب چلپی نے جس نے اپنی جغرافیہ کی کتابوں میں یورپ پر توجہ کی ہے' تاریخ بھی لکھی ہے اور اپنی ایک کتاب میں ''کافر بادشاہوں کی فرنگی تاریخ'' کے ایک ترجمہ کا حوالہ بھی دیا ہے۔اس ترجمے کا ایک نسخہ ترکی میں ایک شخص کے پاس محفوظ ہے اور اس کا ایک حصہ (1862-1863) میں ترکی کے ایک اخبار میں قسط وار چھپتا رہا ہے۔اس کے تعارف میں کاتب چلپی اپنے مآخذ کا بھی حوالہ دیتا ہے۔یہ مآخذ ہے جویان کیرون (1499-1537) کا لاطینی روزنامچہ۔کاتب چلپی نے اس کے 1548ء کے پیرس ایڈیشن سے استفادہ کیا۔روزنامچہ کا مصنف لوتھر کا ماننے والا تھا اور یہ کتاب پروٹسٹنٹ پروپیگنڈے کے لیے بہت استعمال ہوتی تھی۔اس کتاب کے انتخاب سے

ظاہر ہوتا ہے کہ کاتب چلپی کا فرانسیسی معاون بھی جسے وہ سابق راہب کہتا ہے' پروٹسٹنٹ تھا کیتھولک نہیں تھا۔(47)

اس ترجمہ کے علاوہ کاتب چلپی نے یورپ پر ایک طبع زاد کتاب بھی لکھی ہے جس کا صرف ایک نسخہ ہی محفوظ رہ گیا ہے۔ اس کا ذکر اس باب کے شروع میں آ چکا ہے۔ اس نے اس کا مقصد یہ بیان کیا ہے کہ اس سے مسلمانوں کو یورپ کے لوگوں کے بارے میں وہ بات فراہم کرنا مقصود ہے جن کی بہت ضرورت ہے۔ اس کے اس دعوے کے باوجود پروفیسر وکٹر میناژ اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ " اپنے معمولی پن کی وجہ سے وہ کتاب یورپ کے بارے میں لاعلمی کا حوالہ بن گئی ہے' وہ لاعلمی جو سلطنت عثمانیہ کے پڑھے لکھے لوگوں میں عام تھی۔(42)

بہرحال مغربی تاریخ سے کچھ نہ کچھ دلچسپی ضرور موجود تھی اگرچہ بہت ہی معمولی سی۔ اس دلچسپی میں اضافہ سترہویں صدی کے نصف آخر میں اس وقت ہوا جب استنبول کے نواح میں واقع محلات میں ایک نئے قسم کا معاشرہ نمودار ہوا۔ ترک عالم اب مغرب سے متاثر ترکی بولنے والے عثمانی عیسائیوں اور کبھی کبھی یورپ کے لوگوں سے بھی ملتے تھے اور اس طرح انہیں مغربی علوم اور سائنس کے بارے میں جاننے کا موقع مل رہا تھا۔ اس وقت ایک اہم اور ممتاز شخص رومانیہ کا شہزادہ دیمترس کنسٹمر تھا جو عثمانی اور یورپی معاشرہ دونوں سے بخوبی آگاہ تھا اور جس نے سلطنت عثمانیہ کی تاریخ لکھی تھی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ ملاقاتیں ایک محدود اثرات کی حامل تھیں۔ ان کا اثر بیرونی دنیا کے بارے میں عام عثمانی تصورات پر بہت کم پڑ رہا تھا۔ البتہ سترہویں صدی کا ایک کم معروف مورخ حسین ہزارفن (وفات 1691) استثنائی حیثیت رکھتا ہے اس کی اکثر تحریریں کاتب چلپی کی طرح ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہیں۔ وہ کاتب چلپی کی تعریف کرتا ہے۔ وہ دور دراز مقامات کے جغرافیہ اور تاریخ کے ساتھ قدیم تاریخ کے بارے میں معلومات جمع کرنے کی جستجو میں لگا رہتا تھا۔ مشہور ہے کہ کاؤنٹ فرڈینڈ مارسلی اور انتونین گیلنڈ جیسے لوگوں سے اس کی شناسائی تھی اور غالباً وہ کینٹمیر اور عظیم فرانسیسی مستشرق پیتز دی لا کر دیئے کو بھی جانتا تھا۔ غالباً ان یورپی شخصیات کے توسط سے حسین ہزارفن کی یورپی کتابوں کے مضامین تک رسائی ہوئی تھی اور اس نے اپنی تحریروں میں یہ مواد شامل کیا۔

اس کی ایک کتاب "تنقیہ التواریخ" ہے جو 1673ء میں مکمل ہوئی۔ یہ تاریخ کی کتاب نو حصوں پر مشتمل ہے۔ ان کا چھٹا' ساتواں' آٹھواں اور نواں حصہ اسلامی سرحدوں سے

باہر کے بارے میں ہے۔ اتنا زیادہ تناسب واقعی حیرت انگیز ہے۔ چھٹا حصہ یونانی اور رومن تاریخ سے بحث کرتا ہے' ساتواں حصہ قسطنطنیہ کے بارے میں' اس کے آباد ہونے کے وقت سے اس زمانہ تک ہے۔ آٹھواں حصہ ایشیا' چین' فلپائن' ایسٹ انڈیز' ہندوستان اور لنکا کے بارے میں ہے۔ نواں حصہ امریکہ کی دریافت سے متعلق ہے۔ تعجب ہے کہ حسین ہزارفن نے اپنے جائزے میں یورپ کو شامل نہیں کیا۔ لیکن ایشیا اور امریکہ کے بارے میں اس کی معلومات ساری کی ساری یورپی ماخذوں پر مبنی ہیں۔ بیشتر کاتب چلپی کی ''جہاں نما'' کے حوالے ہیں۔ یونانی رومن اور بازنطینی تاریخ کے بارے میں اس کا بیان بھی یورپی مآخذوں سے ہی لیا گیا ہے جو قدیم یورپ کے بارے میں مسلمانوں کے کمزور علم میں اضافہ کا موجب بنتا ہے۔

احمد ابن لطف اللہ المعروف منجم باشی' یعنی منجم اعلیٰ (وفات 1702) کی کتابوں کے ساتھ ہم بڑے پیمانے پر تاریخ عالم لکھنے کے دور میں داخل ہوتے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ ''تاریخ بنی آدم'' ہے۔ یہ تاریخ حضرت آدم سے شروع ہو کر 1672ء تک آتی ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اس نے ستر مآخذوں سے استفادہ کیا ہے۔ منجم باشی نے یہ کتاب عربی میں لکھنا پسند کی اور سوائے ایک آدھ اقتباس کے پوری کتاب ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ البتہ اٹھارہویں صدی کے عظیم ترک شاعر ندیم کے زیر ہدایت اس کا ایک ترکی ترجمہ تین جلدوں میں 1868ء میں طبع ہوا۔ کتاب کا زیادہ تر حصہ اسلامی تاریخ پر ہے۔ تاہم پہلی جلد کا ایک خاصہ بڑا حصہ قبل اسلام اور غیر مسلم ملکوں کی تاریخ پر ہے۔ غیر اسلامی تاریخ کے حصے میں حسب معمول ایک طرف ایرانی اور قدیم عرب ہے اور دوسری طرف اسرائیلی اور قدیم مصری تہذیب۔ یہ سارا بیان روایتی انداز میں ہی ہے۔

منجم باشی کی قدیم تاریخ عام اسلامی تاریخوں سے آگے تک جاتی ہے۔ رومن اور یہودیوں کے بارے میں اس کا بیان واضح طور پر رومن اور یہودی ماخذوں سے براہ راست لیا گیا ہے۔ یہ معلومات کسی حد تک ابن خلدون کے عربی خلاصوں میں موجود ہیں۔ لیکن اس کی معلومات شمالی افریقہ کے اس عظیم مورخ سے زیادہ ہیں اور مکمل ہیں اس میں اسیریا' بابل' سلجوقی اور پٹولمی سلطنتوں کے بارے میں معلومات بھی شامل ہیں جو اس سے پہلے کی اسلامی تاریخوں میں اتفاق سے ہی ملتی تھیں۔

ظاہر ہے اس نے اس کے لیے یورپی مآخذوں سے کام لیا ہوگا۔ یورپ پر منجم باشی کے

باب سے یہ بات یقینی ہو جاتی ہے اس میں ایک حصہ فرنگی باشندوں اور فرانس، جرمنی، اسپین اور انگلستان کے بادشاہوں کی تقسیم سے متعلق ہے اس کا ماخذ، جوہان کیریون کے وقائع عالم کا ترکی ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ منجم باشی اپنا بیان فرانس کے شاہ لوئی سیزدہم، جرمنی کے شہنشاہ لیپولڈ اور انگلستان کے چارلس اوّل تک لے جاتا ہے اس لیے یقین ہے کہ اس کے پاس بعد کی معلومات بھی ہوں گی۔ وہ انگلستان کی طوائف الملوکی اور شاہ چارلس کے سر قلم کرنے کے بارے میں لکھتے ہوئے کہتا ہے۔

''اس کے بعد انگلستان کے لوگوں نے اپنے رو بہ دوسرا بادشاہ مقرر نہیں کیا۔ ان کے معاملات کے بارے میں ہمارے پاس مزید معلومات نہیں ہیں۔'' (44)

کاتب چلپی، حسین ہزارفن اور منجم باشی مغربی یورپ کے بارے میں ساری عثمانی تاریخ کو سولہویں اور سترہویں صدی پر ہی مرکوز کر دیتے ہیں۔ ان کی معلومات سرسری ہیں اور وہ ایک ہی قسم کے ماخذوں پر انحصار کرتے ہیں۔ لیکن یہ تھوڑی بہت دلچسپی بھی دوسرے ترک مصنفین میں نہیں ہے۔ بیشتر عثمانی مسلمانوں کے نزدیک یورپ کا جو کارنامہ قابل توجہ تھا وہ صرف ان کا فن حرب تھا اور اس کا علم جنگوں میں پکڑی جانے والی توپوں اور بحری جہازوں کے مطالعہ سے حاصل کیا جا سکتا تھا۔ یہ مطالعہ بھی جنگی قیدیوں اور ان کے مفرور غداروں کی مدد سے ہی ممکن تھا۔ ان کے دماغوں میں یہ بات آئی ہی نہیں کہ یورپ کی زبانوں، ادب، فنون اور فلسفے کا مطالعہ بھی کسی دلچسپی کے لائق ہو سکتا ہے اور زمانہ کی مناسبت سے ان فنون کا علم بھی ضروری ہے۔ یورپ میں چلنے والی احیائے علوم اور اصلاح مذہب جیسی تحریکوں کی بازگشت مسلمانوں میں بالکل سنائی نہیں دیتی اور نہ اس پر کسی قسم کے ردعمل کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کے برعکس یورپ میں اس زمانے میں مسلمانوں کی فکری تحریکوں کا مطالعہ کیا جا رہا تھا۔

مسلمانوں کی کتابیں جو خاص طور سے یورپ اور اس کے لوگوں سے متعلق تھیں بہت کم اہمیت کی حامل تھیں۔ ان کے چند نسخے ہی محفوظ رہ گئے ہیں، کہیں کہیں تو ایک ہی نسخہ موجود ہے اور زیادہ تر تو طبع ہی نہیں ہوئے اس لیے عثمانی رائے عامہ پر ان کے اثرات بہت ہی کم ہوں گے۔ یورپ کے بارے میں جو عثمانی تصور تھا اس کا اندازہ سلطنت عثمانیہ کے بڑے اور اہم مورخوں کے سلسلے سے لگایا جا سکتا ہے۔ ان میں سے چند کے پاس تو شاہی مورخ یا ''وقائع نویس'' کا عہدہ تھا دوسرے بغیر عہدے کے تھے۔ ان سب نے تاریخ کی متعدد کتابیں لکھیں جو ابتدا سے آخر تک

سلطنت کی تاریخ کا احاطہ کرتی ہیں۔ ان میں سے بیشتر شروع کے زمانے میں ہی طبع ہوئیں۔ یہ کتابیں عثمانیوں کے اپنے بارے میں' دنیا میں اپنے مقام کے بارے میں اور دوسروں کے ساتھ اپنے تعلقات کے بارے میں خاص قسم کے تصورات قائم کرنے میں مدد معاون ثابت ہوئیں۔

عثمانی وقائع نگار خاص طور سے اپنے ہی معاملات و مسائل میں مگن رہتے تھے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جن کا رابطہ جنگ' تجارت' سفارت یا کسی اور وجہ سے یورپی لوگوں کے ساتھ تھا وہ بھی اپنے خول سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ ان رابطوں کی جھلکیاں عثمانی تاریخ نویسی میں کہیں کہیں نظر آجاتی ہیں اور یہ اثر ہے آنے والی صدیوں میں تبدیل ہوتے حالات کا۔

پندرہویں صدی میں عثمانیوں کی یورپ میں پیش قدمی کے زمانے میں بھی عثمانی تاریخ نویسی کسی حد تک حقیری ہی تھی۔ اس کا بیشتر حصہ سادہ ترکی زبان میں سیدھے سادھے بیان پر ہی مشتمل ہے اور وہ سرحدی سپاہیوں یعنی غازیوں کے جذبات کی ترجمانی ہی کرتی ہے۔ انہوں نے یورپی لوگوں کو پہلے دشمن اور پھر جزیہ دینے والی رعایا کی شکل میں دیکھا اور یہ دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ میدان جنگ کی دوسری جانب کیا پیش آ رہا ہے۔ ہاں وہ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ وہ اپنے مقامی عیسائی مخالفوں کے علاوہ دوسرے لوگوں سے بھی نبرد آزما ہیں۔ فرنگی کا لفظ ان دشمنوں کی فہرست میں بار بار استعمال ہوا جن سے ان کا مقابلہ ہوا اور انہیں شکست دی گئی۔ ابتدائی عثمانی تحریروں میں فرنگی (فرینک) سے عام طور پر اطالوی اور بالخصوص وینس کے لوگ مراد لیے گئے جن سے یونان اور بحیرہ روم کی جانب پیش قدمی کے دوران میں ترکوں کا سامنا ہوا۔ فرنگیوں کو ہمیشہ شکست ہوئی اور ان سے کافی مال غنیمت ملا۔

903 ہجری (1497 عیسوی) میں ترکوں کی فتح کا تذکرہ کرتے ہوئے عثمانی مورخ عروج ان چیزوں کی طول طویل فہرست پیش کرتا ہے جو شکست خوردہ فرنگیوں سے طلائی اور نقرئی سکوں' پشمینے اور پوستین' ریشم و کمخواب اور اطلس کے کپڑوں کی شکل میں حاصل ہوئی۔" یہ (اشیاء) انہیں ملیں اور انہوں نے اس طرح لوٹ مار کی کہ کسی کو گاڑیوں' گھوڑوں' خچروں' اونٹوں یا قیدیوں کا خیال ہی نہیں رہا۔ قیدی بھی اتنے پکڑے گئے کہ کوئی ان کا شمار نہیں کر سکتا تھا۔" جن زمانوں میں اتنا زبردست مال غنیمت حاصل کیا گیا وہ ورنا (1444) کوسووا (1389) اور قسطنطنیہ (1453) کے جہاد تھے۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ دولت مند دو قومیں ہیں ایک پولینڈ کے لوگ اور دوسرے فرنگی۔" وہ دنیوی مال و اسباب میں دوسروں سے زیادہ دولت مند ہیں اس لیے

ان کے قبضے سے اسلامی مجاہدوں کو بے مثال مال غنیمت حاصل ہوا۔" (45)

حیرت انگیز طور پر یورپ کی زیادہ مہذب تصویر جو نظر آتی ہے وہ کسی وقائع عالم یا دستاویز میں نہیں ہے بلکہ ایک رزمیہ نظم میں ہے جو سولہویں صدی کے آغاز میں لکھی گئی اور جس میں ترکی کے خلاف یورپ کی بحری مہم کی شکست پر خوشی کا اظہار کیا گیا ہے۔ یہ واقعہ بذات خود ایسا بڑا نہیں تھا۔ ترک عساکر نے یونانی ساحل پر مونڈوں اور وینس کے دوسرے مورچوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ وینس نے یورپ کے بہت سے ملکوں سے امداد حاصل کی اور فرانسیسیوں اور دوسرے اتحادیوں کے ساتھ ترکی کے مقبوضہ جزیرے لیسبوس پر اکتوبر 1501ء کے آخر میں چڑھائی کر دی۔ یہ حملہ پسپا کر دیا گیا۔ اس فتح کی یاد میں یہ طویل رزمیہ نظم لکھی گئی۔ شاعر جو اپنے آپ کو فراودسیؔ ترکی کہتا ہے زبردست خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "اس شکست نے فرنگیوں بالخصوص ان کے رہنمایان پاپ (پاپائے روم) کو بہت ہی غم زدہ کر دیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جب سلطان بایزید نے مونڈوں پر قبضہ کیا تو فرنگی سلطان کی تلوار سے اتنے خوف زدہ ہوئے کہ "بنیے" (آیونیا کے جزائد) کے مگرمچھ کی طرح سمندر میں ڈوب گئے۔ جب کافروں کے سردار "پاپ" نے یہ سنا تو اس نے دوسرے ملکوں کے ساتھ مونڈوں کی بازیابی کے لیے اتحاد کرنے کی کوششیں شروع کر دیں اور فرنگی کافروں کے تمام بادشاہوں کو پیغام بھیجے۔" اس کے بعد شاعر اپنی نظم میں بہت سے فرنگی کردار داخل کرتا ہے جو بار بار سامنے آتے رہتے ہیں۔ ان میں فرانس، ہنگری، بوہیمیا اور پولینڈ کے بادشاہ شامل ہیں۔ آخر الذکر دونوں نام سلاف اساطیر کی بازگشت ہیں جیسے چیک اور لیک، دوسرے یورپی جو اس میں شامل ہیں وہ ہیں کزخان، گرل خاں، یعنی کاستیل کی ازابیلا جو اسپین کا سپہ سالار وہاں بھیجتی ہے۔ دوز یعنی وینس کا منصف اعلیٰ اندلس اور کیتلونیا کے حاکم، روڈز کے مذہبی سورما، حتیٰ کہ ماسکو کا شہزادہ ایوان سوئم (46) بھی۔ خالص رزمیہ طرز پر دشمن کے سرداروں کو بھی نظم میں تقدیر کرنے اور خطوط لکھنے کا موقع فراہم کیا گیا ہے اور وہ اس طرح پیش کیے گئے ہیں جیسے وہ فرنگیوں کے عقائد اور ان کے رویوں کا حصہ ہیں۔ یعنی وہ خود ہی اپنے آپ کو کافر کہتے ہیں اور اس کا اعلان بھی کرتے ہیں۔ ایک سلاف شہزادے سے یہ عجیب وغریب بات منسوب کی گئی ہے۔

"میں یسوع مسیح کا خادم ہوں مارک (وینس کے سینٹ مارک) کے مجسمے کا غلام ہوں، میں ہنگری کے بادشاہ سے بھی بڑا بت پرست اور کافر ہوں۔" (47)

سولہویں صدی میں سلطنت عثمانیہ اپنی طاقت کے عروج پر تھی اور اس کے مورخین مسلمانوں کی اس خود اعتمادی کی تصویر کشی کر رہے تھے' کہ ان کی برتری اور بلا توقف فتوحات میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ صرف معزول وزیر اعظم لطفی پاشا ہی ایک ایسا شخص تھا جس نے اپنی معزولی کے بعد سلطنت کے مصائب پر ماتم کرتے ہوئے احسان فراموش سلطان کو اندرونی بدعنوانیوں اور فرنگی بحری طاقت میں توسیع سے خبردار کیا تھا۔ دوسرے بہت سے مورخین اس قسم کی فکروں سے آزاد تھے۔ اگر فرنگیوں کا ذکر بھی کیا جاتا تو حقارت کے ساتھ' وحشی دشمن کی حیثیت سے یا پھر سرپرستانہ انداز میں۔ جیسے وہ انہیں خراج ادا کرتے ہیں۔ سولہویں صدی کے آخر اور سترہویں صدی میں فرنگی تاجروں' ان کے جہازوں اور کبھی کبھی ان کے مغارت کاروں کی آمد کے حوالے بھی ملتے ہیں۔ عثمانی مورخ سلانیکی مصطفیٰ آفندی 1593ء میں دوسرے انگریز سفیر ایڈورڈ بارٹن کی استنبول میں آمد کا ذکر اس طرح کرتا ہے:

> جزیرہ انگلستان کے ملک' جو استنبول کے طلائی ہلال سے 3700 میل بحری فاصلے پر ہے' کی حکمراں ایک عورت ہے جو اپنی موروثی قلم رو پر حکمرانی کرتی ہے اور پوری قوت کے ساتھ اپنی خود مختاری برقرار رکھتی ہے۔ وہ لوتھر کے مذہب کو مانتی ہے۔ وہ اپنے تہنیتی مکتوب' اپنے سفیر' اپنے تحفے تحائف بھیجتی ہے۔ اس روز مجلس وزرا کا اجلاس تھا۔ قانون کے مطابق سفیر کی ضیافت کی گئی اور اسے اعزازات سے نوازا گیا۔ اس جیسا عجیب و غریب جہاز استنبول کی بندرگاہ میں کبھی داخل نہیں ہوا تھا۔ وہ جہاز 3700 میل کا بحری سفر طے کر کے 83 توپیں اور دوسرا اسلحہ لے کر آیا تھا۔ آتشیں اسلحہ کی ظاہری شکل خنزیر سے ملتی تھی۔ وہ اپنے زمانہ کا ایک ایسا عجوبہ تھا جس کا تحریر میں آنا ضروری ہے۔ (48)

سور کی شکل کی توپیں تو اس کے تخیل کی پرواز معلوم ہوتی ہیں لیکن بہر حال وہ یہ ضرور جانتا تھا کہ انگلستان میں پروٹسٹنٹ ملکہ ہے اور خود اس نے یا اس کو اطلاع دینے والوں نے دیکھا تھا کہ بحر اوقیانوس میں چلنے والے جہاز بہت بڑے ہوتے ہیں اور وہ بھاری توپیں وغیرہ لے جاتے ہیں۔

سترہویں اور اٹھارویں صدی میں عثمانی وقائع نگاروں نے بہت زیادہ تو نہیں لیکن تھوڑی بہت توجہ یورپ کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات پیر دی۔ یورپ کی مختلف قوموں کو ابھی

تک ''انگلیز کافر'' یا ''فرانسیسی کافر'' ہی کہا جارہا تھا۔ اگرچہ پہلے کی تاریخی کتابوں میں جو برا بھلا کہا جاتا تھا اس کی شدت میں اب کمی آ گئی تھی۔

بہرحال عام حالات یہی تھے کہ عثمانی مورخ جو یورپ کے ساتھ اپنی سرحدوں پر زیادہ توجہ دینے لگے تھے اس بارے میں کچھ نہیں بتاتے تھے کہ یورپ کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ اس میں حیرت انگیز طور پر ایک قسم کا تسلسل نظر آتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عثمانی وقائع نگار پرانے واقعات کے بارے میں اپنے پیش رو مصنفین کی روایتوں کو ناقابل تنسیخ سمجھتے تھے۔ وہ یہ نہیں مانتے تھے کہ وہ ان کی ذاتی آراء بھی ہو سکتی ہیں۔ اس لیے ایک کے بعد دوسرے وقائع نگار قدیم دستاویزیں ہی نقل کرتے چلے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ کاتب چلبی جیسا مورخ بھی' جو یورپ سے اپنی دلچسپی کا اظہار کرتا ہے' پرانی روایت سے بہت کم انحراف کرتا ہے۔ مثال کے طور پر ترکی میں یورپ کی تیس سالہ جنگ کی خبر کی آمد پر وہ جو لکھتا ہے وہ بہت ہی مختصر ہے اور یہی باتیں لفظ بلفظ دوسرے مصنفین کے ہاں بھی دہرائی گئی ہیں۔ اسلامی سال 1054ء کے واقعات میں اس کا حوالہ دیا گیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اس سال شوال کے مہینے میں جو عیسوی سال 1644ء تھا۔ بودا کے سرحدی مورچہ سے معززین کے ذریعہ استنبول یہ اطلاع پہنچی کہ شہنشاہ روما فرڈنینڈ نے سات نمائندوں کو جنہیں ترکی میں سات بادشاہ کہا گیا' آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ اس کی زندگی میں اس کے بیٹے کو شاہی تاج کا وارث تسلیم کر لیا جائے۔ ایک نمائندے کو جو فرانس کا طرفدار تھا' شہنشاہ نے شاہ ہسپانیہ سے مل کر گرفتار کیا اور قتل کر دیا۔ شاہ فرانس اس پر بہت ناراض ہوا۔ اس نے سویڈن کے ساتھ سمجھوتہ کیا جس نے جرمن سرزمین پر چڑھائی کی اور قدیم شہر پراگ پر قبضہ کر لیا۔ جنگ 1057ء ہجری (1647 عیسوی) تک جاری رہی اس کے بعد صلح نامہ ہوا۔ آسٹریا نے جو بہت کمزور ہو گیا تھا ایلزاک کو فرانس کے اور پومرینیا کو سویڈن کے حوالہ کر دیا۔ (49)

اس بیان میں پراگ میں سویڈن کے داخلے کی اور معاہدہ ویسٹ فالیا کی تاریخ غلط بتائی گئی ہے۔ (اس سن میں اتفاق سے وہ شہر پر قبضہ کرنے میں ناکام رہے تھے) اور جنگ کے ابتدائی مراحل سے لاعلمی ظاہر کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس جنگ میں جو مذہبی اور سیاسی کشمکش موجود تھی اس کا تو ذکر ہی کہیں نہیں ہے۔ کتاب کے ایک اور حصے میں جس کا عنوان ہے ''آسٹریا کے کافروں سے فرانسیسیوں اور سویڈز کی جنگ'' کاتب چلبی نے تھوڑی سی زیادہ تفصیل دی ہے۔ اسے 1040 ہجری (31-1630 عیسوی) کے سال میں درج کیا گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ فرانسیسی

شاہ لوئی (لوڈوری کس) یازدہم شہنشاہ بننا چاہتا تھا۔ شہنشاہ سات نمائندے منتخب کرتے تھے جو انتخاب کرنے والے کہلاتے تھے' ان میں سے ہر ایک کی اپنی زمین ہوتی تھی۔ مذکورہ بادشاہ نے ان میں سے دو کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ اس وقت کا شہنشاہ موجودہ شہنشاہ فرڈی ننڈ کا باپ تھا۔ (فرڈی ننڈ سوئم 1657 میں مر گیا تھا) اس نے پھر بندوبست کیا کہ اس کا بیٹا اس کی زندگی میں ہی اس کا جانشین نامزد ہو جائے۔ بعض نمائندوں نے اسے کو پسند نہیں کیا اور کہا کہ اس سے انہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور یہ قانون کے خلاف ہی ہے۔ فرانسیسی بادشاہ نے احتجاجاً جنگ شروع کر دی اور اپنے ساتھ سویڈن کے بادشاہ کو ملا لیا اور کہا کہ شہنشاہ کی زندگی میں اس طرح کی نامزدگی کافروں کے قانون کے خلاف ہے۔ فلپ چہارم (وفات 1665) جو ابھی ہسپانیہ کا بادشاہ تھا...... شاہ فرانس کا ماموں تھا اور ان کے درمیان صلح تھی۔ لیکن ہسپانیہ کے بادشاہ نیمچے کی طرح دوستور یا (غالباً آسٹریا کا اطالوی تلفظ دی آسٹریا) کے گھرانے سے تھا' اس لیے اس نے شہنشاہ کا ساتھ دیا۔'' تیس سالہ جنگ کا مختصر بیان ویسٹ فالیا کے صلح نامے پر ختم ہوتا ہے۔ (50)

کاتب چلپی فرانس کے حالات پر کئی اور معلومات بھی بہم پہنچاتا ہے۔ وہ 1018ء ہجری کے تحت درج کرتا ہے کہ فرانسیسی بادشاہ ہنری کا ایک نمائندہ آیا اور اس نے مراعات دینے کے معاہدے کی تجدید کرنے کی درخواست کی۔ (51) فرانسیسی سفیر نے' جس کا نام فرانسکس سیوروں بتایا گیا ہے اس دوستی کے معاہدے کا حوالہ دیا جو فرانسیسی اور عثمانی بادشاہوں کے درمیان پہلے ہوا تھا اور وہ مراعات جو سلطان محمد فاتح کے زمانے میں دی گئی تھیں (ویسے حقیقتاً یہ مراعات بعد میں دی گئیں) فرانسوا سیوری کاؤنٹ دی بریوز (1628-1560) استنبول سے 1605ء میں روانہ ہوا۔ مراعات کے معاہدہ کی تجدید 20 مئی 1604ء کو ہوئی۔ کاتب چلپی لکھتا ہے کہ فرانس کے علاوہ یہ مراعات وینس' انگلستان' جے نیوا' پرتگال' کتلونیا کے تاجروں' سسلی' انکونا' ہسپانیہ اور فلورنس کو دی گئی تھیں۔ ان قوموں میں سے بہت سے فرانسیسی بادشاہ کے نام سے یہ مراعات حاصل کر رہے تھے۔ وہ کہتا ہے کہ مذکورہ سفیر نے جن دوسرے امور پر مذاکرات کیے وہ بیت المقدس کی زیارت' بربری باشندوں کی سرگرمیوں اور فوجی تعاون سے متعلق تھے۔

جنوری 1653ء میں وینس کا سفیر آیا تا کہ برطانوی سفیر کی مدد سے صلح کی بات آگے بڑھائی جا سکے۔ عثمانی وقائع نگار کو یہ بات ایک عجیب و غریب تبصرے پر اکساتی ہے۔ ''وینس کا نمائندہ'' نوے سال کا کافر تھا۔ اس کا سر اور ہاتھ لرز رہے تھے لیکن وہ بہت چالاک سفیر تھا (52)

حالانکہ حقیقت میں یہ سفیر جیوانی کا پیلو (1662-1584) تھا جو دراصل 69 سال کا تھا۔

سترہویں صدی کے عثمانی مورخوں میں ایک ممتاز مورخ ابراہیم پیچوئی تھا جو پچوی کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی تاریخ 1590ء سے 1639ء تک کا احاطہ کرتی ہے۔ وہ 1574ء میں ہنگری کے شہر پیکس میں پیدا ہوا جس کی وجہ سے اس کا یہ نام پڑا۔ باپ کی طرف سے وہ ترک خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ خاندان کئی نسل سے سلطنت عثمانیہ کی ملازمت میں تھا۔ اس کی ماں سوکولو کی تھی یعنی سوکولووچ خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اس طرح وہ سربیا کی مسلمان تھی۔ ابراہیم اناطولیہ میں خدمات انجام دینے کے علاوہ اپنی زندگی کا بڑا حصہ سلطنت کے ہنگری اور سنجک علاقوں میں گزار چکا تھا۔ چونکہ اس کی پیدائش اور پرورش یورپ کی سرحدوں سے ملحق علاقے میں ہوئی تھی اس لیے اس کی معلومات اور دلچسپیاں دیگر عثمانی مورخوں سے مختلف تھیں۔ اسے دنیا کی تاریخ یا جغرافیہ لکھنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کافر بادشاہوں کی تاریخ لکھنے یا ایسی تحریروں کا ترجمہ کرنے کا تو اسے بالکل ہی شوق نہیں تھا۔ اس کا اصل شوق دوسرے عثمانی یا پھر بیشتر مغربی مورخوں کی طرح اس سلطنت کی تاریخ لکھنے کا تھا جس کا وہ باشندہ تھا۔ خاص طور سے یورپی دشمنوں کے ساتھ عثمانیوں کی جنگوں کی تاریخ اس کا موضوع تھی۔

ابتدا میں تو وہ بھی اپنے پیشروؤں کے طریقہ کار پر ہی عمل پیرا رہا لیکن بعد میں اس نے اپنی آنکھوں دیکھی باتوں، اپنے تجربات اور بوڑھے سپاہیوں کی شہادتوں پر انحصار کیا۔ اس سے بھی زیادہ اس نے جو انقلابی قدم اٹھایا وہ یہ تھا کہ اس نے دشمن قوموں کے مورخوں کی کتابوں سے استفادہ کیا۔ اسے سب سے زیادہ دلچسپی فوجی تاریخ سے تھی۔ چنانچہ اس نے نہایت توجہ کے ساتھ ان بڑی جنگوں کا مطالعہ کیا جو ہنگری کے میدانوں میں لڑی گئی تھیں۔ لیکن اس ضمن میں عثمانی وقائع نگار اس کی پیاس نہیں بجھا سکے۔ اسے وہ تفصیل نہیں ملی جو وہ چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے دوسری جانب رجوع کیا۔ وہ کہتا ہے ''ہمارے ملک میں ایسے ہنگری کے باشندے ہیں جو لکھ پڑھ سکتے ہیں۔'' (53) بلاشبہ عثمانی سلطنت میں ایسے پڑھے لکھے ہنگری کے باشندے تھے جو قیدی بن کر آئے تھے یا مسلمان ہو گئے تھے وہ پچوی کے کام آ سکتے تھے۔ اس کا طریقہ کار یہ تھا کہ وہ ہنگری کا کوئی روزنامچہ، جو غالباً لاطینی میں لکھا ہوتا، پڑھوا کر سنتا اور پھر اس کا ترکی میں ترجمہ کرتا۔ اس نے ان روزنامچوں کے بہت سے حصے اپنی کتاب میں شامل کیے۔ ان میں موہاکس کی جنگ عظیم اور ہنگری کی جنگوں کے دوسرے واقعات بھی ہیں۔ اس نے تو اپنے ماخذوں کا ذکر نہیں کیا لیکن جدید

محققین نے ان میں سے دو کی شناخت کر لی ہے۔(54) پچوی غالباً پہلا عثمانی مورخ تھا جس نے دشمن کے بیان کردہ واقعات کا موازنہ اپنے وقائع نگاروں سے کیا اور پھر ان کے مطالعہ کے بعد اپنی تحقیق کے حوالے سے تاریخ لکھی۔ اس معاملے میں ایک آدھ مورخ ہی اس کا پیش رو ہوگا اور کافی عرصے تک اس کی تقلید کرنے والا بھی سامنے نہیں آیا۔

پچوی کے وقائع میں اور بھی بہت سے ایسے واقعات کے حوالے ہیں جن میں سے بیشتر کا تعلق عثمانیوں یا اسلام سے ہے۔ وہ 1552ء میں ہسپانیہ کے خلاف فرانس اور ترکی کی مشترکہ بحری جنگ کا مختصر ذکر کرتا ہے اور ہسپانیہ میں موریکو کی (1568-1570) کی بغاوت کا حوالہ دیتا ہے۔ وہ سرحدوں پر ہونے والی جنگوں اور وینس اور اس کے اتحادیوں کے خلاف بحیرۂ روم میں بحری جنگ کا تفصیل کے ساتھ تذکرہ کرتا ہے۔ کبھی کبھی وہ سیاسی اور فوجی معاملات سے باہر بھی نکل جاتا ہے۔ چنانچہ وہ انگریز تاجروں کی طرف سے ترکی میں تمباکو کا استعمال شروع کرنے اور اس سے پیدا ہونے والے برے اثرات پر روشنی ڈالتا ہے اور یورپ میں پرنٹنگ پریس اور بارود کی ایجاد کی تاریخ بھی بیان کرتا ہے۔(55)

عثمانی دور میں جو اہم تاریخی کتابیں لکھی گئی ہیں غالباً ان میں سب سے اہم "تاریخ ناعمہ" ہے۔ اس میں 1000 سے 1070 ہجری تک کے اسلامی دور کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ زمانہ عیسوی حساب سے 1590ء سے 1660ء تک کا بنتا ہے۔ ناعمہ، جس نے یہ کتاب مرتب کی ہے اور اس کا بڑا حصہ خود بھی لکھا ہے، عظیم عثمانی مورخوں میں سے ایک تھا۔ اپنے دوسرے ساتھیوں کے برعکس، جو صرف واقعات ہی بیان کر دیتے تھے ناعمہ تاریخ کی ہئیت کا فلسفیانہ ادراک بھی رکھتا تھا اور اس بارے میں اس نے خاصہ غور وخوض کیا تھا۔ اس کے اہم موضوعات میں سے ایک موضوع یورپ کی جنگیں تھیں۔ جن میں بلقان اور بحر اسود کی جنگیں بھی شامل تھیں۔ ان جنگوں پر اس نے تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے اور ہنگری ٹرانسلوینیا کے جو رہنما ان جنگوں میں شامل تھے ان کو نمایاں مقام دیا گیا ہے۔ کتاب میں ہیسبرگ کا شہنشاہ ایک موہوم شخصیت رہا ہے اور اس کا نام بھی بہت کم لیا گیا ہے۔ مغرب کے بادشاہ اور ان کی بادشاہت تو بالکل ہی قابل ذکر نہیں سمجھی گئی۔ اس نے جس دور کا احاطہ کیا ہے اس میں تیس سالہ جنگ مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ جنگ ایک ایسا طوفان تھی جسے عثمانی سلطنت کی براہ راست توجہ کا مرکز بننا چاہیے تھا لیکن ناعمہ قدیم وقائع نگاروں کے بیان دہرانے سے زیادہ اور کچھ نہیں کرتا اور وہ بیان بھی اس بے پروائی سے نقل کرتا

ہے کہ ایک سو سال قبل کے ہسپانیہ کے بادشاہ فلپ چہارم کے بارے میں لکھ دیتا ہے کہ وہ آج بھی بادشاہ ہے۔ اسی لیے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ بہت پرانے واقعات سے اسے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی جیسے فرانس میں لوئی چہاردہم یا انگلستان کی طوائف الملوکی۔

تاہم ایک اعتبار سے ناعمہ دوسرے عثمانی وقائع نگاروں سے ممیز ہو جاتا ہے۔ وہ قدیم ترین زمانے میں چلا جاتا ہے اور ماضی اور حال کے واقعات کا موازنہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ عثمانی تاریخ نویسی میں ایسی مثالیں پہلے بھی موجود ہیں۔ لیکن بہت کم جیسے سولہویں صدی کا مورخ کمال پاشازادہ 1521ء میں سلطان سلیمان ذیشان کی شہنشاہ آسٹریا کے خلاف جنگ کو ایشیائے کوچک میں ازمنہ وسطی کی جرمن صلیبی فوج کے حملے کا بدلہ قرار دیتا ہے۔ اسی طرح اٹھارہویں صدی میں جب سلطنت عثمانیہ آسٹریا اور روس کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد بری طرح زخم خوردہ تھی تو ترکوں کا اعتماد بحال کرنے کے لیے قدیم زمانوں کی فتوحات اور صلیبی جنگ جوؤں کی آخری شکست کا حوالہ دیتا ہے۔ اس طرح ان کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کرتا ہے:

> اسلامی دور کے چھ صدی بعد (ناعمہ کی تاریخیں غلط ہیں) چونکہ اسلامی بادشاہوں کے درمیان کوئی سمجھوتہ یا معاہدہ نہیں تھا اس لیے باہمی چپقلش اور اختلافات ظاہر ہونے لگے۔ اور جب وہ ایک دوسرے کے ساتھ لڑنے میں مصروف تھے تو فرانسیسی کافر اور دوسرے کافر بادشاہ خاص طور پر آسٹریا سے جو بے شمار فوجی بھیجے گئے تھے' ایک عظیم بحری بیڑے کے ساتھ بحیرۂ روم کے ساحلوں پر آئے اور ان پر قبضہ کر لیا۔"

ناعمہ بیان کرتا ہے کہ کس طرح فاتح فرنگی شام اور فلسطین کے ساحلوں پر قابض ہوئے اور کس طرح وہ دمشق اور مصر کے لیے خطرہ بن گئے۔ اس خطرے کا مقابلہ صلاح الدین نے کیا۔ اس نے انہیں وہیں روکے رکھا حتیٰ کہ آخرکار اس کے جانشینوں نے انہیں وہاں سے نکال باہر کیا۔ اور مقدس سرزمین جسے انہوں نے اپنے قبضے میں کر رکھا تھا ان کی غلاظت سے پاک ہو گئی۔" معلوم ہوتا ہے کہ ناعمہ نے اس واقعہ سے اپنے زمانے کے عثمانیوں کے لیے تسکین و اطمینان کا راستہ تلاش کیا۔ قرون وسطی کے مصری سلطانوں نے فرنگیوں کے ساتھ صلح صفائی کی ضرورت محسوس کی تھی۔ یہاں تک کہ ایک سلطان تو ان کے ساتھ ایسا معاہدہ کرنے کو بھی تیار تھا جس کے تحت فلسطین فرنگیوں کے پاس چلا جاتا۔ شاید یہ واقعہ بیان کرنے کا مقصد یہ ہو کہ عثمانیوں

کو بھی، جو بار بار شکست سے دوچار ہو چکے تھے، دشمن کے ساتھ صلح کے لیے تیار رہنا چاہیے خواہ اس صلح سے انہیں نقصان ہی کیوں نہ ہو لیکن اس طرح وہ جو کچھ بچا سکتے ہیں بچا لیں گے۔ اور انہیں اپنی طاقت بحال کرنے کا موقع مل جائے گا۔(56)

ایک اور جگہ ناعمہ زیادہ صاف لفظوں میں بات کرتا ہے۔" یہ بات یہ ظاہر کرنے کے لیے لکھی گئی ہے کہ کافر بادشاہوں کے ساتھ جنگ بندی کتنی ضروری ہے اور سارے کرۂ ارض پر عیسائیوں کے ساتھ صلح لازمی ہے تاکہ عثمانی سرزمین کا نظم ونسق بہتر ہو اور یہاں کے باشندوں کو سکون کا وقفہ میسر آئے۔"(57)

ناعمہ کے جانشین رشید آفندی نے تاریخ وہاں سے شروع کی جہاں اعمہ نے چھوڑی تھی۔ اس نے 1070 ہجری مطابق 1660 عیسوی سے شروع کیا اور 1720 تک کے واقعات قلم بند کیے۔ اس کے وقائع یورپ کے ساتھ عثمانی تعلقات کے ایک پورے سلسلے کا احاطہ کرتے ہیں۔ اس میں ویانا کے دوسرا ناکام محاصرہ (1711-1710) میں روس کے پیٹر اعظم سے جنگ اور 1718-1714 میں وینس اور آسٹریا کے ساتھ جنگ شامل ہیں۔ اس میں سویڈن کے بادشاہ چارلس دوازدہم کے ساتھ ایک عجیب وغریب سمجھوتہ بھی شامل ہے حتی کہ بن بلائے مہمان کی حیثیت سے ترکی میں اس بادشاہ کے قیام کا ذکر بھی ہے۔ رشید آفندی اپنے پیش رو مورخوں کے مقابلے میں سفارتی تعلقات پر زیادہ توجہ دیتا ہے اس میں عثمانیوں کے قریب ترین ہمسایوں، روس آسٹریا اور وینس کے ساتھ صلح کی بات چیت بھی شامل ہے۔ وہ یورپ کے دور افتادہ ملکوں کے بارے میں بھی تھوڑا بہت لکھتا ہے۔ رشید پہلا مورخ ہے جو یورپی ملکوں میں بھیجے جانے والے عثمانی سفارتی نمائندوں کی سرگرمیوں پر زیادہ تفصیل سے روشنی ڈالتا ہے۔ اس سے پہلے کے وقائع نگار صرف ان نمائندوں کی آمد ورفت ہی درج کرتے تھے۔ رشید ان نمائندوں کی، جو اب سفیر کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔ ان رپورٹوں سے اقتباسات بھی نقل کرتا ہے جو وہ واپسی پر حکومت کو پیش کرتے تھے۔ تاہم سفارتی تعلقات سے اتنی زیادہ دلچسپی لینے کے باوجود رشید بھی یورپی ملکوں کے اندرونی معاملات پر توجہ نہیں دیتا اور اس زمانے میں یورپ کی تاریخ میں جو نہایت اہم واقعات پیش آ رہے تھے ان پر سے خاموشی سے گزر جاتا ہے۔

رشید کے معاصرین اور اس کے بعد آنے والوں کے بارے میں بھی میں بات کہی جا سکتی ہے۔ یہ مورخین اٹھارویں صدی کے وسطی عشروں کا احاطہ کر رہے تھے اور وہ بھی سفارتی

تعلقات اور یورپ کے حکمرانوں کے بارے میں ہی زیادہ لکھ رہے تھے۔ عثمانی مورخ صلحدار نے 1697ء میں ہونے والے رائزوک سمجھوتہ کا بڑی تفصیل کے ساتھ تذکرہ کیا ہے اور اس سلسلے میں ترکی کا موقف پیش کیا ہے۔ (58) کئی عثمانی مورخ آسٹریا میں تخت نشینی کی جنگ اور اسی جنگ میں شریک فریقوں کے بارے میں بھی لکھ رہے تھے۔ تیس سالہ جنگ کے بعد یورپ کی یہ پہلی سیاسی کشمکش تھی جس نے عثمانی مورخوں کی اتنی زیادہ توجہ حاصل کی۔ اسی زمانے کا ایک اور مورخ شمع دانی زادہ سلیمان آفندی مقدس سلطنت روما کے انتخابی طریقہ کار کا ذکر اس طرح کرتا ہے۔ ''نیمچے کی قلم رو نو بادشاہتوں پر مشتمل ہے' ان میں سے تین رائن کی ولایت میں مینیز کولون اور ٹریٹر کے صوبوں کی ہیں۔ یہ پہلے تین انتخابی ادارے ہیں۔'' چوتھی اور باقی حکومتیں چیک' بوریا' سیکسنی اور روس کی ولایت میں ہیں۔ ان نو صوبوں کے علاوہ سوائے کا صوبہ ہے جو آج کل سارڈینیا کے بادشاہ کے زیر تسلط ہے' پھر بیسے کا صوبہ ہے جو آزاد علاقہ ہے' سربیائی ولایت ہے جو آزاد جمہوریہ ہے۔ شمع دانی زادہ ان سب کے بارے میں تھوڑا تھوڑا لکھتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ پروشیا کی ولایت کا حکمران کوئی گرینڈ یر ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ یہ نام برینڈنبرگ کی بگڑی ہوئی شکل ہے جو اس صوبے میں ایک قلعہ ہے۔ اس کا اصل نام فریڈرریکس ہے۔ ہنوور کی نویں ولایت کے بارے میں شمع دانی زادہ لکھتا ہے یہ انگلستان کے موجودہ بادشاہ جو جو کی موروثی جائیداد ہے۔'' (59) ظاہر ہے جو جو جارج کی بگاڑی ہوئی شکل ہے جو کسی اطالوی باشندے کے ذریعہ پہنچی ہوگی کیونکہ اطالوی زبان میں جارج جارجیو کہلاتا ہے۔ آسٹریا اور وہاں کے ان حالات پر جو تخت نشینی کی جنگ کا سبب بنے شمع دانی زادہ کی مطبوعہ کتاب میں پورے دو صفحے موجود ہیں اور عثمانی مورخوں کی تمام کتابوں میں سے اس کتاب میں تفصیل سب سے زیادہ ہے۔ شمع دانی زادہ یورپ میں پیش آنے والے دوسرے واقعات کا بھی مختصراً ذکر کرتا ہے اور اگرچہ اس کی زیادہ دلچسپی آسٹریا اور روس سے ہے تاہم وہ دور دراز اور پراسرار ملکوں جیسے فرانس' انگلستان' ہالینڈ اور سویڈن کے حوالے بھی دیتا ہے۔ وہ ان ملکوں کی باہمی عداوتوں اور مقابلوں کو بھی جانتا ہے لیکن کہتا ہے کہ مسلم دشمنی میں وہ سب ایک ہیں۔ چنانچہ 1736ء میں جب روس کے ساتھ بحران پیدا ہوا تو انگریز اور ولندیزی سفیروں نے اس خیال سے عثمانیوں کو احتیاط برتنے کا مشورہ دیا کہ اس جھگڑے میں انہیں ترکوں کی شکست کا خطرہ تھا لیکن ان سفیروں کے بارے میں شبہ ظاہر کیا گیا کہ وہ روس کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ (60)

واصف کی کتاب میں کچھ اور تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔ یہ کتاب 1166ء

(1752عیسوی) سے 1188 (1774 عیسوی) کے واقعات کا احاطہ کرتی ہے۔ اس طرح سلطنت عثمانیہ کو پیش آنے والے ان خطرات کا زمانہ اس میں آجاتا ہے جب فاتح روس نے کچک کینار یا کا تباہ کن معاہدہ زبردستی ترکی پر مسلط کر دیا تھا۔ واصف خود اس زمانے میں موجود تھا جب فرانس میں انقلابی واقعات پیش آئے اور نپولین نے جنگیں لڑیں۔ وہ مصر پر فرانس کی چڑھائی اور قبضے کا عینی شاہد ہے۔ اس پر اس نے ایک علیحدہ کتاب لکھی۔ اپنے وقائع میں واصف ویانا اور برلن جانے والے عثمانی وفود کے بارے میں لکھتا ہے اور ان کی لکھی ہوئی رپورٹوں پر مبنی وسطی یورپ کے واقعات بیان کرتا ہے۔

اٹھارویں صدی میں جب سلطنت عثمانیہ یورپ کے معاملات میں بہت زیادہ ملوث تھی اس وقت بھی حیرت انگیز طور پر اس بارے میں بہت کم لکھا جا رہا تھا۔ اصل جنگوں کے بارے میں تو بہت کچھ لکھا جا رہا تھا لیکن وقائع نگار روس، آسٹریا اور دوسرے مغربی ملکوں کے ساتھ سلطنت عثمانیہ کے لین دین پر بہت کم لکھ رہے تھے۔ پر زیادہ توجہ دی جا رہی تھی ایران پر۔ یا پھر صوبائی علاقوں میں سلطنت کے معززین اور پاشاؤں کے درمیان جو جھگڑے چل رہے تھے ان پر توجہ دی جا رہی تھی۔ خارجہ تعلقات پر توجہ تھوڑی سی زیادہ ہوگئی تھی لیکن پھر بھی بہت محدود تھی۔ اور وقائع نگار جن معلومات کو اپنا ماخذ بنا رہے تھے وہ انہیں ذرائع سے حاصل ہو رہی تھی جن سے پہلے وقائع نگار معلومات حاصل کرتے تھے۔ یعنی غیر ملکی، مفرور مغربی باشندے یا مقامی غیر مسلم۔ اٹھارویں صدی کا عثمانی مسلمان یورپی اقوام کے بارے میں اتنا ہی جانتا تھا جتنا انیسویں صدی کا مغربی باشندہ افریقہ کے قبائل اور عوام کے بارے میں جان سکتا تھا۔ ان دونوں کا رویہ تفریح طبع کے ساتھ ان لوگوں کے بارے میں حقارت والا ہی رہا۔ بڑھتے ہوئے خطرات نے اس رویہ میں کچھ تبدیلی پیدا کی لیکن یہ عمل بھی بہت سست اور بتدریج تھا۔

اٹھارویں صدی کے آخر تک یورپ کے بارے میں عثمانی علم زیادہ وقیع نہیں تھا۔ فارسی میں تو یہ معلومات بالکل ہی مفقود تھیں۔ عربی میں بھی صرف مراکشی سفارت خانوں کی چند رپورٹس اس بارے میں موجود تھیں۔

اٹھارویں صدی میں نئی صورت حال پیدا ہوئی۔ یہ صورت شکستوں اور بڑھتے ہوئے خطرات نے پیدا کی تھی۔ اس سے یورپ کے ساتھ عثمانیوں کی دلچسپی اور بڑھی۔ اس کا تعلق خالصتاً دفاع سے تھا۔ اب جیسے ہی دو تہذیبوں کو جدا کرنے والی دیوار گری تو پھر یہ ممکن نہیں رہا کہ دونوں

کے درمیان علوم وفنون کے رسل وترسیل کو روکا جائے۔ایک طرف حربی فنون اور ملٹری سائنس سے دلچسپی بڑھی تو دوسری طرف جاسوسی کے نظام کو بہتر بنانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔اس سے یورپ کی تازہ تاریخ کا مطالعہ بھی ضروری قرار پایا۔ابتدا میں تو یہ مطالعہ سرسری سارہا لیکن پھر اس پر خاص توجہ دی جانے لگی کیونکہ عثمانیوں کو اب یہ احساس ہو گیا تھا کہ ان کی سلطنت کے وجود کا دارومدار اس بات پر ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ یورپ کے اندرونی معاملات کے بارے میں صحیح اور درست معلومات حاصل کریں۔

ترکی میں قائم ہونے والے پہلے پرنٹنگ پریس میں جو 1729ء میں قائم ہوا اور 1742ء میں بند ہو گیا' جو کتابیں طبع کی گئیں ان میں کئی کتابیں تاریخ اور جغرافیہ پر تھیں۔ان میں فرانس میں ترک سفیر محمد آفندی کی یادداشت بھی شامل ہے جو ان حربی فنون سے متعلق ہے جو یورپ کی افواج استعمال کر رہی تھیں۔یہ کتاب پریس کے بانی ابراہیم متفریقہ نے لکھی تھی۔اس کے علاوہ ایران میں جنگ سے متعلق ایک پوری کتاب بھی چھاپی گئی۔ابراہیم نے چند پرانی کتابیں بھی چھاپیں جن میں نئی دنیا کی دریافت کے بارے میں سولہویں صدی کی ایک کتاب اور جغرافیہ پر کاتب چلپی کی تحریریں بھی شامل تھیں۔

ابراہیم کے پریس میں طبع ہونے والی کتابوں کے علاوہ استنبول میں جو چند قلمی نسخے موجود ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یورپ کی تاریخ سے دلچسپی میں اضافہ ہو رہا تھا۔1722ء کے ایک قلمی نسخے میں 800 سے 1662ء تک کی آسٹریا کی تاریخ کا خاکہ ملتا ہے۔یہ ایک ترجمان عثمان آغا نے جرمن زبان سے ترجمہ کیا تھا۔اس زمانے کے حالات سے متعلق جو قلمی نسخے ملے ہیں وہ 1725ء کے قریب کے ہیں۔ان پر کسی مصنف کا نام نہیں ہے۔ان میں عینی شہادتوں پر مبنی یورپ کے تازہ ترین حالات بیان کیے گئے ہیں۔

اس زمانے کے یورپ کا مختصر جائزہ جو ترکی میں محفوظ رہ گیا ہے چار قلمی نسخوں میں ہے۔ان پر کسی لکھنے والے کا نام نہیں ہے۔ان سے یورپ سے ترکوں کی عدم دلچسپی ثابت ہوتی ہے۔ابتدا میں مذہبی اور سیاسی عہدوں کی تشریح کی گئی ہے پھر یورپ کے ملکوں کے ایک اعداد و شمار پیش کیے گئے ہیں۔ابتدا کی گئی ہے مقدس سلطنت روما کے علاقوں کی درجہ بندی سے۔اس کے بعد مملکت اطالیہ (وینس اور جے نیوا وغیرہ) کا بیان ہے اور پھر سوئٹزرلینڈ' فرانس' اسپین' پرتگال' مالٹا (جسے انگریزوں کی قلمرو کہا گیا ہے) ہالینڈ' ڈنمارک' سویڈن' پولینڈ اور روس کے احوال ہیں۔

مصنف انگلستان کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔ اس نے اپنے زمانے کے انگریز بادشاہ کا نام ولیم دوئم لکھا ہے (حالانکہ ولیم سوئم کا انتقال بھی اس کتاب سے پہلے 1702ء میں ہوگیا تھا۔) مقامات کے نام لکھنے میں مصنف نے بہت احتیاط سے کام لیا ہے لیکن انگلستان کے بہت سے مقامات کے نام غلط لکھے ہیں۔ وہ باقی براعظم یورپ سے زیادہ واقف معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً وہ جانتا ہے کہ کولون کا آرچ بشپ ڈیوک آف بوریا کا بیٹا تھا اور لیکمن برگ زمانہ حال تک روسی قبضے میں تھا (دراصل 1716ء میں) اور یہ کہ سابق زار (پیٹر اعظم جو 1725ء میں مرا) نے بالٹک کا بڑا علاقہ سویڈن سے چھین لیا ہے اور اسی قسم کی دوسری باتیں۔

ایک اور مسودہ میں، جو کئی قلمی نسخوں پر مشتمل ہے، دنیا کی بحری فوجوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایک نسخہ میں لکھتا ہے "ایک عالم فاضل راہب فرانس کے مقام طولوس سے آیا اور وزیراعظم کی موجودگی میں اسلام قبول کیا۔ چونکہ اس نے بہت سیر و سیاحت کی ہے اور دنیا کے معاملات سے بہت زیادہ آگاہ ہے اس لیے اس کے بیان کردہ واقعات پر یہ کتاب مبنی ہے۔" (61)

دونوں مذکورہ کتابیں ایک ہی شخص کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ جس شخص نے بحری امور پر کتاب مرتب کی ہے اس کی معلومات کا ذریعہ کوئی فرانسیسی باشندہ ہے جو بھاگ کر ترکی آ گیا تھا۔ جس طرح مغربی ناموں کا تلفظ لکھا گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لکھنے والا شخص ہنگری کا ہوگا اور غالباً وہ شخص خود ابراہیم متفریقہ تھا۔

ایک اور رپورٹ جس کا زمانہ (1734-1733) ہے۔ "یورپی مملکتوں کے تاریخی حالات" کے متعلق ہے۔ یہ رپورٹ کلاڈ الیگزینڈر دی بنیواں نے لکھی تھی جو بعد میں احمد پاشا کہلایا۔ وہ فرانس کے اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور پھر عثمانی ملازمت میں آ گیا اور مسلمان ہوگیا۔ یہ رپورٹ آسٹریا، ہنگری، اسپین اور فرانس کے بارے میں ہے اور غالباً مصنف کی فرانسیسی تحریر سے ترکی میں اس کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ ایک مورخ عبدالرحمٰن منیف آفندی (وفات 1742) نے ممتاز خاندانوں کا جائزہ لیا ہے۔ ان میں صرف اسلامی سربراہ ہی شامل نہیں ہیں بلکہ بت پرست اور عیسائی شہنشاہ بھی شامل ہیں۔ جیسے بازنطینی شہنشاہ، شاہ فرانس اور شاہ آسٹریا۔ اواخر اٹھارویں صدی کے ایک قلمی مسودہ میں جس کا نام "یورپی امور کا جائزہ" ہے فریڈرک ولیم دوئم کے پروشیا اور انقلابی حکومتوں کے زمانے کے فرانس کے احوال بیان کیے گئے ہیں۔ 1799ء میں استنبول کے ایک عیسائی کوسمو کومیداس نے ترکی زبان میں اس زمانے کے یورپ کے

حکمرانوں، ان کی تاریخ پیدائش، تخت نشینی کی تاریخ، ان کے دارالحکومت، ان کے القاب، ان کے ولی عہدوں کی فہرست تیار کی تھی۔ اس کے علاوہ بھی اس میں ضروری معلومات تھیں۔ (63)

دوسرے عرب ملکوں میں جو ترکوں کے زیر تسلط یا زیر اثر تھے، مغرب سے دلچسپی اس سے بھی کم تھی۔ یہ دلچسپی صرف عیسائی اقلیتوں میں تھی۔ مراکش کے ان سفیروں نے جو مغربی ملکوں میں بھیجے گئے تھے یورپ کے اندرونی سیاسی حلقوں کے بارے میں معلومات فراہم کی تھیں لیکن انیسویں صدی سے پہلے تاریخی دلچسپی وہاں بھی نہیں تھی۔ عثمانیوں کے زیر تسلط مشرقی عرب میں جب فرانسیسی اور برطانوی اثرات بڑھنا شروع ہوئے تو اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع میں وہاں یورپ کے بارے میں جاننے کا شوق پیدا ہوا۔ لیکن اس وقت جو کچھ لکھا گیا وہ ایک تو تعداد میں کم ہے دوسرے ان تحریروں میں خاص طور سے مشرق میں فرنگیوں کی سرگرمیوں کے بارے میں ہی لکھا گیا۔ اس بات پر غور نہیں کیا گیا کہ وہ کیا حالات و واقعات تھے جنہوں نے ان قوموں کو اپنے ملکوں سے باہر نکلنے پر آمادہ کیا۔ 1820ء کے عشرے تک بھی مغربی کتابوں کے ترجمے نہیں ملتے۔ اس عشرے میں پہلی بار مغربی کتابوں کے ترجمے شائع ہوتے ہیں۔ یہ ترجمے مصر کے روشن خیال حکمران محمد علی پاشا کے قائم کیے ہوئے پرنٹنگ پریس میں طبع ہوئے۔ یہ پریس قاہرہ میں لگائے گئے تھے۔ دوسرے عرب ملکوں اور ایران میں، مسلمانوں کے اندر مغرب کو جاننے کا شوق بہت بعد میں پیدا ہوا اور وہ بھی وہاں یورپی باشندوں کی موجودگی کا نتیجہ تھا۔

❁......❁......❁

مذہب

مسلمانوں کے نزدیک مذہب ہی ان کی اپنی اور دوسرے لوگوں کی شناخت کی بنیاد تھا۔ ان کے لیے مہذب اور متمدن دنیا تھی دارالاسلام جہاں مسلمانوں کی فرمانروائی ہو' اسلامی قوانین نافذ ہوں اور غیر مسلم رعایا مسلمان حکومت کی رواداری سے فائدہ اٹھا رہی ہو۔ بشرطیکہ وہ ان کی شرائط قبول کرتی ہو۔ ان کے اور بیرونی دنیا کے درمیان بنیادی فرق قبول اسلام تھا۔ طبعی اور انسانی جغرافیہ کی روایتی اصطلاحات ان کے لیے ثانوی حیثیت رکھتی تھیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ مسلمان مصنفین اس حقیقت سے واقف تھے کہ شمالی سرحدوں کے پار ایسے لوگ رہتے ہیں جو رومن' فرینک سلاف اور دوسرے ناموں سے پہچانے جاتے ہیں اور حیرت انگیز طور پر مختلف انواع کی زبانیں بولتے ہیں۔ لیکن ان کے لیے صرف یہی بات قابل توجہ نہیں تھی۔ اسلامی قلم رو میں بھی بہت سی نسلیں آباد تھیں اگرچہ مسلمانوں نے کاروبار حکومت' ثقافت اور تجارت کے لیے بہت ہی محدود زبانوں کا استعمال پسند کیا۔ پھر بھی ان کے ہاں یورپ کی طرح ہی زبانوں کے مقامی لہجوں اور مقامی محاوروں کی بھرمار تھی۔

اصل فرق مذہب کا تھا۔ جو لوگ اسلام کو مانتے تھے وہ اسلامی برادری کا حصہ تھے' خواہ وہ کسی بھی ملک سے تعلق رکھتے تھے یا کسی بھی حکمران کی رعایا تھے' وہ مسلمان تھے۔ جو لوگ اسلام کو نہیں مانتے تھے وہ کافر کہلاتے تھے۔ عربی لفظ کفر کا مطلب ہے انکار کرنا اور یہ عام طور پر ان لوگوں کے لیے بولا جاتا ہے جو اسلام کا پیغام نہیں مانتے اور اسلام کی حقانیت سے انکار کرتے ہیں۔

اب کافر کی اصطلاح تمام غیر مسلموں کے لیے استعمال ہوتی ہے لیکن پہلے عربی' فارسی اور ترکی زبان میں یہ عیسائی کا مترادف تھی۔ اسی طرح دارالحرب ان ملکوں کو کہا جاتا تھا جو حریف عقیدے یا مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ پہلے عیسائی تھے پھر یورپی قرار پائے۔ ویسے مسلمان یہ

جانتے تھے کہ عیسائیوں کے علاوہ بھی کافر ہیں۔ ہندو اور بودھ باشندے مسلمانوں سے اتنی دور تھے کہ انہوں نے مشرق وسطی کے مسلمانوں کے تصور کفر پر کچھ زیادہ اثر نہیں ڈالا۔ افریقہ کے غیر مسلم ان سے بہت قریب تھے اور ان کے ساتھ قریبی تعلقات بھی تھے لیکن وہ بنیادی طور پر مشرک اور بت پرست مانے جاتے تھے اور ان سے حقارت کی جاتی تھی۔ مشرق وسطی میں صرف دو مذہب اور پہچانے جاتے تھے ایک زرتشتی اور دوسرا یہودی مذہب۔ لیکن یہ دونوں مذہب اتنے چھوٹے تھے کہ مسلمانوں کے نزدیک ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔ دونوں مذاہب اپنی سیاسی قوت کھو چکے تھے اور وہ اب مسلمانوں کے ساتھ حالت جنگ میں شمار نہیں ہوتے تھے۔ یہودی صرف ذمی مانے جاتے تھے اور زرتشتیوں کے جو بچے کھچے لوگ رہ گئے تھے انہیں بھی ذمی کا درجہ ہی حاصل تھا۔ عثمانی دور آتے آتے کافر کی اصطلاح' سرکاری استعمال میں بھی یہودیوں کے لیے باقی نہیں رہی تھی۔ مالی اور دوسری ایسی دستاویزوں میں جو غیر مسلموں سے تعلق رکھتی تھیں' عثمانی فارمولا یہ تھا کہ ''کافر اور یہودی'' الگ الگ لکھا جائے۔ یعنی کافر میں یہودی شامل نہیں تھے۔ اس کا ایک مطلب عیسائیوں کی اہمیت تسلیم کرنا تھا اور ایک اعتبار سے یہ بھی ماننا تھا کہ یہودی وحدانیت کے قائل ہیں۔ عثمانی (اور جدید) ترکی محاورہ میں کافر کی جگہ ''گور'' کی اصطلاح استعمال ہونے لگی۔ یہ اصطلاح عام کافروں کے لیے بالعموم اور عیسائیوں کے لیے بالخصوص استعمال کی جاتی تھی۔ یہ لفظ دراصل کافر کی ہی بگڑی ہوئی شکل ہے اور غالباً فارسی کے لفظ ''گبر'' سے لیا گیا ہے۔ گبر کا لفظ پہلے زرتشتیوں یا آتش پرستوں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ بعد میں اسے عیسائیوں کے لیے بھی استعمال کیا جانے لگا۔

یہی مذہبی درجہ بندی عثمانی کسٹم کے ضابطوں میں بھی اختیار کی جاتی تھی۔ ان ضابطوں کے مطابق محصول کی تین شرح تھیں۔ یہ شرح مال و اسباب کی بنیاد پر مقرر نہیں کی جاتی تھی بلکہ تاجر بالخصوص تاجر کے مذہب کی بنیاد پر مقرر کی جاتی تھی۔ تین شرحوں میں سے سب سے کم شرح مسلمانوں کے لیے تھی۔ ان میں عثمانی اور دوسرے تمام مسلمان شامل تھے۔ درمیان کی شرح ذمیوں کے لیے تھی۔ محصول کی سب سے زیادہ شرح ''حربیوں'' سے وصول کی جاتی تھی۔ یعنی ان تاجروں سے جو دارالحرب سے آتے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہودی خواہ کسی قوم کے ہوں حتیٰ کہ وہ یورپ سے بھی آئے ہوں' ان سے ذمیوں والی شرح وصول کی جاتی تھی۔ مخالف سمت میں بھی یہی طریقہ کار رائج تھا۔ اس کا اندازہ ایرانیوں کے بیان سے لگایا جاسکتا ہے کہ کس طرح روس

سے انیسویں صدی کے اوائل میں انہوں نے زبردستی مراعات حاصل کی تھیں۔ یہ مراعات روسی عیسائیوں کو تو دی جاتی تھیں لیکن روسی سلطنت کے مسلمانوں کو نہیں دی جاتی تھیں۔

چنانچہ کافر خاص طور پر عیسائی ہی تھے اور وہ ملک تھے جن کے بارے میں مسلمانوں کا کہنا تھا کہ وہ کافروں کی سرزمین ہے، یعنی عیسائیوں کی سرزمین۔ مذہب کی بنیاد پر تفریق ہر جگہ عام تھی۔ یورپ سے جو لوگ اسلامی دنیا میں آتے تھے وہ اپنے آپ کو انگریز، فرانسیسی، اطالوی یا جرمن وغیرہ کہا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ مراکش، ایرانی یا ترکی قوم میں آئے ہیں۔ اس کے برعکس یورپ میں جانے والا مسلمان، خواہ وہ مراکش سے آ گیا ہو یا ترکی اور ایران سے، اپنے آپ کو صرف مسلمان ہی سمجھتا تھا۔ ایسا مسلمان جو یورپ میں آیا ہے۔ وہ اپنے میزبان سے کسی علاقائی یا قومی تشخص کے حساب سے اپنا تعارف نہیں کراتا تھا۔ اور نہ وہ خود ایسا سمجھتا تھا۔ عام طور پر وہ اپنے ملک کا حوالہ "سرزمین اسلام" کے طور پر دیتا تھا۔ اور اپنے حکمران کو "اسلامی فرمان روا" کہتا تھا۔ یا اسی قسم کا اور لقب استعمال کرتا تھا۔

اٹھارویں صدی کے آخر میں کہیں جا کر یورپ آنے والے عثمانی سفیروں نے اپنے آپ کو اور اپنے ملک کو عثمانی کہنا شروع کیا۔ اس طرح انہوں نے اپنے آپ کو مشترکہ اسلامی شناخت سے ممتاز کیا۔ ادھر جیسے مسلم مسافر اپنے آپ کو مسلمان اور اپنی برادری کو اسلامی برادری کہتے تھے ویسے ہی قریب قریب بلا استثناء یورپی میزبانوں کو کافر کہتے تھے۔ اٹھارویں صدی کا ایک ترک مسافر آسٹریا میں بیٹھ کر کہتا ہے۔ "آسٹریا کے حاکم نے ہم سے ملنے تین کافر بھیجے۔ (1) کافر کی اصطلاح صرف اس وقت ہی استعمال نہیں کی جاتی تھی جب کسی یورپی باشندے کا قومی یا سیاسی عہدہ بیان کرنا ہوتا تھا۔ اس اصطلاح کو آدمی، شخص یا انسان کے لیے بھی استعمال کیا جاتا تھا۔

یورپی باشندہ محض اس لیے مختلف نہیں تھا کہ وہ کسی اور قوم سے تعلق رکھتا تھا یا کسی دوسرے حکمران کی رعایا تھا، کسی دوسرے مقام پر رہتا تھا یا کوئی اور زبان بولتا تھا بلکہ وہ اس لیے مختلف تھا کہ وہ دوسرے مذہب کی پیروی کرتا تھا۔ اس بنا پر اس کے بارے میں یہ فرض بھی کر لیا جاتا تھا کہ وہ دشمن ہے اور حقیر ہے۔ یورپی عیسائی اس سے خوب فائدہ اٹھاتے تھے اور آج کل کے زمانے کے پروپیگنڈے اور تشہیر کے طریقوں کے مطابق وہ مسلمانوں کی ان باتوں کو ان کے خلاف خوب اچھالتے تھے۔ شاید ہی کوئی یورپی قوم، گروہ یا فرد ایسا ہو جسے مسلمان کافر نہ کہتے

ہوں۔ تاریخی کتابوں میں جب مختلف عیسائی قوموں اور ملکوں کے باشندوں کے درمیان تمیز مقصود ہوتی تھی تو انگریز کافر، فرانسیسی کافر، روسی کافر وغیرہ لکھا جاتا تھا۔ اگر ان کی اہانت کرنا ہوتی تھی تو ان کے لیے توہین کے ہم قافیہ الفاظ استعمال کیے جاتے تھے۔ جیسے انگلیز ونسیسز (مذہب سے بے نیاز انگریز) فرانسیز جانسیز (فرانسیسی بے روح) ایگروس منحوس (منحوس ہنگری والے) روس معکوس (روسی بدمعاش) الماں بے ایمان (جرمن بے ایمان) وغیرہ۔ مسلمانوں کے لیے مثبت اور منفی دونوں ہی صفات مستعمل تھیں۔ لیکن "گوور" (گبر) کے لیے ساری صفات منفی تھیں اور جب ان سے خیر سگالی کا اظہار مقصود ہوتا تو یہ صفات حذف کر دی جاتیں۔(2) قرون وسطیٰ کی تحریروں میں کسی یورپی باشندے کے نام کے ساتھ لعنت ملامت کے الفاظ ضرور لگائے جاتے تھے۔ یہ ملامت یونہی نہیں کی جاتی تھی بلکہ اسے زیادہ معنی خیز بنانے کے لیے اس پر اصرار کیا جاتا تھا۔

عیسائیوں کو کافر کہنے کا رواج اتنا عام تھا کہ مسلمان حکمران عیسائی بادشاہوں کو جو دوستی اور خیر سگالی کے مراسلے لکھتے تھے ان میں بھی یہ لفظ استعمال کیا جاتا تھا۔ چنانچہ سلطان مراد ثالث انگلستان کی ملکہ ایلزبتھ کو جو مکتوب بھیجتا ہے اس میں ملکہ کو آسٹریا اور ہنگری کے کافروں پر اپنی فتح اور "ذلیل کافروں کی سرزمین" کی طرف اپنی افواج کی پیش قدمی کی اطلاع دیتا ہے اور اصرار کرتا ہے کہ آپ بھی "ہسپانوی کافروں" پر چڑھائی کریں۔ خدا کے فضل سے آپ ان پر فتح یاب ہوں گی۔" پھر "پولشی اور پرتگالی کافروں" کے ساتھ خیر سگالی کا اظہار کرتا ہے "جو آپ کے دوست ہیں"۔ حتیٰ کہ کاتب چلپی بھی جو اٹھارویں صدی کے وسط میں لکھ رہا ہے جب بھی فرینک کے بارے میں لکھتا ہے تو یہ ضروری سمجھتا ہے کہ ان کے ساتھ "ملعون، جہنمی، خدا انہیں غارت کرے جیسے الفاظ لکھے۔ اٹھارویں صدی کے وسط میں ایک عثمانی افسر نے جو سرحدوں پر حد بندی کمیشن کا رکن تھا بلغراد کی بازیافت کی رپورٹ دیتے ہوئے لکھا کہ "آسٹریا کے چور کافروں کے ہاتھوں سے "دارالجہاد" آزاد کرالیا گیا ہے۔"(3) عام طور پر یورپی حکومتوں اور افراد کے کاموں کے بارے میں لکھا جاتا تھا کہ فلاں بدنماد شمن نے ایسا کیا یا فلاں سازشی یا شرارت پسند شخص نے ایسا کیا۔ ہوسکتا ہے کہ بعض حالات میں یہ لعن طعن درست ہو لیکن ہر تحریر میں اسے محاورتاً استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ عادت اس دور تک جاری رہی جب سلطنت عثمانیہ براہ راست یورپ کے معاملات میں ملوث ہوگئی تھی اور یورپ میں اس کے مخالفوں کے ساتھ اتحاد بھی موجود تھے۔ عثمانی حکام اور

مورخین یورپ کے بین الاقوامی تعلقات کی اچھی باتوں پر بھی توجہ دینے لگے تھے۔ آخر اٹھارویں صدی میں یہ اہانت آمیز الفاظ حذف کیے گئے۔ پھر بھی مسلمان سفارت کاران لوگوں کو جن سے یورپ میں ملتے تھے کافر ہی کہتے تھے۔ البتہ انیسویں صدی میں سرکاری دستاویزوں اور تاریخی تحریروں میں اس کا استعمال ختم ہو گیا۔ یہ اور بات ہے کہ عام بول چال میں یہ بہت بعد تک جاری رہا۔

چونکہ مسلمانوں کے فکر وعمل میں مذہب کا بہت زیادہ عمل دخل تھا اس لیے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ انہوں نے مغربی دنیا کے مذہب پر بھی توجہ دی ہو گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ مسلمان سفارت کار اور مورخین مذہبی معاملات کے بہت حوالے دیتے ہیں لیکن انہوں نے یورپی عیسائیت سے کچھ زیادہ دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ اس سلسلے میں وہ بہت ہی کم معلومات فراہم کرتے ہیں۔ بہر حال عیسائیت ان کے لیے کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ یہ مذہب اسلام کا پیش رو تھا اور اس وقت بھی عیسائی باشندے مسلمان ملکوں میں ایک بڑی اور قابل ذکر اقلیت تھے۔ لیکن مسلمانوں کے نزدیک عیسائی مذہب کی حقانیت ختم ہو چکی تھی کیونکہ اب اسلام آ گیا تھا۔

ازمنۂ وسطی میں مسلمان علماء کے پاس عیسائی عقائد پر عربی زبان میں کافی تحریریں موجود تھیں جن سے یہ ممکن تھا کہ عیسائی مذہب کی ابتدائی تاریخ' اس کے مختلف مکاتب فکر اور فرقوں کے بارے میں کافی معلومات حاصل کی جاسکیں۔ اور انہوں نے پہلے یہ علم حاصل بھی کیا۔ لیکن یہ دلچسپی زیادہ دیر برقرار نہیں رہ سکی۔ عثمانی علماء عیسائی عقائد پر جو بحث مباحثے کرتے تھے ان کا انحصار قدیم عرب مسلمانوں کی تحریروں پر ہی ہوتا تھا۔ اس موضوع پر جو نئی آرا اور نئے تبصرے اور توضیح وتشریح سامنے آ رہی تھی وہ ان کے سامنے نہیں تھی۔ چنانچہ کاتب چلپی نے 1655ء میں یورپ پر جو مقالہ لکھا اس میں عیسائی مذہب کے بارے میں خالصتاً قرون وسطی کی تشریحات کو ہی بنیاد بنایا۔ اس نے اپنے قارئین کو بتایا کہ اس مذہب کی بنیاد چار انجیل ہیں۔ یہ تعداد اس نے درست بتائی ہے۔ پھر اس نے کہا کہ اس کی بنیاد پانچ اصولوں پر ہے۔ یعنی پتسمہ' تثلیث' عیسی میں خدا کی تجسیم' عشائے ربانی اور اعتراف گناہ۔ اس نے ان میں سے ہر ایک پر الگ الگ لکھا تثلیث کے ضمن میں وہ ابتدائی کلیساؤں کے اختلافات پر بحث بھی کرتا ہے۔ اس موضوع پر عیسائیوں کی قدیم عربی تحریروں میں کافی مواد مل جاتا تھا۔ وہ نیقیان عقیدے پر ایک عربی تحری کا حوالہ دیتا ہے اور لکھتا ہے کہ عیسائی تین بڑے فرقوں (جنہیں وہ مذاہب کہتا ہے) میں منقسم ہیں۔

یہ تین مذاہب ہیں۔ یعقوبی یعنی شامی کلیسا کے ماننے والے ملکی اور نستوری کاتب چلپی ان تینوں عقیدوں میں حضرت عیسیٰ کے انسانی اور الوہی خواص کے متعلق وضاحت کرتا ہے۔ یعقوبی فرقے سے اس کی مراد شام کے جیکب برادیس کے ماننے والوں سے ہے۔ غالباً وہ اس سے مراد وہ تمام عقیدے لیتا ہے جو حضرت عیسیٰ اور خدا کو ایک مانتے ہیں۔ کیونکہ زیادہ تر یعقوبی آرمینیائی تھے۔ ملکی عقیدے کے لوگ وہ تھے جو آرتھوڈوکس کہلاتے تھے اور وہ روم یعنی روما اور یونان کے مسلک سے تعلق رکھتے ہیں۔ کاتب چلپی کے زمانہ تک جیکب برادیس اور نستوای کلیسا قریب قریب ختم ہو چکے تھے اور ان کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ آرمینیائی اور قبطی عیسائی مسلمانوں کے زیر تسلط آ چکے تھے۔ عیسائی مذہب کے اندر بعد میں کئی فرقے پیدا ہوئے جیسے ملکی کلیسا یونانی آرتھوڈوکس مشرق اور رومن کیتھولک مغرب میں تقسیم ہوا۔ یا رومن کیتھولک مذہب میں پروٹسٹنٹ کی آمد کے بعد اس کا دو ٹکڑے ہونا ایسے مذہبی مباحث تھے جن سے کاتب چلپی کو واقف ہونا چاہیے تھا۔ لیکن وہ ان نئے فرقوں اور نئے مباحث کے بجائے پرانی بحثوں میں ہی الجھا ہوا ہے۔ وہ ایسا کیوں کرتا ہے؟ اس بارے میں وہ کچھ نہیں بتاتا۔

تاہم تمام عثمانی مورخین کیتھولک اور پروٹسٹنٹ تنازعہ سے غافل نہیں تھے۔ ایک عثمانی مورخ وسطی یورپ میں اس مذہبی جنگ کی وضاحت بھی پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ ایک دن شہنشاہ آسٹریا غمزدہ بیٹھا تھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس کی ملکہ نے جو شاہ ہسپانیہ کی بیٹی تھی دریافت کیا کہ آپ کو کیا پریشانی ہے؟ شہنشاہ نے کہا "میری پریشانی کا سبب میرے اور عثمانی سلطان کے درمیان موجود فرق ہے۔ عثمانی سلطان اپنی قلمرو کے حکمرانوں کو جب بھی طلب کرتا ہے کہ وہ اپنی افواج کے ساتھ آئیں اور سلطان کے عساکر کی مدد کریں تو وہ فوراً آ جاتے ہیں اور اپنی خدمات سلطان کو پیش کر دیتے ہیں۔ لیکن شہنشاہ آسٹریا ہنگری کے حکمران کو ایسا ہی پیغام بھیجتا ہے تو انہیں احساس تک نہیں ہوتا کہ شہنشاہ کی فرماں برداری ان کا فرض ہے۔ اس پر ملکہ نے جواب دیا۔ "عثمانی بادشاہ کے جاں نثار اس کے اپنے مذہب سے تعلق رکھتے ہیں اسی لیے وہ اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ ہنگری کے شہزادگان آپ کا حکم اس لیے نہیں مانتے کہ وہ دوسرے عقیدے کے پیروکار ہیں۔" شہنشاہ اس دلیل سے بہت متاثر ہوا اور فوراً اپنے نمائندے اور پادری ہنگری کے شہزادگان کے پاس بھیجے اور حکم دیا کہ "اپنے اصل عقیدے پر واپس آ جاؤ۔" کچھ لوگوں نے ایسا کیا اور کچھ نے انکار کر دیا۔ اس سے بہت شورش برپا ہوئی اور بغاوت پھیلی۔ "اور اسی لیے اللہ تعالیٰ

نے جو کسی بھی فانی انسان سے غافل نہیں خواہ وہ گو ور ہی کیوں نہ ہو اس کے خلاف عساکر اسلام بھیجیں۔ (5) اولیا چلبی جو اس سے کچھ عرصے پہلے ہنگری اور آسٹریا گیا تھا۔ وہ ان دونوں فرقوں کے اختلاف بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہنگری والے لوتھر کو مانتے اور آسٹریا کے باشندے پوپ کے وفادار ہیں اور اسی لیے وہ ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں۔ لیکن مسلمانوں کے خلاف وہ سب ایک ہیں کیونکہ بقول اولیا چلبی ''وہ تمام ہم مذہب ہیں۔'' (6)

پروٹسٹنٹ اور کیتھولک عیسائیوں کی چپقلش اور اس سے اسلام کے لیے ممکنہ فوائد کے بارے میں علماء کے مقابلے میں عثمانی سرکاری حکام زیادہ باخبر تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ہسپانیہ سے آنے والے مسلمان مہاجر اس بارے میں معلومات لا رہے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ پروٹسٹنٹ نمائندے تجارت وغیرہ میں عثمانیوں سے زیادہ مراعات حاصل کرنے کے لیے یہ دعویٰ کر رہے تھے کہ ان کا مذہب اسلام کے زیادہ قریب ہے کیونکہ وہ شبیہوں کی عبادت کرنے والوں اور ایک سے زیادہ خداؤں کو ماننے والوں کے مقابلے میں زیادہ وحدانیت کے قائل ہیں۔ عثمانی اگرچہ ان دعووں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے لیکن کبھی کبھی ان کا امتحان ضرور لے لیا کرتے تھے۔

1570-1568 میں جب موریسکو (ہسپانیہ میں شمالی افریقہ کے باشندوں کی نسل) نے ہسپانیہ میں بغاوت کی تو سلطان ترکی نے اپنا خاص نمائندہ انہیں یہ بتانے بھیجا کہ لوتھر کے پیروکاروں نے ''ان لوگوں کے خلاف جہاد کر رکھا ہے جو یورپ اور اس کے مکتبہ فکر کے غلام ہیں۔'' باغیوں کو مشورہ دیا گیا کہ وہ لوتھر کے پیروکاروں سے خفیہ رابطہ رکھیں اور جب وہ پوپ کے خلاف جنگ کریں تو کیتھولک علاقوں اور ان کے سپاہیوں کو ان کے اپنے گھروں میں تباہ و برباد کریں۔ (7) سلیم ثانی نے تو یہاں تک کیا کہ اپنا خفیہ ہرکارہ ہسپانوی ہالینڈ میں پروٹسٹنٹ رہنماؤں سے ملاقات کرنے بھیجا۔ ایک عثمانی شاہی مکتوب میں لوتھری عیسائیوں کے ساتھ مشترک مفادات کا تذکرہ بھی کیا گیا اور کہا گیا کہ وہ بھی کیتھولک عیسائیوں کے خلاف لڑ رہے ہیں اور ان کی بت پرستی کو وہ بھی رد کرتے ہیں۔ ''چونکہ آپ لوگوں نے پاپائیت کے خلاف اپنی تلوار اٹھائی ہے اور چونکہ آپ مستقل انہیں قتل کر رہے ہیں اس لیے ہمارا شاہی ترحم اور شاہی نظر کرم ہر لحاظ سے آپ کے علاقے کی طرف ہے۔ جیسا کہ آپ اپنے طور پر بتوں کی عبادت نہیں کرتے' آپ نے کلیساؤں سے بت' تصویریں اور گھنٹیاں نکال باہر کی ہیں اور یہ کہہ کر اپنے ایمان کا اظہار کیا ہے کہ اللہ ایک ہے اور حضرت عیسیٰ اس کے رسول اور بندے ہیں اس لیے آپ کے دل اور آپ کی روح سچے

عقیدے کی تلاش میں ہیں' لیکن ایمان سے عاری۔ وہ شخص جسے پاپا کہا جاتا ہے اپنے خالق کو واحد نہیں مانتا' حضرت عیسیٰ کو الوہی صفات کا حامل قرار دیتا ہے اور ان بتوں اور شبیہوں کی پرستش کرتا ہے جو اس نے اپنے ہاتھوں سے بنائی ہیں۔ اس طرح وہ اللہ کی وحدانیت پر شک کرتا ہے اور کتنے ہی اللہ کے بندوں کو گمراہ کرتا ہے۔" (8) بعد میں ملکہ ایلزبتھ کے نام عثمانی مکتوبات میں پروٹسٹنٹ عیسائیوں کے ساتھ اسی قسم کی دلچسپی کا اظہار کیا گیا ہے۔

پاپائیت کا ادارہ مسلمانوں کی نظروں سے پوشیدہ نہیں تھا اور بہت سے مسلمان مصنف روم کے "حکمراں" کی عجیب و غریب صورت حال پر تبصرے کر رہے تھے کہ وہ پروہت بادشاہ ہے۔ اسے وہ "الباب" یعنی پوپ کہتے تھے۔ اسلام میں پاپائیت ہے نہ کلیسائی نظام مراتب' اور ایک منظم عیسائی کلیسا مسلمانوں کی سمجھ سے بالا تھا۔ صرف عثمانی دور میں مشرقی کلیسا کے نظام مراتب سے شناسائی نے اس ادارہ کو مسلمانوں کے لیے قابل فہم بنایا۔ پہلا شخص جس نے پوپ کا ذکر کیا ہے وہ عرب جنگی قیدی ہارون ابن یحییٰ تھا جو 886 میں روم گیا تھا۔ اس نے لکھا کہ روم ایک شہر ہے' جس پر ایک بادشاہ حکومت کرتا ہے جیسے الباب یعنی پوپ کہا جاتا ہے" وہ اس لقب کی وضاحت نہیں کرتا اور لگتا ہے کہ اس نے اسے بادشاہ کا نام ہی سمجھا ہے۔ یاقوت کی جغرافیائی لغت میں روم کے بارے میں زیادہ تفصیل موجود ہے "موجودہ زمانہ میں روم فرنگیوں کے ہاتھ میں ہے اور اس کا بادشاہ شاہ المان کہلاتا ہے۔ اس میں پوپ رہتا ہے' فرنگی جس کی اطاعت کرتے ہیں اور جو ان کے لیے بحیثیت امام کے ہے۔ جو بھی اس کی نافرمانی کرتا ہے اسے باغی' گنہگار کہا جاتا ہے اور جلاوطنی' ملک بدری اور موت کا مستوجب قرار دیا جاتا ہے۔ وہ ان کے اوپر حکم لگاتا ہے' ان کی عورتوں سے متعلق' جسمانی پاکیزگی سے متعلق اور کھانے پینے کے متعلق احکام دیتا ہے۔ اور کوئی اس سے انحراف نہیں کرتا۔ (9)

اس عجیب و غریب ادارہ کے بارے میں اڑتی اڑتی خبریں اسلامی دنیا کے مشرقی خطوں میں بھی پہنچ گئی تھیں۔ تیرھویں صدی کا ایرانی شاعر خاقانی ایک طنزیہ قصیدے میں بطریق زمانی باب بطروس کا نام لیتا ہے (10) معلوم ہوتا ہے کہ اس نے پوپ کو مشرقی کلیسا کے لاٹ پادری سے گڈمڈ کر دیا ہے۔ بعد میں آنے والے عثمانی بھی یہ غلطی کرتے رہے۔

پوپ کے اختیارات کے بارے میں جو ابتدائی تحریریں سامنے آئی ہیں ان میں شام کے مورخ ابن واصف کی ایک تحریر ہے جو 1261ء میں سفارتی نمائندے کی حیثیت سے جنوبی اٹلی

گیا تھا۔ وہ پوپ کے بارے میں کہتا ہے ''وہ ان کے نزدیک حضرت عیسیٰ کا خلیفہ اور نائب ہے جسے اوامر ونواہی کے اختیارات ہیں۔'' اس کے بعد بھی بہت سے مصنفوں نے ایسے ہی تبصرے کیے۔ ان میں ترکی کا ایک مصنف ہے جس نے کتاب ''مہمات جم'' لکھی' وہ اس سے بھی زیادہ محیرالعقول باتیں لکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عیسائیوں کا ایمان ہے کہ پوپ گناہوں کی معافی دیتا ہے۔ پوپ کا یہ اختیار ایسا تھا جس پر اسلامی دنیا سے آنے والا ہر شخص حیرت واستعجاب کا اظہار کرتا تھا۔ مسلمان مذہبی ہیئت مقتدرہ سے آگاہ تھے۔ لیکن اسلام نے بنی نوع انسان میں روحانی اور مذہبی اقتدار اعلیٰ کے درمیان کبھی تفریق نہیں کی۔ اور ان کے نزدیک پوپ کے ساتھ جو اختیارات منسوب کیے جاتے تھے وہ صرف خدا کو حاصل تھے۔ ابن واصف لکھتا ہے ''وہی (پوپ ہی) بادشاہوں کی تاج پوشی کرتا ہے اور انہیں تخت نشیں کرتا ہے اور ان کی شریعت میں اس کے وسیلے کے بغیر کوئی کام نہیں ہوسکتا۔'' وہ راہب ہے اور جب وہ مرتا ہے تو اسی راہبانہ اختیارات کا شخص اس کی جگہ لیتا ہے۔ (11)

قلقشندی درباری استعمال کے لیے جو ہدایت نامہ لکھتا ہے اس میں پوپ پر یہ الفاظ تحریر کرتا ہے۔

> پوپ کو مخاطب کرنے کے آداب۔ وہ ملکیوں کا لاٹ پاری ہے جو ان کے درمیان خلیفہ کا مرتبہ رکھتا ہے۔ حیرت کی بات ہے'؟ ''تثقیف'' (درباری آداب کی ایک پرانی کتاب) کا مصنف اسے تاتاریوں کے خانِ اعظم کا درجہ دیتا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ''خان'' تاتاریوں میں عظیم بادشاہ کا مرتبہ رکھتا تھا' پوپ ایسا نہیں ہے' اس کے اختیارات صرف مذہبی معاملات تک محدود ہیں جن میں یہ حکم دینے کا اختیار بھی ہے کہ کس بات کی اجازت ہے اور کیا چیز ممنوع ہے۔
>
> اسے مخاطب کرنے کے آداب یہ ہیں...... اللہ تعالیٰ آپ کی پرشکوہ شخصی وجاہت میں اضافہ کرے' عزت مآب' مقدس' روحانی پیشوا' روم کے حاضر پوپ' عیسائی قوم کی عظیم شخصیت' حضرت عیسیٰ کی برادری کے لیے نمونہ' عیسائی دنیا کے بادشاہوں کی تخت نشینی کرانے والا'...... پلوں اور نہروں کا محافظ...... پادریوں' بشپوں اور راہبوں کی پناہ گاہ' انجیلوں کا پیروکار' وہ جو اپنے پیروکاروں

کو حکم دیتا ہے کہ کیا چیز ممنوع ہے اور کیا نہیں' بادشاہوں اور سلطان کا دوست۔''

قلقشندی نے تثقیف کے مصنف کا درج ذیل اقتباس نقل کیا ہے:

سب نے دستاویزوں میں یہی پایا۔ لیکن میرے زمانے میں اسے کچھ بھی نہیں لکھا گیا اور میں نہیں جانتا کہ اس سے پہلے کن موضوعات پر اسے کچھ لکھا گیا تھا......(12)

پاپائیت کے بارے میں رشید الدین کی کتاب ''تاریخ عالم'' میں بھی حوالہ آتا ہے۔ یہ کتاب چودھویں صدی کے اوائل میں ایران میں لکھی گئی تھی اور جیسا کہ بتایا جا چکا ہے یہ پوپ کے ایک نمائندے کے بیان اور پوپ کے احوال پر مبنی ہے۔ شہزادہ جم کے پاپائے روم سے ذاتی تعلقات تھے۔ اس سوانح کا مصنف ان آداب و رسوم کا بہت ہی ہیجان خیز نقشہ پیش کرتا ہے جو نیا پوپ منتخب کرتے وقت ادا کی جاتی تھیں۔ اس موقع پر ہنگامہ خیز منظر سامنے آتے تھے۔ کاتب چلپی یورپ پر مختصر سی کتاب میں پوپ پر بھی ایک باب رقم کرتا ہے۔ جس میں اس وقت تک جتنے پوپ منتخب ہوئے تھے ان کی اور ان کے انتخاب کی تاریخوں کی فہرست پیش کرتا ہے اور یہ بھی لکھتا ہے کہ کون کتنے عرصے پوپ رہا۔ آغاز وہ پیٹر سے کرتا ہے اور پال سوئم پر ختم کرتا ہے جس کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ 1535ء میں پوپ بنا۔ (13) چونکہ کاتب چلپی کی تحریر میں پال سوئم کی موت کا ذکر نہیں ہے جو 1549ء میں ہوئی' اسی طرح اس کے جانشینوں کی موت کا حوالہ بھی نہیں ہے اس لیے اندازہ ہے کہ کاتب کی معلومات کا ذریعہ جو بھی تھا وہ ایک سو سال پرانا ضرور تھا۔ دوسرے بہت سے امور کی طرح اس معاملے میں بھی مسلمان مصنفین تازہ ترین معلومات حاصل کرنا ضروری نہیں سمجھتے تھے یا پھر انہیں اس کا موقع نہیں ملتا تھا۔ چونکہ عیسائی مذہب کے بارے میں کاتب چلپی کی معلومات ایک ہزار سال پرانی ہیں اس لیے کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ اس نے پاپائے روم کی جو فہرست بنائی ہے وہ ایک سو سال سے بھی زیادہ پرانی ہے۔

پاپائیت کی زیادہ بہتر تشریح بلکہ یورپی عیسائیت کی ہی زیادہ تفصیل مراکش کے سفیر الوزیر الغسانی نے پیش کی ہے۔ وہ سترہویں صدی کے آخر میں ہسپانیہ گیا تھا۔ وہ صرف پوپ کے بارے میں ہی نہیں بلکہ پاپائیت کے پورے ادارے' کارڈینل کے کردار حتیٰ کہ اس طریقہ کار کے بارے میں بھی بہت کچھ بتاتا ہے جس سے پوپ کا انتخاب عمل میں آتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ پاپائیت کے ادارے سے ہی وہ خوش نہیں ہے چنانچہ جب بھی وہ پوپ کا ذکر کرتا ہے اس کے ساتھ

اہانت آمیز الفاظ ضرور استعمال کرتا ہے۔ غسانی ہسپانیہ کے عدالتی احتساب یہودیوں پر مظالم، اصلاح مذہب کی تاریخ اور اس کے بعد عیسائی دنیا میں ابھرنے والے مذہبی تفرقوں جیسے امور پر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ وہ انگلستان میں اصلاح مذہب کا حوالہ دیتا ہے اور اسے ہنری ہشتم کے ازدواجی مسائل کا شاخسانہ قرار دیتا ہے۔ جو یقیناً اسے اس کے ہسپانوی میزبانوں نے بتایا ہوگا۔ وہ ہسپانیہ میں رائج کیتھولک مذہب کا ذکر ذرا تفصیل سے کرتا ہے اور مسیحی کنواریوں (Nuns) راہبوں اور اعتراف گناہ کی رسم کا بھی ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس سے بڑی گمراہی پھیل رہی ہے (14) اس کے بعد کے مراکشی سفیروں نے بھی اسی کی مثال پر عمل کیا اور انہوں نے بھی کلیسا اور اس کے اداروں سے بحث کی ہے۔ ان میں سے بیشتر نے اس عدالتی احتساب پر زیادہ روشنی ڈالی ہے جو ہسپانیہ میں مسلمانوں اور یہودیوں پر ظلم ڈھانے کے لیے کیا جاتا تھا اور جس کے ذریعہ مسلمانوں کو جبراً عیسائی بنایا جاتا تھا۔

ایک اور موضوع جو یورپ آنے والے مسلمانوں کی توجہ کا مرکز بنا وہ خود اسلام یا اس سے متعلق معاملات تھے۔ جن ملکوں پر عیسائیوں نے دوبارہ قبضہ کرلیا تھا ان میں سے چند ملکوں میں کچھ مسلمان باقی رہ گئے تھے۔ یہ لوگ قدرتی طور پر توجہ کا مرکز بنے۔ ابن واصل یہ جاننا چاہتا تھا کہ جنوبی اٹلی میں نارمن حکمرانوں کے زیر تسلط مسلمانوں کا کیا حال ہے؟

> جس مقام پر میں ٹھہرا تھا اس کے قریب ہی ایک شہر تھا جس کا نام تھا لوسیرا۔ اس کی ساری آبادی سسلی نژاد مسلمانوں کی تھی۔ وہاں جمعہ کی نماز ادا کی جاتی تھی اور مسلمان کھلے عام عبادات کرتے تھے۔ یہ عمل مینفرڈ کے باپ شہنشاہ (فریڈرک دوئم) کے عہد سے جاری تھا۔ مینفرڈ نے وہاں ایک ایوانِ سائنس کی تعمیر شروع کی ہے جہاں قیاسی علوم کی تمام شاخوں کو اکٹھا کیا جائے گا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے زیادہ تر شہری مسلمان ہیں جو اس کے نجی معاملات کی دیکھ بھال بھی کرتے ہیں اور اس کے کیمپ میں کھلے عام اذان دی جاتی ہے اور نماز پڑھی جاتی ہے۔

ابن واصل لکھتا ہے کہ پوپ نے مینفرڈ کو مذہب سے باہر کردیا تھا کیونکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ ہمدردانہ سلوک کرتا تھا۔ (15)

آخر مسلمان سسلی اور اٹلی کی اصل سرزمین سے نکال ہی دیئے گئے۔ 11 فروری

1502ء کو جو فرمان جاری کیا گیا اس میں کاستیل کی سلطنت کے مسلمانوں سے کہا گیا تھا کہ وہ عیسائی ہو جائیں یا ملک چھوڑ دیں یا پھر موت قبول کر لیں۔ تاج ہسپانیہ کے تمام ملکوں میں بھی یہی فرمان جاری کیا گیا۔ تاہم اس کے بعد بھی چوری چھپے رہنے والے مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی آبادی پھر بھی وہاں رہی۔ اسے مورلیکو کہا جاتا تھا۔ یہ زیادہ عرصے نہیں رہ سکی۔ لیکن اس عرصے میں اس نے کئی بغاوتیں بھی کیں حتیٰ کہ ان مسلمانوں نے ایک مختصر سی مدت کے لیے غرناطہ پر قبضہ بھی کر لیا تھا۔ ہسپانیہ کے مسلمانوں نے اپنی آخری شکست سے پہلے بھی اور بعد میں بھی عثمانیوں سے مدد مانگی تھی لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا حالانکہ اس وقت سلطنت عثمانیہ بہت بڑی طاقت تھی۔ البتہ عثمانیوں نے موریسکو مسلمانوں کے ساتھ گفت وشنید کی تھی اور مختلف ذرائع سے انہیں مشورہ دینے کی اور کبھی کبھی امداد کی کوشش بھی کی تھی۔ خفیہ طور پر ایک نمائندہ بھیجا گیا تھا تاکہ ہسپانیہ شمالی افریقہ اور استنبول کے درمیان رابطہ قائم ہو سکے اور ضروری اطلاعات پہنچتی رہیں۔ لیکن یہ ساری کوششیں بے کار تھیں کیونکہ آخر کار موریسکو بھی اپنے پیش رو مسلمانوں کی طرح وہ علاقہ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔

وسطی یورپ سے عثمانیوں کی پسپائی کے بعد بھی اسی قسم کی صورت حال پیدا ہوئی تھی۔ بیشتر مقامات سے جہاں عیسائیوں نے دوبارہ قبضہ کیا مسلمانوں کا انخلا ہوا' سوائے روسی علاقے تاتارستان کے۔ یہی ایک ایسا عیسائی علاقہ تھا جہاں انیسویں صدی تک مسلمانوں کی بڑی آبادی رہ گئی تھی۔ باقی تمام علاقوں میں ماضی کی اسلامی یادگاریں اور ان کی پرانی یادیں ہی باقی رہ گئی تھیں۔ اسپین میں متعین مراکشی سفارتی نمائندے اور جنوبی یورپ میں عثمانی نمائندے ان علاقوں سے گزرتے تھے جہاں کبھی مسلمانوں کی حکومت رہ چکی تھی۔ جس طرح مشرق میں یورپی مسافر قدیم عیسائی ماضی کے آثار تلاش کرتے تھے ایسے ہی یورپ جانے والے مسلمان بھی وہاں اسلامی آثار دیکھتے اور مسلمانوں کی ماضی کے نقوش دیکھ کر جذباتی ہو جاتے۔ یہ نقوش انہیں اپنا ماضی یاد دلاتے۔ یہ مسلمان قدیم تبرکات تلاش کرتے بلکہ یہ بھی معلوم کرتے کہ وہاں کچھ بچے کھچے مسلمان باقی ہیں یا نہیں۔ چنانچہ مراکشی سفیر الغزال لکھتا ہے کہ ہسپانیہ میں ایک مقام والفرانکا پیلاشیوز کے باشندے اندلسی مسلمانوں کی باقیات ہیں۔ ان کی رگوں میں عرب خون ہے۔ ان کا طرز زندگی غیر ملکیوں (عجمیوں) سے مختلف ہے۔ مسلمانوں سے ان کی محبت' ہمارے ساتھ ملنے جلنے کی خواہش اور ہماری روانگی کے وقت ان کا غمگین ہونا ثابت کرتا ہے کہ یہ لوگ اندلسی مسلمانوں کی باقیات

ہیں۔لیکن انہیں کافروں کے درمیان رہتے ایک زمانہ ہو چکا ہے' خدا ہمیں اپنی پناہ میں رکھے۔" الغزال یہ بھی دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے ایک چھپے ہوئے مسلمان کو دریافت کیا جو اپنی لڑکی کے ساتھ اس کے پاس آیا۔ اسی کا نام بلاسکو تھا۔لڑکی کی شکل و شباہت عربوں کی سی تھی۔ وہ شخص خفیہ اشارے کر رہا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ واقعی چھپا ہوا مسلمان ہے۔ (16) عثمانی سفارتی نمائندے بھی ہنگری اور حتیٰ کہ جنوبی پولینڈ کے علاقوں سے گزرتے تو اپنی سابق رعایا کی آنکھوں میں اپنے لیے ہمدردی کے جذبات دیکھتے اور محسوس کرتے کہ سلطنت عثمانیہ سے وہ محبت کرتے ہیں۔(17) چنانچہ عزمی آفندی 1790ء میں جب ہنگری سے گزرا تو اس نے دیکھا کہ وہاں کے لوگ اس کی خوب آؤ بھگت کر رہے ہیں اور جس مقصد سے وہ وہاں گیا تھا اس مقصد سے بھی ہمدردی ظاہر کر رہے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اسی قسم کے جذبات اٹھارویں صدی میں بھی مراکشی سفیر نے دریافت کیے۔ بعض سفارتی نمائندے یہ یقین رکھتے تھے کہ اسپین کے باشندے صرف اوپر سے ہی عیسائی ہیں ان کے اندر ابھی تک مسلمانوں کے ساتھ وفاداری باقی ہے جو کسی وقت بھی باہر آ سکتی ہے۔

یورپ جانے والے مسلمان مسافر یہ دیکھ کر سخت پریشان ہو جاتے تھے کہ وہاں مسلمانوں کے آثاروں کی شکل بگاڑ دی گئی ہے بلکہ انہیں عیسائی بنا دیا گیا ہے۔ مراکشی سفیر الغزال نے ایک جگہ پہنچ کر دیکھا کہ ایک پتھر پر جو عربی کندہ ہے وہ پتھر الٹا رکھا ہوا ہے اس نے وہاں لوگوں سے کہا کہ اسے سیدھا کرو اور نمایاں جگہ پر رکھو تا کہ وہ پڑھا جا سکے۔ وہ کہتا ہے کہ قرطبہ کی مسجد میں قرآنی آیات کندہ کیا ہوا ایک پتھر سیڑھیوں پر رکھا تھا جس پر سے چل کر لوگ اوپر جاتے تھے۔ اس نے اصرار کر کے اسے وہاں سے ہٹایا۔ مسجد کے مینار تو ان مسلمانوں کے لیے اور بھی اضطراب کا باعث تھے کیونکہ انہیں لائٹ ہاؤس کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا۔ سربیا میں ایسے ہی ایک مینار کو گھنٹہ گھر بنا دیا گیا تھا۔ عیسائیوں نے مسلمانوں کے حماموں کو بھی نہیں بخشا تھا۔ بلغراد پر آسٹریا کے قبضے کے فوراً بعد ایک ترک مسافر نے دیکھا کہ ایک حمام کو رہائش کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ بہت بدمزہ ہوا۔(18) اس سے کافروں کی غلیظ عادات کا پتہ چلا۔

مسلمانوں کی تحریروں میں یہ احساس ہر جگہ موجود ہے کہ مشرقی یورپ ہو یا مغربی یورپ' دونوں ہی مسلمانوں کے علاقے ہیں جن پر ناجائز طور پر عیسائیوں نے قبضہ کر لیا ہے اور آج نہیں تو کل یہ دوبارہ مسلمانوں کو مل جائیں گے۔ حتیٰ کہ جن علاقوں پر مسلمانوں کا قبضہ نہایت مختصر

مدت کے لیے رہا انہیں بھی وہ اپنا ہی سمجھتے تھے۔ چنانچہ 1763ء میں رزمی آفندی پولینڈ کے قلعہ کامی نیت گیا تو اس کے مینار دیکھ کر اس کا دل بھر آیا۔ ان میناروں پر قرآنی آیات لکھی تھیں اور قلعہ کی تعمیر کی تاریخ عربی میں لکھی تھی۔ یہ قلعہ 1672ء سے 1699ء تک ترکوں کے قبضے میں رہا تھا۔ وہ لکھتا ہے "میں نے وہ تحریر دیکھی تو میرے دل سے یہ دعا نکلی" اللہ جل شانہ یہ مقامات جلد ہی مسلمانوں کو عطا کر دے تا کہ ان میناروں سے حق و صداقت کی صدا بلند ہونے لگے۔" (19)
1779ء میں بھی اسپین میں متعین مراکشی سفیر محمد ابن عثمان المقناسی جب بھی کسی مقام کا نام لیتا ہے تو اس کے ساتھ یہ ضرور لکھتا ہے "اللہ تعالیٰ اسے اسلام کے لیے بحال کرے۔" (20)

عمومی طور پر مسلمان عیسائیت کو اسلام کے لیے مذہبی طور پر خطرہ نہیں سمجھتے تھے۔ حتیٰ کہ جب عیسائی افواج اسپین میں اور بعد میں جنوبی یورپ میں ایک کے بعد دوسرا علاقہ فتح کرتی جا رہی تھیں تو اسے سیاسی اور فوجی خطرہ ہی سمجھا جا رہا تھا اسے مذہب اسلام کے لیے کوئی خطرہ نہیں محسوس نہیں کیا جا رہا تھا۔ ان کے نزدیک یہ خیال نہایت احمقانہ تھا کہ مسلمان اسلام سے پہلے کے کسی مذہب کو قبول کر لیں گے۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ اپنی مرضی سے عیسائی مذہب قبول کرنے والے مسلمان بہت ہی کم تھے۔ اسلامی دنیا میں ارتداد گردنی زدنی جرم ہے۔ عیسائی علاقوں میں بھی مسلمانوں سے کہا جاتا تھا کہ وہ وہاں سے نکل جائیں اور عیسائی مذہب قبول نہ کریں۔ جہاں مسلمانوں کو زبردستی عیسائی بنالیا گیا تھا وہاں سمجھا جاتا تھا کہ ان لوگوں نے دل سے یہ مذہب قبول نہیں کیا۔

مسلمانوں کے عقیدے کو مغرب سے جو پہلا خطرہ محسوس ہوا وہ فرانسیسی انقلاب سے تھا۔ اس وقت پہلی بار جس پروپیگنڈے کا رخ مسلمانوں کی طرف کیا گیا وہ کسی قدیم مذہب کا پراپیگنڈہ نہیں تھا بلکہ ایک نئے نظریہ کا پرچار تھا۔ اس خطرے سے آگاہی کے آثار اس یادداشت میں نظر آتے ہیں جو عثمانی چیف سیکرٹری نے 1798ء کے موسم بہار میں تیار کی تھی اور جس میں مملکت کے دربار عالیہ سے رہنمائی طلب کی گئی تھی۔ فرانس کے حالیہ واقعات کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے اس نے کہا "مشہور دہریہ والٹیر، روسو اور ان جیسے دوسرے مادیت پرستوں نے ایسی کتابیں لکھی اور طبع کرائی ہیں جن میں نعوذ باللہ سچے پیغمبروں اور قدیم بادشاہوں کی بے حرمتی کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ تمام مذاہب کو ختم کر دیا جائے اور ان پر پابندی لگا دی جائے۔ اس کے علاوہ انسان کی برابری اور جمہوریت کی تعریف کی گئی ہے۔ یہ تمام باتیں اتنے سہل انداز میں لکھی گئی ہیں

کہ سب کی سمجھ میں آ جائیں۔ بازاری لوگوں کی زبان میں سب کا مذاق اڑایا گیا ہے۔" (21)

مصر پر فرانسیسی حملے نے اس نئی مصیبت کو گھر کے دروازے تک پہنچا دیا اور عثمانی سلطنت کو مجبور کیا کہ وہ ایسی مہم چلائے جسے آج کل نفسیاتی جنگ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ عربی اور ترکی میں جو فرمان جاری کیا گیا اس میں سلطان کی مسلمان رعایا کو انقلابیوں کی گمراہیوں سے اس طرح آگاہ کیا گیا۔

فرانسیسی قوم (اللہ ان کی بستیاں برباد کرے اور ان کے پرچموں کی بے حرمتی ہو کیونکہ وہ ظالم کافر اور بدکردار ہیں) وہ خالق ارض وسما کی وحدانیت کو نہیں مانتی اور نہ روز محشر میں شفاعت کرنے والے کے پیغام پر ایمان رکھتی ہے بلکہ اس نے تمام مذاہب کو ترک کر دیا ہے اور آخرت اور اس کی جزا اور سزا سے بھی منکر ہے۔ وہ روز حشر پر ایمان نہیں رکھتی اور دعویٰ کرتی ہے کہ صرف روز وشب کی آمد ورفت ہی ہمیں تباہ کرتی ہے اور یہ کہ یہاں اور کچھ نہیں ہے سوائے رحم مادر کے جو ہمیں باہر نکالتا ہے اور سوائے زمین کے جو ہمیں ہڑپ کر لے گی اور اس کے آگے روز محشر نہیں ہے اور کوئی باز پرس نہیں ہے' کوئی آزمائش اور عذاب نہیں ہے' کوئی سوال کوئی جواب نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر جو کتابیں لائے وہ غلط ہیں اور یہ کہ قرآن' تورات اور انجیل سوائے جھوٹ اور فضول باتوں کے اور کچھ نہیں ہے اور یہ کہ جن لوگوں نے پیغمبر ہونے کا دعویٰ کیا...... انہوں نے جاہل لوگوں سے جھوٹ بولا...... یہ کہ تمام لوگ برابر ہیں اور سب انسان ہونے کے ناتے ایک جیسے ہیں کسی کو کسی دوسرے پر اہلیت کی بنا پر برتری حاصل نہیں ہے اور ہر آدمی اپنی روح کا خود مختار ہے اور اس زندگی میں اپنی روزی خود کماتا ہے۔ انہوں نے اس احمقانہ عقیدے اور بیہودہ رائے کے ساتھ نئے اصول اور نئے قوانین وضع کیے ہیں اور شیطان نے ان کے کان میں جو پھونکا ہے اسے انہوں نے نافذ کیا ہے اور مذہب کی بنیاد تباہ کر دی ہے۔ اور انہوں نے غلط چیزیں اپنے لیے جائز قرار دی ہیں اور ہر اس چیز کو اپنے لیے حلال کر لیا ہے جو ان کی ہوس چاہتی ہے اور انہوں نے عام لوگوں کو ورغلا لیا ہے جو پاگل ہو گئے ہیں۔ انہوں نے مذاہب میں بغاوت کے بیج بو دیئے ہیں اور

بادشاہوں اور ریاستوں کے درمیان نفاق پیدا کر دیا ہے۔

فرمان جاری کرنے والوں نے اپنے قارئین کو فرانسیسیوں کی چکنی چپڑی باتوں سے اس طرح خبردار کیا ہے۔

جھوٹی کتابوں اور دلکش فریب کے ساتھ وہ ہر ایک کے پاس جاتے ہیں اور کہتے ہیں "ہم تم میں سے ہی ہیں۔ تمہاری برادری اور تمہارے مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔" اور وہ بیہودہ دعویٰ کرتے ہیں اور خطرناک دھمکیاں دیتے ہیں۔"

یورپ میں تباہی مچانے کے بعد فرانسیسیوں نے اپنی توجہ مشرق کی جانب مرکوز کی۔" پھر ان کی بدباطنی اور شیطنت کا رخ امت محمدی کی جانب ہو گیا۔" (22)

یقیناً ایسا ہی ہوا۔ طلوع اسلام کے بعد پہلی مرتبہ اسلام کو ایک ایسے نظریاتی اور فلسفیانہ چیلنج کا سامنا کرنا پڑا جو اسلام کے عقیدے اور اسلامی معاشرے کے لیے خطرہ بن رہا تھا۔ مسلمانوں کے تجربے میں اس سے پہلے ایسا کوئی چیلنج نہیں آیا تھا۔ مشرق وسطی کو فتح کرنے اور وہاں کے معاشروں کو اپنے اندر ضم کرنے کے بعد اسلام کو تین تہذیبوں کا مقابلہ کرنا پڑا تھا۔ یہ تہذیبیں تھیں ہندوستان، چین اور یورپ کی۔ ان تینوں میں سے صرف تیسری تہذیب ایسی تھی جس کے پاس کوئی قابل توجہ مذہب تھا اور وہ اسلامی تہذیب کے لیے ایک سنگین سیاسی اور فوجی متبادل بن سکتا تھا۔ لیکن عیسائی مذہب نے اسلام کے سامنے ہمیشہ پسپائی اختیار کی اور عیسائی طاقت زیادہ سے زیادہ اتنا ہی کر سکی کہ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کے سامنے اپنی جگہ ڈٹی رہے۔ یہ درست ہے کہ قرون وسطی میں اسلامی الٰہیات کو یونانی (Hellenistic) فلسفے اور سائنس سے مقابلہ کرنا پڑا۔ لیکن یہ چیلنج بہت ہی محدود پیمانے کا تھا اور مفتوحہ کلچر کی طرف سے تھا اس لیے اس کی پیش قدمی روک دی گئی پھر ہیلنی یا یونانی ورثہ کا ایک حصہ مسلمانوں نے اپنے اندر ضم کر لیا باقی مسترد کر دیا۔

اب یورپ کے سیکولرزم سے اسلام کو جو نیا چیلنج ملا وہ مختلف قسم کا تھا۔ وہ اپنی وسعت، قوت اور اثر پذیری کے اعتبار سے زیادہ بڑا تھا اور کسی مفتوحہ دنیا کی طرف سے نہیں بلکہ فتح یاب ہونے والی دنیا کی طرف سے آیا تھا۔ وہ ایسا فلسفہ تھا جو بظاہر عیسائی تعبیر و توجیہ سے آزاد تھا اور ایک ایسے معاشرے میں پیش کیا گیا تھا جو دولت مند، طاقتور اور وسعت پذیر تھا۔ بعض مسلمانوں کو

اس میں یورپ کی کامیابی کا راز نظر آیا اور یہ بھی محسوس ہوا کہ ان کی اپنی کمزوری، غربت وافلاس اور پسپائی کا علاج بھی اس میں مضمر ہے۔

انیسویں اور بیسویں صدی میں یورپ کے سیکولرزم اور اس سے پھوٹنے والے سیاسی معاشرتی اور معاشی نظریات نے آنے والی مسلمان نسلوں کو اپنی جانب متوجہ کیا۔

❀......❀......❀

معیشت' ادراک اور رابطے

نویں صدی میں بغداد کے ایک مصنف نے رسالہ ''تجارت پر ایک واضح نظر'' لکھا جس میں اس نے ان مختلف اشیاء کا تذکرہ کیا جو تجارت کی بنیاد بنتی ہیں۔ ان اشیاء کی اقسام' معیار اور جہاں وہ پیدا ہوتی ہیں ان مقامات کا ذکر بھی کیا۔ رسالے کا ایک حصہ ان اشیاء کی فہرست پر مشتمل تھا جو دوسرے ملکوں سے عراق درآمد کی جاتی تھیں۔ دوسرے ملکوں میں ایشیا اور افریقہ کے دورافتادہ مسلمان ملک ہی شامل تھے۔ صرف چار ملک ایسے تھے جو مسلم قلمرو سے باہر تھے۔ وہ تھے خزار (یوریشیا کے میدانی علاقوں میں ایک ترک مملکت) ہندوستان' چین اور بازنطین۔ خزار سے غلام' کنیزیں' زرہ بکتر' فولادی ٹوپیاں اور ہندوستان سے شیر' چیتے' ہاتھی' چیتے کی کھال' عقیق' سفید صندل کی لکڑی' آبنوس اور ناریل' چین سے عطریات' چینی مٹی کے برتن' کاغذ' روشنائی' موز' گھوڑے' گھوڑوں کی کاٹھی' اونی نمدے' دارچینی اور ریوند چینی' اور بازنطین سے چاندی اور سونے کے برتن' خالص شاہی دینار۔ جڑی بوٹیاں' کشیدہ کاری والے کپڑے' گھوڑے' کنیزیں' سرخ تانبے کے نوادرات' قفل ارباب' آبپاشی اور کھیتی باڑی کے ماہرین' سنگ تراش اور خواجہ سرا' درآمد کیے جاتے تھے۔ یہاں یورپ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ وہاں سے اتنا کم مال منگایا جاتا تھا کہ اس کا ذکر کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی۔ لیکن ممکن ہے جن اشیاء کا ذکر بازنطین کی فہرست میں کیا گیا ہو ان میں سے کچھ مغربی یورپ سے منگائی جاتی ہوں۔ (1)

ازمنۂ وسطی کے جغرافیہ دانوں نے ان اشیاء کی جو فہرست دی ہے جو مغربی یورپ سے منگائی جاتی تھیں وہ بہت ہی کم ہیں' روس کے راستے سکینڈے نیویا سے جو اشیا منگائی جاتی تھیں وہ البتہ زیادہ تھیں۔ اس تجارت کا ثبوت وہ سکے فراہم کرتے ہیں جو سکینڈے نیویا بالخصوص سویڈن میں ملے ہیں۔ یہ سکے وسط ایشیاء کی ٹیکنالوجی کے ڈھالے ہوئے ہیں۔

قرون وسطیٰ کے مصنفین مغرب کی اقتصادی صورت حال کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات کا مواد فراہم کرتے ہیں۔

ابن یعقوب اتریشت کے بارے میں لکھتا ہے:

یہ ایک عظیم شہر ہے فرنگیوں کی سرزمین میں۔ اس کے ساتھ وسیع میدان ہیں۔ اس کی مٹی کھاری یا سیم زدہ ہے۔ یہاں کوئی بیج یا پودہ نہیں اگتا۔ عام لوگ مویشیوں' ان کے دودھ اور اون سے روزی کماتے ہیں۔ ایندھن کے لیے ان کے پاس لکڑی جلانے کو نہیں ہے بلکہ ان کے پاس ایک قسم کی مٹی ہوتی ہے جسے وہ ایندھن کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ بس یہاں جو کچھ ہوتا ہے وہ یہی ہے۔ گرمیوں میں جب پانی خشک ہو جاتا ہے تو وہ اپنے کھیتوں میں جاتے ہیں اور کلہاڑی سے اینٹوں کی شکل میں مٹی کاٹتے ہیں۔ ہر آدمی اپنی ضرورت کی مٹی کاٹتا ہے اور دھوپ میں سکھانے رکھ دیتا ہے۔ وہ بہت ہلکی ہو جاتی ہے اور جب اسے شعلے کے پاس لے جاتے ہیں تو وہ آگ پکڑ لیتی ہے۔ آگ اسے ایسے پکڑتی ہے جیسے لکڑی کو اور اس سے بہت اونچے اونچے شعلے بلند ہوتے ہیں جن میں بہت حرارت ہوتی ہے۔ ایسی شدید حرارت جیسے شیشہ بنانے والی دھونکنی کے شعلے میں ہوتی ہے۔ جب اس کا ٹکڑہ جل جاتا ہے تو راکھ رہ جاتی ہے کاربن نہیں رہتا۔

ابن یعقوب دوسرے ان شہروں کے بارے میں بھی ایسا ہی تبصرہ کرتا ہے جہاں وہ پہلے گیا ہے یا جن کے بارے میں اس نے سنا ہے۔ وہ کہتا ہے "بوردیو پانی' درختوں پھلوں اور اجناس سے بھرا ہوا ہے۔ اس شہر کے ساحل پر بہت اچھا عنبر پایا جاتا ہے۔ رواں شہر کے بارے میں وہ لکھتا ہے:

دریائے سین کے کنارے نہایت ترتیب سے لگائے ہوئے پتھروں سے اسے تعمیر کیا گیا ہے۔ درخت اور بیلیں وہاں بالکل نہیں اگتیں لیکن وہاں گندم اور مویشیوں کے چارے کے لیے جو بہت پیدا ہوتی ہے۔ ان کے دریا میں ایک مچھلی پکڑی جاتی ہے جسے وہ سامن کہتے ہیں۔ ایک اور چھوٹی مچھلی ہوتی ہے جس کا مزہ کھیرے کا سا ہوتا ہے...... موسم سرما میں رواں میں جب سردی شدید

ہوتی ہے تو ایک قسم کی سفید بطخ وہاں آتی ہے جس کے پاؤں اور چونچ سرخ ہوتے ہیں...... یہ قسم صرف بے آباد جزیرے میں انڈے دیتی ہے۔ اگر کوئی جہاز تباہ ہو جاتا ہے اور اس کے لوگ اس جزیرے پر پہنچ جاتے ہیں تو وہ ہفتہ دو مہینے ان کے انڈوں اور بچوں پر گذارا کر سکتے ہیں۔

شلیسوگ شہر کے بارے میں وہ لکھتا ہے:

شہر میں چند چیزیں اچھی ہیں اور وہ خدا کی نعمت ہیں۔ ان لوگوں کی خوراک زیادہ تر مچھلی ہے جو بہت ہے۔ کسی کے ہاں بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ خرچہ بچانے کے لیے اسے سمندر میں پھینک دیتے ہیں۔

مینیز شہر سے وہ بہت زیادہ متاثر ہوا ہے:

بہت ہی عظیم شہر ہے۔ اس کا کچھ حصہ آباد ہے باقی میں جھاڑیاں ہیں۔ یہ فرنگیوں کی سرزمین میں ہے دریا کے کنارے جسے رائن کہتے ہیں۔ یہ گندم' جو' جوی' نارنگی اور پھلوں سے مالا مال ہے۔ وہاں درہم چلتا ہے جو 301-302 ہجری (مطابق (934-935) میں ڈھالا گیا تھا۔ اس پر بادشاہ کا نام اور تاریخ کندہ ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اگرچہ یہ شہر انتہائی مغرب میں ہے لیکن یہاں گرم مسالے نہیں ہوتے جو صرف مشرق بعید میں پائے جاتے ہیں' جیسے کالی مرچ' ادرک' لونگ' جولنجان' (ایک قسم کی ادرک' یہ چیزیں ہندوستان سے لائی جاتی ہیں جہاں وہ بہت ہوتی ہیں۔

قرون وسطی کے آخری برسوں میں مسلمان مصنفین زیادہ باخبر ہو گئے تھے۔ جیسے ادریسی خاصی تفصیل کے ساتھ معلومات فراہم کرتا ہے۔ اب انگلستان جیسا دور افتادہ ملک بھی ان کی تحریروں میں نظر آنے لگا ہے۔ چنانچہ ابن سعید انگلستان کا عجوبہ بیان کرتا ہے۔

اس جزیرے میں صرف بارش کا پانی ہے اور بارش کے پانی سے ہی یہ لوگ فصلیں بوتے ہیں...... اس جزیرے میں سونے' چاندی' تانبے اور ٹین کی کانیں ہیں۔ زیادہ سردی کی وجہ سے یہاں انگوروں کے باغ نہیں ہیں۔ لوگ کانوں کی معدنیات فرانس بھیجتے ہیں۔ اور تبادلے میں شراب حاصل کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فرانس کے بادشاہ کے پاس اتنا زیادہ سونا چاندی

ہے......(3)

ایران کا مورخ رشید الدین بھی انگلستان کی دولت سے بہت متاثر ہوا۔ ''انگلستان میں'' بے شمار سونے چاندی' تانبے' ٹین' اور لوہے کی کانیں ہیں اور بہت سے اقسام کے پھل ہیں۔'' رشید الدین لکھتا ہے کہ وہاں فرنگی تاجر ہیں جو مصر' شام' شمالی افریقہ' اناطولیہ اور تبریز کا سفر کر چکے ہیں یہ لوگ جے نیوا سے روانہ ہوتے تھے۔(4)

وسطی اور مغربی یورپ میں جو چیزیں پیدا ہوتی تھیں ان میں سے تین چیزوں نے مسلمان مصنفین کو اپنی طرف متوجہ کیا۔'' وہ تھے سلاوی غلام' فرنگی ہتھیار' اور انگلستان کی اون' چونکہ اسلامی شریعت کی رو سے کسی آزاد مسلمان کو یا ایسے آزاد غیر مسلم کو غلام نہیں بنایا جا سکتا جو اسلامی سلطنت کا قانونی شہری ہو اور جزیہ ادا کرتا ہو اس لیے اسلامی ملکوں کے لیے غلام دو طریقے سے حاصل کیے جاتے تھے۔ پیدائشی طور پر (غلام ماں باپ کے بچے بلا امتیاز مذہب) اور بیرون ملک سے لائے جانے والے لوگ۔ غلام ماں باپ کے بچوں کی تعداد بہت جلد ناکافی ہو گئی۔ رومن اور دیگر قدیم سلطنتوں کی طرح اسلامی سلطنت میں مجرموں' مقروض لوگوں یا غریب لوگوں کو خرید کر غلام نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ اس لیے غلاموں کی کمی اسلامی سرزمین سے باہر سے نئے غلام حاصل کر کے پوری کی جاتی تھی۔ یہ غلام خراج' گرفتاری یا خریداری کے ذریعہ حاصل کیے جاتے تھے۔

اس سے مسلمان اور اس سے پہلے کی سلطنتوں کے درمیان فرق کا پتہ چلتا ہے۔ قدیم زمانے میں غلاموں کی اکثریت مقامی لوگوں کی ہوتی تھی۔ اس کے برعکس اسلامی سلطنت میں غلام مسلم سرزمین کے باہر سے لائے جاتے تھے۔ اس سے مسلمان ملکوں کے آس پاس کے علاقوں میں غلاموں کی تجارت کو زبردست فروغ حاصل ہوا۔

اسلامی ملکوں میں غلاموں کی آبادی پوری کرنے والے دو بڑے ذرائع تھے۔ ایک شمال میں یورپ اور ایشیاء کے سرحدی میدانی علاقے' جہاں سے سفید فام غلام آتے تھے اور جن میں زیادہ تر ترک ہوتے تھے جو فوج میں کام آتے تھے۔ اور دوسرے استوائی افریقہ جہاں سے سیاہ فام غلام پکڑے جاتے تھے یا خریدے جاتے تھے۔ یہ غلام گھریلو کاموں کے لیے ہوتے تھے۔ دوسرے بھی علاقے تھے جہاں سے غلام حاصل کیے جاتے تھے۔ ان میں ایک یورپ تھا۔ ظاہر ہے یورپی غلام مسلمانوں کے مغربی ملکوں بالخصوص ہسپانیہ میں زیادہ ممتاز مقام رکھتے تھے۔ دوسری سرحدوں کی طرح یہ غلام پہلے پہل جنگوں میں پکڑے جاتے تھے۔ میدان جنگ میں

پکڑے جانے والے کافروں کو غلام بنانا جائز تھا۔ چنانچہ ایک عرصے تک یہ غلام حاصل ہوتے رہے۔

مسلمانوں کی پیش قدمی رک جانے' حالات میں کچھ عرصے کے لیے تعطل پیدا ہو جانے اور پھر مسلمانوں کی پسپائی کے ساتھ ہی جنگی قیدیوں کی فراہمی کافی نہیں رہی اور جو گرفتار کیے گئے تھے انہیں بھی تاوان کے لیے یا اپنے قیدیوں سے تبادلے کے لیے آزاد کرنا پڑا۔ اس کے بعد غلاموں کی خریداری شروع ہوئی۔ جس سے یورپی غلاموں کی تجارت خوب پروان چڑھی۔ مسلم ہسپانیہ اور شمالی افریقہ کے لیے یورپی مرد اور عورتیں خوب خریدی جاتی تھیں۔ ان سفید فام غلاموں کو عربی میں ''سقالبہ'' کہا جاتا تھا کا جو ''سقلبی'' کی جمع ہے۔ یورپی زبانوں میں سلیو (Slave) ایک معاشرتی اصطلاح بن گیا اور ایک نسل سلاو یا سلاف کہلائی جانے لگی۔ لفظ سلیو بھی عربی کے سقلبی سے ہی نکلا ہے۔ جغرافیہ دانوں کی تحریروں میں سقالبہ کی اصطلاح وسطی اور مشرقی یورپ کے مختلف سلاوی لوگوں کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔ مسلم ہسپانیہ کے وقائع میں مصر سے پہلے یہ نام قرطبہ کے امیہ خلفاء کی حفاظت پر مامور غلاموں کے لیے استعمال کیا گیا۔ اس کے بعد مشرقی خلافت میں ترک مملوک حکمرانوں نے بھی یہی نام استعمال کیا۔ خیال ہے کہ ہسپانیہ میں پہلے سقالبہ وہ لوگ تھے جنہیں جرمنوں نے مشرقی یورپ پر حملوں کے دوران گرفتار کیا اور مسلم ہسپانیہ میں فروخت کر دیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہ نام ان تمام سفید فام غلاموں کا پڑ گیا جو فوج میں یا گھروں پر خدمات انجام دے رہے تھے۔ دسویں صدی کے عرب سیاح ابن حوقل نے جو مشرق سے ہسپانیہ گیا تھا لکھا ہے کہ جن یورپی غلاموں سے وہ ملا وہ صرف مشرقی یورپ سے ہی نہیں آئے تھے بلکہ ان میں فرانس' اٹلی اور شمالی ہسپانیہ کے باشندے بھی شامل تھے۔ ان میں سے کچھ اب بھی ان کے گرفتار کرنے والے فروخت کر رہے تھے۔ یہ گرفتاری خشکی کے راستے حملوں کے ذریعہ نہیں ہوتی تھی بلکہ سمندری راستوں سے ہوتی تھی۔ فرانس سے خشکی کے راستے غلاموں کی فراہمی جاری رہی جہاں ایک ولندیزی مورخ رائن ہارٹ ڈوری کے بقول ''وردن کے مقام پر خواجہ سرا بنانے کا کارخانہ لگا ہوا تھا۔'' (5)

مسلم معاشرے کے آداب اور ضابطے ایسے تھے کہ وہاں غلام بھی طاقتور اور بااثر حیثیت حاصل کر لیتے تھے۔ اس وجہ سے مسلم ہسپانیہ میں سقالبہ معاشرہ کا نہایت اہم عنصر بن گئے تھے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ جنرل تک بن گئے۔ وزیر بن گئے' ان کے پاس دولت تھی' جاگیریں تھیں'

حتیٰ کہ ان کے اپنے غلام بھی تھے۔ انہوں نے عربی زبان اختیار کر لی تو ان میں سے بڑے بڑے عالم فاضل شاعر اور سائنس داں پیدا ہوئے۔ ان کی تعداد اتنی زیادہ تھی اور وہ اتنے ممتاز تھے کہ ہشام ثانی (976-1013) کے زمانہ میں ان میں سے ایک نے اندلس کے سلاوی باشندوں کے کارناموں پر پوری ایک کتاب لکھ دی۔ اس کتاب کا کوئی نسخہ محفوظ نہیں رہا۔

دسویں صدی کے اوائل میں فاطمیوں نے تونس میں اپنی سلطنت قائم کی اور قریب پچاس سال بعد مصر پر قبضہ کیا تو ان کی کامیابی میں سلاوی غلاموں کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ جوہر جو مصر فتح کرنے والی افواج کا سالار تھا اور جسے قاہرہ کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے غالباً سلاوی نسل کا تھا۔(6)

مسلم دنیا کو غلاموں کی سپلائی میں بہت سے یورپی لوگ ملوث تھے۔ ان میں اٹلی اور فرانس کے شہروں کے تاجر اور مشرقی بحیرۂ روم کے علاقوں میں کاروبار کرنے والے غلاموں کے یونانی مالک بھی شامل تھے۔ وینس کے تاجروں نے بھی اس میں اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے آٹھویں صدی میں ہی اس کاروبار میں یونانیوں کا مقابلہ کرنا شروع کر دیا تھا۔

یورپ کے تاجروں کو ہسپانیہ اور شمالی افریقہ میں عیسائی غلام مسلمانوں کے ہاتھوں فروخت کرتے کوئی شرم نہیں آتی تھی۔ حالانکہ شارلمین اور اس کے بعد پوپ زیکیری اور ہیڈرین اوّل نے اس کام پر پابندی لگا دی تھی وہ یہ کاروبار بند کرنا چاہتے تھے۔ اس معاملے میں وینس کے تاجر سب سے آگے تھے وہ روم کے شہر سے مرد اور عورت دونوں ہی خریدتے تھے۔(7) مسلم اور بازنطینی درباروں کو خواجہ سراؤں کی فراہمی میں بھی وینس ہی سب سے آگے تھا۔ یہ کاروبار اتنا پھیلا کہ ایک زمانے میں رسوائی کا باعث بن گیا۔ جس پر وینس کے حاکم نے یہ تجارت ممنوع قرار دے دی۔ لیکن یہ پابندی زیادہ دیر کارآمد نہیں رہی۔

یہ کاروبار اتنا منافع بخش تھا کہ اس پر ہر قسم کی پابندی اور مذمت ناکام ثابت ہوئی۔ وینس کا جغرافیائی محل وقوع ایسا تھا کہ وہ سلاوی سرزمین کے کنارے پر تھا اور بحری راستوں سے مسلم ملکوں تک اس کی آسان رسائی بھی تھی اس لیے وہاں کے تاجر سب پر بازی لے گئے۔ چنانچہ ایڈریاٹک سمندر کا جزیرہ پولا جو اس وقت وینس کے قبضے میں تھا۔ غلاموں کی سب سے بڑی منڈی بن گیا۔

غلاموں کی فراہمی کے دوسرے وسائل بھی تھے۔ ہسپانیہ سسلی اور شمالی افریقہ کے

مسلمان بحیرۂ روم کے عیسائی ساحلوں پر حملے کرتے تھے۔ یہ حملے خاص طور پر دسویں، گیارھویں اور بارھویں صدی میں بہت زیادہ ہوئے۔ ان حملوں میں بڑی تعداد میں قیدی بنائے جاتے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ 928 میں ایڈریاٹک پر صرف ایک حملے میں بارہ ہزار قیدی بنائے گئے جو تونس کی بندرگاہ مہدیہ لے جائے گئے۔ اس کی کمان ایک شخص صابر نے کی تھی جو حاکم سسلی کا آزاد کردہ غلام تھا اور اٹلی اور دوسرے ملکوں کے ساحلوں پر حملے کرتا رہتا تھا۔

یہ کاروبار پورے قرون وسطیٰ میں جاری رہا۔ پندرھویں صدی میں کہیں جا کر اس کے خاتمے کے آثار پیدا ہوئے۔ کاروبار ختم ہونے کی ایک وجہ یہ تھی کہ گرم مسالوں کے مغربی تاجروں کی طرح غلاموں کے مسلمان تاجروں نے بھی غلام حاصل کرنے کا سیدھا راستہ تلاش کر لیا تھا۔ اب بحیرۂ روم کے دلالوں کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ جس طرح پرتگالی تاجر افریقہ کے گرد چکر لگاتے ہوئے سیدھے ہندوستان اور جنوب مشرقی ایشیا پہنچتے اور گرم مسالے حاصل کرتے۔ اسی طرح ترک بلقان اور بحیرۂ اسود کے علاقوں سے ہوتے ہوئے سیدھے وسطی اور مشرقی یورپ پہنچتے اور غلام حاصل کرتے۔ اس طرح یورپ کے وہ دلال درمیان سے نکل گئے جو یورپ سے سلاوی غلام حاصل کرتے اور مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ میں جا کر فروخت کرتے۔ پندرھویں اور سولھویں صدی میں غلاموں کی سپلائی کا بڑا ذریعہ جنوب مشرقی یورپ تھا جہاں عثمانی جہاد کی پیش قدمی کے سبب البانیوں، سلاوی ہنگرین اور دوسرے عیسائی غلاموں کی مستقل اور وافر تعداد میں سپلائی جاری رہی۔ ان میں سے کچھ تو سلطنت کی رعایا میں سے ہوتے تھے جو عیسائی نوجوانوں کی بنائی جانے والی فوج میں بھرتی کیے جاتے تھے اور کچھ میدان جنگ میں قیدی بنائے جاتے تھے۔ سترھویں صدی میں عیسائی لڑکوں کی فوج، جسے دوشرمے کہا جاتا تھا، ختم کر دی گئی۔ اس کے ساتھ ہی ہیسبرگ کے ساتھ عثمانیوں کی جنگ میں جو تعطل پیدا ہوا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عثمانی معاشرے کی ضرورت پوری کرنے کے لیے غلاموں کی فراہمی کا سلسلہ کم ہو گیا۔

لیکن جلد ہی اس کا متبادل ذریعہ مل گیا۔ کریمیا کے تاتار خانوں نے، جو عثمانی خلافت کو مانتے تھے غلاموں کی گرفتاری اور ان کی تجارت کا ایک بہت بڑا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ وہ روس، پولینڈ اور یوکرین کے باشندے پکڑتے اور کریمیا لے جاتے جہاں سے انہیں استنبول بھیج دیا جاتا۔ استنبول سے انہیں سلطنت عثمانیہ کے دوسرے علاقوں کی منڈیوں میں بھیج دیا جاتا۔ تاتاری اسے میدانوں کی فصل کاٹنا کہتے تھے۔ غلاموں اور کنیزوں کی یہ فراہمی اٹھارویں صدی کے آخر

تک جاری رہی۔ آخر روس نے کریمیا پر قبضہ کیا تو یہ کاروبار بند ہوا۔ (8)

عثمانی دستوں میں بلقان کے عیسائی لڑکوں کی جو بھرتی ہوتی تھی اس نے اس کاروبار میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ ان میں سے بہت سے لڑکے باقاعدہ فوج یا دوسری ملازمتوں میں شامل ہو گئے۔ ایک زمانے میں یہ لڑکے بہت بااثر ہو گئے تھے۔ اس سے دوسرے طبقوں میں بے چینی پیدا ہوئی۔ شکایت کرنے والوں میں کاکیشیا کے غلام بھی شامل تھے جو ان کے مدمقابل تھے۔ حتیٰ کہ آزاد مسلمانوں کو بھی شکایت پیدا ہوئی اور انہوں نے ان نومسلم غلاموں کے سامنے اپنی تذلیل محسوس کی۔ شاعر ویسی نے سترہویں صدی کے اوائل میں سلطنت عثمانیہ پر نازل ہونے والی آفات پر ایک مثنوی لکھی جس میں دوسرے اسباب کے علاوہ اس کا ایک سبب یہ بھی بتایا۔ ''کتنے تعجب کی بات ہے کہ جو لوگ مراتب اور طاقت کے مزے لوٹ رہے ہیں وہ سب البانیہ اور بوسنیا کے ہیں اور پیغمبر خدا کی امت (یعنی پرانے مسلمان اور عرب) ذلت برداشت کر رہے ہیں۔'' (9)

واقعی ان عیسائی نوجوانوں کا اثر بہت زیادہ تھا۔ بہت سے تو ترقی کر کے اعلیٰ عہدوں تک پہنچ گئے' کچھ نے علم و فضل اور شاعری میں نام پیدا کیا حتیٰ کہ کئی ایسے بھی تھے جو قاضی اور فقیہ بن گئے۔ تاہم مشرقی یورپ کے ان کسانوں کے بارے میں زیادہ پتہ نہیں چلتا جو تاتاریوں نے گرفتار کر کے بھیجے تھے۔ وہ لوگ زیادہ خوش نہیں رہے۔ یہ لوگ اعلیٰ مقامات تک نہیں پہنچ سکے اور ادنیٰ کام ہی کرتے رہے۔ ان کا کام صرف گھریلو خدمت کرنا ہی تھا۔ عام خیال کے برعکس ان غلاموں کو معاشی معاملات میں بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ قرون وسطی میں ان غلاموں کو کھیتوں اور کانوں میں بھی کام میں لایا جاتا تھا۔ لیکن یہ طریقہ بہت زیادہ عام نہیں تھا۔ ایسی معلومات موجود ہیں کہ عثمانی دور میں ان غلاموں سے بڑے کھیتوں اور باغوں میں کام لیا جاتا تھا اگرچہ وہ باغ اور کھیت بیشتر سرکاری نہیں ہوتے تھے۔

مختلف نسلوں کے غلاموں کی کیا اہمیت تھی؟ اس کا اندازہ اس موضوع پر مسلمانوں کی کتابوں سے لگایا جا سکتا ہے۔ عربی' فارسی اور ترکی میں ایسی کتابیں ملتی ہیں جو اوائل قرونِ وسطی سے اٹھارویں صدی تک کا احاطہ کرتی ہیں۔ ان میں غلاموں کی مختلف نسلوں کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں اور بتایا گیا ہے کہ کس نسل سے کہاں کام لیا جا سکتا ہے۔ پرانی کتابوں میں خاص طور پر اشیاء اور افریقہ کے غلاموں کا ذکر ہے۔ عثمانی کتابوں میں سلاوی غلاموں پر توجہ دی گئی ہے لیکن چند ایک کے سوا کسی نے مغربی یورپ کے غلاموں کا ذکر نہیں کیا۔ (10)

بعد کے ادوار میں مغربی یورپ کے غلام حاصل کرنے والے صرف شمالی افریقہ کے لوگ ہی رہ گئے تھے۔ یہ لوگ سمندروں میں جہاز پکڑ لیتے اور وقتاً فوقتاً عیسائی ملکوں کے ساحلوں پر حملے کرتے۔ سترہویں صدی کے اوائل میں یہ سرگرمیاں اور بھی تیز ہوگئیں۔ اب یہ لوگ جزائر برطانیہ اور آئس لینڈ جیسے دور افتادہ مقامات تک اپنے جہاز لے جاتے۔ لیکن ان کے قیدی تاوان وصول کرنے کے کام آتے۔ وہ تجارتی مال کے طور پر استعمال نہیں کیے جاتے تھے۔

تاہم بعض ایسے بھی ہوتے جو خود ہی وہاں رہ جاتے اور مسلمانوں کے ساتھ ہی رہنا قبول کر لیتے۔ اس قسم کا جو پہلا گروہ تھا اور جس میں مرد زیادہ تھے اس نے اسلام قبول کیا اور شمالی افریقہ کی مسلم حکومتوں کی ملازمت حاصل کر لی اور وہاں خاصی ترقی پائی۔ یہ لوگ سترہویں صدی کے یورپی بحری قزاقوں کی طرح اسلامی حکومتوں کی خدمات انجام دیتے رہے۔ ان کے ساتھ یورپ سے مسلمان ملکوں میں نئے ہنر بھی آئے جیسے جہاز سازی، توپ سازی اور جہاز رانی۔ کئی مواقع پر یہ لوگ یورپ کے دور افتادہ مقامات پر بھیجی جانے والی فوجی مہموں میں بھی شامل ہوئے اور انہوں نے کافی مال غنیمت حاصل کیا۔ ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ ان لوگوں نے اپنے میزبان ملکوں پر کوئی خاص اثر ڈالا ہو۔ وہاں کے معاشروں پر ان کے اثرات بہت ہی محدود تھے۔

شمالی افریقہ کے مسلمانوں نے یورپ کے جن باشندوں کو گرفتار کیا ان میں سے ایسے بھی تھے جو اپنی مرضی کے خلاف مسلم ملکوں میں رہتے تھے لیکن وہاں ان کا مستقل قیام رہا۔ یہ عورتیں تھیں جو اپنی خوبصورتی کی وجہ سے کنیزوں کے طور پر وہاں رہیں اور انہیں دوسرے حاکموں کے حرم کے لیے ان کے ہاتھ فروخت کیا گیا۔ ان میں سے جو بہت زیادہ پسندیدہ ہوتی تھیں وہ عثمانی دربار میں جگہ پاتی تھیں اور سلطان کے حرم میں یا ان کے وزراء کے حرم میں پہنچائی جاتی تھیں۔ چنانچہ عثمانی سلطانوں کے بارے میں تو سب جانتے ہیں لیکن ان کی ماؤں کے بارے میں بہت کم معلومات موجود ہیں۔ ان میں اکثر کنیزیں تھیں جن کی شناخت اور اصلیت جان بوجھ کر پوشیدہ رکھی جاتی تھیں۔ اس میں سے بعض خواتین کی اصلیت کے بارے میں قیاس آرائیوں نے بھی جنم لیا کہ وہ کنیز کی حیثیت سے حرم میں داخل ہوئیں اور پھر انہوں نے سلطان کی والدہ کی حیثیت سے اثر ورسوخ حاصل کیا۔ سلطانوں کی والداؤں کے بارے میں بہت سی کہانیاں مشہور ہیں۔ ان خواتین میں کئی یورپ کی تھیں۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور ملکہ نقش دل تھی جو عظیم سلطان محمد ثانی کی والدہ تھیں۔ ایک مشہور روایت کے مطابق ان کا اصلی نام ایمی دو بودی ریوری

تھا۔ وہ مارتی نیک کی فرانسیسی خاتون تھیں اور جوزفین وی بوہانے کی عم زاد تھیں۔ لیکن اس روایت کی کہیں سے تصدیق نہیں ہوتی۔ البتہ نور بانو کے متعلق زیادہ بہتر شہادت موجود ہے۔ وہ سلطان سلیم ثانی کی کنیز اور اس کے جانشین سلطان مراد ثالث کی ماں تھی۔ وہ کورخو کے گورنر کی بیٹی تھی اور پیدائشی طور پر وینس کی تھی۔ اس کا اصلی نام سیلیا وینیئر بافو تھا۔ ترکوں نے اسے بارہ برس کی عمر میں گرفتار کیا تھا۔ اسے سلطان سلیمان ذیشان کو تحفے کے طور پر دیا گیا تھا جس نے اسے اپنے بیٹے سلیم کے حوالے کر دیا۔ بعد میں اس نے اور اس کی جانشین صفیہ نے' جو سلطان محمد ثالث کی بہن تھی' وینس اور انگلستان کو مکتوبات بھیجے۔ (11)

اس بات کا امکان کم ہی ہے کہ ان خواتین نے یورپ کے بارے میں مسلمانوں کے علم میں اضافہ کیا ہو۔ حتیٰ کہ انہوں نے اپنے بچوں کو بھی کچھ زیادہ نہیں بتایا ہوگا خواہ وہ بچے شاہی خاندان کے ہی کیوں نہ ہوں۔ عام طور پر وہ نوعمری مین ہی حرم میں داخل ہوتی تھیں ارر مسلم معاشرہ کی روایات کے مطابق ان کے اثرات حرم سے باہر کم ہی پڑے ہوں گے۔

غلاموں کے مقابلے میں ہتھیاروں کی تجارت میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ صلیبی جنگوں سے پہلے بھی عربی کتابوں میں ایسی تحریریں ملتی ہیں جن میں فرنگی اور یورپی ہتھیاروں کے اعلیٰ معیار کی تعریف کی گئی ہے۔ صلیبی جنگوں تک یہ ایک اہم درآمدی مال بن گیا تھا جس سے یورپ اور مسلم ملکوں کے درمیان تجارت کا توازن بہتر ہوا۔ ورنہ یہ توازن بہت خراب تھا۔ یورپ سے مسلم ملکوں کو ہتھیاروں کی برآمد کو پوپ وغیرہ اور کبھی کبھی بادشاہوں کے غیض وغضب کا نشانہ بھی بننا پڑا۔

مسلمانوں کو صرف فرنگی ہتھیار ہی بہت زیادہ کارآمد نظر نہیں آتے تھے بلکہ ان کے بنانے اور انہیں استعمال کرنے والے بھی ان کے لیے کارآمد تھے۔ ایک مصری رسالہ میں ان فرنگیوں کا ذکر ہے جو کاریگروں کی حیثیت سے ملازم رکھے گئے تھے۔ وہ فاطمی دور میں حکومت کی بحریہ اور دوسری افواج کے لیے اسلحہ بناتے تھے۔ (12) ہسپانیہ سے شمالی افریقہ اور ایشیائے کوچک تک مسلم حکمرانوں کو فرنگی سپاہی مل جاتے تھے جو محض دولت کی خاطر ان کی خدمت انجام دیتے تھے۔ اناطولیہ کے ابتدائی ترک حکمرانوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کے پاس ہزاروں عیسائی کرائے کے سپاہی تھے۔ ان میں مغربی یورپ کے بھی تھے۔ ہم جے نیوا اور یورپ کے سپاہیوں کے متعلق بھی سنتے ہیں جنہوں نے مشرق وسطی کے حکمرانوں اور بالخصوص منگولوں کی ملازمت کر لی تھی۔ (13)

ترک زمانہ تک ہتھیاروں کی تجارت بہت بڑھ چکی تھی اس میں خام مال کی تجارت بھی شامل تھی۔ پوپ کلیمنٹ ہفتم نے 1527ء میں ایک مذہبی فرمان جاری کیا جس میں ان تمام لوگوں سے مذہب کے خارج کرنے کا اعلان کیا جو سارسین (عرب مسلمانوں) ترکوں اور عیسائیوں کے دیگر دشمنوں کو گھوڑے، ہتھیار، لوہا، فولادی تار، تانبہ، کانسی، قلمی شورہ، گندھک اور وہ تمام چیزیں جو توپ خانہ سازی کے کام آتی ہوں اور ایسے آلات، ہتھیار اور حربی سامان جو عیسائیوں کے خلاف جنگ میں کام آتا ہو، اس کے علاوہ رسی اور عمارتی لکڑی اور جہاز سازی کا دوسرا سامان اور ممنوعہ اشیاء فراہم کرتے ہوں۔ ایک سو سال بعد اسی قسم کا مذہبی فرمان پوپ اربن ہشتم نے جاری کیا جس میں ایک طویل فہرست دی گئی تھی۔ اس میں ان لوگوں کو بھی مذہب سے خارج کرنے کا اعلان کیا گیا تھا جو براہ راست یا بالواسطہ طور پر ترکوں اور عیسائی مذہب کے دوسرے دشمنوں کو سہولت یا معلومات پہنچاتے ہیں۔ (14)

صرف وینیکن ہی اس کاروبار سے فکرمند نہیں تھا بلکہ یورپی حکومتیں بھی شکایت کرتی رہتی تھیں کہ ان کی مخالف یورپی طاقتیں ترکوں کو جنگی سامان اور فوجی مہارت فراہم کرتی رہتی ہیں۔ سولہویں صدی کے آخر اور سترہویں صدی کے اوائل میں کیتھولک ملک پروٹسٹنٹ ملکوں بالخصوص انگلستان پر مسلسل الزام لگاتے رہتے تھے کہ وہ بہت سی اقسام کا جنگی سامان خاص طور سے ٹین فراہم کرتے رہتے ہیں۔ ''ترک خاص طور سے انگریزوں کے ساتھ اس لیے دوستی کے خواہاں ہیں کہ ان کے پاس ٹین ہے اور جو گزشتہ کئی سال سے وہاں بھیجا جا رہا ہے اور جو ان کے لیے بہت ہی قدر و قیمت کا حامل ہے کیونکہ اس کے بغیر وہ اپنی توپیں نہیں ڈھال سکتے۔ اس تجارت سے انگریز بہت فائدہ اٹھا رہے ہیں یعنی وہ شمالی افریقہ سے صرف اسی مال کی تجارت کر رہے ہیں۔'' ایک انگلستانی جہاز پکڑا گیا جو ترکی جانے والے مال سے لدا ہوا تھا۔ اس میں باریک اونی کپڑے کی دو سو گانٹھیں، بارود سے بھرے سات سو بڑے کنستر، ایک ہزار توڑے دار بندوقوں کی نالیاں، پانچ سو توڑے دار بندوقیں، دو سو تلوار کے پھل، سونے کے ڈلوں سے بھرا ایک کنستر، بیس ہزار طلائی سکے، بہت سے نقرئی سکے اور دوسری قیمتی اشیاء شامل تھیں۔ اس کے علاوہ کپڑے پر کشیدہ کی ہوئی ایک تحریر بھی ملی جو ترکی زبان میں تھی اور وہ سلطان کے احکام تھے۔'' (15)

لیکن مذہب سے خارج کرنے کے یہ فرمان اور دوسری دنیوی دھمکیاں ان لوگوں کے لیے بے کار ثابت ہوئیں جو اس منافع بخش کاروبار میں مصروف تھے۔ عیسائی طاقتوں کی طرف

سے عثمانی اور دوسری مسلم حکومتوں کے ساتھ ہتھیاروں اور جنگی سامان کی تجارت بتدریج بڑھتی رہی اور ایک وقت ایسا آیا جب اس نے ایک وسیع کاروبار کی حیثیت حاصل کر لی۔ غلاموں اور جنگی ساز وسامان کے علاوہ یورپ کے پاس ایسی کم ہی چیزیں تھیں جو مسلمان خریداروں کے لیے پرکشش ہوں۔ البتہ ایک اور چیز ایسی تھی جس کا ذکر مسلمانوں کی تحریروں میں بار بار آتا ہے اور وہ تھا انگلستان کا کپڑا۔ یہ کپڑا قرون وسطی میں مغربی دنیا میں پہلے ہی بہت مشہور تھا۔ دسویں صدی کا سیاح ابن یعقوب جزیرہ شاشیں (غالباً اینگلوسکین انگلستان) کے بارے میں لکھتا ہے:

''وہاں ایک قسم کا انتہائی خوبصورت اون ہوتا ہے جس کی مثال کسی اور سرزمین میں نہیں پائی جاتی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی عورتیں سور کی چربی سے اسے چکنا کرتی ہیں اس سے اس کی خوبی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کا رنگ سفید یا فیروزی ہوتا ہے اور انتہائی خوش نما ہوتا ہے۔'' (16)

اس کے بعد کا ایک مصنف جغرافیہ داں ابن سعید اس پر اضافہ کرتا ہے:

''باریک قرمزی کپڑا (اشکارلات) وہاں (انگلستان میں) بنتا ہے۔ اس جزیرے میں ان کے پاس ایسی بھیڑیں ہیں جن کا اون ریشم کی طرح نرم ہوتا ہے۔ وہ لوگ اپنی بھیڑوں کو بارش، دھویں اور گرد وغبار سے بچانے کے لیے ڈھانپے رکھتے ہیں۔'' (17)

ابن سعید کے اس بیان کو بعد میں آنے والے جغرافیہ دانوں نے بھی نقل کیا ہے۔ ایک حوالہ رشید الدین نے بھی دیا ہے۔ اس نے لکھا ہے:

''دونوں جزیروں (آئرلینڈ اور انگلستان) میں ان کے پاس ایسی مادہ بھیڑیں ہیں جن کے بالوں سے باریک اونی کپڑا اور قرمزی کپڑا (اشکارلات) بنتا ہے۔'' (18)

لفظ اشکارلات کہاں سے لیا گیا ہے؟ یہ پتہ نہیں چلتا۔ خیال ہے کہ عربی اور فارسی میں یہ لفظ مغرب کے لفظ Scarlet سے لیا گیا ہے۔ مغرب میں یہ لفظ مشرق سے نہیں آیا۔ اس پر خاصی بحث وتمحیص ہو چکی ہے کہ تیرہویں صدی میں یہ لفظ خاص رنگ کے لیے استعمال ہوتا تھا یا کسی قسم کے کپڑے کے لیے؟ قیاس یہی ہے کہ یہ کپڑے کے لیے استعمال ہوتا ہوگا۔ سکارلیٹ جو کچھ بھی تھا وہ تیرہویں صدی میں انگلستان کی ایک بڑی پیداوار یا مصنوعات تھی۔ اور اس کی

تجارت کا مشرقی ملکوں میں ذکر خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ اوپر جن ذرائع کا حوالہ دیا گیا ہے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ سکارلیٹ ایسی چیز تھی جو سنی سنائی باتوں تک ہی محدود تھی اور وہ یورپ کے دور افتادہ علاقوں میں پائی جاتی تھی۔ تاہم پندرھویں صدی تک عثمانی دستاویزوں میں واضح طور پر انگلستان کے کپڑے کا ذکر ملتا ہے جو سلطنت عثمانیہ میں درآمد کیا جاتا تھا۔(19)

اٹھارویں صدی کے آخر تک تجارت کا توازن مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ کے مسلم ملکوں کے خلاف اور مغربی ملکوں کے حق میں بہت زیادہ ہوگیا۔ قرون وسطیٰ کے آخر اور جدید ادوار کی ابتدا میں یورپ کی صنعتوں میں جو تبدیلی اور ترقی ہوئی اور تجارتی سرگرمیوں میں جو اضافہ ہوا اس نے اس عمل کو تیز کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ سمندری راستے کھلنے اور ان کی ترقی سے مشرق وسطیٰ کا راستہ بے معنی ہوگیا۔ اور اب ایران کے ریشم کی تجارت جو کبھی ترکی کے لیے خام مال کی فراہمی اور محصول کی آمدنی کے لیے نہایت اہم تھی یورپی تاجروں کے ہاتھ میں چلی گئی کیونکہ اب تجارت کا راستہ بدل گیا تھا۔ نئی دنیا میں یورپ کی نوآبادیاں قائم ہوگئیں' وہاں انہوں نے اپنے تجارتی مراکز بنا لیے اس طرح خود یورپ کے اندر صنعتوں کے لیے بھی گنجائش پیدا ہوئی جس سے یورپی تاجروں کے پاس ایسا مال وافر ہوگیا جو وہ مشرق وسطیٰ کے خریداروں کے ہاتھ فروخت کر سکتے تھے۔

مسلمانوں اور عیسائی دنیا کے درمیان اب صحیح معنی میں تجارت کا رخ بدل گیا تھا۔ پہلے جہاں یورپ مشرق وسطیٰ سے کپڑا درآمد کرتا تھا وہاں اب وہ بنا ہوا کپڑا وہاں فروخت کر رہا تھا اور خام مال درآمد کر رہا تھا۔ اس کی سب سے بڑی مثال کافی ہے۔ پہلے کافی اور اسے میٹھا کرنے والی شکر دونوں ہی مشرق وسطیٰ سے آتی تھیں۔ کافی جو بنیادی طور پر بحیرۂ احمر کے جنوبی خطے' غالباً ایتھوپیا سے آئی تھی' سولہویں صدی کے دوران میں بحیرۂ روم کے علاقوں میں لائی گئی اور پھر وہ سارے یورپ میں پھیلی۔ سترہویں صدی کے آخری ربع تک مشرق وسطیٰ سے یورپ کو برآمد کی جانے والی اشیاء میں کافی ایک نہایت اہم جنس تھی۔ لیکن اٹھارویں صدی کے دوسرے عشرے تک ولندیزی جاوا میں کافی کاشت کر رہے تھے اور یورپی منڈیوں کو بھیج رہے تھے اور فرانسیسی یہاں تک پہنچ گئے تھے کہ جزائر غرب الہند میں پیدا ہونے والی کافی ترکی کو برآمد کر رہے تھے۔ 1739ء تک غرب الہند کی کافی کا حوالہ مشرقی ترکی کے دور دراز مقام ارض روم میں بھی ملتا ہے۔ نوآبادیوں میں کاشت ہونے والی کافی بحیرۂ احمر کی کافی سے سستی تھی اس لیے بحیرۂ احمر کی کافی کی

مانگ بہت کم ہوگئی۔

شکر بھی بنیادی طور پر مشرق کی ہی ایجاد ہے۔ یورپ اسے مصر، شام اور شمالی افریقہ سے درآمد کرتا تھا اور عرب ہی اسے سسلی اور اسپین لے کر گئے تھے۔ وہاں سے وہ بحر اوقیانوس کے جزیروں تک اور پھر نئی دنیا پہنچی۔ یہاں بھی جزائر غرب الہند نے موقع فراہم کیا جس سے فائدہ اٹھایا گیا۔ 1671ء میں فرانسیسیوں نے شکر صاف کرنے کا ایک کارخانہ برسلز میں لگایا جہاں سے وہ ترکی کو شکر برآمد کرتے تھے۔ ترکوں نے جب اپنی کافی کو میٹھا کرنا شروع کیا تو شکر کی مانگ میں اچانک اضافہ ہوگیا۔ کافی کو میٹھا کرنے کی ضرورت شاید اس لیے پیش آئی تھی کہ غرب الہند کی کافی تلخ ہوتی تھی۔ اس سے پہلے وہ مصری کافی استعمال کرتے تھے۔ غرب الہند کی کافی سستی تھی اس لیے وہ مشرق وسطیٰ کی منڈیوں پر چھا گئی اٹھارویں صدی کے آخر تک حالت یہ ہوگئی کہ ترک یا عرب باشندہ کافی کی جو پیالی پیتا تھا اس کی کافی اور شکر دونوں ہی وسطی امریکہ میں کاشت کی ہوئی ہوتیں اور فرانسیسی یا انگریز تاجروں نے انہیں برآمد کیا ہوتا۔ صرف گرم پانی مقامی ہوتا۔

نئی تجارت میں ایک اور اہم جنس تمباکو تھی۔ اسلامی دنیا کے لیے یہ نئی چیز تھی اور تاجر اسے امریکی نوآبادیوں سے لائے تھے۔ مورخ پچوی 1635ء میں لکھتے ہوئے "تمباکو کے اس بدبودار اور سڑے ہوئے دھوئیں" کے بارے میں لکھتا ہے "فرنگی کافر اسے 1009ء ہجری (مطابق 1601 عیسوی) میں لائے اور رطوبت سے پیدا ہونے والی بعض بیماریوں کے علاج کے لیے اسے فروخت کیا۔" لیکن اس کا استعمال تیزی کے ساتھ علاج کے علاوہ بھی بڑھنے لگا۔ وہ لکھتا ہے "اسے عیش و عشرت کے متوالوں اور شہوت پرستوں نے قابو کرلیا اور بہت سے عظیم علماء اور صاحب اقتدار لوگ بھی اس کے چنگل میں آگئے۔" پچوی نے اس کی قبولیت کی وجہ بیان کرتے ہوئے وضاحت سے لکھا ہے "کافی خانوں کے لفنگوں کے نہ ختم ہونے والے دھوئیں سے کافی خانے نیلے دھوئیں سے ایسے بھرے رہتے ہیں کہ وہاں موجود لوگ ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہیں سکتے۔ عام مقامات پر بھی نشہ کرنے والے ہوا کو زہریلا کردیتے ہیں۔" "ان کے پائپ کبھی ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتے۔ ایک دوسرے کے چہروں پر اور آنکھوں میں دھواں چھوڑتے ہوئے یہ لوگ ساری سڑکوں اور بازاروں کو متعفن کردیتے ہیں۔" ایسی صورت حال اور اس کے برے اثرات کے باوجود "1045ء ہجری (مطابق 36-1635 عیسوی) کے آغاز تک یہ جنس سب جگہ پھیل چکی تھی اور اس کی اتنی شہرت ہوچکی تھی کہ اسے بیان کیا جاسکتا ہے نہ اس پر لکھا جاسکتا ہے۔" (20)

اٹھارویں صدی کے آخر تک مشرق وسطیٰ کی اقتصادی حالت یورپ کے مقابلے میں انتہائی خراب ہو چکی تھی چنانچہ اس نے آنے والی صدی میں غیروں کے فوجی اور سیاسی تسلط کا راستہ کھول دیا۔ لیکن مسلمان مصنفین کے ہاں اس کا بالکل احساس نظر نہیں آتا۔ مسلمان قاری یورپ کی ان کتابوں سے بالکل بے خبر رہے جو وہ معاشیات پر لکھ رہے تھے۔ اس موضوع پر یورپ کی ایک بھی کتاب کا عربی، فارسی یا ترکی میں ترجمہ نہیں کیا گیا۔ یہ کام کہیں انیسویں صدی کے آخر میں کیا گیا۔ اس وقت تک جو تھوڑی بہت تحریریں موجود تھیں وہ یورپ کے سیاسی اور فوجی امور سے متعلق تھیں۔ یورپ کی معیشت کے بارے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ لیکن شاید مراکشی سفیر ایک استثنا تھا جو 1690-91 میں میڈرڈ گیا تھا۔ امریکہ میں سپین کی کامیابیوں سے پیدا ہونے والے اثرات پر اس نے جو کچھ لکھا اس میں اس کی بصیرت اور ابن خلدون کے عمرانی فلسفے کی بازگشت سنائی دیتی ہے:

> غرب الہند میں بہت سے صوبے اور وسیع علاقے ابھی تک ہسپانیہ کے قبضے میں ہیں۔ اور ہر سال وہاں سے وہ جو کچھ لاتے ہیں اس سے وہ دولت مند ہو رہے ہیں۔ انڈین کی زمینوں پر قبضے اور ان کے استحصال سے بے پناہ دولت جو وہ وہاں سے حاصل کر رہے ہیں اس سے آج ہسپانوی قوم کے پاس سب سے زیادہ دولت ہے اور تمام عیسائیوں میں ان کی آمدنی سب سے زیادہ ہے۔ لیکن عیش و عشرت اور آرام و سکون ان پر غالب آ گیا ہے اور آپ شاذ و نادر ہی اس قوم کا کوئی آدمی دیکھیں گے جو تجارت میں مصروف ہو یا کاروبار کے لیے بیرون ملک سفر کرتا ہو۔ جس طرح دوسری قومیں جیسے ولندیزی، انگریز، فرانسیسی، جے نیویا والے یا ایسے دوسرے لوگ کر رہے ہیں۔ اسی طرح نچلے طبقوں میں تو دست کاریاں اور صنعت و حرفت ہے لیکن بڑے طبقے اسے حقیر سمجھتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو دوسری عیسائی اقوام سے برتر مانتے ہیں صنعت و حرفت سے وابستہ جو لوگ ہیں ان میں اکثریت فرانسیسیوں کی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اپنے ملک میں بہت کم اجرت ملتی ہے۔ یہ لوگ ہسپانیہ کی طرف بھاگتے ہیں کام اور دولت تلاش کرنے، تھوڑے ہی عرصے تک وہ خوب دولت کما لیتے ہیں۔ (21)

عثمانی سفیر واصف نے بھی جو (1788-1787) میں سپین میں سفیر رہا' امریکی سونے سے پیدا ہونے والے بعض اثرات پر تبصرہ کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے "ہر تین سال بعد پانچ چھ ہزار کے قریب ہسپانوی کان کن نئی دنیا کی کانوں میں کام کرنے کے لیے بھیجے جاتے ہیں۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ بیشتر کان کن وہاں کا موسم برداشت نہیں کر سکتے اور مر جاتے ہیں۔ سونا اور چاندی میڈرڈ کے ٹیکسال میں آتے ہیں لیکن آبادی بہت کم ہے اور زراعت کا برا حال ہے جس کی وجہ سے ہسپانوی باشندے مراکش سے غذائی اشیاء درآمد کرنے پر مجبور ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مراکش کے بادشاہ کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ بلا ڈھلے سونے اور چاندی کی بڑی مقدار میڈرڈ بھیجتا ہے۔ میڈرڈ میں اس کے بھیجے ہوئے سانچے کے مطابق سکے ڈھالے جاتے ہیں جن پر مراکش کے شاہ کا سکہ کندہ ہوتا ہے۔(22)

وزیر الغسانی معاشی امور پر اور بھی بہت کچھ کہتا ہے۔ محمد آفندی بھی اس پر تبصرہ کرتا ہے۔ اور ان کارخانوں سے بہت متاثر نظر آتا ہے جن میں وہ گیا۔ ان کارخانوں میں کپڑا اور شیشہ کا سامان بنتا تھا۔(23)

اٹھارویں صدی کے آخری برسوں میں رزمی اور عزمی جیسے سفارتی نمائندے ان ملکوں کی تجارت اور ان کی مصنوعات کا بار بار حوالہ دیتے ہیں جہاں وہ گئے۔ رزمی جو رومانیہ اور پولینڈ ہوتا ہوا 1777ء میں برلن پہنچا کئی باتیں بتاتا ہے۔ وہ لکھتا ہے "پولینڈ کے دارالحکومت میں پولش لوگوں کے علاوہ روسی اور یہودی اور دوسری دو قومیں بھی ہیں۔ اوّل الذکر زراعت اور دوسرے مشقت کے کام کرتی ہے اور یہودی شہروں کے اندر گندم اور دوسری اشیاء کا کاروبار کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ خرید و فروخت کا منافع بخش کاروبار بھی وہی کرتے ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ فائدہ پولش باشندوں کا ہی ہے جو طلائی دھاگوں سے بنے چوڑی آستینوں والے کوٹ پہنتے ہیں اور بھیڑوں کے بچے کی نرم کھال والی ٹوپی اوڑھتے ہیں۔" پروشیا میں وہ شکر اور کپڑے کے کارخانے دیکھتا ہے اور دیکھتا ہے کہ وہاں جو کارخانے ہیں ان کی مشینیں بھی برلن شہر میں بنائی گئی ہیں۔ رزمی لکھتا ہے کہ پروشیا کے لوگ چینی کے برتنوں کے بہت شوقین ہیں۔ یہ برتن پہلے چین اور ہندوستان سے درآمد کیے جاتے تھے لیکن پھر وہ خود ہی بنانے لگے۔ پہلے یہ برتن سیکسنی میں تیار ہوئے اور اب حال ہی میں برلن میں ہی بننے لگے ہیں۔(24) اس کا جانشین عزمی' جو 1790ء میں برلن گیا' اگرچہ فوجی اور سیاسی امور کے زیادہ دلچسپی لیتا تھا لیکن وہ پروشیا کی اس کامیاب کوشش کا ذکر کرتا

ہے جو اس نے کارخانے لگانے کے لیے کی اور جس کی وجہ سے ملک کو ترقی اور خوش حالی نصیب ہوئی۔(25)

عثمانی دور کی ادبی تخلیقات میں انیسویں صدی سے قبل یورپ کا حوالہ شاذ و نادر ہی ملتا ہے۔اس کی ایک مثال شاعر حشمت کے قصیدے میں ملتی ہے جو اس نے 1757ء میں سلطان مصطفےٰ ثالث کی تخت نشینی کے موقع پر لکھی تھی۔اس قصیدے میں وہ نئے سلطان کی تخت نشینی کی شان و شوکت بیان کرتا ہے اور شاعرانہ انداز میں ایک خواب بیان کرتا ہے کہ کرۂ ارض کے سارے بادشاہ عالم اسلام کے اس حکمراں کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور اپنی وفاداری کا یقین دلاتے ہیں۔خواب میں ایک ایک بادشاہ آتا ہے اور اپنی خواہش بیان کرتا ہے اور درخواست کرتا ہے کہ اسے وہ رتبہ دیا جائے جس کا وہ خواستگار ہے۔ہر بادشاہ اپنے ملک کی خصوصیت بیان کرتا ہے اور نئے سلطان کے دربار میں خدمات انجام دینے کی التجا کرتا ہے۔چین کا شہنشاہ شاہی محل کا خاصہ دار بننے کی درخواست کرتا ہے۔تاکہ وہ چینی کے برتنوں کی دیکھ بھال کر سکے۔امام یمن کافی بنانے کی ذمہ داری سنبھالنا چاہتا ہے۔اس کے بعد یورپ کے چھ حکمران آتے ہیں۔ان کی آمد کی ترتیب یہ ہے۔پہلے روس کا زار آتا ہے جو خیاطِ اعلیٰ بننے کا خواہش مند ہے کہ شاہی لباس وہ تیار کرے گا۔آسٹریا کا شہنشاہ شیشہ سازی میں مہارت کا دعویٰ کرتا ہے اور درخواست کرتا ہے کہ اسے شیشہ اور آئینہ سازوں کا افسر بنا دیا جائے۔جمہوریہ وینس کا حاکم اعلیٰ قیمتی دھاتوں سے متعلق اپنی ہنر مندی کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اسے اس شعبے کا افسر بنا دیا جائے۔انگلستان کا بادشاہ اپنے ملک میں بارود اور جنگی ساز و سامان کی پیداوار کا ذکر کرتا ہے اور درخواست کرتا ہے کہ اسے جنگی پیداوار کا نگراں مقرر کر دیا جائے۔ہالینڈ کا بادشاہ بڑے فخر سے اپنے ملک میں پیدا ہونے والے پھول ٹیولپ اور دوسرے پھولوں کا حوالہ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اسے باغبان بنا دیا جائے۔آخر میں فرانس کا بادشاہ آتا ہے جو اپنے ملک میں بننے والے لٹھے اور دوسرے کپڑے کا ذکر کرتا ہے اور التجا کرتا ہے کہ اسے شاہی لباسوں کی دیکھ بھال پر مامور کر دیا جائے۔اس کے علاوہ کسی دوسرے یورپی حکمران کا ذکر اس قصیدے میں نہیں کیا گیا ہے۔(26)

معیشت کی تاریخ کے طور پر حشمت کے خواب کی کوئی اہمیت نہیں ہے لیکن اس سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ یورپ کے ملکوں اور ان کی پیداوار اور مصنوعات کے بارے میں سلطنت عثمانیہ کا کیا تصور تھا۔

ابوطالب خاں جو اٹھارویں صدی کے آخر میں انگلستان گیا اپنی کتاب کا ایک باب ان کارخانوں کے لیے مختص کرتا ہے جو اس نے دیکھے۔ کارخانوں کی تعداد اور ان کے اعلیٰ معیار کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ انگلستان کی دولت اور عظمت کا یہی راز ہے۔ یہی سبب ہے کہ انگلستان نے اپنے اختیارات اور اپنا اقتدار دور دراز کے علاقوں تک پھیلا لیا ہے اور یہی سبب ہے کہ اس کے ہمسایے' فرانس کے لیے اپنی تمام طاقت اور عزم و ہمت کے باوجود اس کا مقابلہ کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔ ابوطالب نے کئی اقسام کی مشینوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ شروع کرتا ہے سادہ سی مشین سے جو مکئی کے دانے پیستی ہے اور آخر میں بڑی فولادی فاؤنڈریوں کی تفصیل بیان کرتا ہے جو سٹیم سے چلتی ہیں۔" وہ توپ سازی کا حوالہ دیتا ہے اور دھات کی چادروں اور سوئی کا ذکر کرتے ہوئے کپڑا بننے والی اسپنگ جینی کی تیزی اور مستعدی کی خوب تعریف کرتا ہے۔ اس کرگھے یا کھڈی کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ اس مشین کے ذریعہ زیادہ تیزی کے ساتھ بہت زیادہ کپڑا بننا ممکن ہو گیا ہے اور اس طرح زیادہ کام کرنے والوں کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ تاہم وہ ہندوستان کے کپڑے کے مقابلے میں انگلستان کے کپڑے کے معیار کو کمتر قرار دیتا ہے۔ ابوطالب شراب سازی' کاغذ سازی اور دوسرے کارخانوں میں گیا اور ہائیڈرالک پمپ سے بہت متاثر ہوا جس کے ذریعہ سے لندن کو پانی فراہم کیا جاتا تھا۔ اس نے اس سفر میں یہ بھی سنا تھا کہ باورچی خانہ میں استعمال کے لیے بھی مشین بن گئی ہے وہ لکھتا ہے۔ "اس سلطنت کے لوگ بہت ہی بے صبرے ہیں اور محنت مشقت سے جی چراتے ہیں اس لیے انہوں نے باورچی خانے میں استعمال کرنے کے لیے بھی مشین بنا لی ہے۔ یہ مشین مرغ بھونتی ہے' گوشت کا قیمہ بناتی ہے اور پیاز کاٹتی ہے۔ (27)

معلوم ہوتا ہے کہ ابوطالب انگلستان کے بہت سے کارخانوں میں گیا تھا۔ اس نے وہاں جو کچھ دیکھا اس سے بہت متاثر ہوا۔ اپنے ابتدائی جملوں میں وہ اس ملک کی فوجی اور اقتصادی طاقت کا بار بار ذکر کرتا ہے۔ فنی و معاشی ترقی کا سیاسی اور فوجی طاقت کے ساتھ جو تعلق ہے اس پر زیادہ وضاحت کے ساتھ کچھ عرصے بعد آنے والے عثمانی سیاح خالد آفندی نے لکھا۔ خالد آفندی 1803ء سے 1806ء تک پیرس میں ترک سفیر رہا۔ وہ فرانسیسیوں اور دوسرے یورپی ملکوں کو پسند نہیں کرتا تھا اور ان کی تقلید کرنے کے سخت خلاف تھا۔ اس کے نزدیک ایک اس کا علاج آسان تھا۔

اللہ کے فضل و کرم سے میری رائے یہ ہے کہ اگر ہنگامی تدابیر اختیار کی جائیں اور ہر تین یا چار سال بعد پچیس ہزار اشرفیوں کی تھیلیاں مختص کر دی جائیں' پانچ کارخانے نسوار کے' کاغذ کے' شیشے کے' کپڑے کے اور برتنوں کے قائم کر دیئے جائیں۔ اس کے علاوہ زبانوں اور جغرافیہ کے مکتب کھول دیئے جائیں تو صرف پانچ سال میں ان کے لیے کچھ نہیں رہ جائے گا کیونکہ ان کی اصل تجارت انہی پانچ اشیاء میں ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے آقاؤں کو ہمت نصیب کرے۔ آمین (28)

خالد نے تعلیمی ترقی کی جو بات کی ہے اس کا احساس اٹھارویں صدی کے مصلحین کو بھی تھا۔ اس نے یورپ کی طاقت کا ایک سبب صنعتی پیداوار کو قرار دیا ہے۔ خواہ اس نے کتنی ہی سادہ لوحی سے یہ بات کی لیکن اس نے مشرق وسطی کے لوگوں کے سامنے ایک مسئلہ پیش کر دیا تھا۔ چنانچہ انیسویں صدی میں ترکی' مصر اور ایران وغیرہ کے اصلاح پسند حکمرانوں کے لیے اس مسئلے نے خاص اہمیت اختیار کر لی تھی اور وہ سائنس اور صنعت کو ایسی طلسمی چھڑی سمجھنے لگے تھے جس سے پراسرار مغرب کے بے بہا خزانے حاصل کیے جا سکتے تھے۔

حکومت اور عدل وانصاف

ایک مسلمان کے لیے صرف وہ ملت ہی پوری دنیا کا مرکز تھی جس کا وہ خود فرد تھا کیونکہ اللہ وحدہٗ لاشریک کی حقانیت اور خدا کی شریعت کا علم بردار وہی تھا۔ اس اسلامی دنیا میں صرف ایک ریاست تھی اور وہ تھی خلافت۔ اور ایک ہی حاکم اعلیٰ تھا' وہ تھا خلیفہ' جو اسلامی امہ کا جائز سربراہ اور اسلامی نظام حکومت کا مقتدر اعلیٰ تھا۔

پہلی صدی یا اس سے کچھ زیادہ عرصے تک یہ تصور واقعی حقیقت پر مبنی تھا۔ بلاشبہ اسلامی برادری ایک وحدت تھی اور ان کی سیاست بھی متحد تھی۔ اس کی ترقی و توسیع کسی رکاوٹ کے بغیر نہایت تیزی کے ساتھ عمل میں آئی۔ اس زمانے کے لوگوں کو یقیناً صاف نظر آتا ہوگا کہ یہ تیز رفتار ترقی اور اس کے ساتھ فتوحات اور اسلام قبول کرنے والوں کی بڑھتی ہوئی تعداد بہت جلد سارے بنی نوع انسان کو اسلام کے آغوش میں لے آئے گی۔

آٹھویں صدی میں مسلمان عرب اپنے عروج کو پہنچ گئے لیکن پھر بتدریج یہ حقیقت عیاں ہونا شروع ہوئی کہ مسلم مملکت اور عقیدے کی پیش قدمی میں وقفہ اور تعطل آ گیا ہے۔ کونسٹنٹی نوپل (بعد میں قسطنطنیہ) پر قبضہ کرنے کا عظیم منصوبہ ملتوی کر دیا گیا۔ اسے کئی صدی بعد عثمانی ترکوں نے اس وقت دوبارہ زندہ کیا جب مسلم فتوحات کی ایک نئی لہر آئی لیکن اس کے ساتھ ہی وسطی یورپ میں یہ پیش قدمی رک گئی۔

ایک ایسی عالمی اسلامی امہ کا تصور تو قائم رہا جس میں ساری ہی نوع انسانی شامل ہوگی لیکن اس تصور کو حقیقت کا رنگ دینے کا کام مشکل ہوگیا۔ بعض اوقات اسلامی سلطنت کے اندر ہی ایسی خود مختار مملکتیں وجود میں آئیں جو محض علامتی طور پر ہی خلیفہ کی بالادستی تسلیم کرتی تھیں۔ رفتہ رفتہ متقابل خلافتیں قائم ہوگئیں اور 1258ء میں منگولوں کے ہاتھوں بغداد میں خلافت کی تباہی

کے بعد نظری طور پر مسلمانوں کے سیاسی اتحاد کا خاتمہ ہوگیا۔ پھر بھی ایک واحد اسلامی سربراہ کا نصب العین مسلمانوں کے دل ودماغ پر چھایا رہا۔ اس کا اظہار خلافت کا دور ختم ہونے کے بعد مسلمان بادشاہوں کو مذہبی تقدس عطا کرنے کی صورت میں ہوتا رہا۔ قرون وسطیٰ سے انیسویں صدی تک سرزمین اسلام میں سب سے زیادہ خاص بات یہ نظر آتی ہے کہ اس میں کوئی مقامی اور مسلمہ علاقائی یا قومی وحدت باقی نہیں تھی۔ حتیٰ کہ ایسا کوئی شاہی مرتبہ یا منصب بھی نہیں تھا جیسے یورپ میں ابتدا ہی سے موجود تھا جیسے شاہ فرانس، شاہ انگلستان، شاہ ڈنمارک یا اور اسی طرح کے قومی بادشاہ۔

مسلم مشرق وسطیٰ میں ایسا کوئی منصب نہیں تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرون وسطیٰ کی اقلیموں میں مسلسل ردوبدل ہوتا رہتا تھا اور وہاں استحکام نہیں تھا۔ اس زمانے میں ایسا نہیں تھا کہ ایک ہی علاقے میں ایک حکمران کے بعد اس کا جانشین حکومت کرے۔ منگول حملے کے بعد اگرچہ مسلمان حکومتیں نسبتاً زیادہ مستحکم اور مضبوط ہوگئی تھیں اس کے باوجود پے در پے حکمرانوں کی تبدیلی ایک مستقل مسئلہ بنی رہی۔ 1500 تک مشرق وسطیٰ میں صرف تین ایسی سلطنتیں تھیں جنہیں کوئی اہمیت حاصل تھی۔ ایک ترکی، دوسری ایران اور تیسری مصر۔ پھر مصر اور اس کی باج گزار مملکتوں پر ترک قبضے کے بعد دو ہی سلطنتیں باقی رہ گئیں۔ لیکن ان کے لیے اصطلاح وہی استعمال ہوتی تھی۔ یعنی سلطان ترکی، شاہ ایران اور سلطان مصر۔ یہ اصطلاح یا لقب وہ خود استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ ان کے مدمقابل یا بیرون ملک کے لوگ استعمال کرتے تھے۔ ان کے نزدیک کسی علاقے کے حکمران کی حیثیت سے پہچانا جانا توہین کے مترادف تھا۔ یعنی اس طرح وہ ایک علاقے تک محدود ہوجاتے تھے۔ چنانچہ مصر، ایران یا ترکی کے حکمران جب خود اپنا حوالہ دیتے تھے تو وہ سلطان اسلام یا امت مسلمہ کے بادشاہ یا سرزمین اسلام کے شہنشاہ کہتے تھے ترکی، ایران یا مصر کے بادشاہ نہیں۔

دوسرے معاملات کی طرح اس معاملے میں بھی عام رجحان یہ تھا کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کو وہ اپنے جیسا ہی سمجھتے تھے۔ وہ دوسروں میں بھی اپنا ہی عکس دیکھنا چاہتے تھے۔ چونکہ دارالاسلام کو ایک وحدت مانا جاتا تھا اس لیے یہ قدرتی بات تھی کہ دارالحرب کو بھی ایک وحدت ہی تصور کیا جائے۔ اسلامی سرزمین سے باہر کافروں کے اندر قوموں یا علاقوں کی تقسیم ان کے لیے دلچسپی کا باعث نہیں تھی اور نہ ان کے لیے اس کی کوئی اہمیت رکھتی تھی۔

ایک طرف مورخین کی توجہ صرف ملت اسلامیہ اور ان کے حکمرانوں تک ہی محدود تھی تو

دوسری طرف ان کے اپنے حکمراں ان کافروں اور وحشیوں کے ساتھ کسی نہ کسی قسم کے معاملات طے کرنے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ اس مقصد کے لیے وہ ان کے بارے میں معلومات بھی جمع کرر ہے تھے۔

کافروں کے نظام حکومت اوران کی سیاست کی تفہیم کے سلسلے میں سب سے پہلا مسئلہ یہ تھا کہ مختلف حکمرانوں کی شناخت قائم کی جائے۔ اس سے چند اور دلچسپ مسائل پیدا ہو گئے۔ ابتدائی مسلم روایات میں جب اس زمانے کا ذکر کیا جاتا تھا۔ جب اسلام ابھی جزیرہ نما عرب تک ہی محدود تھا تو تین بادشاہوں کا نام لیا جاتا تھا جو اردگرد کے علاقوں پر قابض تھے۔ یہ تین بادشاہ تھے کسریٰ' قیصر اور نجاشی۔ ان میں سے کسی کا نام بھی قرآن میں نہیں آیا صرف قرآن کی تفسیر وتشریح کرتے وقت ان کے نام لکھے گئے۔ یہ تمام باہر کے نام ہیں جو غالباً آرامی زبان سے عربی میں آئے تھے۔ کسریٰ خسرو سے' قیصر سیزر سے اور نجاشی ایتھوپیا کے نیگس سے نکلا تھا۔ مسلمان ان ناموں کو ان ملکوں کے بادشاہوں کے ذاتی نام سمجھتے تھے حالانکہ وہ اس زمانے میں ان تین نہایت اہم ملکوں پر حکمرانی کرنے والوں کے لقب تھے۔ آنحضرت ﷺ کی ایک حدیث بیان کی جاتی ہے کہ "اگر کسریٰ ختم ہو جاتا ہے تو اس کے بعد کوئی کسریٰ نہیں آئے گا۔ اور اگر قیصر مر جاتا ہے تو اس کے بعد کوئی قیصر نہیں آئے گا۔ قسم اس کی جس کے ہاتھ میں میری روح ہے' تم ان کے خزانے اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے۔" (1)

یقیناً کسریٰ ختم ہوا اور بے شک اس کے بعد کوئی دوسرا کسریٰ نہیں آیا۔ ساسانی سلطنت پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا اور اسے دارالسلام میں شامل کر لیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی زرتشتی شہنشاہوں کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ ایتھوپیا (حبشہ) کی سلطنت باقی رہی لیکن وہ چاروں طرف سے گھری رہی اور اس کی بہت کم اہمیت باقی رہ گئی۔ صرف مشرقی رومن سلطنت مسلمانوں کے ہمسایہ کے طور پر برقرار رہی۔ تاہم مسلمانوں نے بازنطینی شہنشاہوں کے لیے قیصر کا لقب کبھی استعمال نہیں کیا۔ بعض اوقات انہیں اہانت آمیز الفاظ سے یاد کیا جاتا تھا۔ ان کے لیے ایک لفظ جو عام طور پر بولا جاتا تھا وہ تھا "طاغیہ" جس کا مطلب تھا ظالم اور آمر بعد میں یہ لفظ یورپ کے بادشاہوں کے لیے بھی استعمال ہوا۔ لیکن یہ زیادہ تر شمالی افریقہ کے مصنفین نے استعمال کیا۔ ایک اور طرز تخاطب جو تھا وہ خلیفہ ہارون الرشید کے مشہور مکتوب سے واضح ہو جاتا ہے۔ یہ مکتوب خلیفہ نے بازنطین کے شہنشاہ نکے فورس کو بھیجا تھا۔ مکتوب اس طرح شروع ہوتا ہے۔ "من ہارون

الرشید امیر المومنین الیٰ نکے فورس کلب روم سلام علیک'' یعنی امیر المومنین ہارون الرشید کی جانب سے نکے فورس روم کے کتے کے نام۔(2)

تاہم بازنطین اور دیگر عیسائی حکمرانوں کے لیے جو عام اصطلاح مروج تھی وہ ''ملک'' یعنی بادشاہ تھی۔ عربی لفظ ''ملک'' قرآنی حوالے سے اور عبرانی کے لفظ ''ملکھ'' کے اس حوالے سے بھی جو عہد نامہ عتیق میں آیا ہے، بہت ہی منفی مفہوم رکھتا تھا اور جب اسے کسی انسانی حکمران کے لیے استعمال کیا جاتا تھا تو اس سے دنیوی اور غیر مذہبی حکمران مراد لیے جاتے تھے۔ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں مسلم سرزمین کے اندر یہ لفظ اس وقت بولا جاتا تھا جب کسی کی مذمت کرنا مقصود ہوتی تھی اور یہ جتانا ہوتا تھا کہ وہ مامور من اللہ خلیفہ کے مقابلے میں صرف دنیوی حکمران ہی ہے۔ یہ تو جب ایرانی روایات اسلامی سیاست کا حصہ بنیں تو شہنشاہیت کا تصور پیدا ہوا اور یہ اصطلاح عزت کے ساتھ استعمال کی گئی۔ پھر بھی اس کا منفی پہلو کسی نہ کسی حد تک برقرار رہا۔ اس کا اندازہ اس بات سے بھی ہو جاتا ہے کہ عیسائی حکمرانوں کو ملوک الکفار یا ''ملوک الکفر'' کہا جاتا تھا۔

بعض حکمرانوں کے لیے تو ملک یا بادشاہ کی اصطلاح بھی ان کے لیے بہت زیادہ عزت افزائی سمجھی جاتی تھی۔ صلیبی عساکر نے مسلمانوں سے جو علاقے چھینے تھے اور وہاں چھوٹی چھوٹی مملکتیں قائم کر لی تھیں انہیں جائز حکومت تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔ سفارتی آداب کی ایک مصری کتاب میں قبرص اور آرمینیا کے حکمرانوں کو مخاطب کرنے کے لیے جو لقب دیا گیا ہے وہ ملک بھی نہیں ہے بلکہ متملک ہے۔ عربی میں جس کا مطلب ہے وہ شخص جو بادشاہ نہیں ہے لیکن بادشاہ ہونے کا ڈھونگ رچاتا ہے۔ ویسے ملک کا لفظ کسی امتیاز کے بغیر فرنگی شہزادوں، افریقہ اور ہندوستان کے قبائلی سرداروں، بازنطینی اور چینی شہنشاہوں اور یورپ کے بادشاہوں سب کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

ملک کے علاوہ صاحب یا عظیم کا لفظ بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ مکتوبات میں جو دعائیہ کلمات لکھے جاتے تھے ان کا طریقہ بھی مختلف تھا۔ اگر ایک مسلمان حکمران دوسرے مسلمان حکمران کو لکھتا تو السلام علیکم لکھتا۔ لیکن جب کسی غیر مسلم کو لکھتا تو اس طرح لکھتا ''سلامتی ہو ان پر جو راہ راست پر ہیں۔'' چنانچہ مراکش کا سفیر جب سپین کے بادشاہ کے سامنے پیش ہوا تو اس نے اسی انداز سے بادشاہ کو مخاطب کیا۔ وہ لکھتا ہے کہ ''ہسپانوی طاغیہ اس پر بہت حیران ہوا لیکن مجبوراً

خاموش رہا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ میں اور کسی طرح اسے مخاطب نہیں کروں گا۔" (3) اس سے صدیوں پہلے شہزادہ جم کے سوانح نگار نے لکھا تھا کہ شہزادے نے پوپ کے ہاتھ پاؤں یا گھٹنے کا بوسہ دینے سے انکار کر دیا۔ اس نے مشرقی تہذیب کے مطابق پوپ کے کاندھے پر بوسہ دیا تھا۔"

ابتدائی صدیوں میں غیر مسلم حکمرانوں کے ساتھ جو سفارتی خط و کتابت ہوتی تھی اس کی دستاویزیں موجود نہیں ہیں تاہم اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ جنگ چھڑنے سے ذرا پہلے ہارون الرشید نے جس طرح "کلب روم" کہہ کر بازنطینی شہنشاہ کو مخاطب کیا تھا وہ عام رواج نہیں تھا بلکہ وہ ایک استثناء تھا جس کی ایک ہی مثال ملتی ہے۔ اس سلسلے میں قرون وسطیٰ کی جو بہترین معلومات ملتی ہیں وہ مصری ذرائع سے ہیں۔ جہاں سب سے پہلے نویں صدی میں بازنطینی شہنشاہ کو لکھے جانے والے مکتوبوں کا سراغ ملتا ہے۔ (4) اس کے بعد مصر کے سرکاری کاغذات سے اور ان دستاویزوں سے ان کا پتہ چلتا ہے جو بیشتر یورپ کے محافظ خانوں میں محفوظ ہیں۔

لیکن مکمل معلومات اس عثمانی دور سے پہلے نہیں ملتیں جب پہلی بار صرف روزنامچے ہی نہیں مکمل دستاویزیں بھی تیار کی گئیں۔ ان روزنامچوں سے پتہ چلتا ہے کہ عثمانیوں کو صحیح یورپی القاب استعمال کرنے کی فکر ہی نہیں تھی۔ چنانچہ سلطان سلمان ذیشان کا مورخ کمال پاشازادہ ممتاز یورپی شہنشاہوں کو ترکی کے لقب "بے" سے مخاطب کرتا ہے۔ جیسے بے فرانس، بے المان۔ سلطنت عثمانیہ میں بے کا لقب صوبائی حاکموں کو دیا جاتا تھا۔ اسی طرح یورپی سلطنتوں کو ولایت کہا جاتا تھا۔ عثمانی سلطنت میں ولایت مملکت کے چھوٹے حصوں کو کہا جاتا تھا۔

عثمانی مکتوبات میں عام طور پر یورپی حکمرانوں کو قرل بھی کہا جاتا تھا اور اسلامی تہذیب اور روایات برقرار رکھتے ہوئے ان کے وہ القاب بھی استعمال کر لیے جاتے تھے جن سے وہ خود اپنے آپ کو مخاطب کرتے تھے۔ انگلستان کی ملکہ ایلزبتھ اوّل کو جو مکتوب لکھا گیا وہ اس طرح شروع ہوتا ہے۔ "سلامتی ہو حضرت عیسیٰ کی امت پر، عیسائی امہ کی معزز خواتین کی سربراہ پر، نصرانی فرقہ کے معاملات کی ثالث پر، جو تقدس اور شان و شوکت کے جلو میں رہتی ہیں اور جو سرزمین انگلستان کی ملکہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی عاقبت بخیر کرے۔" (5) یورپ کے عیسائی حکمرانوں کو جو مکتوب لکھے جاتے تھے ان میں القاب و آداب لکھنے کا یہی طریقہ رائج تھا۔ اس میں مذہب کا ذکر خاص طور پر کیا جاتا تھا۔ ملکہ ایلزبتھ اوّل کو جو مکتوب لکھا گیا ہے اس میں تین بار ان کے عیسائی تشخص کو اجاگر کیا گیا ہے اس کے بعد کہیں جا کر انگلستان کا ذکر آتا ہے۔ "ملکہ عیسائی حکمرانوں

میں سے ایک ہیں۔ عیسائیوں کی وسیع وحدت میں وہ ولایت انگلستان کی حکمران ہیں۔'' جس طرح مکتوب میں اسے دعا دی گئی ہے اس سے یہ امید ظاہر کرنا مقصود ہے کہ مرنے سے پہلے وہ مسلمان ہو جائے گی اور اسے دائمی شادمانی نصیب ہو جائے گی۔

ملکہ ایلزبتھ اوّل کے زمانے میں ترکی میں انگلستان کو بہت کم لوگ جانتے تھے اور اس کے حکمراں کے بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا۔ وسطی یورپ کے متعلق وہ زیادہ جانتے تھے جہاں ویانا کے شہنشاہ اور بعد میں پروشیا کے بادشاہ کو بھی اسی لقب سے مخاطب کیا جاتا تھا لیکن اس سے پہلے ان کے صحیح خطاب بھی شامل کیے جاتے تھے۔

کافی عرصے عثمانی دربار نے عیسائی حکمرانوں کو بادشاہ سے زیادہ کوئی اور لقب دینے سے احتراز کیا۔ مراکش کے سلطان تو دوسرے مسلم حکمرانوں حتیٰ کہ غیر مسلم حکمرانوں کو بھی سلطان کے لقب سے مخاطب کر لیتے تھے لیکن عثمانی کسی اور کو یہ لقب دینے کو تیار نہیں تھے۔ دوسرے مسلم اور غیر مسلم حکمرانوں کو وہ کم تر القاب سے یاد کرتے تھے۔ حتیٰ کہ مقدس رومن شہنشاہ کو بھی عام طور سے اسی طرح بادشاہ کہہ کر مخاطب کیا جاتا تھا۔ اس کا ایک مقصد اس کی تحقیر کرنا بھی تھا۔ پہلا یورپی شہنشاہ جسے کسی حد تک باوقار انداز میں مخاطب کیا گیا وہ فرانس کا فرانسس اوّل تھا جسے ترکی اور فرانس کے درمیان معاہدہ میں پادشاہ کہا گیا۔ حالانکہ پادشاہ ترکی کے سلطان صرف اپنے لیے ہی استعمال کرتے تھے۔ اگلی صدی ہی میں کہیں جا کر آسٹریا، روس اور دوسرے یورپی حکمرانوں کو زیادہ باوقار القاب سے مخاطب کیا گیا۔ اب عام رواج یہ ہو گیا کہ ان کے اپنے القاب ہی استعمال کیے جاتے۔ آسٹریا کے حکمرانوں کو اب ''کاسر'' کہا جاتا تھا جو قیصر کی ہی ایک شکل تھی۔ روس کا بادشاہ زار تھا۔

روسیوں نے القاب و آداب کے اس جھگڑے کو اپنی عزت کا سوال بنا لیا۔ اور انہوں نے 1774ء میں ہونے والے کچک کناریہ کے معاہدہ میں اسے خاص طور پر شامل کرایا۔ روس نے شکست خوردہ ترکی کو مجبور کیا کہ وہ معاہدہ کی دفعہ 13 میں یہ الفاظ شامل کرے۔ ''دربار عالیہ وعدہ کرتا ہے کہ آئندہ تمام اقوال و افعال میں ملکہ روس کا مقدس لقب ترکی زبان میں اس طرح ادا کیا جائے گا۔'' تمامین روسی لیرین بادشاہ۔'' اس میں ترکی کے خاص الفاظ کی شمولیت خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ایک معاصر روسی یادداشت میں معاہدہ کے اس نکتہ کا خصوصیت سے ذکر کیا گیا ہے اور اسے معاشی، فوجی اور سیاسی طور پر حاصل ہونے والے فوائد میں شمار کیا گیا ہے۔ عثمانی یہ الفاظ

شامل کرنا ہرگز نہیں چاہتے تھے۔ یہ ان کے لیے سرکاری وسفارتی آداب سے کہیں زیادہ اہم بات تھی۔ عثمانی مسلمانوں کی عزت و وقار کے لیے یہ بہت بڑا صدمہ تھا۔ اس کا اندازہ ایک ترک سپاہی کی رپورٹ سے لگایا جا سکتا ہے جو 1719ء میں ترک سفیر ابراہیم پاشا کے ساتھ ویانا گیا تھا۔ رپورٹ لکھنے والا کوئی سفارتی نمائندہ یا سرکاری افسر نہیں ہے بلکہ محض ایک سپاہی ہے۔ وہ اپنے بے لاگ انداز میں آسٹریا کے شہنشاہ کو قیصر کہتا ہے جو ترکی رسم الخط میں لکھا گیا ہے۔ اس کی وضاحت وہ یوں کرتا ہے کہ جرمن زبان میں اس کا مطلب ہے پادشاہ' پھر بادشاہ کی مماثلت سے بچانے کے لیے وہ اسے تشبیہ کہتا ہے۔ (6)

ترکوں کو اپنے اسلامی حاکموں اور یورپ کے کمتر حاکموں کے درمیان امتیاز پیدا کرنے کی جو فکر رہتی تھی وہ مکتوبات کے انداز تحریر اور ان کے عنوان سے ظاہر ہو جاتی ہے۔ سلطان مراد ثالث 1583ء میں ملکہ ایلزبتھ کو لکھتا ہے "ہمارا دربار عالیہ ان لوگوں پر اپنا لطف و کرم اور اپنی سخاوت ذا واں کرنے کے لیے کھلا ہے جو وفاداری کا اظہار کریں۔ ہمارے دل جو محبت و مسرت سے منور ہیں ہمیشہ ان لوگوں کے لیے کشادہ ہیں جو وفاداری کا دم بھرتے ہیں۔ آپ کے سفارتی نمائندے...... دوسرے بادشاہوں کے سفارتی نمائندوں کی طرح...... جو ہمارے عظیم الشان محراب اور بلند مرتبہ آستانہ کے ساتھ اپنی عقیدت اور وفاداری کا اظہار کرتے ہیں ان کا خیال رکھا جائے گا اور ان کی حفاظت کی جائے گی۔ اس لیے آپ اپنی جانب سے ہمیشہ دربار عالیہ کی وفادار اور دوست رہیں...... عقیدت اور وفاداری کے راستے پر ثابت قدم رہیں اور دوستی اور وفاداری کی شاہراہ پر گامزن رہیں۔ (7) خط و کتابت بھی اسی قسم کا انداز اور لہجہ اختیار کرنے کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ اس قسم کے تعلقات سے وہ یہ توقع رکھتے تھے کہ یورپ ہمیشہ ان کا تابع فرمان رہے گا۔

اس لیے اس بات پر حیرت نہیں ہونا چاہیے کہ مسلم سفارتی نمائندے اپنی توجہ صرف حکمرانوں تک مرکوز رکھتے تھے۔ ان سے کم کسی شخصیت کو اپنی توجہ کے قابل نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا ذکر خاص طور پر اس وقت کیا جاتا تھا جب ان کے ساتھ ملاقات ہوتی تھی۔ غسانی وراثت میں ملنے والے مغربی خطاب والقاب کے عجیب وغریب طریقہ کار پر حیرت کا اظہار کرتا ہے۔ یہ القاب وراثت میں عورتوں کو بھی ملتے تھے اور سپین میں انہیں حاصل کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جاتی تھی۔ اگر کسی کا خاندانی حق نہیں ہوتا تھا تو شادی کر کے یہ اعزاز حاصل کیا جاتا تھا۔ (8) محمد آفندی اپنے قارئین کو فرانس کے نظام حکومت کے بارے میں بتاتا ہے:

"ان کے ہاں متعدد وزیر ہوتے ہیں جو منسٹر کہلاتے ہیں اور ان کا مرتبہ مارشل اور ڈیوک سے کم ہوتا ہے۔ ہر ایک کے پاس کسی خاص کام کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ کوئی بھی دوسرے کے کام میں دخل نہیں دیتا اور ہر ایک اس کام میں خود مختار ہوتا ہے جو اسے سونپا گیا ہے۔ مذکورہ بالا (آرچ بشپ آف کیمبری) خارجہ امور کا نگراں ہے اور اسے تمام معاملات طے کرنے کا اختیار ہے۔ جیسے جنگ اور امن کی تیاری، تمام تجارتی امور کی دیکھ بھال، دوسرے ملکوں سے آنے والے سفارتی نمائندوں سے بات چیت اور آستانہ لطف وکرم (استنبول) کے لیے فرانسیسی سفیروں کا تقرر اور برطرفی۔" (9)

اٹھارویں صدی کے آخر تک مسلمان سفیر اور یورپ جانے والے دیگر مسلمان وہاں کی حکومت کی اصل ہئیت ترکیبی پر بالکل توجہ نہیں دیتے تھے۔ اور اعلیٰ مراتب سے نیچے کسی عہدیدار سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ لیکن آخر انہوں نے اس طرف بھی توجہ کی۔ ان لوگوں میں جنہوں نے اس کام کا آغاز کیا سب سے دلچسپ شخص عزی آفندی ہے جو 1790ء سے 1972ء تک برلن میں عثمانی سفیر رہا۔ اس زمانے کے دوسرے سیاحوں اور مصنفوں کی طرح یورپ کے بارے میں اس کے رویہ میں بھی واضح تبدیلی نظر آتی ہے۔ اب یہ لوگ یورپی باشندوں کو محض جاہل کافر نہیں سمجھتے تھے کہ ان کا ذکر ان کی عجیب وغریب حرکتوں کی وجہ سے ہی کیا جائے۔ اب انہیں طاقتور اور ترقی کرنے والا مدمقابل تسلیم کیا جارہا تھا۔ ایسا مدمقابل جس کا جائزہ لینا ضروری ہے تاکہ اس سے اپنا تحفظ کیا جاسکے اور اگر ہوسکے تو اس کی نقل بھی کی جاسکے۔ عزی کی رپورٹ اس کے سفر اور روزمرہ کی سرگرمیوں کے احوال سے شروع ہوتی ہے لیکن اس رپورٹ کا دوسرا حصہ زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں وہ پروشیا کی سلطنت پر مختلف عنوانوں کے ساتھ روشنی ڈالتا ہے۔ جیسے حکومت کا نظم ونسق، ملک کے باشندے، اعلیٰ حکام، خزانہ کی صورت حال، آبادی، غذائی اجناس کے سرکاری بھنڈار، فوج، اسلحہ وگولہ بارود اور توپ خانہ، عزمی آفندی حکومت پروشیا کے انتظام سے بہت ہی متاثر ہے خاص طور سے سرکاری انتظامیہ کی مستعدی احکام کی اہلیت، غیر سند یافتہ اور غیر ضروری حکام کی عدم موجودگی۔ تنخواہوں اور ترقیوں کے نظام سے وہ بہت ہی مرعوب ہوا۔ وہ صنعتیں لگانے اور سلطنت کے تحفظ اور استحکام کی خاطر داخلی امن وامان قائم کرنے کے سلسلے میں حکومت کی کوششوں کو سراہتا ہے۔ وہ خاص طور پر مالیاتی نظم وضبط کی بہت ہی تعریف کرتا ہے۔ اس نے

پروشیا کی فوج کی تربیت کے انتظام کی اتنی تعریف کی کہ عثمانی حکام نے بھی اپنی افواج کی بہتر تنظیم پر اصرار کرنا شروع کر دیا۔ عزمی نے وہاں جو کچھ دیکھا اور سیکھا اس کی بنیاد پر اس نے درج ذیل سفارشات پیش کیں۔

1- عثمانی قلمرو میں ظلم وزیادتی اور بدانتظامی کا سبب بدعنوانی ہے اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ضروری ہے۔

2- ریاستی ڈھانچے میں کاٹ چھانٹ کی جائے اور صرف اہل اور لائق لوگ ہی رکھے جائیں۔

3- ہر ملازم کو اس کے کام کی نوعیت کے اعتبار سے تنخواہ دی جائے اور اسے تنخواہ کی ضمانت دی جائے۔

4- جب تک کوئی ملازم ایسا جرم نہ کرے جس سے نظم ونسق اور سلطنت کے نظام کو نقصان پہنچتا ہو اس وقت تک اسے برطرف نہ کیا جائے۔

5- نااہل افراد کو کسی ایسی جگہ متعین نہ کیا جائے جس کے لیے وہ موزوں نہ ہو۔

6- مسلح افواج' خاص طور سے توپ خانے اور بحریہ کی اس طرح تربیت کی جائے اور اسے اس طرح تیار رکھا جائے کہ وہ سردی گرمی دونوں موسموں میں ہر قسم کی ہنگامی صورتحال کا مقابلہ کر سکے۔ اگر ایسا کر لیا جائے تو عثمانی سلطنت کے حلیف طاقت و توانائی میں بڑھ جائیں گے اور حریف شکست کھائیں گے۔ اس طرح مملکت عثمانیہ کے دشمنوں پر قابو پانا ممکن ہوگا۔ (10)

مغربی یورپ کے متعلق مسلمان لکھنے والے وقتاً فوقتاً وہاں بادشاہوں کے انتخاب میں عام انسانی طریقہ کار سے انحراف کرنے پر بھی اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک انحراف ملکہ کی حکومت ہے۔ ایسے معاشرے میں جہاں بادشاہ کئی کئی بیویاں رکھتے ہوں اور ان کے ساتھ بہت سی کنیزیں بھی ہوں وہاں عورت کی حکمرانی کا خیال آنا ہی مشکل تھا۔ ہاں' وہاں چند ایسی غیر معمولی صلاحیتوں والی خواتین ضرور ملتی ہیں جنہوں نے اس ماحول میں بھی اعلیٰ ترین اختیارات حاصل کیے۔ لیکن ان کی حکومت کا عرصہ بہت مختصر رہا۔ تاہم اسلامی دنیا کے لیے دوسرے ملکوں میں ملکہ کی حکومت کوئی نئی بات بھی نہیں تھی۔ انہوں نے ہمسایہ ملک بازنطین میں شہزادیوں کی حکومتیں دیکھی تھیں اور وہ جانشینی کے اصولوں سے بھی واقف تھے۔ قریب قریب اسی زمانے کا ایک مورخ بازنطین کے بارے

میں لکھتے ہوئے ملکہ آئرین کا ذکر کرتا ہے جس نے 797 سے 822 تک حکومت کی' اور کہتا ہے ''رومنوں پر ایک ملکہ نے اس لیے حکومت کی کہ شاہی خاندان میں صرف وہی زندہ تھی۔'' (11)

ایک مسلمان مورخ 906 میں اٹلی کے لومبارڈ بادشاہ کی جانب سے متعین خاتون سفیر برتھانیت لوتھر کی بغداد آمد کا ذکر کرتا ہے لیکن اس کے یا اس کے ملک کے بارے میں کچھ نہیں بتاتا۔ قلقشندی نے اپنی کتاب میں جن بادشاہوں کا ذکر کیا ہے ان میں ایک خاتون حکمران کا تذکرہ بھی ہے جس نے نیپلز پر حکومت کی۔ ایک قدیم ماخذ کے حوالہ دیتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ اس کا نام جوانا تھا اور 773 ہجری (1371 عیسوی) کے آخر میں اسے ایک مکتوب بھیجا گیا تھا جس میں یہ القاب استعمال کیے گئے تھے۔ ''علیہ مقام' عزت مآب' لائق احترام' ذات متبرک' عالی شاہ' جلیلۃ القدر' اپنے مذہب کی عالم' اپنی سلطنت میں عادلہ' نصرانی مذہب کی عظیم ہستی' عیسائی امت کی مددگار' سرحدوں کی محافظ اور بادشاہوں اور سلطانوں کی دوست۔'' قلقشندی آگے کہتا ہے ''اگر اس کی سلطنت میں اس کی جگہ کوئی اور لیتا ہے تو زیادہ مناسب ہوگا کہ ان القاب سے اسے مردانہ صیغہ کے ساتھ مخاطب کیا جائے گا۔ اس کے لیے ملکہ سے بھی زیادہ معزز القاب استعمال کیے جائیں گے کیونکہ مرد کو عورتوں پر برتری حاصل ہے۔ (12)

عثمانیوں کو انگلستان کی ملکہ ایلزبتھ سے آسٹریا کی ماریہ ٹیریسا تک تمام ملکاؤں کے بارے میں علم تھا۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ یورپ جانے والے مسلمان' عیسائی معاشرہ میں عورت کو اعلیٰ مرتبہ دینے کے خلاف تو تبصرے کرتے تھے لیکن ایسا لگتا ہے کہ ان ملکوں پر حکمرانی کرنے والی خواتین کے بارے میں وہ زیادہ فکرمند نہیں تھے۔

بہت سے مسلمان مصنفین نے پوپ کے دنیوی اختیارات پر تبصرہ کیا ہے۔ ان میں سے ایک مصنف ایرانی مورخ رشید الدین نے تو اپنی تاریخ عالم میں جو چودھویں صدی کے اوائل میں لکھی گئی تھی' پوپ' شہنشاہ اور دوسرے عیسائی بادشاہوں کے درمیان موجود تعلقات پر بھی بحث کی ہے۔

> فرانس کے حکمرانوں کے منصبی درجات اس طرح ہیں اول درجہ باب (پوپ) کا ہے۔ جس کا مطلب ہے باپوں کا باپ۔ وہ اسے حضرت عیسیٰ کا خلیفہ مانتے ہیں۔ اس کے بعد شہنشاہ کا درجہ آتا ہے جسے فرنگیوں کی زبان میں ''آمپیرو'' کہا جاتا ہے: جس کا مطلب ہے مسلمانوں کا سلطان۔ اس کے بعد ''ردا فرانس''

آتا ہے جس کا مطلب ہے بادشاہوں کا بادشاہ:۔ شہنشاہ تاحین حیات شہنشاہ رہتا ہے۔ وہ لوگ پاکباز اور لائق افراد میں سے اس کا انتخاب کرتے ہیں اور اسے تاج پہناتے ہیں۔ ردا فرانس وراثت کی بنیاد پر حکمرانی کرتا ہے اور یہ حکومت باپ سے بیٹے کو ملتی ہے۔ آج کل وہ بہت ہی طاقتور اور محترم مانا جاتا ہے۔ اس کے زیر نگیں بارہ حاکم ہیں اور ہر حاکم کے ماتحت تین بادشاہ ہیں۔ اس کے بعد "رے" آتا ہے جس کا مطلب بادشاہ یا آقا ہے۔

پوپ کا منصب بہت بلند اور عظیم ہے۔ جب بھی وہ نیا شہنشاہ مقرر کرنا چاہتے ہیں تو ان کے تین عظیم آدمی جن کا یہی کام ہے جمع ہوتے ہیں اور باہم صلاح مشورہ کرتے ہیں۔ یہ ہوتے ہیں تین مارکی تین بڑے شہزادے اور ایک حاکم۔ وہ فرانس کے تمام معززین کے ناموں پر غور کرتے ہیں اور ان میں سے دس افراد کا انتخاب کرتے ہیں اور پھر پورے غور و خوض کے بعد ان دس افراد میں سے ایک شخص منتخب کرتے ہیں جو اپنی قوت عمل، لیاقت اور پاکبازی کے لیے مشہور ہوتا ہے اور اپنے اندر ایمان، مذہبی تقدیس، اصابت رائے، وقار، نیک چلنی، خاندانی وجاہت اور روحانی استقلال رکھتا ہے۔ المانیہ میں جسے فرنگی دنیا کا ایک تہائی مانا جاتا ہے وہ اس کے سر پر تاج رکھتے ہیں۔ وہاں سے وہ سرزمین لومبارڈیا جاتے ہیں۔ اور اس کے سر پر فولادی تاج رکھتے ہیں۔ پھر وہ وہاں سے رومتہ الکبریٰ جاتے ہیں جو پوپ کا شہر ہے اور پوپ اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر طلائی تاج اٹھاتا ہے اور اس کے سر پر رکھتا ہے۔ پھر وہ بادشاہ گھٹنوں کے بل بیٹھتا ہے اور رکابیں پکڑتا ہے تاکہ پوپ اپنا پاؤں اس کے سر اور گردن پر رکھے اور اس کے اوپر چڑھ کر گھوڑے پر سوار ہو جائے۔ اس کے ساتھ ہی اسے شہنشاہ کا خطاب دیا جاتا ہے۔ اور فرنگیوں کے حکمران اس کے تابع فرمان بن جاتے ہیں اور اس کا اقتدار اقلیم فرنگ کی زمینوں اور سمندروں تک پھیل جاتا ہے۔(13)

رشید الدین کی معلومات کافی حد تک درست ہیں اور ظاہر ہوتا ہے کہ وہ معلومات پوپ کے ذرائع سے حاصل کی گئی ہیں۔ وہ اپنے زمانے تک کے تمام پاپائے روم کی تاریخ بھی بیان کرتا

ہے۔

عورتوں اور پادریوں کی حکمرانی سے بھی زیادہ یورپ میں تیسری قسم کی جس حکمرانی نے مسلمانوں کو حیرت زدہ کیا اس کا ذکر وہ اپنی کتابوں میں بار بار کرتے ہیں۔ قرون وسطی کے مسلمانوں کے لیے جمہوریت کا تصور بالکل ہی اجنبی تھا۔ یونان کی سیاسی تحریروں پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ لفظ عربی شکل میں نمودار ہوا۔ یہ یونانی اصطلاح یا لاطینی **Respubtica** یعنی نظام حکومت یا فلاح عامہ کی اصطلاح کو عربی اصطلاح ''مدینہ'' میں تبدیل کیا گیا۔ افلاطون نے ''جمہوری نظام حکومت'' کی جو زمرہ بندی کی ہے وہ عربی متن میں ''مدینہ جماعیہ'' بن گیا۔ حالانکہ سنی فقہا کے مطابق اسلامی امہ میں بھی خلافت موروثی عہدہ نہیں ہے بلکہ اس کا انتخاب ہوتا تھا اور وہ بھی قوانین شریعت سے ماورا نہیں تھا۔

تاہم چالیس سال اور چار خلفاء کے بعد دنیا کے بیشتر ملکوں کی طرح اسلام میں بھی کم و بیش ملوکیت ہی آ گئی تھی۔ یونانی فلسفیوں سے جمہوری نظام حکومت کا جو تصور لیا گیا اس کا دائرہ اثر فلسفہ کے مطالعہ کرنے والوں اور فلسفہ لکھنے والوں سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ اس کا ثبوت اس حقیقت سے بھی ملتا ہے کہ بعد میں جب یورپی جمہوری نظام حکومت کی تعریف متعین کرنے کے لیے نئی اصطلاح کی ضرورت پیش آئی تو وہ اصطلاح فلسفیانہ تخلیقات کے علم کے بغیر ہی وضع کر لی گئی۔

ظاہر ہے جمہوری نظام حکومت کا ابلاغ ذرا مشکل تھا۔ اس کا ابتدائی حوالہ عمری کی تحریر میں ملتا ہے جو 1340 کے قریب لکھی گئی:

> وینس والوں کا کوئی بادشاہ نہیں ہے بلکہ ان کا نظام حکومت اجتماعی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ لوگ اتفاق رائے سے ایک آدمی کو حکومت چلانے کے لیے مقرر کرتے ہیں۔ وینس والے (بنادقہ) فنسین کہلاتے ہیں۔ ان کا نشان انسانی چہرہ ہے۔ جس کے متعلق ان کا عقیدہ ہے کہ وہ مارک کا چہرہ ہے جو حضرت عیسیٰ کے حواریوں میں سے ایک ہے۔ جو شخص ان پر حکومت کرتا ہے وہ ان میں سے ممتاز خاندان میں سے ایک خاندان سے ہوتا ہے......

عمری اس کے بعد نسان، تسان، اینکونی تان اور فلورنیشن کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ان سب کا نظام حکومت ایسا ہی ہے۔ پھر وہ جے نیوا کے بارے میں زیادہ تفصیل پیش کرتا ہے۔ اس کو یہ معلومات فراہم کرنے والا اسی ملک کا باشندہ ہے۔

جے نیوا کے باشندوں کا طرز حکومت پنچایت ہے۔ ان کا کوئی بادشاہ نہیں تھا اور نہ ہوگا۔ زمانہ حال میں ان پر حکومت کرنے والے دو خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک خاندان ہے دوریاہ۔ میر مخبر بالبن بھی اسی خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرا ہے اسپنولا۔ بالبن نے یہ بھی بتایا کہ ان دونوں خاندانوں کے علاوہ جے نیوا میں گیری بالڈی' ملونو' دی ماری' ساں تورتورے اور فیسیچی خاندان بھی ہیں۔ ان خاندانوں کے ارکان ہر بادشاہ کے مشیر ہوتے ہیں۔ (14)

قلقشندی تثقیف کی پیروی کرتے ہوئے دو اطالوی جمہوریتوں جے نیوا اور وینس کے ساتھ خط و کتابت کے آداب بیان کرتا ہے۔

جے نیوا کے حکمرانوں کے لیے طرز تخاطب۔ یہ مختلف مراتب کے لوگوں کا ایک گروہ ہے' جیسے پودیستا' کپتان اور معززین (شیوخ) تثقیف کے مطابق انہیں چار ورقی کتاب پر مکتوب تحریر کیا جائے اور اس کا انداز تحریر اس طرح ہونا چاہیے۔ ''یہ مکتوب بنام فضیلت مآب عالی شان' والا تبار' عزت مآب' محترم و مکرم' پودیستا اور کپتان فلاں فلاں کے اور بنام معززین (شیوخ) کے لیے ہے جو جے نیوا کی کمیون' کے لیے مشاورت اور انصاف کے امین ہیں۔ عیسائی امہ کے اعلیٰ مرتبت' نصرانی مذہب کے معززین اور بادشاہوں اور سلطانوں کے دوست ہیں اللہ تعالیٰ انہیں صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور ان کی کوششوں کو کامیابی کی سعادت نصیب کرے اور انہیں ہدایت سے سرفراز فرمائے۔''

تثقیف میں مزید لکھا ہے:

767 ہجری (1365-1366 عیسوی) میں پودیستا اور کپتان کے لیے یہ طرز تخاطب ترک کر دیا گیا کیونکہ وہ خود ہی ختم ہو چکے تھے اس کے بعد ڈوجے (جے نیوا اور وینس کا منصف اعلیٰ) کے نام مکتوب لکھے جانے لگے کیونکہ ان کی جگہ ڈوجے (Doge) نے لے لی تھی۔

وینس کے متعلق قلقشندی لکھتا ہے:

وینس کے حکمران کے لیے طرز تخاطب کے بارے میں صاحب تثقیف لکھتا

ہے۔ 767 میں جب مکتوب کا جواب بھیجا گیا تو طرز تخاطب کا مسلمہ طریقہ اختیار کیا گیا۔ اس وقت اس کا نام مارکوکونارو تھا۔ ہم نے فضیلت مآب' والا تبار' محترم و مکرم' بہادر' عالی مرتبت والا شان مارکوکونارو صلیبی فرقہ کی سربرآوردہ ہستی وینس اور ڈالمشیا کے ڈوجے بپتسمہ کے فرزندوں کے مذہب کے علمبردار' بادشاہوں اور سلطانوں کے دوست کا مکتوب وصول پایا۔

کئی مثالیں دینے کے بعد قلقشندی مزید لکھتا ہے:

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دوجے بادشاہ سے مختلف ہستی ہے۔ پہلی اور دوسری مثال میں طرز تخاطب ایک ہی ہے لیکن تیسری مثال میں وہ پہلے دو سے کمتر ہے۔ اگر دوجے ہی بادشاہ ہے تو پھر طرز تخاطب کا فرق بعض دوسرے حالات کی وجہ سے ہے یا پھر لکھنے والے کی غرض مختلف ہے۔ یا پھر مکتوب الیہ کے بارے میں علم کی کمی اس کا سبب ہے جیسے کام کی زیادتی یا عجلت کی وجہ سے ایسا ہو جاتا ہے۔ (15)

ادھر مشرق میں مزید آگے جا کر رشید الدین بھی اٹلی کی جمہوریت کے متعلق سنتا ہے۔ وہ لکھتا ہے "ان شہروں میں کوئی موروثی بادشاہ نہیں ہے۔ معززین اور اعلیٰ مرتبت لوگ ایک پاکباز آدمی کو منتخب کر لیتے ہیں اور اسے ایک سال کے لیے اپنا حکمران بنا لیتے ہیں۔ سال ختم ہونے کے بعد منادی کرنے والا اعلان کرتا ہے "اس سال اگر کسی شخص کے ساتھ بے انصافی ہوئی ہے تو وہ شکایت درج کرائے۔" تمام وہ لوگ جن کے ساتھ بے انصافی ہوئی ہے وہ سامنے آتے ہیں اور اسے معاف کرتے ہیں۔ پھر ایک اور شخص کو بلاتے ہیں اور وہ ان پر حکمرانی کرتا ہے۔ اس ملک سے باہر (جے نیوا کے اردگرد) ایک اور ملک ہے جس کا نام بلونا ہے۔ اس کا دارالحکومت وینس کہلاتا ہے اس کی اکثر عمارتیں سمندر میں سے اوپر اٹھائی گئی ہیں۔ حکمران کے پاس بھی تین سو بادبانی جہاز ہیں وہاں بھی کوئی بادشاہ طاقت کے بل پر یا موروثی طور پر نہیں بنایا گیا۔ شہر کے سوداگر ایک پاکباز آدمی کو اتفاق رائے سے منتخب کرتے ہیں اور اسے اپنا حکمران بناتے ہیں۔ اور جب وہ مر جاتا ہے تو دوسرے کو منتخب کرتے ہیں۔" (16)

لیکن عثمانی دور کے آتے آتے جمہوری ادارے زیادہ معروف ہو گئے تھے اور ان کے بارے میں معلومات بھی زیادہ ہو گئی تھیں۔ سلطنت عثمانیہ نے دالمیشیا کے ساحل پر جمہوریہ راگوسا' وینس' جے نیوا اور دیگر اطالوی ریاستوں کے ساتھ وسیع سفارتی تعلقات قائم کر لیے تھے۔ بعد میں

ریاست ہائے متحدہ ہالینڈ سے بھی روابط ہو گئے تھے۔ البتہ طرز تخاطب ابھی تک ذاتی ہی تھا۔ جمہوریہ راگوسا کے حکمراں کا لقب ریکٹر تھا لیکن عثمانی دستاویزوں میں اسے سلاوی لفظ کنیز (Knez) سے مخاطب کیا گیا ہے۔ جیسے بنام کنیز اور راگوسا کے سورما'' یا'' بنام کنیز اور سوداگر ان راگوسا'' اسی طرح وینس جو مکتوب بھیجے جاتے تھے ان میں جمہوریہ کے بجائے دوجے اور سینوریا ہی لکھا جاتا تھا۔

کاتب چلپی نے 1655ء میں جو رسالہ لکھا اس میں وینس کی امراء شاہی اور ہالینڈ اور کرامویل کے انگلستان کی جمہوریت کا فرق واضح کیا گیا ہے حتیٰ کہ انتخابی طریقہ کار پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

وہ لکھتا ہے کہ نظام حکومت کے مطابق یورپ کی ریاستیں تین مسلکوں یا تین مذاہب میں منقسم ہیں۔ ہر مذہب کے بانی نہایت محترم حکیم فرزانہ ہیں۔ یہ تین مکاتب فکر ہیں۔ مورنا کیا جس کا بانی افلاطون ہے۔ ارسطو کراتیا جس کا بانی ارسطو ہے اور دیموکراتیا جس کا بانی ڈیموکریٹس ہے۔ مونارکی کا مطلب ہے کہ سب لوگ ایک دانش منداور منصف حکمران کی تابع داری کرتے ہیں۔ یورپ کے بیشتر حکمران اس نظام پر عمل کرتے ہیں۔ ارسطو کراتیا میں حکومت کا نظم ونسق امراء کے ہاتھ میں ہوتا ہے جو اکثر امور میں آزاد ہوتے ہیں لیکن اپنے آپ میں سے کسی ایک شخص کو اپنا سربراہ بنالیتے ہیں۔ وینس کی مملکت اس نظام پر قائم ہے۔ تیسری قسم دیموکراتیا میں نظام حکومت رعایا کے ہاتھ میں ہوتا ہے جو اس طرح اپنے آپ کو جبر واستبداد سے محفوظ رکھتے ہیں۔ وہ ہر گاؤں میں انتخاب کر کے ایک یا دو ایسے آدمی چن لیتے ہیں جنہیں وہ دانش منداور لائق سمجھتے ہیں اور انہیں مرکزی حکومت میں بھیج دیتے ہیں جہاں وہ ایک مجلس بناتے ہیں اور اپنے آپ میں سے ایک قائد منتخب کرتے ہیں۔ یہ وہ نظام ہے جس پر ہالینڈ اور انگلستان بھی عمل کرتے ہیں۔

کاتب چلپی منتخب مجلس کو دیوان کہتا ہے۔ وہ وینس کے مختلف دیوانوں کی تفصیل بیان کرتا ہے حتیٰ کہ رائے دہندگی کے طریقہ کار کی وضاحت بھی کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دیوان کے ہر رکن کے ہاتھ میں دو گیندیں ہوتی ہیں ایک سفید اور ایک سیاہ۔ وہ بالوتا'' کہلاتی ہیں۔ دیوان میں بحث وتمحیص کے بعد جو لوگ وہاں بیٹھے ہوتے ہیں وہ اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ سیاہ یا سفید گیند گرا دیتے ہیں۔ (17)

اٹھارویں صدی کے اوائل کا ایک مصنف یورپ کے امور پر لکھتے ہوئے ری پبلک یا

''جمہور'' کی اصطلاح کی تشریح کرتا ہے۔ یہ اصطلاح وینس' ہالینڈ اور دوسری جمہوریتوں میں استعمال ہوتی تھی۔ وہ کہتا ہے''ان ریاستوں میں کوئی ایک حکمران نہیں ہے بلکہ ممتاز افراد کے اتفاق رائے سے تمام امور طے کیے جاتے ہیں۔ یہ افراد آبادی کی مرضی سے منتخب کیے جاتے ہیں۔'' یہی مصنف سوئٹزرلینڈ کو''متحدہ جمہوریہ'' کہتا ہے جہاں ہر کنٹون الگ جمہوریہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہی اصطلاح ہالینڈ کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے لیکن معمولی فرق کے ساتھ کہ وہاں ممتاز افراد ہی فیصلہ کرتے ہیں لیکن اس کے نفاذ کی ذمہ داری ایک آدمی کے سپرد کر دی جاتی ہے۔ پولینڈ کے بارے میں وہ لکھتا ہے کہ وہاں بادشاہت بھی ہے اور جمہوریت بھی۔ اور وہ کسی حد تک صحیح کہتا ہے۔

اٹھارویں صدی تک عثمانی مسافروں نے آزاد شہر جیسے عجیب و غریب اداروں پر بھی توجہ دینا شروع کر دی تھی۔ محمد آفندی پیرس جاتے ہوئے تولوس اور بورویو سے گزرتا ہے تو انہیں آزاد (سربست) شہر قرار دیتا ہے۔''ایسے شہر کی قلعہ بندی مقامی فوج کرتی ہے اور وہاں کا نظام ایک''پارلیمنٹ'' چلاتی ہے جس کا سربراہ''پریذیڈنٹ'' ہوتا ہے۔ یہ دونوں الفاظ اس نے فرانسیسی تلفظ میں لکھے ہیں لیکن رسم الخط عربی ہے [illegible] مصنف بندرگاہ ڈینزگ کو بھی سربست یا آزاد کہتا ہے جو شاہی اقتدار اور محصولات سے آزاد ہے۔ اٹھارویں صدی کا ایک اور مصنف مقدس سلطنت روم کی ہیئت ترکیبی کی وضاحت کرتے ہوئے سلطنت کے اندر سوابیا جیسی وحدتوں کو بھی آزاد حتیٰ کہ جمہوریہ قرار دیتا ہے۔ (20) ہنگری جانے والے چند عثمانی یہاں تک کہتے ہیں کہ ہنگری کے لوگ اپنی پرانی آزادی چھن جانے کا ماتم کرتے ہیں۔

انقلابِ فرانس کے بعد جمہوری اداروں کا تصور ایک نئے مرحلے میں داخل ہوا جب سلطنت عثمانیہ کو صرف فرانس کی نئی جمہوریہ کے ساتھ ہی نہیں بلکہ دوسری جمہوریتوں کے ساتھ بھی معاملات کرنا پڑے۔ ان میں سے چند ترکی کی سرحدوں پر تھیں اور وہ فرانسیسی نمونہ پر قائم کی گئی تھیں۔ چونکہ فرانس کے ساتھ ترکی کی جنگ ہو رہی تھی اس لیے ترکی میں فرانسیسی خیالات کی آمد قریب قریب بند تھی۔ تاہم جس آسانی اور جس تیزی کے ساتھ فرانس کی تیس ہزار فوج نے مصر پر قبضہ کیا اور جس طرح تین سال سے زائد عرصے وہاں حکومت کی اس کے بہت گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ مصر میں فرانس نے جس رواداری اور عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کی اس نے بھی بہت اچھا تاثر پیدا کیا۔ مصری مورخ جبرتی نے دوسری باتوں کے علاوہ ان کا بھی خصوصیت

سے تذکرہ کیا ہے۔ فرانسیسی حکمرانوں کے طرزِ عمل نے مصری علماء پر جو اثر کیا جبرتی نے اسے اپنی تحریر میں محفوظ کیا ہے۔

1802ء کے صلح نامہ کے تحت فرانس نے مصر اور آیونیا کے جزیرے خالی کر دیئے اور نیا عثمانی سفیر خالد آفندی پیرس بھیجا گیا جہاں وہ 1806ء تک موجود رہا۔ اس کا تبصرہ خاصہ معنی خیز ہے:

> چونکہ فرانسیسیوں کا کوئی بادشاہ نہیں ہے اس لیے ان کی کوئی حکومت بھی نہیں ہے۔ علاوہ ازیں حکومت کا جو تعطل پیدا ہوا ہے اس کے نتیجے میں بیشتر اعلیٰ منصب اوباش لوگوں نے سنبھال لیے ہیں۔ اگرچہ چند معززین ابھی موجود ہیں لیکن اصل اقتدار ابھی تک اجڈ اور گنوار لوگوں کے ہاتھ میں ہی ہے۔ اس لیے وہ ایک جمہوریہ بھی نہیں سنبھال سکتے۔ چونکہ وہ انقلابیوں کے یا سادہ ترکی زبان میں، کتوں کے غول کے سوا اور کچھ نہیں ہیں، اس لیے ان لوگوں سے وفاداری اور دوستی کی توقع بھی ممکن نہیں۔ نپولین پاگل کتا ہے جو تمام ملکوں کو اسی بدنظمی کا شکار کرنا چاہتا ہے جس سے اس کی اپنی ملعون قوم دوچار ہے۔ تالی رینڈ بگڑا ہوا پادری ہے۔ اور باقی سب غنڈے بدمعاش ہیں۔ (21)

29- مئی 1807ء کو عظیم اصلاح پسند سلطان سلیم ثالث کو تخت سے اتار دیا گیا اور رجعت پسند قوتوں کی فتح کا جشن اس طرح منایا گیا کہ اصلاح کے حامیوں کا قتل عام کیا گیا۔ ان واقعات کے چند سال بعد ایک شاہی مورخ احمد عاصم آفندی نے 1808ء 1791ء کے حالات پر ایک رسالہ تحریر کیا جس میں تحریک اصلاح پر بالعموم اور فرانسیسی اثرات پر بالخصوص روشنی ڈالی گئی ہے۔ عاصم اصلاحات کا حامی ہے اور اس امید کا اظہار کرتا ہے کہ ان اصلاحات سے سلطنت کی روبہ زوال فوجی طاقت بحال ہو جائے گی اور وہ دشمن کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائے گی۔ روس کی مثال دیتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ وہ مغربی سائنس اور فنون اختیار کرنے کے بعد اپنی کمزوری اور پسماندگی کی دلدل سے باہر نکلا اور عظیم طاقت بن گیا ہے۔ لیکن مغربی طریقہ کار قبول کرنے کی حمایت کرنے کے باوجود عاصم عیسائیوں کے ویسے ہی خلاف ہے اور تمام عیسائی طاقتوں کو اسلام کا دشمن مانتا ہے۔ اس کی رائے میں ان طاقتوں کے ساتھ سمجھوتہ کرنے سے برائیاں ہی جنم لیں گی۔ وہ خاص طور سے فرانس کے سخت خلاف ہے اور فرانس کے حامی ترکوں کی شدید مذمت کرتا ہے اور

انہیں احمق قرار دیتا ہے۔ فرانس کے داخلی حالات کے بارے میں وہ کچھ نہیں لکھتا اور یہی اس کا منفی رویہ ہے' وہ لکھتا ہے "فرانسیسی جمہوریہ آگ میں لکڑی کے چٹخنے کی آواز اور پیٹ میں اٹھنے والے درد کی گڑ گڑ ہے۔ اس کے اصولوں میں مذہب سے انکار اور امیر و غرب کی برابری شامل ہے۔" (22)

مسلمان مبصروں کے لیے سب سے زیادہ ناقابل فہم مغربی ادارہ منتخب نمائندوں کی اسمبلی تھی۔ کاتب چلبی نمائندہ اور جمہوری اداروں کے بارے میں چند باتیں ضرور لکھتا ہے لیکن اس کی معلومات سرسری ہیں۔ یورپ پر اس کا مقالہ زیادہ مشہور نہیں ہے۔ دوسرے عثمانی مصنفین نے بھی اس موضوع پر کم ہی لکھا ہے۔ اٹلی' فرانس' ہالینڈ اور دوسرے ملکوں کے جو حوالے ملتے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان اس سے دلچسپی نہیں تھی اور وہ ان کے بارے میں زیادہ جانتے بھی نہیں تھے۔

جمہوری اداروں کی تشریح کرنے کی پہلی کوشش ابوطالب خان نے کی ہے جو اٹھارویں صدی کے آخر میں انگلستان گیا۔ اس نے بھی انگلستان کے سیاسی نظام پر ایک طویل اور ہمدردانہ تبصرہ کرتے ہوئے صرف عمال حکومت اور ان کے فرائض پر زیادہ تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ دارالعوام کے بارے میں اس نے صرف دو مختصر سے حوالے دیئے ہیں حالانکہ وہ اپنے انگریز دوست کے ساتھ دارالعوام گیا تھا۔

دارالعوام کے متعلق لکھتے ہوئے پہلے تو وہ وہاں تقریر کرنے والوں کا مذاق اڑاتا ہے۔ انہیں سن کر اسے ہندوستان کے طوطے یاد آجاتے ہیں۔ لیکن بعد میں وہ لکھتا ہے کہ یہ ایوان تین مقاصد پورے کرتا ہے۔ محصولات جمع کرنے میں سہولت فراہم کرنا' ٹھیکیداروں کو غلطی کرنے سے روکنا اور عام معاملات میں بادشاہ نیز وزیر کی نگرانی کرنا۔" (23) ایک دوسری جگہ ابوطالب خاں مختصراً دارالعوام کے ارکان' ان کے انتخاب کے طریقے اور ان کے فرائض پر تبصرہ کرتا ہے۔ اسے اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ یہ ارکان غلط کام کرنے والوں کو سزا دینے کے لیے قانون سازی کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ بیان کرتا ہے کہ چونکہ مسلمانوں کی طرح ان کے پاس خدا کی طرف سے نازل کیے ہوئے قوانین نہیں ہیں اس لیے وہ وقت اور حالات کے مطابق اور منصفوں کے تجربات کی روشنی میں اپنے قانون بناتے ہیں۔ (24)

قانون سازی کے متعلق پارلیمنٹ کے فرائض کا ذکر کر کے ابوطالب خاں اسلام اور

عیسائی دنیا کے درمیان بنیادی فرق ظاہر کرتا ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک انسان کو قانون بنانے کا حق نہیں ہے۔ اللہ کو ہی قانون سازی زیب دیتی ہے جس نے اپنی شریعت وحی کے ذریعہ نافذ کی ہے۔ اللہ کی شریعت انسانی زندگی کے ہر پہلو پر محیط ہے۔ کسی دنیوی طاقت کو خدا کی شریعت منسوخ کرنے یا اس میں ترمیم کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ ان کا فرض اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ شریعت نافذ کریں۔ انسان کو صرف تفسیر و تشریح کرنے کی اجازت ہے لیکن یہ تشریح بھی مفسرین اور علماء ہی کرسکتے ہیں۔ اصولی طور پر تو یہ سب باتیں تسلیم کی جاتی تھیں لیکن عملاً صورت حال مختلف تھی۔ بہت سے امور میں شریعت کا پاس نہیں کیا جاتا تھا یا پھر اس کی تشریح و تفسیر اپنی سہولت کے مطابق کی جاتی تھی۔ جوں جوں حالات تبدیل ہوتے رہے شرعی قوانین بھی بدلتے رہے۔ یہ تبدیلی حکمرانوں کے احکام سے بھی عمل میں آتی رہی۔ تاہم ایسا صرف عملاً ہی ہوتا تھا اصولی طور پر یہی مانا جاتا تھا کہ حاکمیت خدا کی ہی ہے' انسان صرف اس کے قوانین کی تشریح کرسکتا ہے یا انہیں نافذ کرسکتا ہے۔

شروع شروع میں مسلمان جب عیسائیوں کے مذہبی عقائد کا حوالہ دیتے تھے تو ان کے بارے میں بھی ایسا ہی سمجھتے تھے۔ حتیٰ کہ "عیسائی شریعت" بھی کہا کرتے تھے۔ یعنی ان کی نظر میں عیسائیوں کی شریعت بھی مسلمانوں جیسی ہی تھی۔ لیکن آہستہ آہستہ انہیں علم ہوا کہ عیسائی دنیا کا تصور قانون سازی مختلف ہے اور عدل و انصاف کے نفاذ کے طریقے میں بھی فرق ہے۔

چنانچہ ابتدائی دور میں یورپ کے نظام عدل کے بارے میں مسلمانوں کا رویہ معاندانہ اور اہانت آمیز ہے۔ مثلاً قرون وسطیٰ کا ایک مسلمان مصنف یورپ جاتا ہے تو جسمانی آزمائش کے ذریعہ مجرم کا پتہ چلانے کے قانونی طریقے پر وہ یہ تبصرہ کرتا ہے۔

> ان کے ہاں عجیب و غریب رواج ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص دوسرے شخص پر دروغ گوئی کا الزام لگاتا ہے تو تلوار سے دونوں کا امتحان لیا جاتا ہے یہ اس طرح ہوتا ہے کہ دونوں آدمی' ملزم اور مدعی اپنے بھائیوں اور ثالثوں کے ساتھ آتے ہیں۔ دونوں میں سے ہر ایک کو دو تلواریں دی جاتی ہیں۔ ایک تلوار وہ کمر میں باندھ لیتا ہے اور دوسری ہاتھ میں پکڑتا ہے۔ پھر وہ شخص جس پر الزام لگایا گیا ہے اس چیز کی قسم کھاتا ہے جسے وہ عزیز رکھتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کے خلاف جو الزام لگایا گیا ہے وہ غلط ہے اور وہ بے گناہ ہے۔ دوسرا قسم کھاتا ہے کہ وہ سچ کہہ

رہا ہے۔ اس کے بعد وہ ایک دوسرے سے تھوڑے فاصلے پر مشرق کی طرف منہ کر کے دوزانو ہو جاتے ہیں۔ پھر اپنے دشمن کے سامنے جاتے ہیں اور اس وقت تک لڑتے ہیں جب تک ان میں سے ایک مر نہیں جاتا یا فرار نہیں ہو جاتا۔
ان کی ایک اور عجیب وغریب رسم ہے وہ ہے آگ کے ذریعہ امتحان لینا۔ اگر کسی شخص پر جائیداد یا قتل وخون کے معاملے میں الزام لگایا جاتا ہے تو وہ لوگ لوہے کا ایک ٹکڑا لیتے ہیں۔ اسے آگ میں تپاتے ہیں پھر توریت اور انجیل سے کچھ پڑھ کر اس پر پھونکتے ہیں پھر دو دو لکڑیاں زمین میں سیدھی گاڑتے ہیں۔ تپتا لوہا چمٹے سے پکڑ کے آگ سے نکالتے ہیں اور اسے دونوں لکڑیوں کے سروں پر رکھ دیتے ہیں۔ اس کے بعد ملزم آتا ہے دونوں ہاتھ دھوتا ہے' تپتا لوہا پکڑتا ہے اور تین قدم چلتا ہے۔ پھر وہ لوہا گرا دیتا ہے۔ اس کے ہاتھ پر پٹی باندھ دی جاتی ہے اور پٹی پر مہر لگادی جاتی ہے۔ پھر ایک رات اور ایک دن اسے نگرانی میں رکھا جاتا ہے۔ اگر تیسرے دن اس کے ہاتھ پر چھالے پڑ جاتے ہیں اور ان سے مواد نکلنے لگتا ہے تو وہ مجرم ٹھہرتا ہے اگر ایسا نہیں ہوتا تو وہ بے گناہ ٹھہرایا جاتا ہے اور اسے رہا کر دیا جاتا ہے۔
ان کا ایک اور طریقہ پانی سے امتحان لینا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ملزم کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے جاتے ہیں اور اسے رسی باندھ کر پانی میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اگر وہ اوپر تیرتا رہے تو مجرم ٹھہرایا جاتا ہے ڈوب جائے تو بے گناہ۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ پانی نے اسے قبول کر لیا۔
صرف غلاموں کا امتحان پانی اور آگ سے لیا جاتا ہے۔ جہاں تک آزاد انسانوں کا تعلق ہے۔ اگر ان پر پانچ دینار سے کم مالیت کے سامان کا مقدمہ ہے تو دونوں لاٹھیوں اور ڈھالوں کے ساتھ میدان میں جاتے ہیں اور اس وقت تک لڑتے ہیں جب تک ان میں سے ایک ذرا نہیں ہو جاتا۔ اگر ایک فریق عورت ہے' معذور ہے یا یہودی ہے تو وہ پانچ دینار دے کر اپنا نائب مقرر کر سکتا ہے۔ اگر ملزم گر جائے تو لازمی طور پر اسے سولی پر چڑھایا جاتا ہے اور اس کا سارا مال واسباب ضبط کر لیا جاتا ہے۔ اس کی جائیداد سے مخالف فریق

دس دینار وصول کرتا ہے۔(25)

یہ اقتباس قزوینی نے عذری سے نقل کیا ہے اور غالباً ابراہیم ابن یعقوب کی رپورٹ کا حصہ ہے۔ عثمان ابن منقض جو صلیبی جنگوں کے زمانے سے تعلق رکھتا ہے فلسطین میں صلیبی افواج کے مقبوضہ نابلوس کے مقام پر پیش آنے والا آنکھوں دیکھا ایک واقعہ بیان کرتا ہے۔

ایک دن میں نے نابلوس میں جنگ کے ذریعہ امتحان لینے کا ایک واقعہ دیکھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ چند مسلمان بدمعاشوں نے نابلوس کے ایک گاؤں پر دھاوا بولا تھا اور الزام لگایا گیا تھا کہ ایک کسان نے ان بدمعاشوں کی رہنمائی کی تھی۔ وہ تو بھاگ گیا لیکن بادشاہ نے اس کے بچوں کو پکڑ لیا۔ اس پر وہ واپس آیا اور کہا ''میرے ساتھ انصاف کرو۔ میں اس شخص کو للکارتا ہوں جس نے یہ کہا کہ میں نے گاؤں تک بدمعاشوں کی رہنمائی کی۔'' اس پر بادشاہ نے اس آقا سے کہا کہ جو گاؤں کا سردار تھا ''اس سے لڑنے کے لیے کسی کو بلاؤ۔'' وہ گاؤں گیا اور وہاں اسے ایک لوہار ملا جسے اس نے حکم دیا کہ وہ اس سے مقابلہ کرے۔ سردار اپنے کسانوں کو بچانا چاہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی کسان مرجائے اور اس کے مویشیوں کو نقصان ہو۔

میں نے اس لوہار کو دیکھا وہ طاقتور نوجوان تھا۔ لیکن کشتی لڑنا نہیں جانتا تھا۔ وہ چند قدم چلتا اور بیٹھ جاتا پھر پینے کو کچھ مانگتا۔ اس کا مدمقابل ایک بوڑھا آدمی تھا لیکن وہ دل کا مضبوط جوشیلا اور نڈر تھا۔ گاؤں کا رئیس اعظم آگے بڑھا اور دونوں کو ایک ایک لاٹھی اور ایک ایک ڈھال دی اور لوگوں کے گھیرے میں انہیں کھڑا کر دیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے بھڑ گئے۔ بوڑھے نے لوہار کو دھکا دیا اور تماشائیوں کے گھیرے سے باہر دھکیل دیا۔ لیکن وہ پھر میدان کے بیچ میں آ گیا۔ وہ ایک دوسرے کو مارتے رہے یہاں تک کہ وہ خون کے ستون نظر آنے لگے۔ یہ لڑائی تھوڑی دیر اسی طرح جاری رہی۔ اور رئیس اعظم چیختا رہا۔ ''جلدی کرو جلدی کرو۔'' لوہار ہتھوڑا چلانے کے تجربے سے فائدہ اٹھا رہا تھا اور بوڑھا کمزور پڑتا جا رہا تھا۔ پھر لوہار نے ایک وار کیا جس سے بوڑھا گر گیا اور اس کی لاٹھی اس کے نیچے دب گئی۔ اس پر لوہار اس کے اوپر جھکا اور اس کی

آنکھوں میں اپنی انگلیاں مارنے کی کوشش کی لیکن وہ ایسا نہیں کر سکا کیونکہ اس کی آنکھوں سے بے تحاشہ خون بہہ رہا تھا۔ وہ کھڑا ہوا اور اس کے سر پر لاٹھیاں برسانا شروع کر دیں حتیٰ کہ وہ مر گیا۔ پھر اس نے بوڑھے کی گردن میں رسی باندھی اور گھسیٹتا ہوا باہر لے گیا اور اسے پھانسی دے دی۔ لوہار کا آقا آیا اور اسے اپنی خلعت پیش کی۔ پھر اسے اپنے گھوڑے پر بٹھایا اور لے کر چلا گیا۔ ان کے عدل وانصاف اور قانونی طریقہ کار کا یہ ایک نمونہ ہے۔ خدا کی لعنت ہو ان پر۔" (26)

کسی مہذب مسلمان کے لیے جو قاضی کی عدالت کے طریقہ کار کا عادی ہو اس قسم کے قانون اور انصاف کا حقارت کے ساتھ ذکر کرنا یقیناً قابل فہم ہے۔ لیکن یورپ میں بہت جلد اس قسم کی لڑائی یا مقابلہ کے ذریعہ انصاف کرنے کا طریقہ کار باقی نہیں رہا۔ لہٰذا بعد کے مسلم مبصرین جنہیں عدالتی نظام زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اپنے تبصروں میں زیادہ مثبت انداز اختیار کرتے ہیں۔ بہت پہلے بارہویں صدی میں ہسپانوی مسلمان سیاح ابن جبیر جو شام گیا تھا لکھتا ہے کہ فرنگی اپنے مفتوحہ مسلمانوں کے ساتھ عادلانہ سلوک کرتے ہیں۔ یہ دیکھ کر اسے پریشانی ہوتی ہے۔ اسی قسم کے جذبات کا اظہار اٹھارویں صدی کے آخر میں مصری مورخ جبرتی بھی کرتا ہے۔ وہ اپنے ملک کو فتح کرنے والی فرانسیسی افواج کا ذکر کرتا ہے اور شہری آبادی کے ساتھ ان کے سلوک اور قانون وانصاف کا احترام کرنے پر ان کی تعریف کرتا ہے۔ خاص طور پر وہ اس سلوک سے بہت متاثر ہوتا ہے جو اس مسلمان قاتل کے ساتھ کیا گیا جس نے جنرل کلیبر کو قتل کیا تھا۔ یہ جنرل بوناپارٹ کے بعد مصر میں فرانسیسی افواج کا سپہ سالار تھا۔

وہ کہتا ہے کہ فرانسیسی حکام نے اس مقدمہ کی کارروائی تین زبانوں فرانسیسی، ترکی اور عربی میں طبع کی تھی۔ چونکہ وہ غلط عربی میں تھی اور بہت طولانی تھی اس لیے وہ اسے نظر انداز کر سکتا تھا لیکن وہ چاہتا تھا کہ اس کے قارئین کو نہ صرف اصل واقعات کا علم ہو بلکہ وہ یہ بھی جان جائیں کہ فرانسیسی انصاف کیسے کرتے ہیں۔ "یہ لوگ جن کا کوئی مذہب نہیں ہے دیانت داری کے ساتھ قانون کی پاسداری کرتے ہیں۔" وہ کہتا ہے کہ یہ واقعہ ہمارے لیے سبق آموز ہے۔ "دور دراز کا ایک اجنبی اپنے سربراہ پر حملہ کرتا ہے اور اسے قتل کر دیتا ہے۔ لوگ اسے موقع پر پکڑ لیتے ہیں لیکن وہ اسے اور ان مجرموں کو فوراً ہلاک نہیں کر دیتے جنہیں وہ نامزد کرتا ہے۔ حالانکہ انہوں نے اسے اس آلہ قتل

کے ساتھ گرفتار کیا تھا جس سے سپہ سالار کا خون ٹپک رہا تھا۔ اس کے بجائے انہوں نے ایک عدالت قائم کی اور قاتل کو اس کے سامنے پیش کیا اور زبانی طور پر اور تشدد کے ذریعہ تفتیش کی۔ پھر ان لوگوں کو بھی طلب کیا گیا جنہیں اس نے نامزد کیا تھا۔ ان سے علیحدہ پوچھ گچھ کی گئی۔ اس کے بعد قانون کے مطابق ان کا فیصلہ سنایا گیا۔ انہوں نے کاتب مصطفیٰ آفندی امیر علی کو بری کر دیا کیونکہ اس کے خلاف کوئی مقدمہ نہیں بنتا تھا۔'' جبرتی واضح طور پہ اس بات سے بہت متاثر معلوم ہوتا ہے کہ فرانسیسیوں نے قانون کے مطابق سارا کام کیا اور اس ملزم کو بری کر دیا جس کے خلاف ناکافی شہادتیں تھیں۔ اس کا موازنہ وہ ان فوجیوں کی بداعمالیوں سے کرتا ہے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور صرف اپنے حیوانی جذبات کی تسکین کے لیے انسانوں کو قتل کرتے ہیں۔'' (27)

لیکن تمام مسلمان مبصرین مغربی عدالتی نظام کی تعریف نہیں کرتے۔ ان میں سے ایک ابوطالب خاں ہے۔ بدقسمتی سے لندن کے ایک درزی نے اس پر دس شلنگ کا جرمانہ کرا دیا تھا اور عدالتی سمن کی تعمیل نہ کرنے پر جج نے مزید چھ شلنگ بطور جرمانہ اس سے وصول کر لیے تھے۔ وہ جیوری کے نظام سے خوش نہیں ہوا۔ کیونکہ اس کے خیال میں جیوری کے ارکان آسانی سے جج کے کہنے میں آ جاتے ہیں اور جج کی رائے ہی تسلیم کر لیتے ہیں۔ جج اپنی رائے پر نظر ثانی کے لیے مقدمہ انہیں واپس بھیج دیتا ہے۔ اتنا ہی نہیں اگر یہ تدابیر بھی کارگر نہیں ہوتیں تو جج کو اختیار ہے کہ جیوری کے ارکان کو کمرے میں بند کر دے جہاں انہیں کھانا پینا بھی نہ ملے اور جج و وکلا کے ساتھ دوسرے کمرے میں جا کر سرکاری خرچ پر کھائے پیئے اور عیش کرے۔ جیوری سے زیادہ ایڈووکیٹ یا وکیل ابوطالب کے لیے پریشانی کا باعث بنے جو ایک ایسے پیشے سے وابستہ تھے جو اسلامی عدالتی نظام کے لیے اجنبی تھا۔ ابوطالب مانتا ہے کہ انگریز جج ''باوقار اور خدا ترس ہیں اور وکلاء کی چالاکیوں سے بچاتے ہیں لیکن عدالت کی طول طویل کارروائی اور انگریزی مقدمات کے بہت زیادہ اخراجات مدعی کو انصاف فراہم کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ نیک نیت جج بھی وکلاء کو موقع دیتے ہیں کہ مقدمہ کو الجھائیں اور گواہوں کو خوفزدہ کریں۔ وہ کہتا ہے کہ اکثر و بیشتر قانون کی حکمرانی قدرتی انصاف کے خلاف ہی جاتی ہے اور خدا ترس جج بھی انسان کے بنائے ہوئے اس قانون کی خلاف ورزی کئے بغیر منصفانہ فیصلہ نہیں دے سکتے۔ (28)

بہرحال عموماً وہ مسلمان جنہوں نے یورپ کے عدالتی نظام کا جائزہ لینے کی زحمت گوارا کی وہ اس سے متاثر ضرور ہوئے' مصر کے شیخ رفاعہ نے' جو 1826ء سے 1831ء تک پیرس میں

رہا، اتنی محنت کی کہ فرانسیسی آئین کے پورے متن کا عربی میں ترجمہ کیا۔

شیخ رفاعہ مساوات کے فرانسیسی نظریہ سے پوری طرح متفق نہیں تھا۔ اس نے لکھا کہ یہ معاشی امور پر اس نظریہ کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ ''ان کے اندر مساوات صرف ان کے الفاظ اور ان کے اعمال تک ہی محدود ہے ان کی املاک پر ان کا اطلاق نہیں ہوتا۔'' شیخ رفاعہ رائے دیتا ہے کہ فرانسیسی سخی نہیں ہیں بلکہ کنجوس ہیں۔ دراصل سخاوت تو عربوں کے پاس ہے۔'' تاہم وہ فرانس کے اس نظریہ کی تعریف کرتا ہے کہ قانون کے سامنے سب برابر ہیں۔ اور اسے عدل وانصاف کا بلند ترین درجہ حاصل کرنے اور مہذب فنون میں ترقی کرنے کا سبب بتاتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ جسے وہ آزادی کہتے ہیں اور جس کے حصول کے لیے وہ کوشش کرتے ہیں وہ وہی ہے جسے ہم عدل و مساوات کہتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آزادی کی حکمرانی کا مطلب ہے قانون کے سامنے سب کی برابری مستحکم کرنا۔'' شیخ رفاعہ خاص طور سے مستقل قوانین کی موجودگی کو سراہتا ہے اور آزادی و مساوات کے لیے آئینی ضمانت کی اہمیت کی طرف توجہ مبذول کراتا ہے اور بتاتا ہے کہ وہاں آئین کے تحت منتخب ایوان وجود میں آتا ہے جو قوانین وضع کرتا ہے۔ (29)

یہ آئین اور پارلیمانی حکومت کا قیام ہی تھا جس نے مسلم مشرق سے یورپ آنے والوں کو معاشی ترقی سے بھی زیادہ متاثر کیا۔ یہی وہ شعبے تھے جن سے یہ امید وابستہ کی جارہی تھی کہ انہیں سمجھ کر ہی مغربی ترقی کے سربستہ راز معلوم کیے جاسکتے ہیں اور مغرب کی دولت اور طاقت سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

سائنس اور ٹیکنالوجی

مسلم سائنس کے کلاسیکی دور کا آغاز ایرانی' ہندوستانی اور سب سے زیادہ یونانی سائنسی کتابوں کا ترجمہ کرنے سے ہوا۔ اگرچہ ترجمہ کرنے کی مہم گیارہویں صدی میں ختم ہو چکی تھی تاہم اسلامی سائنس پر اس کے بعد تک بھی کام جاری رہا۔ مسلمان سائنس دانوں نے طب' زراعت' جغرافیہ اور حربی فنون جیسے مختلف اور متضاد علوم کے شعبوں تک اپنی تحقیق اور عملی تجربوں میں بہت اضافہ کیا۔ جن بیرونی اثرات نے مسلمانوں کی سائنسی ترقی میں نہایت اہم کردار ادا کیا وہ یونانی علوم تھے۔ لیکن ان کے علاوہ دوسرے اثرات بھی تھے جن میں سے بعض خاصے اہم تھے۔ ریاضی' فلکیات اور خاص طور پر علم ہندسہ یا اعداد' جنہیں عربی اعداد کہا جاتا ہے' ہندوستان سے آئے۔ یہ علوم زبردست اہمیت کے حامل تھے۔ اس کے علاوہ منگولوں کے حملے کے ساتھ پہلی بار اسلامی دنیا کا براہ راست تعلق چین سے ہوا اور مشرق بعید کی تہذیب اور سائنس کے کچھ اثرات مسلمانوں کے اعمال پر بھی پڑے۔ البتہ مسلمانوں کی فکر اس سے کم متاثر ہوئی۔

اس زمانے میں مغرب کا اثر عملاً نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ مغرب کے پاس اس وقت کچھ دینے کو بھی نہیں تھا۔ اب تک سائنسی علوم پر صرف ایک ایسا عربی متن ملا ہے جو مغرب کے طبع زاد متن پر مبنی ہے۔ یہ ایک عرب یہودی متن ہے۔ یعنی لکھا تو عربی میں گیا ہے لیکن رسم الخط عبرانی ہے۔ یہ فلکیات کا جدول ہے جس میں سیاروں کی گردش دکھائی گئی ہے۔ بظاہر اس کا ماٰخذ اٹلی کے شہر نووارا سے ملنے والی کتاب ہے جو 1327ء میں لکھی گئی تھی۔ (1) چونکہ وہ عبرانی رسم الخط میں لکھی گئی اس لیے عربوں کے لیے اسے پڑھنا مشکل تھا کیونکہ وہ یہ رسم الخط نہیں پڑھ سکتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ کتاب یہودی سائنس دانوں کے لیے تھی۔ اس سے ایک اور حقیقت بھی آشکار ہوتی ہے کہ قرون وسطیٰ اور جدید دور کے آغاز تک یہ یہودی سائنس داں

بالخصوص یہودی طبیب ہی تھے جن کے وسیلے سے مغربی علوم اسلامی دنیا تک پہنچ رہے تھے۔

بارہویں صدی کا مسلمان مصنف اسامہ ابن منقض اس بارے میں زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ قرون وسطیٰ کے یورپ میں جو طب رائج تھی اس نے مسلم دنیا کو کس طرح متاثر کیا:

> منیترا کے سردار (ہمسایہ صلیبی جنگ جو) نے میرے چچا کو لکھا کہ اس کا ایک ساتھی بیمار ہے اس کے علاج کے لیے کسی طبیب کو بھیج دیں۔ انہوں نے ایک شامی عیسائی طبیب ثابت کو کو بھیج دیا۔ وہ صرف دس دن ہی وہاں رہا اور واپس آ گیا۔ ہم نے اس سے کہا ''کتنی جلدی تم نے بیمار کو اچھا کر دیا؟'' اور اس نے جواب دیا۔'' وہ میرے پاس دو مریض لائے۔ ایک صلیبی سورما تھا جس کے پاؤں پر پھوڑا تھا اور ایک عورت تھی جس کے دماغ پر اثر تھا۔ میں نے سورما کے پٹی باندھی اور پھوڑا پھوٹ گیا اور اسے افاقہ ہو گیا۔ میں نے عورت کو بھوکا رکھا اور اسے خوش رکھنے کی کوشش کی۔ پھر ایک فرنگی طبیب ان کے پاس آ گیا۔ وہ کہنے لگا۔ ''یہ آدمی بالکل نہیں جانتا کہ ان کا علاج کیسے کیا جائے۔'' اس کے بعد اس نے سورما سے دریافت کیا۔ ''تم کیا پسند کرو گے؟ ایک ٹانگ کے ساتھ زندہ رہنا یا دو ٹانگوں کے ساتھ مر جانا؟ اسی پر سورما نے کہا ''ایک ٹانگ کے ساتھ زندہ رہنا۔'' اس پر عیسائی طبیب نے کہا۔ ''ایک توانا سپاہی اور ایک کلہاڑا میرے پاس لاؤ۔'' وہ دونوں لائے گئے۔ اس اثنا میں وہ وہاں کھڑا رہا۔ اب اس طبیب نے بیمار آدمی کی ٹانگ لکڑی کے تختے پر رکھی اور سپاہی سے کہا ''اس کی ٹانگ پر کلہاڑا چلاؤ اور ایک ہی وار میں اسے کاٹ دو۔'' میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ سپاہی نے ٹانگ پر ایک بار کلہاڑا چلایا لیکن ٹانگ نہیں کٹی۔ پھر اس نے دوسرا وار کیا تو ٹانگ کا گودا باہر نکل پڑا اور وہ آدمی فوراً مر گیا۔
>
> اب وہ طبیب عورت کی طرف مڑا اور بولا ''اس عورت پر بھوت آ گیا ہے اور وہ اس پر عاشق ہو گیا ہے۔ اس کا سر مونڈ ڈالو۔'' چنانچہ اس کا سر مونڈ دیا گیا اور اس نے اپنی معمول کی غذا کھانا شروع کر دی جو لہسن اور سرسوں وغیرہ تھی اس کا پاگل پن اور بھی بڑھ گیا۔ اس پر عیسائی طبیب نے کہا ''دو بھوت اس کے سر میں گھس

گیا ہے۔ پھر اس نے ایک استرا لیا اور اس عورت کے سر پر صلیب کا نشان کاٹا۔ پھر بیچ میں سے کھال ادھیڑنا شروع کی یہاں تک کہ کھوپڑی کی ہڈی نظر آنے لگی۔ اس پر اس نے نمک چھڑکا اور وہ عورت وہیں مرگئی۔
اس پر میں نے ان سے کہا "کیا آپ کو اب بھی میری ضرورت ہے؟" اور انہوں نے کہا نہیں۔ تو میں گھر چلا آیا۔ میں ان کے طبی طریقہ کار کے بارے میں جان گیا تھا جو میں پہلے نہیں جانتا تھا۔" (2)

بات یہ ہے کہ اُسامہ کے چچا نے کسی مسلمان کو فرنگیوں کے چنگل میں دینے کے بجائے یقیناً کسی مقامی عیسائی طبیب کو بھیجا ہوگا۔ وہ شامی عیسائی بھی جالینوس اور بقراط کے پیروکار مسلمانوں کی طرح فرنگی ڈاکٹروں کے پسماندہ اور وحشیانہ طریقہ علاج سے نفرت کرتا ہوگا اور اسے بھی سب کچھ دیکھ کر افسوس ہوا ہوگا۔ لیکن اسامہ نے چند ایسے واقعات بھی بیان کیے ہیں جہاں فرنگی ڈاکٹروں کا علاج کارآمد ثابت ہوا۔ ان میں سے ایک ہڈیوں کی تپ دق کے مریض کا علاج تھا۔ اسامہ کہتا ہے کہ فرنگی طبیب نے سب سے پہلے تو فرنگی سے یہ قسم لی کہ وہ اجرت لے کر یہ دوا کسی اور کو نہیں بتائے گا۔ بہرحال فرنگیوں کے بارے میں اسامہ کی رائے عام طور پر منفی ہی ہے۔

صرف ایک شعبہ ایسا ہے جس میں مسلمان صلیبی سپاہ کا عزت سے نام لیتے تھے اور وہ تھا جنگ کا شعبہ یا فنِ حرب۔ ہتھیاروں اور قلعہ بندی کے معاملے میں مسلمانوں نے فرنگیوں سے ہی سیکھا۔ یہ کام انہوں نے ان کی تکنیک سیکھ کر کیا یا پھر عیسائی جنگی قیدیوں سے سیکھا۔

عثمانی دور کے آتے آتے فرنگی فنِ حرب میں کمال حاصل کرنا ایک دردناک حقیقت بن چکا تھا۔ خاص طور پر توپ خانے اور بحریہ میں یہ احساس بہت عام تھا۔ اگرچہ بارود صدیوں پہلے چین نے ایجاد کی تھی لیکن اس کی اصل حقیقت کو سمجھنے اور اس کی فوجی اہمیت تسلیم کرنے کا سہرا یورپ کے سر جاتا ہے۔ مسلم دنیا ابتدا میں تو اس اختراع کو قبول کرنے میں ہی ہچکچاتی رہی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے توپ کا استعمال حلب کے دفاع کے لیے کیا گیا جب تیمور نے اس کا محاصرہ کرلیا تھا۔ لیکن عام طور پر مصر اور شام کے مملوک سلطان اس ہتھیار کا استعمال بزدلی سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ چیز معاشرتی نظام تباہ کرنے والی ہے۔ البتہ عثمانی آتشیں اسلحہ کی اہمیت جلد ہی مان گئے تھے اور توڑے دار بندوقوں اور توپوں کے استعمال کی وجہ سے ہی وہ اپنے "مدِمقابل مسلمان دشمنوں کو شکست دینے میں کامیاب ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک سلطان مصر تھا اور دوسرا شاہ

ایران۔" 1453ء میں قسطنطنیہ میں یورپی قوتوں اور مسلمان دشمنوں پر عثمانی فتح میں توپ خانے کا کامیاب استعمال ہی فیصلہ کن ثابت ہوا۔ قابل قدر بات یہ ہے کہ توپیں ڈھالنے والوں اور توپچیوں کی بڑی تعداد یورپ سے فرار ہو کر آنے والوں کی ہی تھی۔ عثمانی ان ہتھیاروں کے استعمال ہی جانتے تھے لیکن انہیں تیار کرنے کی سائنس اور ٹیکنالوجی کے لیے وہ ابھی تک بیرونی ملکوں کے محتاج ہی تھے۔ یہی بات توپچیوں اور قلعہ بندی کے لیے خندقیں تیار کرنے والوں کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ وہ سب باہر سے آتے تھے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ وقت گزرنے کے ساتھ عثمانی توپ خانہ بتدریج اپنے یورپی مدمقابل کے سامنے کمزور ہوتا چلا گیا۔

توپوں اور معدنیات سے عثمانیوں کو جتنی دلچسپی تھی اتنی ہی دلچسپی انہیں جہاز سازی اور جہاز رانی کے میدان میں یورپ کا مقابلہ کرنے سے بھی تھی۔ ایک بار وینس کا ایک بڑے چپوؤں والا بادبانی جہاز ترکی کے سمندر میں خشکی پر چڑھ گیا تو عثمانی بحریہ نے اس کا جائزہ لینے اور اس کی خوبیاں اپنے جہازوں میں شامل کرنے کے لیے اپنے انجینئر وہاں بھیجے۔ دارالحکومت کے مفتی سے استفتا کیا گیا کہ ان معاملات میں کافروں کی اختراعات کی نقل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جواب ملا کہ کافروں کو شکست دینے کے لیے ان کے ہتھیاروں کی نقل کرنا جائز ہے۔

اس وقت جو استفتا کیا گیا وہ اس زمانے کے لحاظ سے نہایت اہم تھا۔ مسلم روایات کی رو سے ایجاد و اختراع اس وقت ہی جائز ہے جب وہ اچھائی کے لیے ہو اور ایسی نظر بھی آتی ہو۔ عربی میں "بدعہ" کا مطلب ہے اختراع جو بُرے معانی میں استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ اس کا مطلب ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام سے قول و فعل کی جو روایت چلی آرہی ہے اس سے انحراف کرنا۔ چنانچہ مسلمانوں کے نزدیک بدعت کا وہی مفہوم ہو گیا ہے جو عیسائیوں میں Heresay (الحاد و زندقہ) کا ہے۔

بدعت کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ کافروں کی نقل کی جائے۔ آنحضرتؐ کی ایک حدیث ہے کہ "جو شخص جن لوگوں کی نقل کرتا ہے وہ ان میں سے ہے" اس کا مطلب یہ لیا جاتا تھا کہ کافروں سے مخصوص افعال و اعمال اختیار کرنا یا ان کی نقل کرنا بذات خود کافرانہ فعل ہے۔ چنانچہ مسلم فقہا اور علماء جہاں بھی مسلمانوں کو یورپ اور کافروں کی نقل کرتے دیکھتے تھے تو اس کی مخالفت کرتے تھے اور اسے اسلام کے خلاف قرار دیتے تھے۔ قدامت پرست لوگوں نے اسے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا اور سائنس اور ٹیکنالوجی حتیٰ کہ یورپی طریقہ علاج کو بھی کافرانہ حرکات قرار

دیا۔

تاہم ایک شعبہ اس سے مستثنیٰ تھا اور وہ تھا فن حرب۔ کافروں اور نصرانیوں کے خلاف جہاد مسلم مملکتوں اور عام مسلمانوں کی اجتماعی ذمہ داری تھی۔ اپنے دفاع کے لیے لڑی جانے والی جنگ ہر مسلمان کا انفرادی فرض بن جاتی تھی۔ مسلمانوں کے جنگی ساز وسامان کو طاقت ور بنانا اور کافروں کے خلاف جہاد میں اسے موثر بنانا بذات خود ایک مذہبی فریضہ تھا۔ کافروں سے لڑنے کے لیے ان کے طریقے اور حربے سیکھنا ضروری تھا۔ چنانچہ اس کے لیے عثمانی فقہاء اور مصنفین ایک اصطلاح استعمال کرتے ہیں جسے وہ ''المقابلہ بالمثل'' کہتے ہیں۔ یعنی کافروں کے اپنے ہتھیاروں سے ہی ان کا مقابلہ کرنا۔ (3) ادھر فن حرب کو جدید خطوط پر استوار کرنے کے حامی بھی مسلمانوں کے ماضی اور قرآن وحدیث سے مثالیں تلاش کر رہے تھے۔ ان کا استدلال تھا کہ خود نبی کریم ﷺ اور قدیم مسلم سپہ سالار نے آفندی پرست ایرانیوں اور بازنطینی عیسائیوں کی ترقی یافتہ حربی تکنیک اختیار کرنے پر آمادہ رہتے تھے تاکہ ان کے ساتھ مقابلہ کیا جاسکے۔ بعد میں خلفاء کی افواج نے بازنطین کے ذریعہ یونانی آتشیدہ اسلحہ حاصل کیا۔ اس طرح یہ لوگ عیسائی دنیا سے بارود اور آتشیں اسلحہ حاصل کرنے کا جواز بھی پیش کرتے تھے۔ اس کے لیے انہیں قرآن کی ایک آیت سے بھی سند مل گئی جس میں مومنوں سے کہا گیا ہے کہ ''اور ان مشرکین سے سب سے لڑنا جیسا کہ وہ تم سب سے لڑتے ہیں۔'' (4) اس کی تشریح یہ کی گئی کہ کافروں کو شکست دینے کے لیے مسلمانوں کو تمام ہتھیار استعمال کرنا چاہئیں خواہ وہ کافروں کے ہتھیار ہی ہوں۔

عثمانی سلطنت جنگ میں عام طور پر اور توپ خانے اور بحریہ کے لیے خاص طور پر یورپ کا فن حرب اختیار کرنے کو تیار تھی۔ یہاں اسے علماء کی مخالفت کا کم سامنا کرنا پڑتا تھا۔ انہوں نے معدنیات میں بھی مغرب کی تقلید کی۔ جنوبی یورپ میں عثمانیوں کے علاقے نہایت اہم معدنیات سے مالا مال تھے۔ ان میں لوہا اور چاندی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ یہاں کانوں کی کھدائی اور لوہا اور چاندی نکالنے کا کام جرمن ماہرین کے ہاتھوں میں تھا جو منافع میں شرکت کی بنیاد پر عثمانیوں کے ملازم تھے۔ کانوں کی کھدائی کے لیے وہ وہی طریقہ اختیار کرتے تھے جس سے وہ واقف تھے۔ حتیٰ کہ کانوں کی کھدائی کے لیے قانون بھی ان کے ہی تھے۔ یہ سیکسن قوانین ترکی میں بھی رائج تھے اور ''قانون سس'' کہلاتے تھے۔

اس قسم کے مقاصد کے لیے عثمانی یورپی ماہروں کو کافی بڑی تعداد میں ملازم رکھنے پر

تیار ہوگئے تھے۔ان ماہرین کا ایک بڑا گروہ بن گیا تھا جو ''طائفہ افرنجیان'' کہلاتا تھا۔عثمانی سلطان اور ان کے وزراء یورپی ٹیکنالوجی کی اہمیت سے اچھی طرح آگاہ تھے اور اپنے مقاصد پورے کرنے کے لیے یورپ سے ماہرین بلاتے تھے۔لیکن قدامت پرست مذہبی عناصر کی طرف سے ہمیشہ ان کی مخالفت کی جاتی تھی۔ان عناصر کی جانب سے کافروں کی ٹیکنالوجی اختیار کرنے کی اتنی مخالفت نہیں کی جاتی تھی جتنی مقامی ٹیکنالوجی کی ترقی روکنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ مسلمانوں کے پاس اتنی طاقت اور اتنے اختیارات تو تھے کہ وہ بیرون ملک سے ماہرین بلالیں لیکن قدامت پسند علماء کے زیر اثر مدارس اور مکتبوں میں جو نظام تعلیم رائج تھا اس کے ذریعہ اپنی ٹیکنالوجی پیدا کرنے کا اختیار کسی سلطان کے پاس نہیں تھا۔ان تمام مشکلات کے باوجود عثمانی دوسرے مسلم ملکوں کے مقابلے میں بہتر پوزیشن میں تھے۔عثمانی سلطان اور ان کے وزراء کم سے کم مغربی ٹیکنالوجی کی اہمیت دیکھ تو رہے تھے اور کبھی کبھی محدود پیمانے پر ہی سہی اختراعات کے لیے تدابیر بھی اختیار کر رہے تھے۔ان صدیوں میں عثمانی نہ صرف یورپ کے ترقی یافتہ ہتھیاروں کا مقابلہ کر رہے تھے بلکہ اپنی بعض ایجادات واختراعات میں ان سے آگے بھی تھے۔سولھویں اور سترہویں صدی کے بعض یورپی مبصروں نے عثمانیوں کی اس سرعت رفتار ترقی کا ذکر کیا ہے جس سے انہوں نے یورپ کے ہتھیاروں اور گولہ بارود کی نقل کی اور ان میں تبدیلیاں بھی کیں۔ 1683ء میں ترکی کی طرف سے ویانا کے دوسرے محاصرہ میں جو ہتھیار استعمال کیے گئے اس زمانے کے آسٹریا کے بعض مبصروں نے خاص طور پر ان کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ ترکی کی توڑے دار بندوقیں آسٹریا کی بندوقوں کے برابر تھیں بلکہ بعض پہلوؤں سے' خاص طور سے زیادہ فاصلے پر نشانہ مارنے میں' وہ ان سے بھی بہتر تھیں۔لیکن بیرونی ماہرین اور غیر ملکی فنون پر مسلسل انحصار نے اپنا رنگ دکھایا۔عثمانیوں کے لیے تیزی سے ترقی کرتی مغربی ٹیکنالوجی اور ایجادات کا مقابلہ کرنا روز بروز مشکل ہوتا گیا اور اٹھارہویں صدی میں سلطنت عثمانیہ فنون حرب میں یورپ سے فیصلہ کن طور پر بہت پیچھے رہ گئی اگرچہ باقی اسلامی دنیا سے وہ بہت آگے تھی۔(6)

تبدیلی کے یہ مراحل مسلمانوں اور یورپ کے بحری بیڑوں میں موجود فرق سے صاف ظاہر ہوتے ہیں۔جب تک عثمانی بحری بیڑے کی سرگرمیاں بحیرۂ روم تک محدود رہیں اس وقت تک وہ جہاز سازی اور جہاز رانی میں یورپ کا خاصہ مقابلہ کرتے رہے۔سترہویں صدی کے اوائل میں جب عثمانی سلطنت کے اثرات مغربی بحیرۂ روم تک پھیل گئے تو بحر اوقیانوس کی بحری

طاقتوں کے ساتھ ان کا براہ راست رابطہ ہوگیا۔ اس میں ان کی مدد مغربی یورپ میں ہونے والی زبردست تبدیلی نے بھی کی۔ 1603ء میں انگلستان کی ملکہ ایلزبتھ کے انتقال کے بعد جیمز اوّل نے سپین کے ساتھ صلح کر لی اور 1604ء کے سمجھوتہ کے تحت دونوں ملکوں کے درمیان ایک طویل بحری جنگ کا خاتمہ ہوگیا۔ اس زمانے میں ہالینڈ کے ساتھ سپین کا تنازعہ بھی ختم ہوگیا اور 1606ء میں سپین نے ولندیزیوں کی آزادی تسلیم کر لی۔ بہت سے انگریز اور ولندیزی بحری قزاق جو سپین کے خلاف ان دونوں ملکوں کی جنگوں میں نہایت اہم کردار ادا کر رہے تھے۔ اب نہ صرف بے معنی ہوگئے بلکہ خطرناک بھی ہوگئے۔ چنانچہ انگلستان' ہالینڈ اور دوسرے مغربی ملکوں نے انہیں برداشت کرنے کی پالیسی ترک کر دی اور اپنے ہی قزاقوں کے خلاف سخت کارروائی شروع کر دی۔ ان قزاقوں نے حالات مخدوش دیکھے تو وہاں اپنی سرگرمیاں چھوڑ چھاڑ کر شمالی افریقہ کے ساحلوں کی طرف فرار ہوگئے۔ جہاں ان کا خیر مقدم کیا گیا۔ یہ مغربی قزاق چوکور بادبانوں والے ایسے بحری جہاز استعمال کرنے کے عادی تھے جن کے دونوں جانب توپیں وغیرہ لگی ہوتی تھیں۔ انہوں نے اپنے میزبانوں کو یہ جہاز بنانے کا طریقہ سکھایا اور انہیں استعمال کرنا بھی بتایا۔ شمالی افریقہ کے ان مسلمانوں نے فوراً ہی پرانے انداز کے بادبانی جہازوں کے مقابلے میں ان جہازوں کی خوبیاں پہچان لیں اور یہ اندازہ لگا لیا کہ ان جہازوں میں زیادہ اسلحہ رکھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ جلد ہی وہ بحری جنگوں کے نئے طریقوں میں ماہر ہوگئے اور ان کے بحری بیڑے شمالی افریقہ سے آبنائے جبرالٹر' جزائر برطانیہ اور اس سے بھی آگے تک مار کرنے لگے۔

کچھ عرصے تک مسلمان بحری بیڑے عیسائیوں کے بیڑوں کے برابر یا ان سے بہتر ہی رہے۔ لیکن یہ بہتری زیادہ عرصہ برقرار نہیں رہی اور آہستہ آہستہ اس میں تنزل آتا گیا۔ اب چونکہ مغرب سے آنے والے پناہ گزینوں اور اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد میں بھی کمی آ گئی تھی اس لیے وہ اپنا معیار برقرار نہیں رکھ سکے اور زوال پذیر ہوگئے۔ عثمانی اور شمالی افریقہ کی جہاز سازی کی صنعت اس تیز رفتار ترقی کا ساتھ نہیں دے سکی جو سترہویں اور اٹھارویں صدی میں یورپ میں ہو رہی تھی۔ اور اٹھارویں صدی کے آخر میں یہ حال ہوگیا کہ عثمانی' جو اسلحہ اور جہاز سازی میں خود کفیل تھے اب غیر ملکی جہاز سازوں سے بحری جہاز منگانے پر مجبور ہوگئے۔ یہ سلطنت عثمانیہ کے لیے یہ بہت ہی بری فال تھی۔

اسلحہ و گولہ بارود اور جہاز رانی کے علاوہ ایک اور کارآمد شعبہ ایسا تھا جس میں یورپ

ترقی کر رہا تھا۔ یہ شعبہ تھا طب کا۔ پندرہویں اور سولہویں صدی تک حالات کافی تبدیل ہو چکے تھے۔ پہلے زمانے میں یہ حال تھا کہ صلیبی جنگوں کے مغربی جنگجو علاج معالجے کے لیے مسلمان یا مشرقی عیسائی یا یہودی طبیب کی مدد طلب کرتے تھے۔ اب یہ یورپ تھا جو اس شعبے میں بھی ترقی کر رہا تھا اور مسلمان زوال آمادہ تھے۔ شعبہ طب کا تعلق چونکہ براہ راست انسان کی ذاتی زندگی اور صحت سے ہے اس لیے دوسری غیر ذاتی سائنس اور ٹیکنالوجی کے مقابلے میں اس کی طرف زیادہ توجہ مبذول کی گئی۔ طب میں انسان کی ذاتی صحت بلکہ اس کی زندگی کا سوال پیش تھا اور مریض کی زندگی اور موت طبیب کے ہاتھ میں تھی۔ ہر زمانے اور ہر مقام پر انسان بہترین طبیب یا ڈاکٹر تلاش کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ یعنی اس کی اپنی خالص نجی غرض دوسرے تمام امور پر حاوی ہو جاتی ہے اس لیے مریض اچھے ڈاکٹر تلاش کرتا ہے اور ڈاکٹر اچھا علاج اور اچھی دوا۔ لیکن اس کے باوجود قدیم طرز کے ڈاکٹر اور طبیب اس ترقی کا مقابلہ کرنے کے لیے بھی موجود تھے۔

ابتدا میں تو سلطنت عثمانیہ میں مغربی طب کا رواج بالکل نہیں تو بڑی حد تک غیر مسلموں کے ذریعہ، یعنی بیشتر یہودیوں اور کبھی کبھی عیسائیوں کے ذریعہ ہی ہوا۔ پندرہویں صدی میں سلطان محمد فاتح نے اٹلی سے یہودی طبیب جیا کوموری گائتا کو ترکی بلایا۔ یہ شخص بعد میں مسلمان ہو گیا اور یعقوب پاشا کے نام سے مشہور ہوا۔ سولہویں صدی تک یہودی طبیب عثمانی سلطنت میں عام ہو گئے تھے۔ ان میں سے اکثر ہسپانوی، پرتگالی اور اطالوی نژاد تھے۔ سلطان ہی نہیں رعایا میں سے بہت سے لوگ ابھی ان سے ہی علاج کراتے تھے کیونکہ وہ انہیں زیادہ اہل اور زیادہ لائق مانتے تھے۔ عیسائی مغرب سے عارضی طور پر وہاں جانے والے اس بات پر ناک بھوں چڑھاتے تھے کہ یہودی طبیبوں کا دربار میں بہت زیادہ اثر و رسوخ ہو گیا ہے۔ ان میں سے کچھ تو یہودی اطباء کو یہ بھی طعنہ دیتے تھے کہ وہ لاطینی اور یونانی زبان زیادہ نہیں جانتے اور یورپ میں مغربی طب جس تیزی سے ترقی کر رہی ہے اس کا ساتھ بھی نہیں دے سکتے۔ (7) لیکن ان میں سے بعض ان کی تعریف بھی کرتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ بہت پڑھے لکھے لوگ ہیں اور ان کا تجربہ بھی بہت زیادہ ہے۔ وہ یونانی، عربی اور عبرانی میں موجود علم طب سے بخوبی واقف ہیں۔ (8)

ان میں سے چند یہودی طبیبوں نے شاہی مریضوں اور عام لوگوں کے فائدے کے لیے رسالے بھی لکھے۔ یہ رسالے انہوں نے خود بھی لکھے اور دوسری زبانوں سے ترکی میں ترجمہ بھی کیے۔ ان میں سے ایک کتاب کا نام ہے "اعصائے پیراں"۔ اس کتاب میں بوڑھوں کی

بیماریوں اوران سے حفاظت اوران کے علاج بتائے گئے ہیں۔اس کا مصنف کوئی مینویل بردود معلوم ہوتا ہے جو کبھی کبھی اپنے آپ کو بردوس لوسی تانس یعنی پرتگالی بردود لکھتا ہے۔ غالباً وہ پرتگال کا یہودی تھا جس نے عیسائیوں کے خوف سے اپنا مذہب چھپایا ہوا تھا۔ وہ 1530ء میں پرتگال سے آیا تھا۔ پہلے وہ لندن گیا تھا پھر اینٹورپ منتقل ہو گیا۔ وہاں سے اٹلی گیا اور آخر ترکی میں مستقل قیام کیا اور اپنا یہودی مذہب ظاہر کیا۔ کتاب میں علاج معالجے کے ساتھ ان تجربات کا ذکر بھی کیا گیا ہے جو اسے یورپ کے قیام میں حاصل ہوئے۔ مثال کے طور پر وہ لکھتا ہے کہ انگریز انڈہ اور مچھلی کس طرح پکاتے ہیں اور سردیوں میں رطوبت سے بچنے کے لیے لندن والے کونسا ایندھن استعمال کرتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ انگریز اور جرمن باشندوں کی عادت ہے کہ ناشتے میں تازہ مکھن اور انڈے کھاتے ہیں اور ان کے ہاں رواج یہ ہے کہ ہاضمے کے لیے کھانے سے پہلے وہاں پکائے ہوئے آلو بخارے پیش کیے جاتے ہیں۔ وہ عیسائیوں کی دوپہر کے کھانے کی عادت کی برائی کرتا ہے اور مسلمانوں کی تعریف کرتا ہے کہ صبح ہی صبح کھانا کھا لیتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب سلطان سلیمان ذیشان کے لیے لکھی گئی تھی۔(9)

مینویل بردود ان متعدد یورپ نژاد یہودی طبیبوں میں سے تھا جو سلطان کی ملازمت میں تھے۔ ان لوگوں نے اتنی اہمیت اختیار کر لی تھی کہ عثمانی دربار کے روزنامچوں کے مطابق طبیبوں کے دو دستے بنا لیے گئے تھے ایک مسلمان طبیبوں کا اور دوسرا یہودی طبیبوں کا۔ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان اطباء ابھی تک مسلمانوں کا قدیم طریقہ علاج ہی استعمال کر رہے تھے اور یہودی یورپ کے طریقہ پر کاربند تھیں حالانکہ یورپ کے ساتھ رابطہ قائم ہو جانے کی وجہ سے ان کا علم بھی بتدریج پرانا ہوتا جا رہا تھا۔ اس زمانے میں یہودیوں کی لکھی ہوئی کتابوں میں سے ایک کتاب دانتوں کے علاج پر بھی ملتی ہے۔ یہ کتاب موسس ہامون نے لکھی تھی جو اندلسی یہودی تھا اور سلیمان ذیشان نے اسے اپنا یہودی طبیب اعلیٰ مقرر کیا تھا۔(10) دانتوں کی بیماریوں اور علاج پر ترکی زبان میں یہ پہلی کتاب معلوم ہوتی ہے اور غالباً دنیا بھر میں بھی یہ ابتدائی کتابوں میں سے ہی ہے۔ اس زمانہ کا ایک اور مختصر سا رسالہ مرکبات پر ہے جس کا لکھنے والا انکساری میں اپنے آپ کو موسیٰ جالینوس اسرائیلی کہتا ہے۔ وہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس کے رسالے کی اساس اسلامی، فرنگی، یونانی اور یہودی تحریروں پر ہے۔

ان یہودی طبیبوں میں سے کئی نے تو سیاسی کردار بھی ادا کیا۔ سلطان اور وزیروں کے

ساتھ چونکہ ان کے ذاتی تعلقات ہوتے تھے اور وہ یورپ کی زبانوں اور وہاں کے حالات سے بھی واقف ہوتے تھے اس لیے ترک حکمرانوں اور غیر ملکی سفیروں دونوں کے لیے وہ بہت کار آمد ہوتے تھے۔ چنانچہ ان میں سے بعض نے تو کافی اثر ورسوخ حاصل کیا۔ اور کئی تو سفارتی نمائندے بنا کر باہر بھی بھیجے گئے۔

اس سے اگلی صدی میں عثمانی اطباء کو ایک ایسا تلخ تجربہ ہوا جس کی وجہ سے انہیں مجبوراً یورپ کی طبی مہارت سے رجوع کرنا پڑا۔ یہ ایک ایسی بیماری تھی جس سے پہلے ان کا واسطہ نہیں پڑا تھا اور یہ مغرب سے آئی تھی۔ اسی لیے اس کا نام ہی فرنگی مرض پڑ گیا جو آج تک مروج ہے۔ یہ مرض تھا آتشک۔ اس مرض پر پہلا ترکی مقالہ تھا جو ان طبی مقالوں کے مجموعہ کا ایک حصہ تھا جو سلطان محمد چہارم کو 1655ء میں پیش کیا گیا تھا۔ یہ مقالہ وردنا کے جیرو لاموفرا کا سترد (1483-1553) کی مشہور تحریروں پر مبنی ہے اور اس میں ژاں فیناں (وفات 1558) سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ اس میں دوسرے امراض سے جو بحث کی گئی ہے اس میں سولہویں صدی کے متعدد مشہور یورپی ڈاکٹروں کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف یورپی طب سے آشنا ہے اور شاید لاطینی زبان بھی جانتا ہے یا کم سے کم اس کے پاس کوئی آدمی ہے جو اسے لاطینی پڑھ کر سمجھا دیتا ہے۔ لیکن یورپی طب کے بارے میں ان کا علم قدرے پرانا ہے۔ یہ کتاب 1655ء میں سلطان کو پیش کی گئی تھی لیکن اس میں جن یورپی کتابوں کے حوالے دیئے گئے ہیں وہ سولہویں صدی کے ہیں۔ (11) جو یہودی طبیب سولہویں صدی میں یورپ سے آئے وہ اس صدی کے علم طب کے اعلیٰ ترین مدارج کی نمائندگی کرتے تھیں لیکن سترہویں صدی میں جو یہودی طبیب ترکی میں موجود تھے ان کا علم سولہویں صدی کا تھا۔ سترہویں صدی کے وسط سے سلطنت عثمانیہ کے یونانی طبیب تربیت حاصل کرنے اٹلی بھیجے جاتے تھے لیکن اس سے کوئی بنیادی تبدیلی پیدا نہیں ہوئیں عثمانی سلطنت میں سائنسی کتابیں اور رسالے لکھنے میں جتنا وقت لیا جاتا اور جس طرح وہ سہج سہج لکھی جاتیں اس سے مغربی اور عثمانی سائنس کے درمیان وقت کا ایک بہت بڑا فاصلہ پیدا ہو گیا' اور پھر وہ فاصلہ بڑھتا ہی گیا۔

عثمانی کتابوں میں وقتاً فوقتاً مغربی سائنس کے جو حوالے ملتے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ریسرچ' افکار و خیالات کے تبادلے اور علم میں بتدریج اضافے کے حوالے سے نہیں سوچتے تھے۔ نئی دریافتوں کے بارے میں جاننے کی کوشش کہیں نظر نہیں آتی ایسا لگتا ہے کہ انہیں یہ

علم ہی نہیں تھا کہ ایسا کوئی عمل کہیں ہو بھی رہا ہے۔ اس زمانے میں تشریح اعضا اور افعال اعضاء کے علوم میں جو زبردست انقلاب آ رہا تھا اس سے وہ لوگ بالکل ہی بے خبر تھے۔

اسلام کے ابتدائی دور میں اجتہاد کا اصول رائج تھا جس کے مطابق علماء فقہا اور قاضی، شریعت اور قوانین کے ان امور میں آزادانہ رائے دے سکتے تھے جن پر قرآن و حدیث میں تفصیل و تشریح موجود نہیں ہے۔ فقہ کا بڑا حصہ اسی طرح وجود میں آیا لیکن رفتہ رفتہ یہ سلسلہ بند ہو گیا اور یہ تصور کر لیا گیا کہ تمام اشکال رفع ہو گئی ہیں چنانچہ قدامت پسند علماء کی طرف سے فیصلہ کر لیا گیا کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا ہے اب آزادانہ رائے کی گنجائش نہیں ہے اور نہ اس کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ تمام سوالوں کا جواب مل چکا ہے اس لیے اب صرف ان پر عمل کرنا ہی کافی ہے۔ اجتہاد کے دروازے بند کرنے کے فیصلے کی روشنی میں اگر مسلمانوں کے ابتدائی کاموں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اجتہاد اور آزادانہ رائے نے مسلمانوں سے کیسے بڑے بڑے کام کرائے تھے اور اس زمانے میں سائنسی دریافتوں اور سائنسی سرگرمیوں کا کتنا بڑا ذخیرہ سامنے آیا تھا۔ اجتہاد کا دروازہ بند ہونے کے ساتھ ہی سائنسی علوم کی تحقیق اور تخلیقی کاموں کی رفتار سست پڑ گئی اور صرف نقل ہی باقی رہ گئی۔

کچھ زمانے کے لیے یورپ سے آنے والے یہودیوں نے عثمانی طب میں ایک نئے دور کا بیج ڈالا۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ جو کچھ وہ اپنے ساتھ لے کر آئے تھے وہ چند نئی معلومات اور تفصیلات ہی تھیں جنہیں انہوں نے پرانے علوم میں شامل کر دیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ چونکہ یورپ سے ان کا رابطہ منقطع ہو گیا اس لیے وہ بھی مشرق وسطی کے معاشرہ کا حصہ بن گئے۔ چنانچہ اب وہ اپنے مسلمان ہمسایوں سے کسی علمی مسئلے پر کسی قسم کا بنیادی اختلاف ہی نہیں رکھتے تھے۔

اس زمانے میں ترکی میں رہنے والے یونانی کسی حد تک یہودیوں کی جگہ لے رہے تھے۔ اب ان کا اثر و رسوخ بڑھ رہا تھا۔ پیناجیوتس نکوسیاس پہلا یونانی نژاد عثمانی تھا جو طب کی تعلیم حاصل کرنے پادوا یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ جہاں سے وہ 1650ء میں فارغ التحصیل ہوا۔ استنبول واپس آ کر وہ معالج کی حیثیت سے اتنا کامیاب ہوا کہ وزیر اعظم محمد کوپرولو نے اسے اپنا ذاتی معالج بنا لیا۔ اور جیسا کہ پہلے یہودی طبیبوں کے معاملے میں ہوا تھا اب وزیر اعظم یورپ کے معاملات میں اپنے یونانی معالج کے مشوروں پر بھروسہ کرنے لگے۔ نکوسیاس نے اتنی ترقی کر لی کہ دربار عالیہ میں ترجمان اعلیٰ بن گیا۔ غالباً اتنے اہم عہدہ پر مقرر ہونے والا وہ پہلا یونانی تھا۔

1673ء میں اس کے انتقال کے بعد ایک اور یونانی ڈاکٹر اس عہدہ پر متمکن ہوا۔ اس کا نام تھا کیوتے ایلیگزینڈر ماد رکورداتو۔ اس نے دوران خون میں پھیپھڑوں کے عمل پر ایک تحقیقی مقالہ تحریر کیا۔ لیکن یہ مقالہ اس نے لاطینی زبان میں شائع کرایا اسی لیے اسے عثمانی طب کے بجائے یورپی طب کی تاریخ کا حصہ مانا جاتا ہے۔ بہرحال عثمانی تاریخ میں اس کا نام ترجمان اعلیٰ کی حیثیت سے آتا ہے۔

اوائل اٹھارویں صدی اپنے ساتھ چند تبدیلیاں لائی۔ 1704ء میں ایک طبیب عمر شفائی نے علاج معالجے میں علم کیمیا کے استعمال پر ایک مختصر سا رسالہ تحریر کیا جسے اس نے پیراکلیس کا ترجمہ قرار دیا۔ اسی زمانے میں کریٹ کے ایک یونانی نومسلم نوح ابن عبدالمنان نے طب کی ایک اور کتاب ترجمہ کی۔ ایک اور طبیب شعبان شفائی نے جو مسجد سلمانیہ سے منسلک مدرسہ طبیہ کا استاد تھا۔ حمل' بچہ کی پیدائش اور پیدائش سے پہلے اور بعد میں ماں اور بچہ کی دیکھ بھال پر ایک مقالہ تحریر کیا۔ یہ تمام تحریریں علم طب کی ایک نئی قسم اور علاج معالجہ میں ایک نئے انداز کی نشاندہی کرتی ہیں۔

ظاہر ہے اس اختراعی فکر کی مخالفت بھی ہونا تھی۔ قدیم مدرسہ فکر کی طرف سے ان کے خلاف اتنا شور مچایا گیا کہ 1704ء میں ایک فرمان کے ذریعہ "طب جدید" کا استعمال ممنوع قرار دے دیا گیا۔ کہا یہ گیا کہ جاہل طبیب یہ کام کر رہے ہیں۔ فرمان میں کہا گیا تھا کہ "بعض نام نہاد فرنگی اطباء کی برادری نے قدیم اطباء کا طریقہ کار ترک کر دیا ہے اور وہ بعض ایسے علاج معالجے کر رہے ہیں جنہیں "طب جدید" کہا جاتا ہے۔" ترک اطباء کو ہدایت کی گئی کہ دوبارہ امتحان کے لیے پیش ہوں۔ غیر ملکی اطباء پر علاج کرنے کی پابندی لگا دی گئی۔ لیکن اس فرمان کے باوجود عمر شفائی نے جدید طب پر تحقیق جاری رکھی اور آٹھ جلدوں میں اپنی تحقیق شائع کی۔ اگرچہ سرکاری طور پر جالینوس اور ابن سینا کی طب کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی لیکن پیرکلیس کے پیروکاروں کی تعداد بھی بڑھنا شروع ہو گئی تھی۔ (12)

متعدد سفارتی نمائندے جو یورپ جاتے تھے وہ سائنس بالخصوص ٹیکنالوجی کی طرف توجہ دینے لگے تھے۔ محمد سعید آفندی نہایت دلچسپی کے ساتھ فرانس کے رسل و رسائل کے نظام کا بار بار ذکر کرتا ہے اور ان نہروں' پلوں' سڑکوں اور سرنگوں کے حوالے دیتا ہے جن سے وہ جنوبی ساحل سے پیرس تک جاتے ہوئے گزرا۔ اسے رصدگاہ بھی لے جایا گیا تھا جہاں اس نے علم

فلکیات کے اور دوسرے آلات دیکھے اوران کا مقصد اوران کی افادیت بھی اس کی سمجھ میں آئی۔ وہ بے شمار ایسی مشینوں کا ذکر کرتا ہے جن سے ستاروں کا مشاہدہ کیا جاتا تھا' جن سے بھاری بوجھ آسانی سے اٹھالیا جاتا تھا۔ جن سے دیکھا جاتا کہ نیا چاند کب نکلے گا اور جن سے پانی نیچے سے اوپر کھینچا جاتا تھا' اس کے علاوہ اس نے اور بھی کئی عجیب وغریب اور لائق تحسین چیزیں دیکھیں۔ اس نے مجوف آتشی آئینے دیکھے جو اس کے بقول دمشق کے دھات ڈھالنے والے کارخانوں کے بنے ہوئے تھے۔ وہ بڑے طشت کے برابر تھے۔ ان آئینوں سے اتنی تیز حرارت پیدا ہوتی تھی کہ لکڑی جل جاتی اور دھات پگھل جاتی۔ وہ فلکیات کے آلات پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کرتا ہے اور دوربین کی بہت تعریف کرتا ہے۔(13)

تاہم دوسرے لوگ ان چیزوں سے زیادہ متاثر نہیں ہوئے۔ سائنس اور اس کے ذریعہ بنائے جانے والے آلات کے بارے میں اس قسم کے رویہ کی ایک مثال مصطفیٰ ہطی آفندی کے ایک سفارتی روزنامچے میں ملتی ہے۔ مصطفیٰ 1748ء میں سرکاری کام سے ویانا گیا تھا۔ جرمنی میں اسے اور اس کے رفقاء کو رصدگاہ دیکھنے کی دعوت دی گئی تاکہ اس زمانے کے سائنسی کارنامے اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔ وہ وہاں گیا لیکن اس سے متاثر نہیں ہوا:

> "شہنشاہ کے حکم پر ہمیں رصدگاہ میں آنے کی دعوت دی گئی تاکہ ہم چند عجیب و غریب آلات اور حیرت انگیز چیزیں دیکھیں جو وہاں رکھی تھیں۔ ہم نے چند دن بعد ان کی دعوت قبول کر لی اور سات' آٹھ منزلہ عمارت پر گئے۔ بالائی منزل پر اس عمارت کی چھت کھلی تھی۔ ہم نے فلکیات کے آلات دیکھے اور سورج' چاند اور ستارے دیکھنے والی چھوٹی بڑی دوربینیں بھی دیکھیں۔ بہت سے کل پرزوں میں سے ایک چیز ایسی ہمیں دکھائی گئی جو یہ تھی کہ دو ملحقہ کمرے تھے۔ ان میں سے ایک میں ایک بہت بڑا پہیا سا تھا اس پہیئے پر دو بہت ہی بڑی شیشے کی مدور گیندیں تھیں۔ اس کے ساتھ ایک کھوکھلا بیلن (سلنڈر) لگا تھا جو اس سے بھی پتلا تھا اس میں سے ایک لمبی زنجیر دوسرے کمرے تک چلی گئی تھی۔ جب وہ پہیہ گھمایا جاتا تو زنجیر میں سے تیز طوفانی ہوا اس کمرے میں جاتی اور وہاں زمین سے اوپر اٹھتی اگر کوئی آدمی اسے چھو لیتا تو اس کی انگلی پر ضرب لگتی اور اس کا جسم لرز اٹھتا۔ اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات

یہ ہے کہ جو آدمی اسے چھوتا اگر کوئی اور آدمی اسے چھوتا' اور اس آدمی کو ایک اور آدمی چھوتا اور اسے کوئی اور' اور اس طرح دائرہ بنا کر بیس تیس آدمی ایک دوسرے کو چھوتے تو ان سب کی انگلیوں پر ویسا ہی جھٹکا لگتا جیسا پہلے آدمی کو لگا۔ ہم نے خود اس کا تجربہ کیا۔ چونکہ انہوں نے ہمارے سوالوں کے واضح جواب نہیں دیئے اور چونکہ وہ ساری چیزیں محض کھلونا ہیں اس لیے ہم نے مناسب نہیں جانا کہ اس کے بارے میں مزید معلومات حاصل کی جائیں۔

ایک اور چیز جو انہوں نے ہمیں دکھائی وہ تانبے کی دو طشتریوں سے بنی ہوئی تھی۔ ہر طشتری ایک ایل (ایک ایل 45 انچ لمبا ہوتا ہے) کے فاصلے پر ایک کرسی پر رکھی تھی۔ ایک طشتری میں آگ بھڑکائی جاتی تو دوسری طشتری پر بھی وہی اثر ہوتا اور ایسا دھماکہ ہوتا جیسے آٹھ بندوقیں چلائی گئی ہوں۔

تیسری چیز ایک چھوٹی سی مشین تھی۔ ہم نے دیکھا کہ انہوں نے شیشی کو پتھر پر مارا لیکن وہ نہیں ٹوٹی۔ پھر انہوں نے سنگ چقماق کے ٹکڑے شیشی میں ڈالے تو انگلی کے برابر موٹی وہ شیشی جو پتھر سے بھی نہیں ٹوٹی تھی آٹے کی طرح بکھر گئی۔

ہم نے اس کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ اگر شیشی کو آگ سے نکالنے کے فوراً بعد پانی میں ٹھنڈا کر لیا جائے تو ایسا ہو جاتا ہے۔ ہم نے اس جواب کو فرنگیوں کا کرتب ہی جانا۔

ایک صندوق تھا جس کے اندر ایک آئینہ تھا اور باہر لکڑی کے دو کنڈے تھے۔ وہ کنڈے گھمائے جاتے تو اندر سے آہستہ آہستہ کاغذ نکلنا شروع ہوتا۔ کاغذ پر باغ، محل اور دوسری پرستانی چیزیں بنی ہوئی تھیں۔

ان کھلونوں کی نمائش کے بعد ماہر فلکیات کو خلعت عطا کی گئی۔ اور رصدگاہ کے ملازموں کو نقد انعام دیا گیا۔ (14)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اٹھارہویں صدی کے یورپی باشندے سائنسی عجائبات سے اپنے عثمانی ہم عصروں کے مقابلے میں زیادہ متاثر ہوتے تھے؟ درحقیقت اصل فرق معاشرتی اور تہذیبی رویوں کا تھا۔ ترک اپنے معاشرے کے رویوں کا اظہار کر رہے تھے اور مغربی نمائندے اپنے معاشرتی رویوں کا۔

اس کے علاوہ عثمانی دوسرے مسلمانوں کی طرح ہی مغرب میں رہنے والے مشرکوں سے نفرت کرتے تھے۔ لیکن فرق یہ تھا کہ عثمانی نفرت کے ساتھ ان ذہین و فطین کافروں کی ان سائنسی اختراعات کا مطالعہ کرنے اور ان سے استفادہ کرنے کے لیے تیار بھی تھے جو ان کے طرز حیات کو خطرے میں ڈالے بغیر ان کے کام آ سکیں۔ یہ نکتہ استنبول میں مقدس سلطنت روما کے سفیر گیلن وی بسبک نے اس طرح بیان کیا ہے:

"کسی قوم نے دوسروں کی کار آمد اختراعات قبول کرنے میں اتنی رد و کد نہیں کی۔ (جتنی مسلمانوں نے) مثلاً انہوں نے اپنے استعمال کے لیے چھوٹی بڑی توپیں اور دوسری دریافتیں تو قبول کر لیں لیکن وہ اپنے آپ کو کبھی اس بات پر آمادہ نہیں کر سکے کہ کتابیں طبع کریں اور عام لوگوں کے لیے گھڑیال لگائیں۔ ان کا ایمان ہے کہ ان کی مقدس کتابیں اگر طبع کی جائیں گی تو مقدس نہیں رہیں گی۔ اور اگر عام گھڑیال لگا دیئے جائیں تو ان کے موذن کا اختیار اور قدیم روایات ختم ہو جائیں گی۔" (15)

لیکن ترکوں نے یہ دونوں کام جلد ہی کر لیے۔ ترکی اور عربی کتابوں کی طباعت اٹھارہویں صدی میں شروع ہو چکی تھی اور گھڑیاں اس سے بھی پہلے سے درآمد کی جانے لگی تھیں حتیٰ کہ عظیم شاہی مسجد میں بھی آخر کار کلاک لگا دیا گیا تھا۔

مسلمانوں کے لیے وقت کی پیمائش کے آلات کوئی نئی چیز نہیں تھے بلکہ زمانہ قدیم سے دھوپ اور پانی کے ذریعہ وقت معلوم کرنے کے جو آلات چلے آ رہے تھے مسلمانوں نے ان میں ترمیم و تبدیلی کر کے خود اپنے آلات بنا لیے تھے۔ یورپ کی مشینی گھڑیوں سے مسلمانوں کی دلچسپی بہت پہلے شروع ہو چکی تھی۔ مغرب نے یہ مشینی گھڑیال چودھویں صدی سے بنانا شروع کر دیئے تھے۔ سولہویں صدی تک یورپی کلاک اور گھڑیاں عثمانی سلطنت میں کافی نظر آنے لگی تھیں بلکہ ان کی نقل بھی شروع ہو گئی تھی۔ گھڑی سازی کے فن پر شام کے ایک شخص تقی الدین (1525-1588) کی ایک کتاب خاص طور پر قابل ذکر ہے جس میں بتایا گیا کہ وزن اور بیرنگ سے کس طرح گھڑیاں چلتی ہیں۔ یہ کتاب اس فن کی تاریخ میں نمایاں مقام رکھتی ہے۔

تاہم عثمانی سلطنت میں جو گھڑیال اور گھڑیاں استعمال کی تھیں وہ ساری ہی یورپ سے درآمد نہیں کی جاتی تھیں۔ 1630ء سے 1700ء تک استنبول کے محلے غلاطہ میں گھڑی سازوں کی

ایک باقاعدہ انجمن تھی۔ ان کی گھڑیوں اور گھڑیالوں کا معیار سوئیس اور برطانوی گھڑیوں کے ماہرین کے برابر تھا۔ تاہم وہ یورپ کے پناہ گزین تھے مقامی مسلمان نہیں تھے اور پھر سترہویں صدی کے آخر تک وہ بھی اپنا معیار برقرار نہیں رکھ سکے تھے۔ ان کے زوال میں کئی عوامل کا ہاتھ تھا۔ ان میں سے ایک ضروری پرزوں کے حصول میں بڑھتی ہوئی مشکلات تھیں جو مغربی ملکوں کی تاجرانہ ذہنیت کی وجہ سے پیدا ہوئی تھیں۔ کیونکہ وہ خود ہی عثمانی ذوق اور بازار کی ضرورت کے مطابق گھڑیاں بنا رہے تھے اور برآمد کر رہے تھے۔ اب وہ مکمل گھڑیاں برآمد کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کے کل پرزے اور ضروری سامان جو پہلے بھیجتے تھے اب وہ بھیجنا نہیں چاہتے تھے۔ ایک اور وجہ تھی یورپ میں پنڈولم کلاک اور سپرنگ سے چلنے والی گھڑیوں کی تیاری اور ان کے ڈیزائنوں میں ترقی جس کا مقابلہ استنبول کے گھڑی ساز نہیں کر سکتے تھے۔ اٹھارہویں صدی کے ابتدائی برسوں میں ہی ترکی میں گھڑی سازی کی صنعت ختم ہوگئی۔ ترکی جانے والے آخری مغربی گھڑی سازوں میں سے ایک گھڑی ساز مشہور فرانسیسی ماہر عمرانیات ژاں ژاک روسو کا باپ آئزک روسو تھا۔ ژاں ژاک روسو نے بھی اپنے ''اعترافات'' میں لکھا ہے کہ ''میرے بھائی کی پیدائش کے بعد میرے والد قسطنطنیہ روانہ ہوئے جہاں سلطان کے دربار میں گھڑی ساز مقرر ہوئے تھے۔''

عجیب اتفاق ہے کہ ترکی میں گھڑی کی منڈی سے والتیئر کا بھی تعلق تھا۔ ایک جاگیردار کی حیثیت سے اس نے اپنی جاگیر کے لوگوں کی مدد کے لیے کچھ کام کیے تھے۔ ان لوگوں میں جنیوا کے چند مذہبی پناہ گزیں بھی تھے' اتفاق سے یہ گھڑی ساز تھے۔ والتیئر نے ان کی گھڑیوں کی فروخت کے لیے منڈیاں تلاش کرنے کی کوشش کی۔ 1771ء میں والتیئر نے فریڈرک اعظم کے نام ایک خط میں لکھا کہ ترکی بہت اچھی منڈی ہے۔ گزشتہ ساٹھ سال سے وہ جنیوا سے گھڑیاں درآمد کر رہے ہیں اور اب تک وہ اس قابل نہیں ہوئے کہ ایک بھی گھڑی تیار کر سکیں یا اسے ٹھیک ہی کر سکیں۔''(16)

گھڑیوں اور گھڑیالوں کے علاوہ ایک اور یورپی ایجاد ایسی تھی جو مشرق وسطی کے لوگوں کو کارآمد نظر آتی تھی۔ ایران جیسے دور دراز مشرقی ملک میں 1480 کے اوائل میں ایک شاعر بڑھاپے کی آمد کا افسوس کرتے ہوئے دوسری کمزوریوں کے علاوہ کہتا ہے:

''میری دونوں آنکھیں اس وقت تک کام نہیں کرتیں جب تک فرنگی شیشہ نہ

لگاؤں۔اس سے (فرنگی شیشے سے) وہ چار ہوگئی ہیں۔" (17)

ادھر روایتی طرز زندگی کے لیے خطرہ بننے والی چیزوں کی چھان پھٹک کا کام بھی بہرحال جاری تھا۔ یہ پابندیاں مغربی افکار و خیالات پر تھیں جو تحقیق و تجسس، تجربات و مشاہدات اوران تبدیلیوں پر اصرار کرتے تھے جو مغربی سائنس اور ٹیکنالوجی کی بنیاد تھے۔مغربی ٹیکنالوجی کی مصنوعات خاصی چھان پھٹک کے بعد درآمد کرلی جاتی تھیں اور بعض مواقع پر مغربی سائنس سے بھی کام لیا جاتا تھا لیکن صرف ایک حد تک۔

اٹھارہویں صدی میں یہ سوال اس وقت نہایت شدت کے ساتھ سامنے آیا جب پے در پے شکستوں کے بعد عثمانی حکومت کی اشرافیہ کو احساس ہوا کہ سلطنت عثمانیہ کے عیسائی دشمن فن حرب میں زبردست فوقیت حاصل کر چکے ہیں اور عثمانی طاقت بحال کرنے کے لیے تبدیلی ناگزیر ہو چکی ہے۔ ان جذبات کا اظہار جانکلی علی پاشا کی اس یادداشت میں پوری طرح ہوتا ہے جو 1774ء میں عثمانیوں کی روس سے زبردست شکست کے بعد اس نے لکھی تھی۔علی پاشا نے لکھا ہے کہ دو سوال ایسے ہیں جو اس کے ذہن کو ہر وقت مضطرب رکھتے ہیں۔ ایک سوال یہ ہے کہ وہ سلطنت جو اتنی زیادہ طاقت ور تھی اتنی کمزور کیسے ہوگئی ہے۔ اور دوسرے اس کی طاقت و عظمت بحال کرنے کے لیے کیا کیا جا سکتا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ ترک عساکر اب بھی ویسی ہی بہادر ہیں، عوام کی تعداد بھی اتنی ہی ہے۔ سرحدیں بھی اتنی ہی وسیع ہیں اور وسائل سلطنت بھی ابھی تک بہت زیادہ ہیں۔ تاہم پہلے عساکر اسلام عام طور پر کافروں کو اپنا دفاع کرنے پر مجبور کرتی تھیں اور آج کافر مسلمانوں کو دفاع پر مجبور کر دیتے ہیں۔ (18)

تاہم جانکلی علی پاشا جو علاج تجویز کرتا ہے وہ قدامت پرستوں والا ہی ہے کہ پرانے سنہری دور کی طرف واپس چلے جاؤ۔ لیکن کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو اصل مسئلہ مغرب کی فوجی برتری کو سمجھ رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ اس کا جواب فوجی اصلاحات ہیں۔ اس کا ایک اہم حل یہ تھا کہ جدید فن حرب کے لیے تربیتی مراکز قائم کیے جائیں۔

اٹھارویں صدی میں بری اور بحری انجینئرنگ کے جو نئے مراکز قائم کیے گئے انہوں نے مغربی سائنس کے بعض پہلوؤں کو قبول کرنے کے لیے تحریک پیدا کی۔ 1734ء میں انجینئرنگ کا اسکودر مرکز کھولا گیا تھا۔ اس کا ایک استاد محمد سعید تھا جو اناطولیہ کے مفتی کا بیٹا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے توپچیوں کے استعمال کے لیے ہدف کے فاصلے کی پیمائش کا آلہ ایجاد کیا تھا جو دو

فولادی پتروں پر مشتمل تھا۔ اس کے علاوہ اس نے ایک رسالہ لکھا تھا جس میں جغرافیائی اشکال بھی تھیں۔ اس زمانے کی دوسری تحریریں بھی موجود ہیں جن میں علم مثلث پیمائی کا ایک ترکی رسالہ بھی ہے یہ رسالہ غالباً مغربی مآخذوں پر مبنی ہے۔ اٹلی کے فوجی کاؤنٹ مونٹے بوکی عسکری فنون پر مشہور کتاب کا ترجمہ اور علم طب پر چند کتابیں بھی ان میں شامل ہیں۔ (19)

پہلے تربیتی مرکز اور پہلے انجینئرنگ دستے کے قیام کی مخالفت بھی اسی کے ساتھ ہی شروع ہوگئی تھی یہ زبردست مخالفت ترکی جاں نثار کررہے تھے۔ اور آخر وہ انہیں بند کرانے میں کامیاب بھی ہوگئے۔ پھر بھی مسلح افواج کو جدید بنانے کا عمل ختم نہیں ہوا۔ 1773ء میں بحری انجینئرنگ کا ایک نیا مرکز قائم کرکے یہ سلسلہ پھر شروع کیا گیا۔ اس مرکز کے استادوں میں کئی یورپی استاد بھی تھے۔ اس مرکز کے طلبہ میں کچھ تو پرانے مراکز کے لڑکے ہی تھے کچھ فوجی افسروں کے بیٹے تھے۔ توپ خانے کا ایک مغربی افسر جس نے یہ مرکز قائم کرنے میں مدد کی تھی۔ ''سفید داڑھی والے کپتان اور ساٹھ سال کے شاگردوں کا ذکر کرتا ہے۔ (20)

اس بار رجعت پسند طاقتیں یہ مرکز بند کرانے میں کامیاب نہیں ہوسکیں بلکہ وہ مرکز ترقی کرتے رہے۔ سلطان سلیم ثالث اور دوسرے مسلمانوں نے فوجی انجینئرنگ، طب اور اسی قسم کے دوسرے علوم کے جو مراکز قائم کیے ان کے لیے اس مرکز نے نمونے کا کام دیا۔ وینس کے پادری جیان بتستا تودرینی نے جو 1781ء اور 1786ء کے درمیان استنبول گیا تھا اس مرکز کی تفصیل بیان کی ہے۔ اس نے وہاں جہازرانی کے بہت سے آلات، اٹلسیں اور یورپی بحری نقشے دیکھے۔ اس کے علاوہ اٹلس مائنر کا ترکی نمونہ، ستاروں کی رفتار بتانے والا گلوب جس پر ترکی زبان میں ستاروں اور سیاروں کی علامتیں تھیں۔ مرکز کے کسی استاد کا ہی یہ کارنامہ تھا۔) نیز پیرس کا بنا ہوا فولادی آکاش گولہ (جس سے افلاک کے بنیادی دائروں اور گردشوں کی پیمائش کی جاتی ہے) چند عرب اصطرلاب، چند ترکی فرنگی دھوپ گھڑیاں، ایک نہایت اعلیٰ برطانوی ثمن دائرہ (جہازرانی کے کام آنے والا) جسے جان ہیڈلی نے بنایا تھا، کئی ترکی قطب نما اور دوسرے بحری آلات بھی وہاں تھے۔

ایک دوسرے کمرے میں تودیرینی کو ایشیا کا نقشہ دکھایا گیا جو ریشمی پارچہ پر چھپا ہوا تھا اس کے نیچے ترکی زبان میں لکھا تھا کہ یہ متفریقہ ابراہیم نے 1141 ہجری (29-1728 عیسوی) میں ترجمہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ مختلف سائز کے تین ارضی گلوب پیرس کی بنی ایک بہت ہی اعلیٰ

زاویہ پیما دوربین' فاصلوں کی پیمائش کے جدید آلات' ایک زاویہ دار بلندیوں کی پیمائش کرنے والی دوربین اور مثلث پیمائی کی کئی جدولیں بھی وہاں تھیں۔ تودرینی کہتا ہے کہ اس نے وہاں جہازوں کے مستول چڑھانے اور اتارنے والی مشین کے وہ ماڈل نہیں دیکھے جو توت نے بنائی تھی۔ یورپ کی بہت سی کتابوں میں سے اس نے موسیودی لالانڈے کی ستاروں کی گردش کی جدولیں بھی دیکھیں جن کا ترکی میں ترجمہ کیا گیا تھا۔ اس نے گائیڈ کو بتایا کہ یہ جدولیں جدید نہیں ہیں اور مشورہ دیا کہ نیا ایڈیشن منگایا جائے۔ اس کے گائیڈ نے اسے منجنیقوں کے علم سے متعلق ترکی زبان کی جدولیں بھی اسے دکھائیں یہ یورپی کتابوں سے ترجمہ کی گئی تھیں اور اصطرلاب' دھوپ گھڑی' قطب نما اور جیومیٹری پر کتابیں بھی تھیں جو پڑھائی جاتی تھیں۔

تودرینی کا گائیڈ اس مرکز کا چیف انسٹرکٹر تھا۔ وہ پکی عمر کا الجزائری تھا جو اطالوی' فرانسیسی اور ہسپانوی زبانیں بول سکتا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ بحیرۂ روم' بحراوقیانوس اور غرب الہند حتیٰ کہ امریکہ تک کا بحری سفر کر کے استنبول پہنچا ہے۔ وہ ایک ماہر جہازراں تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ انگلستان کے آلات اور فرانسیسی نقشے زیادہ پسند کرتا ہے۔

الجزائری استاد نے بتایا کہ مرکز میں پچاس سے زیادہ طلبہ ہیں۔ یہ طلبہ جہازوں کے کپتانوں اور ترک معززین کے بیٹے ہیں' لیکن ان میں چند ہی ایسے ہیں جو توجہ اور محنت سے پڑھتے ہیں۔(21)

لیکن 1783ء میں روس نے کریمیا پر قبضہ کر لیا تو یہ طلبہ بھی اپنی پڑھائی پر زیادہ توجہ دینے لگے کیونکہ اب عثمانیوں کو احساس ہوا کہ وہ جس قسم کے خطرے سے دوچار ہیں اس کا سامنا کرنے کے لیے انہیں زیادہ عقل وہوش سے کام لینا پڑے گا۔ 1784ء میں وزیر خلیل حامد پاشا کی تحریک پر اور فرانسیسی سفارت خانہ کی مدد سے تربیت کا ایک نیا پروگرام شروع کیا گیا۔ تربیت دینے والے دو فرانسیسی انجینئر تھے جو آرمینیا کے ترجمانوں کی مدد سے پڑھاتے تھے۔ لیکن 1787ء میں آسٹریا اور روس کے ساتھ جنگ چھڑ جانے کے بعد یہ پروگرام بھی بند ہو گیا۔ ترکی میں فرانسیسی استادوں کی موجودگی کو غیر جانبداری کے منافی سمجھا گیا اس لیے فرانس نے انہیں واپس بلا لیا۔ ان استادوں کی واپسی اور جنگ کی مشکلات نے تربیتی پروگرام کو نقصان پہنچایا۔ آخر 1792ء میں شمالی ہمسایوں کے ساتھ صلح ہو جانے کے بعد نئے سلطان سلیمان ثالث کو یہ موقع ملا کہ یہ کام دوبارہ شروع کیا جائے۔ اب پھر فرانس سے ہی رجوع کیا گیا اور 1793ء میں استادوں

اور کاریگروں کا ایک فہرست پیرس بھیجی گئی جن کی ترکی میں ضرورت تھی۔ 1796ء میں رئیس آفندی واتب نے ایک اور اس سے بھی طویل فہرست پیرس بھیجی۔ یہ فہرست فرانس کی تحفظ عامہ کی کمیٹی کو بھیجی گئی تھی۔ فرانس میں اب کوئی بادشاہ نہیں تھا بلکہ وہاں جمہوریہ قائم ہو چکی تھی لیکن ترک سلطان کو اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ 1796ء میں فرانس کا نیا سفیر جنرل آبیرٗ دوبیت جو امریکی اور فرانسیسی انقلاب میں حصہ لے چکا تھا' فرانس کے فوجی ماہروں کے ایک گروپ کے ساتھ استنبول پہنچا۔ (22) اس مرتبہ فوجی اور بحری افسروں کی تربیت کے گئے مکتب کھولے گئے ان میں توپ خانہ' قلعہ بندی' جہاز رانی اور اس کے معاون علوم کی تعلیم و تربیت دی جاتی تھی۔ فرانس کے استادوں سے کہا گیا کہ وہ انسٹریکٹر کے طور پر کام کریں اور طلبہ کے لیے فرانسیسی زبان سیکھنا لازمی قرار دے دیا گیا۔ لائبریری میں بھی قریب چار سو یورپی کتابیں تھیں' ان میں بیشتر فرانسیسی تھیں۔ ان کتابوں میں فرانسیسی کی مشہور انسائیکلوپیڈیا (Grande Encyclopedie) بھی تھی۔

فرانس کی انقلابی جنگوں اور پھر نپولین کی جنگوں کی وجہ سے ایک بار پھر یہ مرکز مشکلات میں پھنس گئے۔ چند مرکز تو رجعت پسندوں کے دباؤ کے باعث بند ہی ہو گئے۔ سلطان محمود ثانی نے 1826ء میں جب اصلاحات شروع کیں تو اس وقت صرف دو مرکز باقی تھے ایک فوجی تربیت کا اور دوسرا بحری انجینئرنگ کا۔ ان کے ساتھ 1827ء میں ایک میڈیکل کالج اور 1834ء میں ملٹری سائنسز کا کالج قائم کیا گیا۔ اس کالج کو انگلستان کے سینڈھرسٹ کی طرز پر قائم کیا گیا تھا۔ ان تمام کالجوں کے استادوں میں غیر ملکی استادوں کی تعداد زیادہ تھی جن میں بیشتر فرانسیسی تھے۔ طلبہ کے لیے ایک غیر ملکی زبان سیکھنا لازم تھا۔ جو مسلمان مغربی زبانیں جانتے تھے ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ مغربی سائنس پڑھیں اور مغربی کتابوں کا ترکی میں ترجمہ کریں یا خود ترکی زبان میں نصابی کتابیں لکھیں تاکہ جدید تیکنیکی اور سائنسی اصطلاحات پیدا ہوں جو ترکی زبان میں مفقود تھیں۔

اس کام کے لیے دو آدمیوں نے نہایت اہم خدمات انجام دیں۔ ان میں سے ایک تھا عطاء اللہ محمود عرف شانی زادے (1816-1769) وہ اپنی وفات تک شاہی مورخ رہا۔ تعلیم و تربیت کے لحاظ سے وہ علماء کے طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ لیکن اس نے اپنے طور پر یورپ کی کم سے کم ایک زبان سیکھ لی تھی اور وہاں کی طب اور سائنس کا مطالعہ کیا تھا۔ شاہی تاریخ نویسی کے علاوہ اس کا سب سے بڑا کارنامہ طب پر آسٹریا کی ایک نصابی کتاب کا ترجمہ ہے جو غالباً اس نے اس

کتاب کے اطالوی ترجمہ سے کیا۔ اس نے تشریح اعضاء اور افعال اعضاء پر اپنی طرف سے بھی ایک مقالہ تحریر کیا۔ اس نے آسٹریا کی ایک اور طبی کتاب کا بھی ترجمہ کیا یہ کتاب حفظان صحت کے ٹیکوں پر تھی۔ ترکی زبان میں اس کی نصابی کتاب آنے سے ایک دور کا خاتمہ اور دوسرے دور کا آغاز ہوا۔ اب تک وقتاً فوقتاً مغربی علوم وفنون کے اضافے کے باوجود ترکی میں قدیم یونانی اور اسلامی طریقہ علاج ہی رائج تھا۔ جس کی بنیاد جالینوس اور ابن سینا کے طریقے پر تھی، جیسے اسلامی فلسفے کی بنیاد ارسطو اور بطلیموس کے فلسفے پر تھی۔ پیریکلیس، کوپرنیکس، کیپلر اور گیلیلیو کی دریافتیں ترکوں کے لیے ایسی ہی اجنبی اور بے معنی تھیں جیسے لوتھر اور کیلون کے مذہبی دلائل۔

اب پہلی بار شانی زادے نے ترکی زبان میں نئی طبی زبان پیدا کی (جو جدید دور کی لسانی اصلاحات تک ترکی میں رائج رہی) اس نے طب کے ترک طلبہ کو ایک جامع نصابی کتاب فراہم کی جو ترکی زبان میں طبی کتابوں کی اشاعت اور علاج معالجے کے طریقوں کے لیے نقطۂ آغاز ثابت ہوئی۔

جو کام طب کے لیے شانی زادے نے کیا وہ کام ریاضی اور طبیعیات کے میدان میں خواجہ اسحاق آفندی (وفات 1834) نے کیا۔ اسحاق پیدائشی طور پر یہودی تھا اور یونان کا رہنے والا تھا جو بعد میں کسی وقت مسلمان ہو گیا اور انجینئرنگ کالج میں استاد مقرر ہو گیا۔ وہ ترقی کر کے چیف انسٹرکٹر بن گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ فرانسیسی، لاطینی، یونانی اور عبرانی زبانیں جانتا تھا۔ ترکی، فارسی اور عربی سے تو واقف تھا ہی۔ اسحاق نے کئی کتابیں لکھیں جن میں بیشتر ترجمہ تھیں ان میں سب سے اہم کتاب چار جلدوں پر مشتمل ریاضی اور طبیعیاتی علوم پر کتاب ہے۔ اس کتاب نے پہلی مرتبہ ترک طلبہ کو ان سائنسی علوم سے روشناس کرایا جو مغرب میں پڑھائے جا رہے تھے۔ شانی زادے کی طرح اسحاق آفندی نے بھی ان علوم کے لیے اپنی لغت تخلیق کی جو انیسویں صدی میں ترکی میں رائج تھی اور جو لسانی اصطلاحات تک استعمال ہوتی رہی۔ جس طرح یورپی مصنفین لاطینی اور یونانی زبان کا سہارا لیتے تھے اسی طرح عثمانی علما اور اساتذہ نئی اصطلاحات تخلیق کرنے کے لیے بیشتر عربی اور کسی حد تک فارسی زبانوں کے مصادر پر انحصار کرتے تھے۔ اس لیے اسحاق نے بھی جب اپنی لغت تیار کی تو ان دونوں زبانوں کا ہی سہارا لیا۔ اس کی بعض اصطلاحات عرب ملکوں میں آج بھی رائج ہیں۔ خواجہ اسحاق آفندی کی دوسری تحریریں خاص طور پر فوجی اور انجینئرنگ سائنسوں سے متعلق ہیں۔

ان دو آدمیوں کی کتابوں کی اشاعت' نئے کالجوں کے قیام' جہاں پر کتابیں پڑھائی جا رہی تھیں اور سب سے زیادہ اہم یہ کہ زیادہ سے زیادہ طلبہ کو سائنسی تعلیم کے لیے یورپ بھیجنے سے پرانی سائنس قدیم طب' ریاضی' طبعیات اور کیمیا کا خاتمہ ہو گیا۔ مسلمانوں کے دور افتادہ ملکوں میں یہ قدیم علوم کچھ عرصہ رائج رہے لیکن آخر وہ زمانہ آ گیا جب سائنس کا مطلب مغربی سائنس ہو گیا کیونکہ کوئی اور سائنس تھی بھی نہیں۔

❁......❁......❁

ثقافتی زندگی

جہاں استنبول کا بڑا بازار شروع ہوتا ہے وہیں مسجد نور عثمانیہ واقع ہے۔ اس مسجد کی تعمیر ماہر تعمیرات چلبی مصطفےٰ کی نگرانی میں 1755ء میں مکمل ہوئی۔ راج مستریوں کا سربراہ ایک عیسائی سائمن تھا۔ ترکی میں اسلامی ثقافتی ارتقاء میں یہ مسجد ایک نئے موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر عام نقشہ کے اعتبار سے دیکھا جائے تو مسجد نور عثمانیہ سلطان محمد فاتح سے لے کر آنے والے تمام سلطانوں کے زمانے تک تعمیر کی جانے والی مساجد کی روایت کے مطابق ہی ہے' کہ وسط میں ایک گنبد ہے اور سامنے صحن ہے لیکن فن تعمیر کے بعض دوسرے پہلوؤں کے اعتبار سے اس میں خاصہ فرق ہے۔ یہاں واضح طور پر اطالوی بیروک طرز آرائش کا اثر نمایاں ہے۔ (1)

یہ اثر اس سے پہلے شاہی محل کی آرائش میں بھی دیکھا جا سکتا تھا لیکن شاہی مسجد میں اس اثر کا اظہار ثقافتی زندگی میں بہت بڑی تبدیلی کی نشان دہی کرتا ہے۔ یعنی اب عثمانیوں کے پائے استقامت میں لرزش آ گئی تھی۔ خود اعتمادی کی اس کمی اور اپنے اوپر شکوک و شبہات پیدا ہو جانے کا اظہار پیرس میں متعین عثمانی سفیر محمد آفندی کے اس قول سے ہوتا ہے جو اس نے پیرس کے باغوں کی خوبصورتی دیکھ کر کہا۔ اس نے کہا ''یہ دنیا ایمان والوں کے لیے قید اور مشرکوں کے لیے بہشت ہے۔'' (2)

یورپ کے ثقافتی اثرات کی پہلی لہر' جو مسجد نور عثمانیہ میں دیکھی جا سکتی ہے' اٹھارہویں صدی کے شروع میں آئی۔ عثمانی وقائع میں اس دور کو ''لالے دوری'' یا ''دور لالہ'' (Tulip) کہا جاتا ہے یہ دور 1718ء میں آسٹریا کے ساتھ پسارووٹز کے صلح نامہ کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ اس کا یہ نام اس لیے پڑا کہ پورا عثمانی معاشرہ گل لالہ یا ٹیولپ کے شوق میں دیوانہ ہو گیا تھا۔ یہ امن و امان کا دور تھا۔ سلطان احمد ثالث اور اس کے وزیر اعظم داماد ابراہیم پاشا شمال کی جانب موجود

خطرات سے پوری طرح آگاہ تھے۔ یہ خطرہ صلح نامہ کی وجہ سے وقتی طور پر ٹل گیا تھا۔ ان حالات میں وہ دو مقاصدہ کے لیے کام کر رہے تھے۔ ایک جنگ سے گریز اور دوسرے نئے دوستوں کی تلاش۔ 1699ء میں کارلوونٹر کا جو صلح نامہ ہوا تھا اس نے انہیں ایک راستہ دکھایا۔ وسطی اور مشرقی یورپ میں اپنے ہمسایوں سے خطرہ پا کر انہوں نے مغرب کی طرف دیکھنا شروع کیا تھا اور پہلی بار ان کے ساتھ قریبی تعلقات قائم کیے تھے۔

عثمانی تاریخ میں ''دورِ لالہ'' امن وامان اور ثقافتی فروغ وترقی کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ اسی زمانے سے نئے راستے بھی نکلے۔ توقع کے مطابق سب سے پہلے عثمانیوں نے اپنی تہذیب کے مآخذوں کی جانب رجوع کیا اور باقاعدہ پروگرام کے تحت عربی اور فارسی کی ان کلاسیکی کتابوں کا ترکی میں ترجمہ کرایا جو ابھی تک ترکی زبان میں دستیاب نہیں تھیں۔

ترجمے کے اس منصوبے کو مغرب تک جس طرح وسعت دی گئی وہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ صرف چند سال پہلے وزیر اعظم داماد ابراہیم پاشا نے 1716ء میں پیٹر وارڈین کی جنگ میں وفات پائی تھی تو ایک بہت بڑا کتب خانہ چھوڑا تھا۔ سلطنت کے مفتی اعظم ابوالحسن اسماعیل آفندی نے فتویٰ دیا کہ اس کتب خانے کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچایا جائے۔ یہ کتب خانہ ایک تبرک وقف ہے کیونکہ اس میں فلسفہ' تاریخ' علم نجوم اور شاعری کی کتابیں موجود ہیں (ان میں بعض یورپی کتابیں بھی تھیں) چنانچہ ساری کتابیں شاہی محل بھیج دی گئیں۔(3)

مغرب کے ساتھ یہ دلچسپی ابھی تک بہت محدود تھی۔ اس کا مقصد سلطنت کو مضبوط بنانا اور دشمن کی مزاحمت کرنا تھا۔ مغرب سے جو رہنمائی یا معلومات مطلوب تھیں وہ صرف فوجی و جنگی امور سے متعلق تھیں یا زیادہ سے زیادہ ان سیاسی امور کے بارے میں تھیں جن کا علم ضروری تھا۔ تاہم اس وقت اس حقیقت کا احساس پیدا ہونے لگا تھا کہ فوجی اور سیاسی امور کے علاوہ بھی ایسے معاملات ہیں جن سے آگاہی ضروری ہے۔ اس سلسلے میں محمد آفندی کو دی جانے والی وہ ہدایت قابل ذکر ہے جو 1712ء میں فرانس روانہ ہونے سے پہلے دی گئی۔ اس سے کہا گیا۔ ''قلعہ بندیوں اور کارخانوں کا معائنہ کرنا۔ تہذیبی وسائل و تعلیمی نظام کا گہرا مطالعہ کرنا اور واپسی پر بتانا کہ ان کے کون سے اقدام ترکی میں قابل عمل ہیں۔''(4)

محمد آفندی کی اس سفارت نے دونوں جانب معاشرتی اور ثقافتی زندگی میں ہلچل پیدا کی۔ ترک سفیر کی آمد اور اس کے لباس نے پیرس میں ایک نئے فیشن کو جنم دیا جس کا نام

Turquerie پڑا۔ خواتین نے ایسے لباس پہننا شروع کیے اور فن تعمیر اور موسیقی میں بھی ترکی اثر نمایاں ہوا۔ یہ اثر یورپ کے دوسرے ملکوں تک پھیلا۔ استنبول میں جو فرانسیسی فیشن رائج ہوا اس کا اثر سلطان اور وزراء کے ان محلات میں بالخصوص ان باغوں میں نظر آتا ہے جو ''دورِ لالہ'' میں تعمیر کیے گئے۔ محمد آفندی نے اپنی رپورٹ میں فرانس کے ورسائے اور دیگر مقامات کے باغوں کی تفصیل بیان کی ہے اور ان کی بہت ہی تعریف و تحسین کی ہے۔(5) سنگ مرمر کے فواروں، ان کے اردگرد روشوں اور پھولوں کی کیاریوں سے آراستہ باغوں میں فرانسیسی اثر صاف نظر آتا ہے۔ شاہی محلات میں مغربی طرز کا فرنیچر بھی داخل ہو گیا جو اس سے پہلے نظر نہیں آتا تھا۔ خیال ہے کہ ابتداء میں یہ فرنیچر مغربی مہمانوں کے لیے بنایا گیا تھا۔

فنونِ لطیفہ کی جانب رغبت کے سلسلے میں محمد آفندی کی یہ تحریر ہماری زیادہ اچھی رہنمائی کرتی ہے:

> ''ان لوگوں کے ہاں قاعدہ یہ ہے کہ بادشاہ سفیروں کو ہیروں سے مرصع اپنی تصویر پیش کرتا ہے، لیکن چونکہ مسلمانوں میں تصویر کی اجازت نہیں ہے اس لیے مجھے ہیروں سے مرصع کمر کی ایک پٹی، پیرس کے بنے دو غالیچے ایک بڑا آئینہ، ایک بندوق اور پستول، طلائی ورق چڑھی زیورات کی ایک صندوقچی، طلائی ورق چڑھی تانبے کی گھڑی، برف رکھنے کے لیے چینی کے برتن جن کے دستوں پر سونے کے ورق لگے تھے اور ایک شکردانی پیش کی۔''(6)

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ محمد آفندی تصویر کو اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ پینٹنگز سے اسے یقیناً کوئی دلچسپی نہیں تھی کیونکہ فرانس کے محل میں اسے جو شخصی تصویریں دکھائی گئیں اس نے ان کا صرف سرسری سا ہی ذکر کیا ہے:

> ''پھر ہم نے نہایت ہی عمدہ تصویریں دیکھنا شروع کیں جو دربار کے ایوان عام میں آویزاں تھیں۔ ہم بادشاہ کے ساتھ گھومتے رہے جو خود ہی ان کے بارے میں وضاحت کرتا رہا۔''(7)

اس کے برعکس آرائش و زیبائش کے لیے استعمال ہونے والے کپڑے کی تعریف میں وہ خوب رطب اللسان ہے:

> ''وہاں زیبائشی کپڑے کا ایک خاص کارخانہ ہے جو بادشاہ کی ملکیت ہے......

انہیں معلوم ہوا کہ ایک سفیر وہاں آ رہا ہے تو انہوں نے جتنے اقسام کے کپڑے بھی تیار تھے وہ سب دیواروں پر لٹکا دیئے۔ کارخانہ چونکہ بہت بڑا ہے اس لیے دیواروں پر ایک سو سے زیادہ اقسام کے کپڑے لٹکے ہوں گے۔ ہم نے انہیں دیکھا تو حیرت سے انگلی منہ میں دبالی۔ مثلاً ان پر پھول اس طرح بنے گئے ہیں کہ وہ اصلی پھولوں کا گلدستہ معلوم ہوتے ہیں۔ انسانی شکلوں میں آنکھوں کی پلکیں بھنویں بالخصوص سر کے بال اور داڑھی ایسی بنائی گئی تھیں کہ مانی اور بہزاد بھی اعلیٰ ترین چینی کاغذ پر ایسی تصویریں نہیں بنا سکتے۔ ایک آدمی خوشی و مسرت کے اظہار کے لیے قہقہہ لگاتا دکھایا گیا تھا۔ دوسرا آدمی رنج والم کے اظہار میں افسردہ تھا' ایک اور آدمی آنسو بہاتا تھا۔ ایک آدمی کسی مرض میں مبتلا دکھایا گیا تھا۔ پہلی نظر میں ہی ہر آدمی کے جذبات سامنے آ جاتے تھے۔ ان تصویروں کی خوبصورتی بیان اور تصور سے ماورا ہے۔''(8)

حقیقت پسندانہ آرٹ اور وہ بھی اٹھارویں صد کے آرٹ کے بارے میں محمد آفندی کا ردعمل خاصہ زوردار بھی ہے اور معلوماتی بھی۔ بالخصوص قلمی تصویروں اور زیبائشی کپڑے دیکھ کر اس کا جو متضاد ردعمل ہوتا ہے۔ دیوار پر جو آئل پینٹنگز لگی تھیں وہ اس کے لیے بالکل نئی چیز تھیں۔ لیکن زیبائشی کپڑے جنہیں وہ ''گلیم'' کہتا ہے ان سے وہ آشنا تھا اس لیے وہ اس کی سمجھ میں آ گئیے۔ یہ فرق اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک کو دیکھ کر تو وہ یونہی گزر جاتا ہے اور دوسرے کو دیکھتا ہے تو دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔

تاہم یورپی پینٹنگز اور خاص طور سے یورپی پورٹریٹ اسلامی دنیا کے لیے بالکل ہی نئی چیزیں نہیں تھیں۔ ایسی شہادتیں ملتی ہیں کہ سلطان بایزید ثانی نے لےنارڈو داونچی کے بارے میں اپنا اشتیاق ظاہر کیا تھا۔ لیکن خیال ہے کہ داونچی کے ساتھ اس کی دلچسپی انجینئر کی حیثیت سے تھی مصور کی حیثیت سے نہیں اور وہ بھی باسفورس پر پل بنانے کے سلسلے میں دلچسپی تھی۔ اس منصوبہ پر تو عمل درآمد نہیں ہوسکا البتہ اس کے بعد بہت سے یورپی مصوروں نے استنبول اور دوسرے شہروں کا دورہ کیا۔

فوٹوگرافی کے زمانہ سے پہلے یورپی سفیر اور دوسرے سیاح جن کے پاس کافی دولت ہوتی تھی اکثر دوسرے خدام کے علاوہ ایک مصور بھی اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ یہ مصور کیمرے کا کام

بھی کرتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یورپ سے دیواری پینٹنگز اور بالخصوص پرنٹس اور کتابوں کی آرائش کے لیے تصویریں بنانے والوں کی بہت مانگ تھی۔ ان تصویروں میں عجائبات عالم دکھائے جاتے تھے۔ ظاہر ہے اپنے درمیان مغربی مصوروں کی موجودگی سے ترک بے خبر تو نہیں رہ سکتے تھے۔ استنبول کی فتح کے بعد اطالوی مصور جنٹیل بیلینی استنبول گیا تھا اور اس لیے فاتح سلطان کا پورٹریٹ بنایا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مصور سلطان کی فرمائش پر وینس کی سینوریا نے بھیجا تھا۔ سلطان محمد ثانی کی وفات کے بعد اس کے بیٹے اور جانشین سلطان بایزید نے' جو تصویروں وغیرہ کو ناجائز سمجھتا تھا اپنے باپ کی ساری تصاویر پھاڑ ڈالیں اور اس کا پورٹریٹ بازار میں فروخت کر دیا۔ یہ پورٹریٹ جسے وینس کے ایک تاجر نے خرید لیا تھا بالآخر لندن کی نیشنل گیلری تک پہنچ گیا۔(9)

اس لحاظ سے پورٹریٹ اسلامی دنیا کے لیے نئی چیز تھی۔ اس وقت اسلامی شریعت کی اس طرح تشریح کی جاتی تھی کہ اسلام میں انسانوں کی تصویریں بنانا ممنوع ہیں۔ مجسمہ سازی پر تو بالکل ہی پابندی تھی۔ کہیں جا کر انیسویں صدی میں مجسمے بنانا شروع ہوئے لیکن قدامت پسند مسلمان آج بھی مجسمہ بنانا گناہ سمجھتے ہیں۔ تاہم دوابعدوی پینٹنگز بنانے کا رواج تھا۔ خاص طور سے ایران اور ترکی میں یہ تصویریں یورپی پینٹنگز سے دو پہلوؤں سے خاص طور سے مختلف ہوتی تھیں۔ ایک تو اس لیے کہ یہ کتابوں کی آرائش اور منی ایچر تک محدود ہوتی تھیں' کہیں کہیں یہ دیواروں پر بھی بنائی جاتی تھیں۔ دیواری پینٹنگز' ٹانگنا خالصتاً مغربی رواج تھا۔ مسلمانوں میں انیسویں صدی کے آخر تک ایسا کوئی رواج نہیں تھا۔ دوسرے یہ کہ ان پینٹنگز میں جو شکلیں بنائی جاتی تھیں وہ عام طور پر ادبی اور تاریخی ہوتی تھیں۔ کلاسیکی اسلامی آرٹ میں پورٹریٹ ملتے ہیں لیکن بہت ہی شاذ و نادر انہیں بھی کبھی پسندیدہ نہیں سمجھا گیا۔

عثمانی سلطانوں اور ان کے مصوروں کی طرف سے پورٹریٹ بنانے کا آغاز ہی یورپی اثرات کی نشاندہی کرتا ہے۔ محمد فاتح نے جو مثال قائم کی تھی اس کے بعد آنے والے سلطانوں نے اس کی تقلید نہیں کی تاہم سولہویں صدی تک یہ رواج عام ہو چکا تھا۔ 1579ء میں تصویروں کا جو مجموعہ مکمل کیا گیا اس میں عثمانی سلطانوں کی تصویروں کا البم بھی شامل تھا۔ اس مجموعے کا مرتب درباری مورخ سیّد لقمان تھا۔ دوسرا مصور تھا عثمانی دربار کا نقاش عثمانی۔ اس نے بارہ سلطانوں کی تصاویر بنائی تھیں جو اس وقت تک تخت نشین رہے تھے۔ لقمان کے دیباچہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ پرانے سلطانوں کی تصاویر تلاش کرنے میں خاصی دشواری پیش آئی تھی اور اس نے اور اس کے

رفقاء نے مجبور ہو کر فرنگی مصوروں کی تخلیقات سے مدد لی تھی۔ اس کا اشارہ غالباً ان تصویروں کی طرف تھا جو یورپی مصوروں نے کتابوں کے لیے ترک سلطانوں کی بنائی تھیں اور جو زیادہ تر خیالی تھیں۔ یہ اثر اس احتیاط میں بھی دیکھا جاسکتا ہے جو پورٹریٹ کی صداقت برقرار رکھنے حتیٰ کہ ہر سلطان کا صحیح لباس دکھانے کے معاملے میں برتی جاتی تھی (10) اس کتاب کی مقبولیت کا ثبوت یہ ہے کہ کافی تعداد میں تیار کی گئی تھی اور ان کے بہت سے نسخے آج تک محفوظ ہیں۔ اسی کتاب کی نقل میں اور بھی شاہی تصویروں کے البم بنائے گئے۔

سترہویں صدی کے آخر اور اٹھارہویں صدی کے اوائل تک ایسا ماحول بن گیا تھا کہ سلطان اور درباری اشرافیہ اپنا پورٹریٹ بنوانے کے لیے خود بیٹھتے تھے۔ اس زمانے کا ممتاز یورپی مصور ژاں بپٹسٹ وان مور (1737-1671) تھا جس نے ترکی میں تیس برس گزارے۔ دوسرا مصور انتواں دی فادرے (1706-1702) تھا۔ وہ مالٹا کا رئیس تھا اور فرانسیسی سفیر کے مہمان کے طور پر کچھ عرصے استنبول میں رہا۔ ان میں سے بہت سے مصوروں نے سلطان اور وزیروں کے ساتھ سفیروں کی ملاقات کی تصویریں بنائیں جو غالباً سفیروں نے ہی بنوائی ہوں گی۔ فان مور نے یورپ میں فروخت کرنے کے لیے بھی سلطان اور وزیروں وغیرہ کی تصویریں بنائیں لیکن یہ معلوم نہیں ہوتا کہ سلطان وغیرہ نے یہ تصویریں خود سامنے بیٹھ کر بنوائی تھیں یا اس نے خود ہی بنائی تھیں۔ بہرحال توپ کاپی میں جو تصویریں موجود ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض تصویریں فرمائش پر بنوائی گئی تھیں۔ (11)

قابل ذکر بات یہ ہے کہ اب مسلمان مصوروں کی تخلیقات میں بھی تبدیلی نظر آنا شروع ہو گئی تھی۔ محمد فاتح کے جو دو پورٹریٹ آج بھی استنبول کے محل میں رکھے ہیں وہ ترک مصوروں کے شاہکار معلوم ہوتے ہیں جو اطالوی نمونے پر بنائے گئے ہیں۔ ان کا سٹائل تو اسلامی ہے لیکن ان پر مغربی اثر نمایاں ہے بالخصوص اس لیے کہ ان میں سایہ دکھایا گیا ہے۔ پہلی تصویر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ پہلے ممتاز عثمانی مصور سنان کی بنائی ہوئی ہے۔ سنان کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ وینس کے مصور پاولی کا شاگرد تھا۔

اٹھارہویں صدی بالخصوص اس صدی کے آخر میں ترک مصوری پر مغربی اثر واضح طور پر نظر آنے لگا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ دربار اور دوسرے شعبوں میں یورپی مصور ملازم رکھے گئے تھے۔ ان میں سے ایک پولینڈ کا مصور تھا جو بعد میں مسلمان ہو گیا۔ ایک یورپی مہمان نے 1781ء

اور 1785ء کے درمیان آرمینیا کے ایک مصور رافیل کی بہت سی تصویریں دی تھیں جو محل میں رکھی گئیں۔ اٹھارہویں صدی کے آخر تک مصوری کی قدیم روایت بالکل ہی ختم ہوگئی حتیٰ کہ کتابوں کی آرائش کے لیے جو تصویریں بنائی جارہی تھیں ان پر بھی مغربی اثر نمایاں تھا۔ مصوری پر تو مغربی اثر پڑ رہا تھا لیکن موسیقی پر یہ اثر بعد میں آیا۔(12)

مصوری پر مغربی اثر صرف ترکی تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ ایران اور اس سے بھی آگے تک یہ اثر نمایاں ہو رہا تھا۔ اسلامی آرٹ میں نام پیدا کرنے والے مصوروں میں ایک ممتاز نام بہزاد کا ہے جو پندرہویں صدی کے آخر اور سولہویں صدی کے اوائل تک مصوری پر چھایا رہا۔ اس کے بہت سے شاگرد تھے جنہوں نے اس کے سٹائل کو اپنایا۔ اس کے طرز مصوری کو ہراتی مکتبہ مصوری کہا جاتا ہے۔ اس مکتبہ مصوری سے بہت سی تصویریں منسوب ہیں۔ جن میں سے کچھ شاہی خاندان کے افراد کی بھی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان میں سے بعض بہزاد نے خود بنائی تھیں لیکن اس کی تصدیق نہیں ہوسکی۔ اس سے پہلے کے زمانے کے بعض پورٹریٹ بھی ملتے ہیں۔ لیکن پورٹریٹ بنانے کے لیے مصور کو بلانا اور پورٹریٹ کے لیے خود مصور کے سامنے بیٹھنا یقیناً یورپی اثر ہی ظاہر کرتا ہے۔ خیال ہے کہ یہ اثر ترکی سے ایران آیا جہاں سولہویں صدی کے شروع میں پہلے ہی ہمیں بیلینی کی ایک پینٹنگ کی نقل ملتی ہے جو کسی ایرانی مصور کی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ بیلینی کی ترک تصویریں نہ صرف یہ کہ ایران میں معروف تھیں بلکہ ایرانی مصور ان کی نقل بھی کرتے تھے۔

1502ء کے اوائل میں صفوی خاندان کی تخت نشینی کے بعد ایران کے ترکی اور مغربی یورپ کے ساتھ زیادہ قریبی تعلقات استوار ہوگئے اور وہاں سے بہت سے لوگ ایران کے ساحل اور دوسرے شہروں میں آنے لگے۔(13) اس خاندان کے ابتدائی بادشاہوں میں سے شاہ طہماسپ خاص طور پر مصوری کا بہت دلدادہ تھا۔ اس نے تبریز میں شاہی نگار خانہ کی سربراہی کے لیے بہزاد کو دعوت دی تھی۔ بہزاد اس منصب پر 1537ء میں اپنی وفات تک برقرار رہا۔ اسی زمانے میں یورپ کو ریشم اور کمخواب کی برآمد ایران کی آمدن کا بڑا ذریعہ تھی چنانچہ شاہ نے اس تجارت کو فروغ دینے کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ شاہ عباس اپنا دارالحکومت اصفہان لے گیا۔ اس نے کیتھولک عیسائیوں کو وہاں بسایا اور یورپ کے ساتھ سفارتی اور تجارتی تعلقات بڑھانے کی حوصلہ افزائی کی۔ شاہ عباس کو اصفہان شہر کی آرائش و زیبائش کا بھی شوق تھا۔ ان دنوں ایک

اطالوی سیاح پیترو دیلا اصفہان آیا اور شاہ سے ملا۔ پیترو منی ایچر پینٹنگز سے بالکل متاثر نہیں ہوا۔ وہ حقارت کے ساتھ ان کا ذکر کرتا ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ اصفہان کی ایک دکان میں اطالوی تصویریں فروخت ہو رہی تھیں۔ یہ دکان وینس کے باشندے کی تھی اور خوب چل رہی تھی۔ ''شاہ خود بھی اس دکان پر گیا۔ دکان تصویروں' آئینوں اور دوسری اطالوی چیزوں سے بھری ہوئی تھی۔'' شاہ ایران سکودونیلی (وینس کا تاجر) کی ساتھ نہایت مہربانی سے پیش آئے اور ہندوستان کے سفیر کو (جو ان کے ہمراہ تھے) تصویریں دکھائیں اور کہا کہ ان میں سے آپ کو جو پسند ہو بلا تکلف لے لیجئے ان میں شہزادوں کی بہت سی تصویریں بھی تھیں۔ وہ ایسی تصویریں تھیں جو روم کے بازار میں ایک ایک کراؤن میں مل جاتی ہیں لیکن وہاں وہ ایک سیکوینز (وینس کا طلائی سکہ) میں مل رہی تھیں۔ (14) یورپ کے اثر کی مزید شہادت ہسپانوی سفیر ڈان گارسیاوی سلوافگر وا کے بیان سے ملتی ہے۔ اسے اسپین کے فلپ سوئم نے اپنا سفیر بنا کر 1716ء میں ایران بھیجا تھا۔ وہ ایک چھوٹی سی صحنچی کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے ''وہاں بہت ہی خوبصورت تصویریں تھیں جو نسبتاً ان تصویروں سے بہت بہتر تھیں جو ایران میں عام طور پر نظر آتی ہیں۔ بتایا گیا کہ ان کا مصور کوئی ژول ہے۔ وہ یونان میں پیدا ہوا اس نے اٹلی میں پرورش پائی جہاں اس نے مصوری بھی سیکھی۔ انہیں دیکھ کر ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ کسی یورپی مصور کا کام ہے کیونکہ ان میں اطالوی انداز نظر آتا ہے۔ (15)

شاہ عباس کی وفات 1629ء میں ہوئی لیکن اس کے جانشین مغربی مصوری کی برابر حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ ان میں شاہ عباس دوئم خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس نے اطالوی اور ولندیزی مصوروں کو ایران بلایا جنہوں نے منی ایچر مصوری کو ترقی دی۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ نے خود بھی ولندیزی مصوروں سے تصویر کشی سیکھی۔

یورپ کے ساتھ بڑھتے ہوئے تعلقات اور خاص طور سے وینس اور ہالینڈ کے ساتھ تعلقات نے مغربی مصوری کے فروغ میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ ایران میں یورپ کے باشندے بھی خاصی تعداد میں موجود تھے پھر یورپ کے ساتھ آمدورفت بھی جاری تھی۔ اس ربط اور تعلق نے بہت سے یورپی فن کاروں کو موقع فراہم کیا کہ وہ ایران جائیں اور وہاں قیام کریں۔ اس طرح ایرانی مصوروں کو ان کی تخلیقات دیکھنے اور ان کی تنقید و تحسین کرنے کا موقع ملا۔ ان کا اثر اصفہان کی متعدد دیواری تصویروں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان تصویروں میں درباری مناظر اور

شاہی افراد دکھائے گئے ہیں۔ حتی کہ منی ایچر تصویروں پر بھی مغربی اثر پڑا۔ چنانچہ بہت جلد ایران میں مغربی اثر واضح ہونے لگا اور آہستہ آہستہ آرائشی نقش و نگار کم ہونے لگے اور آخر کار وہ ختم ہو گئے۔ تصویروں میں جو فاضل اور فالتو چیزیں نظر آتی تھیں وہ ختم ہو گئیں اور مرکزی شکل زیادہ نمایاں ہوگئی۔ اس کے بے حس نقوش زیادہ حساس انسانی خط و خال میں بدل گئے۔ اب مصور پورٹریٹ بنانے کے فن سے بھی فائدہ اٹھا رہے تھے اور روشنی اور سائے بھی دریافت کر رہے تھے۔ اس طرح تصویریں حقیقت سے زیادہ قریب ہوگئیں۔ ایرانی مصوری میں اس حقیقت پسندی کو پندرھویں اور اٹھارہویں صدی میں فروغ حاصل ہوا۔ اور انیسویں صدی کے اوائل میں یہ رجحان نمایاں حیثیت اختیار کر گیا۔

متعدد ایسے مصوروں نے جن کے نام ہم جانتے ہیں ایران میں طویل قیام کیا۔ ان میں سے بعض شاہ کے لیے کام کر رہے تھے۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ شاہ عباس نے ایک ایرانی مصور کو تربیت حاصل کرنے اٹلی بھیجا۔ اس کا نام محمد زماں تھا۔ وہ روم میں رہا اور اس نے مصوری کی جدید تیکنیک کی تربیت حاصل کی۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے رومن کیتھولک مذہب اختیار کر لیا تھا اور وہ محمد پاؤلوزمان کہلاتا تھا۔ اور بھی بہت سے ایرانی مصوروں کے ہاں مغربی اثر نظر آتا ہے۔ اگر وہ یورپ نہیں گئے تو ایران میں یورپی مصوروں سے انہوں نے تربیت ضرور حاصل کی۔ یہی عمل ہندوستان میں بھی نظر آتا ہے۔ مغل بادشاہ فنونِ لطیفہ کے زبردست مداح اور قدر شناس تھے۔ انہوں نے اس نئے انداز اور نئے اسٹائل سے کافی دلچسپی کا اظہار کیا جو یورپی باشندے ہندوستان لا رہے تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب یورپ کے لوگوں نے ہندوستان میں قدم جمانا شروع کیے تھے۔ 1588ء میں ہی ایک ہندوستانی مصور نے شہنشاہ اکبر کے لیے عیسائی مذہب کی شخصیات اور رسومات کی تصویریں بنائی تھیں۔ یہ تصویریں عیسائی مصوروں کی نقل تھیں۔ اکبر کے جانشین جہاں گیر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے قلعہ کی دیواروں پر یورپی مصوروں کی پینٹنگز لگائی ہوئی تھیں۔ ایران کے مقابلے میں ہندوستانی مصوروں پر مغرب کا اثر زیادہ واضح اور نمایاں نظر آتا ہے۔ ایران کی تہذیبی و ثقافتی روایات بنیادی طور پر اسلامی تھیں اور کئی صدی سے ان پر اسلامی اثر چھایا ہوا تھا۔ اس کے برعکس ہندوستان کا معاملہ مختلف تھا۔ یہ ملک کئی مذاہب اور کئی ثقافتوں کا سنگم تھا۔ ہندوستانی مصور ہندو اور مسلم دونوں روایات سے آشنا تھے اور ان کے ہاں صدیوں سے بت تراشی کی جا رہی تھی جو اسلامی ملکوں میں ممنوع تھی۔ ان سب چیزوں

نے ان کے لیے مغربی مصوری کو قابل قبول بنا دیا۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ ایران اور ہندوستان دونوں جگہ مصوروں نے پینٹنگز میں استعمال ہونے والے سامان کے سلسلے میں یورپ کی تقلید نہیں کی۔ مثال کے طور پر یورپی آرٹ کی ترقی میں آئل پینٹنگز کا مرکزی حصہ ہے۔ لیکن ایران یا ہندوستان کے مصوروں نے یہ طرز اختیار نہیں کیا اور روایتی سامان ہی استعمال کرتے رہے۔

ایک دلچسپ اختراع مسلمان مصوروں کی طرف سے یورپی مرد اور عورتوں کی تصویریں بنانا ہے۔ یہ کام بہت بعد میں شروع ہوا۔ مثلاً صلیبی جنگوں کے سارے زمانے میں ایک ہی تصویر ایسی ملتی ہے جہاں عیسائی جنگجو دکھائے گئے ہیں۔ یہ کاغذ پر بنی ہوئی تصویر ہے جو مصر سے ملی ہے۔ یہ تصویر بارہویں صدی کی بنائی ہوئی ہے۔ اس میں شہر کی فصیل کے سامنے جنگ کا منظر دکھایا گیا ہے۔ گول ڈھال ہاتھ میں لیے ایک سپاہی سامنے نظر آتا ہے جو غالباً مسلمان ہے۔ وہ سپاہی چار سپاہیوں سے لڑ رہا ہے جن کے ہاتھوں میں تکونی ڈھالیں ہیں۔ یہ لوگ شاید نارمن ہیں۔ (17)

تیرہویں صدی میں منگولوں اور یورپی طاقتوں کے رابطوں کا عبوری دور اپنے پیچھے فنونِ لطیفہ اور ادب کے کئی ریکارڈ چھوڑ گیا ہے۔ رشید الدین کی تاریخ فرنگ کے اوراق شہنشاہوں اور کئی پاپائے روم کی تصویروں سے مزین کیے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سب تصویریں خیالی ہیں۔ اسی لیے ان کے لباس، ان کے انداز حتیٰ کہ ان کے خط و خال پر بھی چینیوں اور منگولوں کی شباہت نمایاں ہے۔ تاہم ان کے لباسوں، بالخصوص پادریوں کے لباسوں میں جو یورپی جھلک ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایرانی مصوروں نے یورپی باشندے دیکھے تھے یا ان کی تصویریں دیکھی تھیں۔ (18) یورپ کی مذہبی تصویروں کے اثر کی ایسی ہی شہادت ان چند مصور مخطوطوں میں بھی ملتی ہے جو عراق اور مغربی ایران میں تیرہویں اور چودھویں صدی کے دوران تیار کیے گئے۔

مشرقی بحیرۂ روم اور شمالی افریقہ میں یورپی باشندوں کی سرگرمیاں مسلمان ادیبوں کے مقابلے میں مصوروں کی توجہ کا مرکز کم رہیں۔ ایران میں یورپی مہمانوں کی تصویر کشی کی دوسری کوشش سولہویں صدی کے آخر اور سترہویں صدی کے اوائل میں شروع ہوئی۔ اصفہان کے دو مقام چہل ستون اور علی کاپو ایسے تھے جہاں سترہویں صدی کے شروع میں ایران کے شہنشاہ دربار لگاتے تھے اور غیر ملکی مہمانوں کو شرف باریابی بخشتے تھے۔ ان دونوں ایوانوں کی دیواروں پر چھ تصویریں آویزاں تھیں۔ ان میں مختلف قسم کے ان مغربی مہمانوں کی بھی چند تصویریں تھیں جو ایران آئے تھے۔ اس دور کی منی ایچر تصویروں میں بھی ان کی نمائندگی کی گئی ہے۔

ہندوستان میں مغربی باشندوں کی موجودگی نے ہندوستانی اور مسلم آرٹ پر اثر ڈالا۔ متعدد ایسی منی ایچر پینٹنگز ملی ہیں جن میں یورپی مردوں اور عورتوں کو دکھایا گیا ہے۔ حتیٰ کہ مغرب کے بعض مشہور افراد کی تصویریں بھی ہیں جیسے ایک پینٹنگ میں انگلستان کے سفیر سر ٹامس رو کو شہنشاہ جہانگیر (1605-1627) کے دربار میں دکھایا گیا ہے۔ ایک اور پینٹنگ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے مشہور افسر وارین ہیسٹنگز کو مغرب کا درباری لباس پہنے اور رچرڈ جانسن کو سرخ وردی پہنے ہاتھ میں نوکیلا ہیٹ لیے کرسی پر بیٹھے دکھایا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ایک ملازم بھی ہے جو چھتری لیے کھڑا ہے۔

فن کارانہ نقطہ نظر سے چند نہایت دلچسپ پینٹنگز ترک مصور عبدالجلیل چلپی عرف لونی کی ہیں۔ عبدالجلیل ایڈرین کا رہنے والا تھا اور استنبول کے نقش خانہ میں اس نے تربیت حاصل کی تھی۔ اس نے کتابوں کے طلاکار کی حیثیت سے کام شروع کیا تھا۔ اس کے اس کام میں بھی مغرب کے فن تزئین کا اثر جھلکتا ہے۔ بعد میں وہ شاہ مصطفےٰ ثانی (1695-1703) اور شاہ احمد ثالث (1703-1730) کا درباری مصور رہا۔ (19) لونی نے تصویروں کے البم، مصور کتابیں اور بہت سی انفرادی پینٹنگز بھی بنائیں۔ پورٹریٹ کے علاوہ اس نے درباری تقریبات کی تصویریں بھی بنائیں۔ ان میں یورپی سفیر وغیرہ بھی نظر آتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے لباس سے اور خاص طور پر اس لیے بھی پہچانے جاتے ہیں کہ دوسروں کے برعکس وہ کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ ان لوگوں کو ترجمان اور محافظوں کے جلو میں دربار میں لایا جاتا تھا۔ وہاں مغربی نوجوانوں کی دو پیاری پیاری تصویریں بھی ہیں۔ ایک ایسا ترک مخطوطہ بھی ہے، جو غالباً 1793ء کے بعد کی کسی تاریخ کا ہے اور جس میں یورپ کی مختلف قوموں کے لوگوں کی تصویریں ہیں۔ ان تصویروں پر یورپی اثر بہت زیادہ نظر آتا ہے اور ہوسکتا ہے کہ یہ یورپی تختیوں سے نقل کی گئی ہوں۔ تاہم ان میں جو لباس پیش کیے گئے ہیں وہ سوائے سہ رنگی ٹوپی کے جو فرانسیسی عورت نے پہنی ہوئی ہے، اس سے پہلے والی صدی کے ہیں۔ (20)

یورپی اثر صرف مصوری میں ہی نظر نہیں آتا عمارتوں کی تزئین و آرائش میں بھی وہ دکھائی دیتا ہے۔ بلکہ یہاں اثر کچھ زیادہ ہی ہے۔ ترکی اور ایران دونوں ملکوں میں اب زیادہ سے زیادہ دیواری تصویریں نظر آنے لگی تھیں۔ اس سے پہلے روایتی طور پر دیواروں کو پھول پتوں سے سجانا عام تھا۔ دیواری تصویریں براہِ راست پلاسٹر پر بنائی جاتی تھیں اور ان کے چوگرد بیروک

موتیف کا فریم بنایا جاتا تھا۔ ایران میں عام طور پر ان تصویروں میں درباروں اور شاہی شخصیتوں کی تصویر کشی کی جاتی تھی۔ ترکی میں زیادہ لینڈ سکیپ بنائے جاتے تھے۔ اکثر و بیشتر استنبول شہر کے مناظر ہوتے لیکن ایسے مناظر جن میں محلات اور مساجد ضرور نظر آتی تھیں۔ پورٹریٹ اور مناظر کی تصویر کشی دونوں ہی اسلامی روایت میں نئی اختراع تھیں اور وہ یورپی سٹائل اور مغربی ذوق کے اثر و فنون کی نشاندہی کرتی ہیں۔ عثمانی مصوروں کے لیے پورٹریٹ کے مقابلے میں لینڈ سکیپ پینٹنگز میں مغربی اثر قبول کرنا آسان تھا۔ عثمانی آرٹ ''نقشہ نویسی' والی مصوری میں اپنی ایک روایت رکھتا تھا۔ انسانی شکل کی تصویر کشی کے مقابلے میں عمارتوں' بازاروں یا مناظر کی تصویر کشی میں کوئی چیز مانع نہیں تھی۔ (21) یہی وجہ ہے کہ یورپی فن تعمیر اور فن مصوری تو بہت زیادہ چھا گئی لیکن مجسمہ سازی حتیٰ کہ منبت کاری تک کو قبول نہیں کیا جاتا تھا۔

ترکی' ایران اور مسلم ہندوستان میں فن مصوری میں جو نئے رجحانات پیدا ہوئے تھے عرب ملکوں میں ان کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ وہاں قرون وسطیٰ میں ہی منی ایمپر بنانے کا فن ختم ہو چکا تھا اور شمالی افریقہ کے دور افتادہ علاقوں کے سوا باقی ساری عرب دنیا میں فن تعمیر بھی عثمانی طرز کی بھونڈی نقل ہی بن گیا تھا۔ انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں کہیں جا کر پہلے مصر میں اور پھر دوسرے عرب ملکوں میں مغربی آرٹ اور فن تعمیر نظر آتا ہے۔

مصوری کے مقابلے میں کسی اجنبی تہذیب و ثقافت کی موسیقی کے لیے اپنے قدم جمانا زیادہ دشوار کا ہوتا ہے۔ مغربی ملکوں میں بھی ایشیا اور افریقہ کے آرٹ سے ہی زیادہ دلچسپی تھی بنسبت ان کی موسیقی کے۔ اسی طرح مسلمانوں نے بھی مغربی آرٹ کی تحسین بہت پہلے شروع کر دی تھی۔ مغربی موسیقی کو تو انہوں نے بہت بعد میں پسند کیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ حالیہ دور سے پہلے دونوں جانب موسیقی سے دلچسپی نہ ہونے کے برابر تھی۔ یورپ جانے والے ابتدائی مسلم سیاح ایسی موسیقی کا حوالہ بہت ہی کم دیتے ہیں جو انہوں نے سنی ہو۔ ابراہیم ابن یعقوب شلاسوک کے مقام کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> ''میں نے اس سے بری موسیقی نہیں سنی۔ جیسی شلاس وک کے لوگ گاتے ہیں۔ یہ خرخراہٹ کی طرح ہے جو حلق سے نکلتی ہے' جیسے کتے کا بھونکنا بلکہ کچھ زیادہ ہی درندگی کے ساتھ بھونکنا۔'' (22)

صدیوں بعد عثمانی سیاح اور لیا چلبی ویانا میں زیادہ تحمل اور بردباری کا ثبوت دیتا ہے۔

موسیقی کے سلسلے میں دوسری چیزوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ کافر موسیقاروں کے آرکیسٹرا کا حوالہ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کا آہنگ ترکی کے سازوں کی آواز سے کافی مختلف ہے لیکن نہایت دلربا پرسوز اور دلدوز آواز ہے۔" (23) وہ ویانا کے لڑکوں کے کوائر گانے کی پیش کش اور ظاہری دلکشی سے بھی بہت متاثر معلوم ہوتا ہے۔ اتفاق سے وہاں کتب خانہ کے مختصر سے ذکر کے علاوہ یورپ کی ثقافتی زندگی سے شناسائی کے بارے میں یہ اس کی نہایت قریب ترین شہادت ہے۔ محمد آفندی اپنے پیرس کے قیام کے دوران اوپیرا دیکھنے گیا لیکن اسے وہ موسیقی کے بجائے تماشہ نظر آیا۔

> پیرس میں ایک خاص قسم کی تفریح ہوتی ہے جسے اوپیرا کہتے ہیں جہاں اعجوبے دکھائے جاتے ہیں۔ وہاں لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے کیونکہ وہاں تمام بڑے نواب اور لارڈ جاتے ہیں۔ وزرا تو اکثر جاتے ہیں اور بادشاہ کبھی کبھی۔ اس لیے میں نے بھی جانے کا فیصلہ کیا۔ ہر شخص اپنے مرتبہ کی حیثیت سے بیٹھتا تھا۔ میں بادشاہ کی نشست کے ساتھ بیٹھا تھا جس پر سرخ مخمل چڑھی ہوئی تھی۔ وزیراعظم بھی اس روز آیا تھا۔ میں بتا نہیں سکتا وہاں کتنے مرد اور کتنی عورتیں تھیں۔
>
> وہ عظیم الشان مقام تھا' سیڑھیاں' ستون' چھتیں اور دیواریں سب پر سونے کے ورق چڑھے تھے۔ ان سونے کے پتروں اور عورتوں کے زرق برق لباسوں کی چمک دمک خیرہ کن تھی۔ نیز جن زیورات سے وہ عورتیں لدی پھندی تھیں وہ دیکھنے کے قابل تھے۔ سیکڑوں مومی شمعوں کی روشنی میں وہ ایوان انتہائی خوبصورت تاثر پیدا کر رہا تھا۔ تماشائیوں کے سامنے اسی مقام پر جہاں گانے والے بیٹھے تھے کمخواب کا پردہ لٹک رہا تھا۔ جب سب بیٹھ گئے تو وہ پردہ اٹھا اور ایک منظر نمودار ہوا جس میں تھیٹر والے لباسوں میں ملبوس اداکار اور حوروں جیسے چہرے والی قریب بیس لڑکیاں' طلائی بیل بوٹوں والے لباس پہنے ہوئی تھیں۔ ان سب کے زرق برق لباس آنکھوں کو خیرہ کر رہے تھے۔ پھر موسیقی شروع ہوئی' تھوڑا سا رقص ہوا۔ اس کے بعد اوپیرا شروع ہوا۔ (24)

اس کے بعد ترک سفیر اوپیرا کا پلاٹ بیان کرتا ہے اور منظر اور اداکاروں کے لباسوں کی تفصیل بیان کرتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ اوپیرا کا ڈائریکٹر ایک نہایت اہم شخصیت ہے اور اوپیرا نہایت مہنگا تماشہ ہے۔

مراکشی سفیر وزیر الغسانی ہسپانوی موسیقی کے بارے میں جب اپنی رائے دیتا ہے تو وہ اس ملک میں استعمال کیے جانے والے تین سازوں کے نام لیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سب سے زیادہ مقبول ہارپ (عربہ) ہے اس سے نہایت مسرت افزا آواز نکلتی ہے۔ یہ ساز کلیساؤں میں تقریبات کے علاوہ اکثر ہسپانوی گھروں میں بھی پایا جاتا ہے۔ وہاں بربط نہیں ہے لیکن ہسپانویوں کے پاس اس جیسا ایک اور ساز ہے جسے وہ گٹار کہتے ہیں۔ آگے چل کر وہ کلیساؤں اور ان میں کی جانے والی عبادت کا ذکر کرتے ہوئے ایک تیسرے ساز کا حوالہ دیتا ہے۔ یہ ساز ہے آرگن۔ یہ بہت بڑا ساز ہے جس میں دھونکنیاں اور طلائی ورق چڑھے تانبے کے پائپ لگے ہیں جن سے زبردست آوازیں نکلتی ہیں۔" وہ 1690ء میں اسپین گیا تھا۔ ظاہر ہے اس وقت مراکشی سفیر ہسپانوی موسیقی کے متعلق اتنا ہی دریافت کرسکا ہوگا۔ (25) ترک سفیر واصف جو اس کے بھی نوے سال بعد اسپین جاتا ہے اس سے بھی کم بتاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہسپانوی باشندوں نے ان موسیقاروں اور گانے والوں کو بہت پسند کیا جو وہ اپنے ساتھ ترکی سے لے گیا تھا۔ اسے وہاں کے گانے والے پسند نہیں آئے۔ "بادشاہ کے حکم پر تمام بڑے لوگوں نے ہماری ضیافت کی اور ہمیں بادل ناخواستہ ان کی موسیقی برداشت کرنا پڑی......(26)

چونکہ مسلمانوں کی کلاسیکی موسیقی سینہ بسینہ روایت کے ساتھ چلی آتی تھی اس لیے سترہویں اور اٹھارہویں صدی کی اسلامی موسیقی کا ایسا کوئی ریکارڈ نہیں ملتا جس سے یہ معلوم کیا جاسکے کہ اس پر مغربی موسیقی کا اثر ہوا بھی تھا یا نہیں۔ مغربی موسیقی کی حمایت میں پہلا سرکاری قدم اس وقت اٹھایا گیا جب 1826ء میں جاں نثاروں کا خاتمہ ہوگیا۔ سلطان نے فوج میں اصلاح کا جو سلسلہ شروع کیا تو قدیم جاں نثاری بینڈ ختم کرکے مغربی طرز کا بینڈ رائج کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

1827ء میں "سرعسکر" یا فوجی کمانڈر محمد خسرو پاشا نے استنبول میں سارڈینیا کے سفارتی نمائندے سے کہا کہ سارڈینیا کے فوجی بینڈ میں جو ساز استعمال کیے جاتے ہیں انہیں حاصل کرنے کے لیے اس کی مدد کی جائے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ موسیقی کے پہلے فوجی گروپ کو تربیت دینے کے لیے ایک بینڈ ماسٹر کا انتظام بھی کروائیں۔ ترکی اور سارڈینیا کی حکومتوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا اور کچھ عرصے بعد مشہور موسیقار گیتانو دونیزیتی کا بھائی جیوسیپ دونیزیتی استنبول آیا اور اس نے شاہی فوجی بینڈ کی تربیت کی۔ آخر اسے موسیقی کے شاہی عثمانی مکتب کا سربراہ بنادیا گیا۔ ان اقدامات کا ذکر ان یورپی باشندوں نے کیا ہے جو اس زمانے میں استنبول گئے۔ ایک اطالوی

ہمعصر نے لکھا ہے ''ایک سال سے بھی کم عرصے میں کئی نوجوانوں کو جنہوں نے پہلے کبھی یورپی موسیقی سنی تک نہیں تھی برگاموکے سینوردونی زیتی نے اتنا سکھادیا کہ باقاعدہ فوجی بینڈ بن گیا جس کا ہر رکن خاصی موسیقی پڑھ سکتا تھا اور ساز بجا سکتا تھا۔(27)

1832ء میں چھپنے والی ایک کتاب میں اس کا مصنف اس بینڈ کے بارے میں لکھتا ہے:

''فوراً ہی یونانی ملاحوں کے ان نغموں کی جگہ جنہوں نے ہمارے رگوں میں روح پھونکی تھی فوجی بینڈ کی آواز گونج اٹھی، باسفورس کے کناروں پر میرے لیے (یہ آواز) غیر متوقع تھی۔ ہم نے زیتی کی موسیقی سنی۔ اس کا سہرا پروفیسر سینوردونی زیتی کے سر جاتا ہے۔ ہم اٹھے اور دریا کے گھاٹ پر چلے گئے۔ جہاں وہ بینڈ اپنے فن کا مظاہرہ کررہا تھا۔ میں بینڈ میں نوجوانوں کی نوعمری دیکھ کر حیران رہ گیا...... اور یہ دیکھ کر اور بھی حیرت ہوئی کہ وہ شاہی خدمت گار ہیں اور سلطان کی خوشنودی کے لیے انہیں (یہ موسیقی) سکھائی جارہی ہے۔ دونی زیتی نے مجھے بتایا کہ ان (نوجوانوں) میں سیکھنے کی وہ صلاحیت ہے جو اٹلی میں بھی نہیں پائی جاتی۔ ظاہر ہوا کہ ترک فطری طور پر کن رس ہیں لیکن ان نوجوانوں کے پاس مہارت حاصل کرنے کے لیے وقت نہیں ہے کیونکہ ان کی قسمت انہیں دوسرے پیشوں میں لے جائے گی۔ یہ سلطنت کی اشرافیہ کے نونہال ہیں، قرآن اور موسیقی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہیں شاہی مناصب پر متعین کردیا جائے گا۔ میں انہیں دیکھ کر سوچتا ہوں کہ ایک مہینے کے اندر ہم دیکھیں گے کہ فلیوٹ (بانسری کہہ لیجئے) بحری جہاز کی کپتانی کررہی ہوگی، بڑا ڈھول قلعہ کا محافظ اعلیٰ ہوگا اور بگل توپ خانہ کی رجمنٹ کا کرنل ہوگا۔''

دونی زیتی کو ترقی دے کر ''میر آلہ'' بنادیا گیا اور اسے پاشا کا خطاب دے دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ چند سال بعد اس نے سلطان عبدالحمید ثانی کی خوشنودی کی خاطر حرم کی خواتین کے لیے آرکیسٹرا ترتیب دیا اور اس کے ساز بجانے والوں کی تربیت کی۔(28)

اس کے باوجود مسلم ملکوں میں مغربی موسیقی کی قبولیت کی رفتار بہت سست تھی۔ اگرچہ مغربی ملکوں میں بعض اسلامی ملکوں بالخصوص ترکی کے کمپوزر اور گانے والے خاصے کامیاب رہے

لیکن وہاں اس قسم کی موسیقی کی طرف توجہ کم ہی رہی۔ سائنس کی طرح موسیقی بھی مغربی کلچر کے اندرونی حصار کا حصہ ہے۔ اس کے اسرار جاننے کے لیے اجنبی کو پردے کے اندر جانا پڑتا ہے۔

البتہ مغرب کا ایک تماشہ ایسا تھا جسے مسلمانوں نے کبھی قبول نہیں کیا۔ وہ تھا اسپین کی بل فائٹنگ (بیلوں سے مقابلہ) مراکشی سفیر غسانی اس تماشے کے بارے میں یہ لکھتا ہے۔ ظاہر ہے بیل سے لڑنے والا شوقیہ کھلاڑی تھا جسے غسانی نے دیکھا' ابھی وہ پیشہ ور نہیں بنا تھا:

یہ ان کی رسم ہے کہ مئی کے وسط میں وہ طاقت ور اور تندرست بیلوں کا انتخاب کرتے ہیں اور اس میدان میں لاتے ہیں جو ہر طرح کے ریشم و کمخواب کے کپڑوں سے سجا ہوتا ہے۔ وہ ان شہ نشینوں پر بیٹھ جاتے ہیں جہاں سے میدان نظر آتا ہے وہ ایک ایک کر کے بیل میدان میں چھوڑتے ہیں۔ جو شخص بھی جرأت و ہمت کا دعویدار ہوتا ہے اور طاقت کا مظاہرہ بھی کرنا چاہتا ہے وہ گھوڑے پر سوار ہو کر میدان میں آتا ہے اور تلوار کے ساتھ بیل سے لڑتا ہے۔ بعض مر جاتے ہیں اور کچھ بیل کو مار دیتے ہیں۔ بادشاہ کے لیے میدان میں خاص نشست ہوتی ہے اس کے ساتھ اس کی ملکہ اور سارے خدام ہوتے ہیں۔ ہر طرح کے لوگ کھڑکیوں میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ جشن کے دوران میں اس دن کا کرایہ پورے سال کے کرائے کے برابر ہوتا ہے۔ (29)

الغزال جو بعد میں اسپین میں مراکش کا سفیر بنا لکھتا ہے:

ہم سے اس کے بارے میں پوچھا گیا تو ہم نے بادل ناخواستہ اخلاقاً کہا کہ ہمیں ان کے کھیل اچھے لگے لیکن ہمارا خیال اس کے بالکل برعکس تھا کیونکہ جانوروں پر ظلم کی اجازت اللہ کا قانون بھی نہیں دیتا اور قانون فطرت بھی......" (30)

دوسری قسم کی تفریح اور کھیل بھی خوب پسند کیے جاتے تھے۔ مثلاً خطی آفندی جو 1748ء میں ویانا گیا لکھتا ہے:

ویانا میں ایک کھیل گھر ہے چار یا پانچ منزل بلند' ڈرامے کھیلنے کے لیے اسے وہ کامیڈی اور اوپیرا کہتے ہیں۔ مرد اور عورتیں ہر رات وہاں جمع ہوتی ہیں سوائے ان دنوں کے جب وہ کلیسا میں جمع ہوتے ہیں۔ اور اکثر شہنشاہ خود اور ملکہ خود

بھی وہاں آتے ہیں۔ خوبصورت ترین جرمن لڑکیاں اور بہترین نوجوان مرد
زرق برق لباسوں میں ملبوس' مختلف رقص اور شاندار اداکاری دکھاتے ہیں۔
اداکار سٹیج پر زورزور سے اپنے پیر مارتے ہیں اور انتہائی شاندار منظر پیش کرتے
ہیں۔ کبھی وہ اسکندر کی کتاب سے داستانیں پیش کرتے ہیں اور کبھی عشق ومحبت
کی کہانیاں' جو تماشائیوں کے صبر وقرار کو راکھ کردیتی ہیں۔ (31)

اس کا براہ راست اثر ان یہودی پناہ گزینوں کے ذریعہ ہوا جو سولہویں اور سترہویں صدی میں ہی ترکوں میں ڈرامائی تماشے دکھانے لگے تھے۔ ان کے بعد آرمینیا' یونان کے لوگوں اور خانہ بدوشوں نے یہ تماشے شروع کیے۔ یہودی چونکہ یورپ سے تازہ ترین آنے والوں میں سے تھے اس لیے ترکی میں تھیٹر اور ڈرامہ متعارف کرانے میں ان کا زیادہ اہم حصہ ہے۔ وہاں پہلا ڈرامہ انہوں نے ہی پیش کیا یہ وہی تھے جنہوں نے مسلمان اداکاروں کو جن میں بیشتر خانہ بدوش تھے' تربیت دی۔ سلطان مراد پنجم کے زمانے (1640-1623) تک ہر جمعرات کو نوجوان خانہ بدوش شاہی محل میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔ مغرب کے ان اثرات نے ترکی کے روایتی فن ''اورتا اویونو'' کی ترقی میں بھی مدد کی۔ ترکی کا یہ ڈرامائی فن ایک قسم کی برجستہ گوئی کا مظاہرہ ہوتا تھا جو اطالوی Commedia Dell Arte سے زیادہ مختلف نہیں ہوتا تھا۔ اس کھیل کا نمونہ سلطان احمد (1603-1595) کے منی ایچر کے البم میں ملتا ہے۔ ترکی کے اورتا اویونو' کے کئی مآخذ تھے۔ ایک تو نقالی کی قدیم روایت پھر ہسپانوی یہودیوں کی ڈرامائی پیش کش اور اطالوی تھیٹر کے نمونے جو استنبول میں مقیم یورپی باشندوں کے ذریعہ وہاں مقبول ہو رہے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض یورپی ڈرامے بھی وہاں معروف ہوگئے ہوں۔ مثلاً اوتھیلو کا موضوع تو ایسا ہے جو مسلمان تماشائیوں کی فوراً سمجھ میں آجاتا ہوگا۔ (32)

ترکی کے ڈرامہ کی روایت آگے ایران تک پہنچی جہاں حضرت امام حسین کی شہادت اور کربلا کے واقعہ کو عام ماتم کی شکل دینے کا مظاہرہ اٹھارہویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں شروع ہوا۔

تاہم مغربی ادب کے خلاف رکاوٹ بہرحال موجود رہی۔ اور موسیقی جیسے فنون کے لیے تو صرف اتنا ہی ضروری ہے کہ انہیں سمجھنے کے لیے دیکھا جائے یا سنا جائے۔ دشواری تو اس وقت پیش آتی ہے جب غیر ملکی زبان کی مہارت حاصل کی جاتی ہے یا اس کے لیے خواہش اور

ارادہ پیدا کیا جاتا ہے۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ یورپ جانے والے تعلیم یافتہ مسلمان جیسے عثمانی یا مراکشی سفیر' یورپی ادبی تخلیقات سے عملاً کسی قسم کی دلچسپی ظاہر نہیں کرتے تھے۔ البتہ وہ ان کی تہذیب کے تیار مال پر توجہ دیتے تھے۔ سپین جانے والے مسلم سفارتی نمائندے اسکوریل کی لائبریری میں موجود عربی مخطوطات کی بڑی تعداد کا بہت ذکر کرتے تھے۔ لیکن بجائے اس کے کہ اس بات پر اطمینان کا اظہار کرتے کہ وہاں مسلمانوں کے تہذیبی اثرات موجود ہیں اور مغرب کو مسلمانوں کا پیغام پہنچا رہے ہیں الثا یہ سمجھتے تھے کہ وہ مخطوطات وہاں کافروں کے ہاتھ میں قید ہیں اور جس طرح بھی ممکن ہو ان کی بازیابی ضروری ہے۔ اس سلسلے میں عثمانی سفیر واصف کو جب وہ لائبریری دکھائی گئی اور عربی کے مخطوطات کی فہرست دی گئی تو اس کا ردعمل یہ تھا "جب ہم نے دیکھا کہ لائبریری میں قرآن کریم کے دس قدیم ترین نسخے اور اسلامی شریعت پر بے شمار کتابیں موجود ہیں تو ہمارا دل بھر آیا اور ہمیں بہت افسوس ہوا۔" (33) مراکشی سفیروں نے تو یہاں تک کہا کہ مسلمان قیدیوں کے بدلے عربی مخطوطات حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اسی جذبے کے تحت اٹھارہویں صدی کا مراکشی سفیر المقناسی چند مسلم سکے بازیاب کرنا چاہتا تھا کیونکہ ان سکوں پر اللہ اور رسول کا نام اور قرآنی آیات لکھی تھیں اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایسے سکے کافروں کے پاس رہیں۔ (34) معلوم ہوتا ہے کہ مراکشی سفیروں کو یورپ کی کتابوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ عثمانی سفیروں میں بھی اولیا ہی ایک ایسا شخص تھا جس نے کسی عیسائی لائبریری کا دورہ کرنے کا ذکر کیا ہے۔ وہ لائبریری تھی ویانا مین سینٹ اسٹیفن کیتھیڈرل کی۔

وہ لائبریری کی وسعت سے بہت متاثر ہوا اور لکھا کہ وہ استنبول اور قاہرہ کی مساجد کے بڑے کتب خانوں سے بھی بڑی ہے۔ وہ ان بات سے بھی متاثر ہوا کہ اس میں کافروں کی تمام زبانون میں ہر زبان اور ہر رسم الخط کی کتابیں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ جس احتیاط کے ساتھ وہ کتابیں رکھی جاتی ہیں اس سے بھی وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے لکھا "یہ بے دین اپنی ساری لامذہبیت کے باوجود اس کا بہت احترام کرتے ہیں جسے وہ خدا کا کلام مانتے ہیں۔ وہ ہر ہفتے اپنی تمام کتابوں کی جھاڑ پونچھ کرتے ہیں۔ اس کام کے لیے ستر اسی ملازم رکھے ہوئے ہیں۔" تقابل اور موازنہ کی بہت ہی ابتدائی مثالوں میں سے یہ ایک مثال ہے۔ اس کے علاوہ اصلاحات سے پہلے دور کی اور بھی ایسی مثالیں ہیں۔ ایک اور موازنہ کسی حد تک برابری کی سطح پر رہنے کا ہے۔ اولیا

لکھتا ہے "ویانا کی لائبریری میں باتصویر کتابوں کی زیادہ تعداد ہے" لیکن ہمارے ہاں تصویریں ممنوع ہیں اس لیے ہمارے پاس تصویروں والی کتابیں نہیں ہیں۔ اس نے جن کتابوں کا نام لکھا ہے ان میں صرف ایٹلس مائنز اور Mappemonde (دنیا کا نقشہ) ہیں اس نے سرسری طور پر جغرافیہ اور علم نجوم کی کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ یعنی دوسرے الفاظ میں وہ کتابیں جن میں عملی سائنس ہے اور ایسے کارآمد علم جن سے کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ یورپ کے آرٹ اور ادب کے بارے میں اولیا کچھ نہیں کہتا۔ (35)

عثمانیوں نے فرنگی یورپ کے بارے میں وہی رویہ اختیار کیا جو خلافت کے زمانے میں بازنطین کے بارے میں رکھا گیا تھا۔ خیال یہ تھا کہ فوجی علم ضروری ہے اور سائنس اور اسلحہ سازی کارآمد ہے باقی سب بے کار ہے۔ ادھر اٹھارہویں صدی کے آتے آتے بیشتر عربی اور کسی حد تک فارسی اور ترکی ادب و شاعری اور دوسرے مضامین کی تخلیقات کے ترجمے یورپی زبانوں میں تو موجود تھے لیکن کسی یورپی زبان کے ادب و شعر کا ترجمہ کسی اسلامی زبان میں نہیں کیا گیا تھا۔ کسی مغربی مآخذ پر مبنی پہلی ترکی تحریر علی عزیز کی کتاب تھی جو پیتی دی لاکرا کی Mille et-un Jours کی نقل تھی۔ حالانکہ وہ کتاب خود بھی الف لیلہ ولیلہ سے ماخوذ تھی۔ الف لیلہ کا اس سے پہلے ہی فرانسیسی میں ترجمہ ہو چکا تھا اس لحاظ سے یہ کوئی دریافت نہیں تھی۔

دوسری کتاب جس کا ترجمہ کیا گیا وہ فینلان کی Telemaque تھی۔ اس کا عربی خلاصہ 1812ء میں حلب کے ایک عیسائی نے کیا تھا اور استنبول میں لکھا گیا تھا۔ اس کی طباعت کبھی نہیں ہوئی لیکن اس کا مسودہ پیرس کی لائبریری ببلیو تھک ناسیونال میں محفوظ ہے۔ (36) معلوم ہوتا ہے کہ Telemaque نے مشرق وسطی کے مسلم رہنماؤں کو بہت ہی متاثر کیا۔ نصف صدی بعد یہ پہلی مغربی کتاب تھی جس کا ترجمہ ترکی اور عربی دونوں زبانوں میں چھاپا گیا۔

ایک اور عربی ترجمہ رابنسن کروسو کا تھا یہ انیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں مالٹا میں طبع ہوا۔ کئی عشروں بعد کہیں جا کر فرانسیسی اور پھر انگریزی ادب کا ترجمہ عربی اور ترکی میں چھپنا شروع ہوا۔ رابنسن کروسو اور ٹیلی ماک نے یورپی ادب کے خزانہ کا راستہ دکھایا۔

معاشرتی اور نجی زندگی

عظیم انگریز مستشرق سرولیم جونز (1794-1746) یورپ میں عثمانیوں کے بارے میں تحقیق ومطالعہ کے فقدان پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہتا ہے:

''عام طور پر ایسا ہوا ہے کہ جو لوگ ترکوں کے درمیان رہے' اور وہ جو مشرقی زبانوں کی مہارت حاصل کرنے کے باعث اس لائق تھے کہ اس قوم کی صحیح صورتحال ہمارے سامنے پیش کر سکتے' وہ یا تو ترکی میں معاشرہ کی نچلی سطح تک محدود رہے یا اپنی دلچسپی کے دوسرے کاموں میں پھنسے رہے۔ انہیں ادب اور فلسفے کا شوق کم رہا۔ اور جو لوگ اعلیٰ حیثیت اور اعلیٰ ادبی ذوق رکھتے تھے اور ان کے اندر ترک پالیسی کے اسرار جاننے کا شوق بھی تھا اور ان کے پاس موقع بھی تھا وہ قسطنطنیہ میں بولی جانے والی زبان سے ناآشنا تھے۔ چنانچہ وہ اس واحد وسیلے سے محروم رہے جس سے وہ کسی حد تک قطعیت کے ساتھ ان انوکھے لوگوں کے جذبات و تعصبات کے متعلق سیکھ سکتے تھے۔ جہاں تک ترجمانوں کے سرسری علم کا تعلق ہے ہم ان کی حیثیت کے لوگوں سے فہم وادراک کی گہرائی اور مشاہدے کی باریکی کی توقع نہیں رکھ سکتے۔ اگر وہ محض لفظوں کی کمائی کھاتے ہیں تو صرف الفاظ ہی جاننے کا وہ دعویٰ کر سکتے ہیں۔(1)

ولیم جونز نے ترکی کے بارے میں یورپ کی معلومات کی جس کمی کا رونا رویا ہے یورپ کے متعلق معلومات کے سلسلے میں ترکی میں صورتحال اس سے بھی زیادہ خراب تھی۔ آغاز اسلام سے فرانسیسی انقلاب تک جن مسلمانوں نے یورپ کے مختلف ملکوں کا سفر کیا ان کی تعداد بہت ہی کم تھی۔ ان لوگوں میں بھی جو یورپ گئے بہت ہی کم تعداد ایسے لوگوں کی تھی جنہیں کوئی ایک بھی

یورپی زبان سیکھنے کا شوق رہا ہو۔ ان کا رابطہ سیاسی اور تجارتی حلقوں تک ہی رہا ہوگا چنانچہ وہ اپنا کام ترجمہ کے ذریعہ اور ترجمانوں کے واسطے سے ہی چلاتے رہے ہوں گے۔ اس لیے یورپ کی صورت حال پر ان کی نظر کافی حد تک محدود ہوگی۔ اپنی اس خامی سے وہ خود یا ان کے سامعین و قارئین پریشان بھی نہیں ہوں گے کیونکہ اپنی سرحدوں سے باہر ان کافروں کے اندر انہیں کوئی دلچسپ یا کام کی چیز بھی نظر نہیں آتی تھی۔

یورپ پر لکھنے والے مسلم مصنفین کے اندر انسانی یا تاریخی تجسس تو مزید جانچنے پرکھنے کی تحریک پیدا نہیں کرتا تاہم ایک اور چیز ایسی ہے جو انہیں اپنی دلچسپ رائے ظاہر کرنے پر اکساتی ہے۔ یہ ہیں عجائب وغرائب اور حیرت انگیز چیزیں۔ جس تہذیب نے الف لیلۃ ولیلہ جیسی عظیم تخلیق پیش کی ہو اس کے اندر عجیب وغریب اور انوکھی چیزوں کا بے پناہ ذوق وشوق فطری بات ہے۔ اس شوق اور اس تجسس کی تسکین کے لیے ادب بھی کافی تخلیق کیا جاتا ہے۔

یورپ میں ایسی چیزوں کی کمی نہیں تھی اور مسلمانوں نے ایسی چیزیں کافی دیکھی تھیں جو انہیں عجیب وغریب یا غیر معمولی لگی تھیں۔ ایک مثال تو یورپ میں داڑھی مونڈھنے کی عادت تھی۔ مسلمانوں اور بہت سے دوسرے لوگوں کے نزدیک داڑھی مردانگی اور شرافت کی نشانی تھی۔ بعد میں اسے علم وفضل اور تجربے کی علامت بھی سمجھا گیا۔ ہارون ابن یحییٰ نے جو 886ء میں روم میں عرب قیدی تھا اس عجیب عادت کی یہ وضاحت کی ہے:

> ''روم کے باشندے، بوڑھے، جوان اپنی ساری داڑھی مونڈھ ڈالتے ہیں۔ ایک بال بھی نہیں چھوڑتے۔ میں نے ان سے داڑھی مونڈھنے کا سبب دریافت کیا۔ میں نے پوچھا ''مرد کی داڑھی اس کی خوبصورتی ہوتی ہے تم لوگ اپنے ساتھ ایسا کیوں کرتے ہو''
>
> انہوں نے جواب دیا۔ ''جو شخص بھی داڑھی نہیں مونڈھتا وہ پکا عیسائی نہیں ہے۔ کیونکہ جب سائمن اور عیسیٰ کے حواری ہمارے پاس آئے تو ان کے پاس نہ عصا تھا اور نہ کاسۂ گدائی لیکن وہ غریب اور کمزور تھے اور ہم اس وقت بادشاہ تھے کمخواب میں ملبوس اور طلائی تخت پر بیٹھے ہوئے۔ انہوں نے ہمیں عیسائی مذہب کی دعوت دی۔ لیکن ہم نے جواب نہیں دیا۔ ہم نے انہیں پکڑا اور ان پر تشدد کیا اور ان کے سر اور ان کی داڑھیاں مونڈ ڈالیں۔ اور پھر جب ان کی

سچائی ہم پر ظاہر ہوئی تو ہم نے کفارہ ادا کرنے کے لیے اپنی داڑھیاں مونڈھنا شروع کر دیں۔(2)

بعد میں آنے والے مصنف ابراہیم ابن یعقوب نے بھی فرنگیوں کے داڑھی مونڈھنے اور دوسری گندی عادتوں پر اس طرح تبصرہ کیا ہے:

''یہ بدطینت اور خسیس لوگ ہیں۔ یہ سال میں ایک یا دو بار سے زیادہ اپنی صفائی یا غسل نہیں کرتے اور وہ بھی ٹھنڈے پانی سے کرتے ہیں۔ اور وہ اپنے کپڑے بھی نہیں دھوتے اور اس وقت تک وہ کپڑے پہنے رہتے ہیں جب تک وہ چیتھڑے نہ ہو جائیں۔ وہ اپنی داڑھیاں مونڈھتے ہیں اور مونڈھنے کے بعد وہ بالوں کی مکروہ کھونٹیاں اگائے پھرتے ہیں۔ ان میں سے ایک سے داڑھی مونڈھنے کے بارے میں دریافت کیا گیا تو اس نے کہا ''بال فالتو چیز ہیں، تم اپنے ستر کے بال مونڈھتے ہو تو اپنے چہروں پر کیوں رہنے دیتے ہو۔''(3)

مغربی لوگوں کی گندی عادتیں مسلمانوں کو مسلسل بیزار کرتی رہیں۔ اٹھارہویں صدی کے آخر میں ہندوستانی مسلمان سیاح ابوطالب خاں دیکھتا ہے کہ پورے ڈبلن میں صرف دو غسل خانے یا حمام ہیں اور دونوں بہت ہی تنگ اور ضروری سامان سے محروم۔ ضرورت پڑنے پر وہ ان میں سے ایک میں گیا لیکن وہاں جا کر خوش نہیں ہوا۔ وہ لکھتا ہے کہ گرمیوں میں ڈبلن کے لوگ سمندر میں جا کر اپنے جسم دھو لیتے ہیں، سردیوں میں وہ بالکل نہیں دھوتے۔ وہ دو حمام بھی بیماروں کے لیے ہیں اور واقعی وہ لوگ ہی استعمال کرتے ہیں جو بہت زیادہ بیمار ہوتے ہیں۔ ابوطالب خاں ایک حمام میں گیا تو وہاں اسے سینگی لگانے والا یا حجام تک نہیں ملا۔ مالش کرنے والے کے بجائے اسے گھوڑے کے بالوں والا برش دے دیا گیا جس سے جوتے صاف کیے جاتے ہیں۔ ''ہر شخص اپنی غلاظت اپنے ہاتھ سے صاف کرتا ہے۔''(4)

یورپ کے لباسوں پر بھی مسلمان سیاحوں وغیرہ نے کبھی کبھی تبصرہ کیا ہے۔ ویانا کی عورتوں کے لباس پر اولیا کا تبصرہ اس طرح ہے:

''مردوں کی طرح عورتیں بھی زیر جامہ کے اوپر جو لباس پہنتی ہیں وہ مختلف قسم کے سیاہ کپڑے کا اور بغیر آستین کا دوہرا کوٹ ہوتا ہے۔ البتہ اس کے نیچے وہ کمخواب اور ریشم کی عبا پہنتی ہیں جو طلائی اور دوسری قیمتی چیزوں سے مزین

ہوتی ہیں۔ یہ کافروں کے دوسرے ملکوں کی طرح چھوٹی اور تنگ نہیں ہوتی بلکہ بہت بھری بھری اور بھاری بھرکم ہوتی ہیں اس لیے وہ مولویوں اور درویشوں کی لمبی عباؤں کی طرح اسے فرش پر گھسیٹتی چلتی ہیں۔ وہ ہر رنگ کے جوتے پہنتی ہیں اور ان کے کمر بند عام طور پر جواہرات سے مزین ہوتے ہیں۔ کنواری لڑکیوں کے برعکس شادی شدہ عورتیں اپنے سینے کھلے رکھتی ہیں جو سفید برف کی طرح چمکتے ہیں۔ یہ عورتیں اپنا لباس کمر بند سے اپنی کمر کے گرد نہیں باندھتیں جیسے ہنگری' اور مولداویا کی عورتیں کرتی ہیں بلکہ اپنی کمر کے گرد رومال باندھتی ہیں اتنے چوڑے جیسے چھلنی۔ یہ بہت ہی بدصورت لباس ہے جس سے وہ ایسے لگتی ہیں جیسے کبڑا آدمی۔ وہ اپنے سر پر سفید ململ کی ٹوپی رکھتی ہیں جو نازک بیل اور کشیدہ کاری سے آراستہ ہوتی ہے۔ ان کے اوپر گچھے ہوتے ہیں ہیرے جواہرات کے اور باندھنے کے لیے بندھن ہوتے ہیں۔ اللہ کے فضل سے اس ملک کی عورتوں کی چھاتیاں ترکی عورتوں کی طرح نہیں ہوتیں' اتنی بڑی جیسے مشکیزے' بلکہ نارنگیوں کی طرح چھوٹی ہوتی ہیں۔ پھر بھی وہ اپنے بچوں کو اپنا ہی دودھ پلاتی ہیں۔'' (5)

شیخ رفاعہ یورپی لباسوں میں ایک اور عجیب و غریب حرکت کا ذکر کرتا ہے یعنی وقتاً فوقتاً ان کا سٹائل تبدیل کرنا:

''فرانس کے باشندوں کی ایک خاص عادت ہے۔ ہر نئی چیز کے لیے ان کا تجسس اور ہر چیز میں بالخصوص لباس کے معاملے میں تبدیلی اور تنوع سے رغبت۔ کوئی چیز ان کے لیے مستقل نہیں ہے اور کوئی فیشن یا لباس ایسا نہیں ہے جو آج تک ایک ہی رہا ہو۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ سارا ہی لباس بدل دیتے ہیں بلکہ اس کا مطلب ہے کہ وہ اس میں تغیر و تبدل کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً عورتیں ہیٹ کی جگہ پگڑی نہیں پہننا شروع کر دیتیں بلکہ کبھی وہ ایک قسم کا ہیٹ لگاتی ہیں اور کبھی اس کی جگہ دوسری قسم کا ہیٹ' مختلف رنگ اور طرز کا۔'' (6)

ابو طالب خاں مغربی باشندوں کے اتنے پیچیدہ لباس پہننے کو تضیع اوقات کہتا ہے۔ انگریزوں کی خامیوں اور کمزوریوں پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالتے ہوئے وہ ان کی چھٹی خامی یہ

بتاتا ہے کہ وہ "سونے میں، کپڑے پہننے میں، بال بنانے میں، داڑھی مونڈھنے میں اور اسی قسم کی حرکات میں بہت وقت ضائع کرتے ہیں۔" (7) "وہ فیشن کا ساتھ دینے کے لیے ٹوپی سے جوتے تک لباس کے پچیس سے کم حصے زیب تن نہیں کرتے۔ ان کے صبح کے اور شام کے لباس مختلف ہوتے ہیں۔ چنانچہ انہیں کپڑے چڑھانے اتارنے کا سارا کام دن میں دو مرتبہ کرنا پڑتا ہے۔ وہ کپڑے پہننے، بال سنوارنے اور داڑھی مونڈھنے پر دو گھنٹے، ناشتے پر کم سے کم ایک گھنٹہ، کھانے پر تین گھنٹے، تین گھنٹے خواتین کی صحبت میں یا موسیقی سننے میں اور جوا کھیلنے میں اور نو گھنٹے سونے میں صرف کرتے ہیں۔ چنانچہ کام کرنے کے لیے چھ گھنٹے بچتے ہیں۔ اور بڑے لوگوں کے پاس تو چار گھنٹے ہی بچتے ہیں۔ ابو طالب کہتا ہے کہ اتنے کپڑوں کے لیے سرد موسم کا بہانہ صحیح نہیں ہے۔ کم کپڑے پہن کر بھی سردی سے بچا جاسکتا ہے اور وہ داڑھی مونڈھنے اور بال سنوارنے وغیرہ کا وقت بھی بچا سکتے ہیں۔

یورپ جانے والے مسلمانوں میں سے بعض لوگ یہ بھی سوچتے تھے کہ جس طرح مغربی باشندے انہیں طرفہ تماشہ نظر آتے ہیں وہ خود بھی مغربی باشندوں کو انوکھی شے ہی محسوس ہوتے ہوں گے۔

یورپ جانے والے ترکوں کی طرح واصف خوشی خوشی بتاتا ہے کہ اس نے وہاں کے لوگوں میں کیا تاثر پیدا کیا۔ ایک ہجوم اسے دیکھنے اُمڈ آیا۔ قرطبہ میں اسے لوگ دیکھنے آنے لگے تھے اور جنگلے کے باہر کھڑے اسے دیکھتے رہتے تھے۔

جب وہ باقاعدہ میڈرڈ میں داخل ہوا تو اسے دیکھنے والوں کی تعداد اور ان کی حالت ناقابل بیان تھی۔ باہر کی طرف کھلنے والی شہ نشینوں میں اسے دیکھنے والے ٹھنسے ہوئے تھے۔ سڑکوں پر آگے پیچھے پانچ پانچ چھ چھ قطاریں لگی تھیں۔ سڑک اتنی چوڑی تھی کہ پانچ گاڑیاں ایک ساتھ گزر جائیں لیکن اس وقت اتنا ہجوم تھا کہ ایک گھوڑ سوار بھی وہاں سے مشکل سے ہی گزرتا۔ وہ کہتا ہے "ہمیں بتایا گیا کہ فی کھڑکی ایک سو پیاستر کرایہ لیا گیا۔ (8)

ایک ایرانی سرکاری عہدیدار جو 1839ء میں لندن میں کرائیڈن ریلوے کی افتتاحی تقریب میں شرکت کرنے گیا تھا وہاں جمع ہونے والے تیس چالیس ہزار کے ہجوم پر اس طرح تبصرہ کرتا ہے:

"جیسے ہی انہوں نے ہمیں دیکھا حیرت اور خوشی کے ساتھ چیخنا چلانا شروع کر دیا

لیکن آجوان باشی نے آگے بڑھ کر ہمارا استقبال کیا۔ اس کے ساتھ ہی سب نے اپنی ٹوپیاں اتار لیں۔ اس طرح معاملہ ٹھیک ہوگیا۔ ذرا سی بھی بے احتیاطی سے کام بگڑ سکتا تھا۔ درحقیقت وہ بھی کسی حد تک صحیح تھے کیونکہ ہماری شکل و صورت اور لباس وغیرہ ان کے لیے عجیب وغریب تھے۔ خاص طور سے میری داڑھی جس کی مثال سارے فرنگستان میں نہیں مل سکتی۔''(9)

اوائل انیسویں صدی میں مسلمان ملکوں میں عام لوگوں کے لباس اور شاہی پوشاکوں میں جو تبدیلی نظر آتی ہے وہ یورپ کے بارے میں مسلمانوں کی فکرونظر میں پیدا ہونے والی تبدیلی کی نشانی وہی کرتی ہے۔ یہ تبدیلی اس وقت آئی جب حکمران اور اشرافیہ نے یورپی لباس اختیار کرلیا۔ اس کے ساتھ ہی عام لوگوں میں بھی یہ لباس مقبول ہوگیا۔

لیکن ایسا اس سے پہلے بھی ہو چکا تھا۔ تیرہویں صدی میں منگولوں نے اسلامی دنیا کے بڑے حصے پر قبضہ کیا تو مسلمان اپنی طاقت سے بڑی طاقت دیکھ کر مبہوت ہوگئے چنانچہ انہوں نے اس قوم کا لباس قبول کرلیا تھا۔ حتیٰ کہ مصر میں بھی جس پر منگولوں نے قبضہ نہیں کیا تھا مملوک سلطان نے درباری امراء کے لباس کے بارے میں چند قواعد وضوابط جاری کیے۔ ان سے کہا گیا تھا کہ منگولوں کی طرز کی وردی استعمال کی جائے اور سر کے بال چھوٹے کرانے کے بجائے بال بڑھائے جائیں اور لمبی زلفیں چھوڑی جائیں۔ اسی جذبے کے ساتھ سلطان محمد ثانی ایک بار لوگوں کے سامنے پتلون اور بند گلے کا کوٹ پہنے نمودار ہوا۔ پھر اس نے اپنی فوج کو بھی ایسی ہی وردی پہنائی۔ اس کے حکم سے فوج میں بند گلے کا کوٹ' سرکاری افسروں میں فراک کوٹ (لمبی دم والا لمبا کوٹ) اور دونوں میں پتلون رائج کی گئی۔ یہاں سے پھر یہ لباس شہروں کے پڑھے لکھے طبقے میں مقبول ہوتا چلا گیا۔ پہلے ترکی میں پھر بعض عرب ملکوں میں اور آخر میں ایران میں مغربی لباس عام ہوگیا۔ کافی عرصے تک مغربی لباس صرف مردوں تک ہی محدود رہا اور وہ بھی گردن سے نیچے تک۔ سر کی ٹوپی یا عمامہ چونکہ مسلمانوں کی عبادت کے ساتھ مخصوص ہے اس لیے وہ ان کا امتیازی نشان رہا۔ لیکن بیسویں صدی میں کم سے کم فوج کی حد تک اس پر بھی سمجھوتہ کرلیا گیا اور پیک کیپ آگے چھجے والی ٹوپی (ہیٹ) اور کیپی یعنی چپٹی چندیا والی فرانسیسی ٹوپی اختیار کرلی گئی۔ بلکہ زیادہ متشدد مسلم ملکوں میں بھی یہ لباس اختیار کرلیے گئے۔

چودھویں صدی کے شروع میں جب منگولوں نے خود اسلام قبول کیا اور مشرق وسطے

کے معاشرے میں ضم ہونے لگے تو منگولوں کی طرز کا لباس سرکاری طور پر ترک کر دیا گیا۔ ایک اور مملوک سلطان محمد نے حج سے واپسی پر دوبارہ مسلم لباس رائج کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ اس نے اور اس کے تمام امراء نے منگولی لباس اتار دیا اور لمبے بال کٹوا لیے۔ مغربی کوٹ وغیرہ موجود رہے لیکن عوام اور امراء دونوں میں اس کی مخالفت جاری رہی۔

عورتوں میں مغربی لباس بہت بعد میں مقبول ہوا اور وہ بھی زیادہ نہیں۔ یہ فرق بنیادی تہذیبی اور ثقافتی سطح پر دیکھا جا سکتا ہے۔

انیسویں صدی میں یورپ جانے والے مسلمان جنہوں نے کچھ لکھا بلا استثناء سارے ہی مرد ہوتے تھے۔ تاہم ان میں سے بیشتر نے معاشرہ میں عورت کے مقام پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہے۔ جو لوگ عجائب وغرائب کی تلاش میں وہاں جاتے تھے ان کے پاس کچھ اور کارآمد داستانیں بھی بیان کرنے کو تھیں۔ عیسائیوں میں کی رسوم' معاشرہ میں عورتوں کو نسبتاً زیادہ آزادی اور معززین کی طرف سے بھی عورتوں کا احترام ایسی چیزیں تھیں جو سرزمین اسلام سے وہاں جانے والوں کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھیں۔ وہ انہیں حیرت سے دیکھتے تھے لیکن پسند نہیں کرتے تھے۔

صنفی معاملات میں یورپ کے طریقہ کار کے بارے میں جو ابتدائی تاثرات ملتے ہیں ان میں عرب سفیر الغزال کا ایک تاثر نمایاں ہے۔ وہ 845ء کے قریب وائکنگ کے دربار میں گیا تھا۔ اس کے اپنے بیان کے مطابق وائیکنگ لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے ان کی ملکہ کے ساتھ اس کا چھوٹا موٹا معاشقہ بھی ہو گیا تھا۔

> شاید وائگینگ کی ملکہ نے الغزال کا سنا تو اس نے اسے اپنے پاس بلایا تا کہ اسے دیکھے۔ جب وہ اس کے سامنے پہنچا تو دیر تک اسے دیکھتا رہا' وہ ایسے دیکھتا جیسے کوئی عجوبہ شے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا ہو۔ ملکہ نے ترجمان سے کہا۔ ''اس سے پوچھو کہ وہ ہمیں ایسے کیوں دیکھ رہا ہے؟ کیا اس لیے دیکھ رہا ہے کہ میں اس کے لیے بہت خوبصورت ہوں یا اس کے برعکس۔ اس نے جواب دیا'' بے شک اس کا سبب یہ ہے کہ میں نے دنیا میں ایسا خوش نما منظر آج تک نہیں دیکھا۔ میں نے اپنے بادشاہ کے محلات میں ایسی عورتیں دیکھی ہیں جو اس کے لیے تمام قوموں میں سے چن کر لائی جاتی ہیں۔ لیکن ایسی خوبصورتی ان میں بھی نہیں

دیکھی۔

ملکہ نے ترجمان سے کہا ''اس سے پوچھو کہ یہ بات وہ سنجیدگی سے کر رہا ہے یا وہ مذاق اڑا رہا ہے؟'' اس نے جواب دیا۔ ''میں بالکل سنجیدہ ہوں'' ملکہ نے اس سے کہا ''تمہارے ملک میں کوئی خوبصورت عورت نہیں ہے؟'' الغزال نے جواب دیا۔ ''مجھے اپنی کچھ عورتیں دکھاؤ تاکہ میں اپنی عورتوں سے ان کا موازنہ کرسکوں۔''

ملکہ نے ان عورتوں کو بلایا جو اپنے حسن و جمال میں مشہور تھیں۔ وہ آئیں اور اس نے اوپر سے نیچے تک انہیں دیکھا اور کہا ''ان میں حسن ہے لیکن وہ حسن نہیں ہے جو ملکہ کے اندر ہے کیونکہ اس کے حسن اور اس کی خوبیوں کی تحسین ہر ایک نہیں کرسکتا صرف شاعر ہی اس کا اظہار کرسکتے ہیں۔ اگر ملکہ مجھے اجازت دیں کہ میں ان کے حسن' ان کی خوبیوں اور ان کی عقل و دانش کے ایسے قصیدے پڑھوں جس کی ساری دنیا تعریف و توصیف کرے تو میں ضرور ایسا کروں گا۔

اس پر ملکہ بہت خوش ہوئی اور بخوشی حکم دیا کہ اسے تحفہ دیا جائے۔ الغزال نے یہ کہہ کر تحفہ لینے سے انکار کردیا کہ ''یہ میں نہیں لوں گی۔'' پھر ملکہ نے ترجمان سے کہا ''اس سے پوچھو کہ تحفہ قبوں کیوں نہیں کرتا آیا اسے تحفہ اچھا نہیں لگتا یا اسے میں پسند نہیں ہوں؟''

ترجمان نے سوال کیا اور الغزال نے جواب دیا۔ بے شک آپ کا تحفہ لاجواب ہے اور آپ کے ہاتھوں وصول کرنا میرے لیے بہت بڑا اعزاز ہوگا کیونکہ آپ ملکہ ہیں اور ایک بادشاہ کی دختر ہیں لیکن میرے لیے یہی تحفہ کافی ہے کہ میں نے آپ کو دیکھ لیا اور آپ نے مجھے شرف باریابی بخشا۔ میں صرف یہی تحفہ چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ ملکہ مجھے اپنے قرب کا شرف عطا کرتی رہیں۔''

ترجمان نے اس کے ان الفاظ کی ملکہ کے سامنے وضاحت کی تو ملکہ کی نظر میں اس کی توقیر اور بھی بڑھ گئی اور اس نے کہا ''اس کا تحفہ اس کی رہائش تک پہنچا دیا جائے اور جب بھی یہ میرے پاس آنا چاہیں ان کے لیے کوئی بھی دروازہ بند نہ کیا جائے۔ کیونکہ میرے دربار میں ہمیشہ عزت و احترام کے ساتھ ان کا

استقبال ہوگا۔" الغزال نے اس کا شکریہ ادا کیا' اس کی خوش حالی اور شادمانی کی دعا کی اور رخصت لی۔"

اس موقع پر اس واقعہ کا راوی تمام ابن علقمہ اپنی طرف سے تبصرہ کرتا ہے:

"میں نے الغزال کو یہ واقعہ بیان کرتے سنا۔ میں نے اس سے سوال کیا" کیا اس کا حسن واقعی ایسا تھا جیسا آپ نے اس کے سامنے بیان کیا؟" اور اس نے جواب دیا۔ "قسم تمہارے والد کی اس میں دلکشی تھی لیکن اس طرح چرب زبانی کر کے میں نے اس کا دل جیت لیا اور اپنی خواہش سے زیادہ حاصل کر لیا۔"

تمام ابن علقمہ مزید لکھتا ہے۔

اس کے ایک رفیق نے مجھے بتایا کہ وائی کنگ کے بادشاہ کی بیوی اس کے عشق میں گرفتار ہوگئی تھی اور کوئی بھی دن ایسا نہیں جاتا تھا جب وہ اسے اپنے پاس نہ بلاتی ہو۔ اور وہ مسلمانوں' ان کی تاریخ' ان کے ممالک اور ان اقوام کے بارے میں اسے کچھ نہ سناتا ہو۔ شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا کہ وہ ملکہ کے پاس سے آیا ہو اور ملکہ نے اس کے پیچھے کوئی تحفہ نہ بھیجا ہو اور اپنی خوشنودی کا اظہار نہ کیا ہو۔ پوشاکیں' کھانے یا عطریات تحفے میں ملتے تھے حتیٰ کہ ان کی ملاقاتوں کی شہرت عام ہوگئی اور اس کے رفقاء نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ الغزال کو تنبیہ کی گئی اور وہ محتاط ہوگیا اب وہ ایک دن چھوڑ کر ملکہ سے ملنے جاتا۔ ملکہ نے اس کا سبب دریافت کیا تو اس نے بتا دیا کہ اسے انتباہ کیا گیا ہے۔

اس پر اس نے قہقہہ لگایا اور کہا" ہمارے مذہب میں ایسی باتیں نہیں ہوتیں اور نہ ہمارے یہاں رقابت ہوتی ہے۔ ہماری عورتیں اپنی مرضی سے اپنے مردوں کے پاس جاتی ہیں۔ ایک عورت اس وقت تک اپنے شوہر کے ساتھ رہتی ہے جب تک وہ اسے خوش رکھتا ہے۔ اگر وہ اسے خوش نہیں رکھتا تو وہ اسے چھوڑ دیتی ہے۔" روما کا مذہب یہاں پہنچنے سے پہلے وائی کنگ لوگوں کا رواج تھا کہ کوئی عورت مرد کو انکار نہیں کر سکتی تھی سوائے اس کے کہ کوئی معزز عورت کسی نچلے طبقے کے مرد کو قبول کر لے۔ اس عورت کو اس پر مطعون کیا جاتا تھا اور عورت کا خاندان دونوں کو جدا کرا دیتا تھا۔ الغزال نے ملکہ سے یہ کلام سنا تو اسے حوصلہ

ہوا اور اس نے اپنا پرانا وطیرہ پھر اختیار کر لیا۔'' (10)

راوی ملکہ کے ساتھ الغزال کے تعلقات اسی طرح بیان کیے جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ الغزال ملکہ کی شان میں برجستہ اشعار کہتا تھا جن کا ترجمہ فوراً ترجمان کر دیتا تھا۔ اس سے یہ ساری کہانی غلط ہونے کا گمان ہوتا ہے۔

مغربی عورتوں کی آزادی پر اور بھی بہت تبصرے کیے گئے ہیں۔ مثلاً ابراہیم ابن یعقوب شلسں وک کی عورتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''ان کے ہاں عورتوں کو طلاق دینے کا حق ہے۔ عورت جب چاہے خود ہی طلاق دے سکتی ہے۔''

ابراہیم مغربی سمندر میں عورتوں کے ایک ''جزیرہ'' کے بارے میں اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز کہانی بیان کرتا ہے:

''اس میں رہنے والی عورتیں ہیں جن پر مردوں کو کوئی اختیار نہیں ہے یہ عورتیں گھوڑ سواری کرتی ہیں اور نہایت جرأت مندی کے ساتھ مقابلہ کرتی ہیں۔ ان کے پاس مرد غلام ہیں اور ہر غلام رات کو باری باری اپنی مالکن کے پاس جاتا ہے۔ وہ رات بھر اس کے پاس رہتا ہے۔ علی الصباح جاگتا ہے اور سورج نکلنے سے پہلے چوری چھپے وہاں سے چلا جاتا ہے۔ اگر ان میں سے کسی عورت کے بیٹا پیدا ہوتا ہے تو'' وہ اسے مار دیتی ہے اور اگر بیٹی پیدا ہو تو زندہ رہنے کے عذاب میں مبتلا کرتی ہے۔''

یہ سوچ کر کہ ایمیزون عورتوں کی اس قدیم کہانی پر شاید اس کے قارئین کو اعتبار نہ آئے ابراہیم ابن یعقوب مزید لکھتا ہے:

''عورتوں کا جزیرہ ایک مسلمہ حقیقت ہے جس کے بارے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا...... اوٹو شاہ روما نے اس کے بارے میں خود مجھے بتایا۔''

قرون وسطیٰ کے ساتھ جدید دور کے مسلمان مبصرین کو بھی سب سے زیادہ جو چیز پریشان کرتی تھی وہ عورتوں کی بے محابہ آزادی اور یہ حقیقت تھی کہ مردوں کے اندر مردانہ رقابت اور حسد بالکل نہیں ہے۔ اس نکتہ کی وضاحت میں اسامہ جو صلیبی جنگ جوؤں کا ایک ہمعصر تھا کئی کہانیاں بیان کرتا ہے:

''فرنگیوں میں رقابت یا مردانہ غیرت کا شائبہ تک نہیں ہے۔ اگر کوئی مرد اپنی بیوی کے ساتھ جارہا ہے راستے میں ایک اور مرد ملتا ہے' وہ مرد اس کی بیوی کو ایک طرف لے جاتا ہے اور تنہائی میں اس سے باتیں کرنے لگتا ہے تو شوہر دور کھڑا ان کی باتیں ختم ہونے کا انتظار کرتا رہتا ہے۔ اگر ان کی باتیں طویل ہو جاتی ہیں تو شوہر اسے وہیں چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔

یہ ایک نمونہ ہے جو میں نے دیکھا۔ میں نابلوس گیا تو ایک شخص کے گھر ٹھہرا جس کا نام معز تھا۔ اس کا گھر ایک سرائے تھی جس کی کھڑکیاں مشرق کی سمت کھلتی تھیں۔ اس کے سامنے سڑک کی دوسری طرف ایک فرنگی کا گھر تھا۔ وہ دوسرے سوداگروں کی شراب فروخت کرتا تھا۔ وہ شراب کی بوتل بازار میں لے جاتا اور اعلان کرتا کہ فلاں تاجر نے شراب کا مٹکا کھولا ہے جو چاہے فلاں مقام سے شراب حاصل کرسکتا ہے۔ اس منادی کی اجرت اسے شراب کی ایک بوتل کی شکل میں ملتی تھی۔

ایک دن وہ گھر آیا تو اس نے ایک مرد کو اپنی بیوی کے ساتھ بستر پر دیکھا۔ اس نے اجنبی مرد سے پوچھا ''تم میری بیوی کے پاس کیسے آئے؟''

''میں نے بستر بچھا دیکھا تو میں اس پر لیٹ گیا۔'' لیکن تمہارے ساتھ عورت بھی لیٹی ہے۔'' ''یہ اس کا اپنا بستر ہے۔ میں اسے اس کے اپنے بستر پر آنے سے کیسے روک سکتا تھا۔''

''ایمان کی قسم'' شوہر نے کہا ''اگر تم نے پھر ایسا کیا تو ہمارا تمہارا جھگڑا ہو جائے گا۔''

اس کی ساری رقابت کا اور ناخوشی کا صرف اتنا ہی اظہار تھا۔'' (12)

اسامہ کی یہ کہانی اپنے اندر علاقائی لطیفہ بازی کی ساری خوبیاں رکھتی ہے۔ پھر بھی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شادی کے عیسائی رسوم ورواج کو اس زمانے کے مسلمان کیسے دیکھتے تھے۔

ان عیسائی عورتوں کی ظاہری شکل وصورت بھی ان کے لیے ناخوش گوار نہیں ہوتی تھیں۔ شام کا سیاح ابن جبیر جو صلیبی قبضے کے دوران فلسطین گیا تھا خوش قسمتی سے عیسائیوں کی ایک شادی میں چلا گیا:

''دنیا کے انتہائی دلکش تماشوں میں سے ایک تماشہ دلہن کا وہ جلوس یا بارات تھی جو ہم نے ایک دن طائر میں ساحل کے قریب دیکھی۔ تمام عیسائی مرد اور عورتیں اس موقع پر جمع ہو گئے تھے اور انہوں نے بیاہی جانے والی دلہن کے گھر کے سامنے دو قطاریں بنالی تھیں۔ وہ بانسری اور بربط اور دیگر ہر قسم کے ساز بجا رہے تھے۔ آخر دلہن باہر آئی اس کے ساتھ دو مرد تھے جنہوں نے دائیں اور بائیں جانب سے اس کے ہاتھ تھام رکھے تھے۔ وہ دونوں قریبی عزیز معلوم ہوتے تھے۔ اس نے نہایت خوبصورت لباس پہنا تھا۔ اور بہت سجی بنی تھی۔ اس نے طلائی گوٹ لگا ریشمی جوڑا پہنا ہوا تھا۔ ان کی رسم کے مطابق اس کے پیچھے اس کے عروسی جوڑے کا دامن فرش پر گھسٹتا جا رہا تھا۔ سر پر اس نے سنہری پٹی باندھی ہوئی تھی جس کے گرد طلائی جالی تھی...... اس کے پیچھے عیسائی مرد چل رہے تھے جو اس کے خاندان کے نہایت اہم افراد تھے' وہ شاندار لباس زیب تن کیے ہوئے تھے ان کی عبائیں ان کے پیچھے زمین کو چھو رہی تھیں۔ ان کے پیچھے ان کے برابر حیثیت کی عیسائی عورتیں تھیں۔ اعلیٰ لباسوں میں ملبوس اور زیورات سے لدی پھندی۔ موسیقی کی دھنیں گونج رہی تھیں۔

کئی صدی بعد اولیاء چلبی ویانا کی خواتین کو دیکھ کر بہت خوش ہو رہا تھا۔

''چونکہ اس ملک کی آب و ہوا بہت اچھی ہے اس لیے یہاں کی تمام عورتیں خوبصورت ہیں' اچھے قد ہیں جسم اور قد کاٹھ اچھا ہے اور پریوں کے سے خط و خال ہیں۔ ہر جانب بے شمار لڑکیاں ہیں ایسی شیریں' باوقار اور حسین جیسے چمکتا ہوا سورج وہ اپنی ہر ادا سے مردوں کو رجھاتی ہیں۔

مسلمان مہمانوں کو عیسائی معاشرہ کی ایک حرکت پریشان کیے بغیر نہیں رہتی تھی اور وہ تھی عام لوگوں کا عورتوں کی عزت کرنا۔ اولیا لکھتا ہے:

''میں نے اس ملک میں انتہائی عجیب و غریب منظر دیکھا اگر شہنشاہ سڑک پر کسی عورت کو دیکھتا ہے اور وہ گھوڑے پر سوار ہے تو اپنا گھوڑا کھڑا کر لیتا ہے اور عورت کو گذرنے دیتا ہے۔ اگر شہنشاہ پیدل ہو تو عورت کو دیکھ کر نہایت احترام کے ساتھ کھڑا ہو جاتا ہے۔ عورت شہنشاہ کو سلام کرتی ہے اور وہ اپنی ٹوپی سر سے

اتار کر عورت کے سامنے ادب سے سر جھکاتا ہے اور جب تک وہ عورت گزر نہیں جاتی وہیں کھڑا رہتا ہے۔ یہ انتہائی عجیب و غریب منظر ہوتا ہے۔ اس ملک میں اور کافروں کے ہر ملک میں ہر جگہ عورتوں کی بات چلتی ہے۔ حضرت مریم کی وجہ سے ان کا ادب اور احترام کیا جاتا ہے۔" (14)

اس بات پر حیرت نہیں ہونا چاہیے کہ اولیاء جب ایسی عجیب و غریب کہانیاں سناتا تھا تو ترکی میں اسے جھوٹا سمجھا جاتا تھا۔

مراکشی سفیر الغزال 1766ء میں جب سپین کا سفر کرتا ہے تو وہاں بھی عورتوں کی اتنی آزادی دیکھ کر اسے صدمہ ہوتا ہے۔ دوسرے مسلمان مسافروں کی طرح وہ یہ دیکھ کر دہشت زدہ رہ جاتا ہے کہ یورپی۔ حتیٰ کہ ہسپانوی عورتوں میں بھی بے پناہ آزادی ہے۔ اسے اس وقت بھی صدمہ ہوتا ہے جب وہ سرحد پار کر کے مراکش کے شمالی ساحل پر سیوتہ پہنچتا ہے:

"ان کے مکانوں کی کھڑکیاں سڑکوں کی طرف کھلتی ہیں۔ جن میں ہر وقت عورتیں بیٹھی آنے جانے والوں کے ساتھ سلام دعا کرتی رہتی ہیں۔ ان کے شوہران مردوں کے ساتھ بڑی عزت کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ عورتیں اپنے شوہروں کے سوا دوسرے مردوں کے ساتھ لوگوں کے سامنے یا تنہائی میں باتیں کرنے اور بے تکلفی برتنے کی شوقین ہیں۔ وہ جہاں چاہیں جائیں انہیں جانے کی ممانعت نہیں ہے۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ کوئی عیسائی اپنے گھر پہنچتا ہے تو اپنی بیوی' اپنی بیٹی یا اپنی بہن کو کسی اجنبی عیسائی مرد کے ساتھ بیٹھا' شراب پیتا اور ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل کر باتیں کرتا دیکھتا ہے۔ اس سے وہ بہت خوش ہوتا ہے اور جیسا کہ مجھے بتایا گیا وہ اس عیسائی کی عزت افزائی کے لیے ایسا کرتا ہے جو اس کی بیوی یا اس کے گھرانے کی کسی دوسری عورت کے ساتھ موجود ہوتا ہے۔"

الغزال نے سیوتہ میں جو کچھ دیکھا اور اس سے جو معنی اخذ کیے وہ کچھ مبالغہ محسوس ہوتا ہے۔ اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں کہ اپنے سے پہلے وہاں جانے والے مسلمانوں کی طرح اسے بھی تقریبات میں جوڑوں کو رقص کرتا دیکھ کر اور عورتوں کی تعظیم و تکریم کرتا دیکھ کر شدید صدمہ ہوا ہوگا۔ اس کے لیے ایسا ہی افسوسناک طرز عمل عورتوں کا شرمناک لباس پہننا اور اچھے خاندانوں

کی لڑکیوں کا کھلے عام پھرنا اور مردوں کا انہیں اس کی اجازت دینا تھا۔ اس کے خیال میں مردوں کو ان کی غیرت و شرم کا محافظ ہونا چاہیے تھا۔ ایسی ہی ایک تقریب میں شرکت کے بعد الغزال لکھتا ہے:

> ''جب محفل برخواست ہوگئی تو ہم اپنی اقامت گاہوں کو واپس آ گئے اور ہم نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ ہمیں ان کافروں کی اس بدبختی سے محفوظ رکھے جو حسد و رقابت سے عاری ہو چکے ہیں اور کفر کے قعر مذلت میں گر گئے ہیں۔ اور ہم نے رب ذوالجلال سے التجا کی کہ ہمیں ان لوگوں سے ملنے جلنے پر جواب دہ نہ بنا کہ حالات نے ہمیں ایسا کرنے پر مجبور کیا ہے۔'' (15)

محمد آفندی فرانس کی عورتوں کی آزادی سے متاثر ہوا:

> فرانس میں عورتیں مردوں سے بلند مرتبہ رکھتی ہیں اسی لیے ان کا جو جی چاہے کرتی ہیں اور جہاں چاہیں جاتی ہیں اور بڑے سے بڑا لارڈ کم سے کم تر عورت کی بھی حد سے زیادہ تعظیم کرتا ہے۔ اس ملک میں ان کا حکم چلتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فرانس عورتوں کی جنت ہے۔ جہاں انہیں کوئی فکر و فاقہ نہیں ہے اور جہاں وہ جو چاہیں کوشش کے بغیر انہیں مل جاتا ہے۔ (16)

ابو طالب خاں جو اٹھارہویں صدی کے آخر میں انگلستان گیا وہ دوسرا پہلو دیکھتا ہے جو اس سے پہلے یورپ جانے والے مسلمان نظر انداز کر گئے تھے۔ اسے انگریز عورتیں عام طور پر اپنی مسلمان بہنوں سے بدتر حالت میں نظر آئیں۔ وہ کہتا ہے کہ ان عورتوں کو دکانوں اور دوسری ملازمتوں میں مصروف رکھا جاتا ہے۔ اس صورت حال کو وہ انگریز قانون سازوں اور فلسفیوں کی دانش مندی پر محمول کرتا ہے کہ انہوں نے عورتوں کے فتنے سے محفوظ رہنے کے لیے انہیں مصروف کر دیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ وہاں عورتیں طرح طرح کی پابندیوں میں پھنسی ہوئی ہیں۔ مثال کے طور پر وہ اندھیرا ہونے کے بعد باہر نہیں جاسکتیں اور کسی بھی گھر میں اس وقت تک رات نہیں گذار سکتیں جب تک ان کا شوہر ساتھ نہ ہو۔ شادی کے بعد جائیداد پر ان کا کوئی حق نہیں ہوتا اور وہ اپنے شوہر کے رحم و کرم پر ہوتی ہیں جو اپنی مرضی سے انہیں کسی وقت بھی چھوڑ سکتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں مسلمان عورتیں بہت بہتر ہیں۔ ان کی قانونی حیثیت ہے اور جائیداد پر ان کا حق مسلمہ اور قانوناً محفوظ ہے۔ انہیں اور بھی مراعات حاصل ہیں۔ وہ نقاب میں چھپ کر (یہاں وہ افسوس

کرتا ہے) ہر قسم کی شرارت اور فتنہ انگیزی کر سکتی ہیں۔ اس کے یے بہت گنجائش موجود ہے۔ وہ جب چاہیں گھر سے باہر جا سکتی ہیں۔ اپنے ماں باپ' رشتے داروں اور دوست عورتوں کے گھر جا سکتی ہیں اور وہاں کئی کئی دن اور راتیں قیام کر سکتی ہیں۔ ان مواقع اور ان آزادیوں کے بارے میں ابو طالب کے کچھ خدشات بھی ہیں۔(17)

انگلستان سے ابو طالب فرانس گیا۔ وہاں عام خیالات کے برعکس اسے نہ عورتیں اچھی لگیں اور نہ وہاں کے کھانے۔ اسے فرانس کے کھانوں کے مقابلے میں انگلستان کے سادہ کھانے زیادہ پسند آئے۔ اور عورتیں بھی وہیں کی اچھی لگیں۔ ''فرانس کی عورتیں'' وہ لکھتا ہے ''انگریز عورتوں کے مقابلے میں زیادہ لمبی' زیادہ بھاری اور زیادہ گول مٹول لیکن کم خوبصورت ہیں غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ ان کے اندر دوشیزگی کی سادگی اور شرم و حیا اور انگریز عورتوں والی باوقار چال ڈھال نہیں ہے۔'' ابو طالب کو فرانسیسی عورتوں کے بال سنوارنے کا انداز بھی اچھا نہیں لگا۔ اس نے لکھا کہ وہ بالکل ہندوستان کی طوائفوں کی طرح لگتی ہیں۔ چہرے پر غازہ تھوپے' زیورات سے لدی' قریب قریب ننگی چھاتیوں والی فرانسیسی عورتیں اسے عیاش اور بدمعاش نظر آئیں۔ اس سے بھی زیادہ خرابی یہ نظر آئی کہ وہ ''بہت آزاد' چٹر پٹر بولنے والی' بلند آواز اور منہ پھٹ ہیں۔'' ان کے سینے پر ابھرنے گاؤن دلکش کے بجائے مضحکہ خیز لگے۔ آخر میں ابو طالب کہتا ہے کہ لندن میں مختلف مقامات پر جو مناظر دیکھے ان سے اس کی طبیعت خوش ہوگئی لیکن پیرس میں کہیں بھی ایسا نہیں ہوا۔ پیرس میں شاہی محل کے سامنے اسے ہزاروں لوگ ملے لیکن کسی ایک نے بھی اسے متاثر نہیں کیا۔(18)

فرانس کی کسان عورتیں بلکہ دیہات کی ہر چیز ہی اس کے لیے بری تھی۔ گاؤں بہت ہی ناخوشگوار اور شہروں سے بالکل مختلف تھے۔ عورتیں اتنی بھدی تھیں کہ ان کی شکل دیکھ کر ہی طبیعت خراب ہونے لگتی۔ ''ان کے لباس ایسے تھے کہ ان کے مقابلے میں ہندوستان کے گاؤں کی لڑکیاں حوریں نظر آتی ہیں۔''(19)

تاہم اس زمانے کا ترک شاعر بظاہر بہت ہی عاشق مزاج معلوم ہوتا ہے۔ فاضل بے جو فاضل اندرونی (1757-1810) کے نام سے معروف ہے اس مشہور فلسطینی عرب رہنما کا بیٹا تھا جس نے اٹھارہویں صدی کے ستترہویں عشرے میں عثمانیوں کے خلاف بغاوت کی تھی۔ وہ استنبول میں پلا بڑھا اور اپنی عاشقانہ شاعری کی وجہ سے بہت مشہور ہوا۔ خاص طور سے اس کی دو

طویل نظمیں بہت مشہور ہیں۔ ایک لڑکیوں پر ہے اور دوسری لڑکوں پر۔ قومیت کے اعتبار سے ان دونوں کی خوبیاں اور خامیاں گنائی گئی ہیں۔ اس مقصد کے لیے فاضل نے مختلف قوموں کو اپنے ذہن میں رکھا ہے۔ ان میں سلطنت عثمانیہ اور ہمسایہ ملکوں کے بالائی طبقے اور استنبول کے فرنگی بھی شامل ہیں۔ ان میں ڈینیوب کے باشندے ہیں فرانسیسی ہیں پولش ہیں' جرمن ہیں' ہسپانوی' انگریز' روسی اور ولندیزی بھی ہیں۔ حتیٰ کہ امریکی بھی ان میں موجود ہیں۔ ان سے فاضل بے کی مراد یقیناً ریڈ انڈین تھے۔ ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ فاضل بے نے بیرونی مملکوں کی سیر کی ہو لیکن چونکہ وہ شاہی محل میں پلا بڑھا تھا اس لیے اسے مختلف قوموں کی عورتیں دیکھنے اور ان سے ملنے کا کافی موقع ملا ہوگا۔ البتہ لڑکوں کے بارے میں اس کا بیان کچھ مبہم سا ہے۔ لڑکیوں کے بارے میں تفصیل ٹھیک ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ ان کا سراپا بیان کرتا ہے تو ایک ایک عضو کی تشریح کرتا ہے۔ ہاں کبھی کبھی وہ ثقافتی پہلو کو بھی اہمیت دیتا ہے۔ وہ نہایت بیزاری کے ساتھ فرانسیسی عورتوں کے اس شوق کا ذکر کرتا ہے کہ وہ چھوٹے کتے پسند کرتی ہیں اور انہیں سینے سے لگا کر خوب چومتی چاٹتی ہیں۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ہسپانوی عورتیں گٹار بجاتی ہیں اور گاتی ہیں وہ کہتا ہے کہ یہ عادت مراکش سے آئی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ انگریز عورتیں پاک باز اور گلابی گالوں والی ہوتی ہیں اور وہ ہندوستان کی مالک ہیں۔ ولندیزی عورتیں مشکل زبان بولتی ہیں لیکن جنسی خواہش ابھارنے میں ناکام رہتی ہیں۔ (سمجھ میں نہیں آتا کہ فاضل بے اس نتیجے پر کیسے پہنچا۔)

خالد آفندی جو 1803ء سے 1806ء تک پیرس میں رہا' اور جو عام طور پر منفی تصویر ہی پیش کرتا ہے' یورپی لوگوں کی عادات کے ایک ایک پہلو کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ وہ بہت غصے کے ساتھ مسلمانوں پر لگائے جانے والے ایک الزام کا ذکر کرتا ہے۔

> وہ کہتے ہیں' جان لو کہ عام طور پر مسلمان اغلام باز ہیں حالانکہ دنیا میں ایسے بہت سے آرمینیا کے باشندے اور یونانی بھی ہیں۔ یہ بیہودہ اور رسوا کن بات ہے۔ فرنگستان میں تو جیسے ایسی بات کبھی ہوتی ہی نہیں اور اگر ہو جائے تو وہ سخت سزا دیتے ہیں اور ایسا ہنگامہ کرتے ہیں کہ اسے سن کر لگتا ہے کہ ہم سب یہی شوق رکھتے ہیں' جیسے ہمیں اور کوئی فکر ہی نہیں ہے۔
>
> پیرس میں ایک قسم کی منڈی ہے جسے پیلے رائل کہتے ہیں جہاں چاروں جانب مختلف اقسام کی اشیاء کی دکانیں ہیں۔ ان کے اوپر کمرے ہیں جن میں پندرہ سو

عورتیں اور پندرہ سولونڈے رہتے ہیں جو خاص طور سے لواطت کے لیے رکھے
گئے ہیں۔ رات کے وقت وہاں جانا شرم کی بات ہے لیکن چونکہ وہاں دن میں
جانے سے میں کوئی ہرج نہیں ہے اس لیے میں وہاں تماشہ دیکھنے گیا۔ جوں ہی
آپ وہاں داخل ہوتے ہیں چاروں جانب سے آپ کو عورتوں اور لڑکوں کی
تصویروں کے چھپے ہوئے کارڈ ملتے ہیں جن پر لکھا ہوتا ہے "میرے پاس اتنی
عورتیں ہیں، میرا کمرہ فلاں جگہ پر ہے اور معاوضہ یہ۔ یا میرے پاس اتنے
لڑکے ہیں، ان کی عمریں یہ ہیں اور معاوضہ اتنا ہے" یہ سب خصوصی طور پر چھپے
ہوئے کارڈوں پر ہوتا ہے۔ اور اگر ان عورتوں یا لڑکوں میں سے کسی کو آتشک
ہو جائے تو وہاں علاج کے لیے حکومت کے مقرر کردہ ڈاکٹر موجود ہیں۔ عورتیں
اور لڑکے چاروں طرف سے مرد کو گھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں ہم میں سے آپ کو
کون پسند ہے؟" سب سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ یہاں کے بڑے
لوگ فخر کے ساتھ آپ سے دریافت کرتے ہیں "تم پیلے رائل گئے ہو؟" اور
تمہیں وہاں عورتیں اور لڑکے پسند آئے؟" الحمدللہ سرزمین اسلام میں ایسے
لڑکے اور ایسے لوطی نہیں ہیں۔ (21)

اس سے بعد پیرس جانے والا مصری شیخ رفاعہ ہم جنسیت کے موضوع پر ایک نیا پہلو پیش کرتا ہے۔ وہ کسی حد تک پسندیدگی کے ساتھ لکھتا ہے کہ فرانس میں ہم جنس پسندی دہشت اور حقارت کے ساتھ دیکھی جاتی ہے اتنی زیادہ کہ فرانسیسی ادیبوں نے عربی سے جو شاعری اپنی زبان میں ترجمہ کی اس میں مذکر کے صیغہ کو مونث میں تبدیل کر دیا ہے۔

البتہ وہ فرانسیسی عورتوں سے زیادہ متاثر نہیں ہوا۔ اس کی نظر میں فرانس کی عورتوں میں شرم و حیا کی کمی ہے اور مردوں میں مردانہ وجاہت نہیں ہے:

> "ان کے ہاں مرد عورتوں کے غلام ہیں اور عورتیں خوبصورت ہوں نہ ہوں وہ ان کا حکم بجالاتے ہیں۔ ان میں سے ایک نے کہا مشرق کے لوگوں میں عورتیں ان کی املاک کی طرح ہیں۔ فرنگیوں میں عورتیں بگڑے بچوں کی طرح ہیں۔ فرنگی اپنی عورتوں کے بارے میں کوئی برا خیال دل میں نہیں لاتے۔ حالانکہ ان کی عورتوں میں آوارگی بہت زیادہ ہے۔"

رفاعہ مزید لکھتا ہے کہ اگر عورت کی بدچلنی اس کے مرد کے سامنے آ جائے اور شہادتوں کے ذریعہ ثابت بھی ہو جائے اور میاں بیوی میں علیحدگی بھی ہو جائے تب بھی مرد کے لیے ضروری ہے کہ وہ طلاق دینے کے لیے عدالت میں جا کر ثابت کرے کہ اس کی بیوی بدچلن ہے۔ ان کی بری باتوں میں سے ایک بات ان کی بہت سی عورتوں میں چال چلن کی خرابی ہے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے اور ایسے مواقع پر مردوں میں رقابت کا فقدان ہے۔ حالانکہ مسلمان مردوں میں حسد اور رقابت کے جذبات بھڑک اٹھتے ہیں اگر بہت زیادہ بے تکلفی اور عیاشی ہو۔ ان کے ہاں عورتوں مردوں کے جنسی تعلقات گناہ کبیرہ کے بجائے معمولی گناہ ہیں بالخصوص غیر شادی شدہ لوگوں کے درمیان۔

البتہ شیخ فرانسیسی عورتوں کی شکل وصورت، ظاہری رکھ رکھاؤ اور گفتگو سے بہت متاثر ہے۔

فرانسیسی عورتیں اپنی خوبصورتی، وقار، بات چیت اور ادب آداب میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ وہ ہمیشہ آراستہ پیراستہ نظر آتی ہیں اور سیر وتفریح کے مقامات پر مردوں کے ساتھ گھل مل کر باتیں کرتی ہیں۔

شیخ دوسرے مسلمانوں کی طرح رقص کی ایک محفل میں بھی گیا اور مغربی دنیا کی عجیب رسموں سے بہت بیزار ہوا۔ اپنے پیش رو مسلمانوں کی طرح یہ سب چیزیں اسے اجنبی اور عجیب و غریب تو لگیں لیکن دوسروں کی طرح اسے بہت زیادہ صدمہ نہیں ہوا۔ وہ لکھتا ہے "رقص کی محفل میں ہمیشہ مرد اور عورتیں دونوں شامل ہوتے ہیں اور وہاں بہت روشنی ہوتی ہے اور کرسیاں ہوتی ہیں بیٹھنے کے لیے۔ یہ کرسیاں زیادہ تر عورتوں کے بیٹھنے کے لیے ہوتی ہیں اور جب تک تمام عورتیں نہیں بیٹھ جاتیں کوئی مرد نہیں بیٹھتا۔ اگر کوئی عورت آئے اور اس کے بیٹھنے کی کوئی جگہ نہ ہو تو مردوں میں سے ایک کھڑا ہو جاتا ہے اور عورت کو جگہ دیتا ہے۔ مرد کے لیے کوئی عورت کھڑی نہیں ہوتی۔" وہ حیرت کے ساتھ لکھتا ہے کہ ان محفلوں میں مردوں کے مقابلے میں ہمیشہ عورتوں کا زیادہ خیال کیا جاتا ہے۔"

ان مغربی محفلوں کی ایک اور عجیب بات بھی ہے "ان کے ہاں رقص کرنا تہذیب مانا جاتا ہے...... اور ہر آدمی اسے سیکھتا ہے...... شائستہ اور معزز لوگ اس میں شرکت کرتے ہیں اور اس میں بداخلاقی کی کوئی بات نہیں ہے کیونکہ شرافت کی حد سے باہر کوئی نہیں جاتا۔"

شیخ بار بار مغربی آداب اور مصری آداب کا موازنہ کرتا ہے اور مغرب کی تعریف کرتا ہے۔ وہ فرانسیسی اسٹیج کی ایکٹرسوں اور مصر کی رقاصاؤں کا بھی موازنہ کرتا ہے اور وہاں کے تھیٹر اور مسلمانوں کے کھیل تماشوں کا بھی مقابلہ کرتا ہے اور مغربی تھیٹر کو بہت بہتر قرار دیتا ہے۔ رقص پر اس کا تبصرہ قابل ذکر ہے:

''مصر میں رقص صرف عورتیں کرتی ہیں تا کہ مردوں کے اندر شہوانی خواہش بیدار کریں اس کے برعکس پیرس میں رقص ادرگرد اچھلنا کودنا ہی ہوتا ہے بغیر کسی بداخلاقی کے۔ اس کی یہ رائے اس اعتبار سے زیادہ حیرت انگیز ہے کہ وہ مغربی محفلوں میں جانے والے دوسرے مسلمانوں کی طرح رقص کرنے والوں میں اپنا ساتھی بدلنے کی عجیب رسم پر حیران رہ گیا تھا۔

ہر مرد کسی عورت کو اپنے ساتھ رقص کرنے کی دعوت دیتا ہے جب وہ رقص ختم ہو جاتا ہے تو دوسرا مرد اس عورت کو رقص کرنے کی دعوت دیتا ہے اور اسی طرح چلتا رہتا ہے۔ رقص کی ایک خاص قسم وہ ہے جس میں مرد اپنا ہاتھ اپنے اس ساتھی کی کمر کے گرد لے جاتا ہے جس کے ساتھ وہ رقص کر رہا ہے اور عام طور پر اسے اپنے بازو میں جکڑ لیتا ہے۔ ان عیسائیوں میں عام طور پر عورت کے جسم کے اوپر کے کسی حصے کو چھونا برا نہیں سمجھا جاتا۔ مرد عورت کے ساتھ گفتگو کرنے اور اسے خوش کرنے کے فن میں جتنا ماہر ہوتا ہے اتنا ہی وہ معزز اور خاندانی مانا جاتا ہے۔(22)

اب ایک آخری رائے اس ایرانی مسافر کی جو 1838ء میں ازمیر سے جا رہا تھا۔ وہ جہاز پر اپنے ساتھی مسافروں کے بارے میں کہتا ہے:

''چار انگریز لڑکیاں جہاز پر آئیں۔ نہایت فیشن ایبل اور تیز طرار لیکن بدشکل اور بدمزاج۔ چونکہ انہیں اپنے ملک میں مناسب مرد نہیں ملے تھے اس لیے وہ ملک سے باہر جانے پر مجبور ہو گئی تھیں اور کچھ عرصے سے شوہر کی تلاش میں ادھر ادھر سفر کر رہی تھیں۔ لیکن اپنے مقصد میں ناکام ہو گئی تھیں اور اب اپنے گھر واپس جا رہی تھیں۔

اتوار کے دن دوپہر کے وقت ہم جزیرہ پیرے (؟) پہنچے وہ پہلا یونانی علاقہ تھا جہاں ہم پہنچے تھے۔ وہاں ہمیں بیس دن قرنطینے میں رکھا گیا جو جہنم کا نمونہ تھا۔ چاروں دوشیزائیں (وہ یہی دعویٰ کرتی تھیں) قرنطینے کی عمارت میں ہماری ساتھ ہی تھیں۔ آجوداں باشی نے ان کے رہنے سہنے کا خرچ ادا کیا۔ ان میں سے ایک خوش قسمت تھی کہ اسے ایک شہوت کا مارا یونانی نوجوان مل گیا جو ہمارے ساتھ جہاز پر سوار تھا۔ اس کے ساتھ وہ اشارہ بازہ کرتی چلی آ رہی تھی۔ اب وہ بے تکلف ہو گئے اور ایک ہی جگہ رہنے لگے۔ (23)

بہت سے سفارتی نمائندے ان شہروں کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں جہاں وہ گئے اور کبھی کبھی ان کا موازنہ اپنے شہروں سے بھی کرتے ہیں۔ محمد آفندی لکھتا ہے:

پیرس اتنا بڑا نہیں ہے جتنا استنبول' لیکن عمارتیں تین چار یا سات منزل تک بلند ہیں اور ہر منزل پر ایک پورا خاندان رہتا ہے۔ سڑکوں پر لوگوں کی بہت بڑی تعداد نظر آتی ہے کیونکہ عورتیں ہمیشہ سڑکوں پر ہی پائی جاتی ہیں اس گھر سے اس گھر جاتی۔ وہ کبھی گھر نہیں بیٹھتیں۔ عورتوں اور مردوں کے اس اجتماع کی وجہ سے اندرون شہر زیادہ پرہجوم دکھائی دیتا ہے حالانکہ حقیقت میں وہ شہر اتنا پرہجوم نہیں ہے۔ عورتیں دکانوں میں بیٹھتی ہیں اور کاروبار کرتی ہیں۔ (24)

شمالی افریقہ' ہندوستان اور مشرق وسطیٰ سے آنے والے سیاح مغربی شہروں میں دکاندار عورتوں اور ہر جگہ ان کی موجودگی کا ذکر بہت کرتے ہیں۔

ان تمام مسلمان مسافروں کے اندر اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے اوائل میں بھی' یورپ کے داخلی امور پر توجہ دینے کی کوئی خواہش نظر نہیں آتی۔ حتیٰ کہ عزمی جو 1790ء میں پروشیا گیا تھا اپنے خاص مقصد کے سوا اور کسی معاملے سے دلچسپی کا اظہار نہیں کرتا اور نہایت جھنجھلاہٹ کے ساتھ یورپی باشندوں کی اس عادت پر تبصرہ کرتا ہے کہ وہ مہمانوں کو اپنے شہروں کے خاص خاص مقامات دکھانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس طرح اصل کام سے ان کی توجہ ہٹاتے ہیں اور ان کے ملک میں زیادہ دیر قیام کر کے وقت اور رقم ضائع کراتے ہیں۔ انیسویں صدی تک جتنے بھی مسلمان مہمان مغرب گئے ان میں صرف مرزا ابوطالب خاں ہی ایسا شخص ہے جو ان امور پر زیادہ

توجہ دیتا ہے۔(25) اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ وہ ایک ایسے ملک سے آیا تھا جس پر مغرب کا براہ راست اثر پڑا تھا۔ تاہم انیسویں صدی میں مشرق وسطیٰ کے ملکوں کے مسلمان مہمانوں کے لیے ایسے اسباب پیدا ہوئے کہ انہوں نے اپنا قیام بڑھایا اور انہیں اپنی دلچسپی کا سامان بھی زیادہ نظر آیا۔

❁......❁......❁

خلاصۂ کلام

اٹھارہویں صدی کے آخر میں مصر پر فرانس کے قبضے کے دوران میں مصری مورخ جبرتی اس لائبریری اور ریسرچ سنٹر گیا جو فرانسیسیوں نے مملوک سلطانوں کے ایک بے آباد محل میں قائم کیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ وہاں کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ ہے اور ایک عام فرانسیسی سپاہی بھی وہاں کتابیں پڑھنے آتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ وہاں مسلمانوں کو بھی خوش آمدید کہا جاتا ہے:

> ''فرانسیسی خاص طور پر خوش ہوتے ہیں اگر کوئی مسلمان سائنسی علوم سے رغبت ظاہر کرتا ہے۔ وہ خود اس سے بات چیت شروع کر دیتے ہیں اور اسے ہر قسم کی مطبوعہ کتابیں دکھاتے ہیں جن میں افلاک' سیاروں' ستاروں' جانوروں اور پیڑ پودوں کی تصاویر ہوتی ہیں۔ ان کے پاس قدیم تاریخ پر کتابیں بھی ہیں۔ (1)

جبرتی کئی بار لائبریری گیا۔ اسے اسلامی تاریخ اور اسلامی علوم پر کتابیں دکھائی گئیں۔ وہ یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ فرانسیسیوں کے پاس عربی مخطوطات کا بہت بڑا ذخیرہ ہے اور اس کے علاوہ مسلمانوں کی بہت سی کتابیں عربی سے فرانسیسی زبان میں ترجمہ کرائی گئی ہیں۔ اس کام میں وہ دن رات لگے رہتے ہیں۔ ان کے پاس ایسی کتابیں بھی ہیں جو خاص طور پر ہر قسم کی زبانوں سے متعلق ہیں' ان زبانوں کی صرف ونحو اور گردانیں بھی ان کتابوں میں موجود ہیں۔'' جبرتی لکھتا ہے کہ ان کتابوں سے ان کے لیے بڑی سہولت ہوسکتی ہے کہ جس زبان سے چاہیں اپنی زبان میں جلدی سے ترجمہ کر سکتے ہیں۔ (2)

اس طرح جبرتی نے گویا یورپ کے مستشرق دریافت کیے تھے۔ اس کی حیرت قابل فہم ہے۔ اٹھارہویں صدی کے آخر تک جب جدید یورپ نے پہلی بار عرب کے مشرقی علاقوں میں اپنا

اثر ورسوخ قائم کیا اس وقت تک مشرق وسطی کے امور کے مغربی عالموں کے پاس اس موضوع پر کافی کتابیں موجود تھیں۔ عربی صرف ونحو پر قریب ستر کتابیں یورپ میں شائع ہو چکی تھیں۔ اسی طرح دس فارسی اور قریب پندرہ ترکی صرف ونحو پر کتابیں تھیں۔ لغات میں دس عربی کی' چار فارسی کی اور سات ترکی کی تھیں۔ ان میں سے بیشتر صرف طالب علموں کے لیے ہی نہیں تھیں بلکہ باقاعدہ تحقیق کے بعد طبع زاد کتابیں عالموں کے لیے لکھی گئی تھیں۔

دوسری طرف اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ عربوں ایرانیوں یا ترکوں کے لیے کسی مغربی زبان کی لغت یا گرائمر کی ایک بھی کتاب مخطوطے کی شکل میں یا مطبوعہ شکل میں موجود نہیں تھی۔ انیسویں صدی میں کہیں جا کر ہمیں مشرق وسطی کے لوگوں کے لیے مغربی زبانوں کی لغات اور گرائمر لکھنے کی کوششیں ملتی ہیں اور وہ بھی سامراجی اور عیسائی مشنری لوگوں کی کوششوں کا نتیجہ تھیں۔ عربی میں کسی یورپی زبان کی پہلی لغت عربی بولنے والے ایک مصری نے لکھی اور 1828ء میں شائع ہوئی۔ یہ پہل ایک عیسائی نے کی جو مصری قبطی تھا۔ اس کتاب پر نظر ثانی اور اس میں اضافہ ایک فرانسیسی مستشرق نے کیا۔ مصنف نے تعارف میں لکھا ہے کہ یہ کتاب مغربی باشندوں کے استعمال کے لیے لکھی گئی ہے عربوں کے لیے نہیں۔ (3) لوگوں کو یہ خیال بہت بعد میں آیا کہ عربوں کو بھی ایسی لغت کی ضرورت ہوگی۔

مشرق وسطی کے طالب علموں کے مقابلے میں یورپ کے طالب علموں کے لیے زبانیں سیکھنے کی زیادہ سہولتیں موجود تھیں۔ اٹھارہویں صدی کے آخر تک یورپی طالب علم کے پاس مسلمانوں کی تاریخ' مذہب اور ثقافت پر خاصی کتابیں تھیں ان میں نہایت اہم عالمانہ کتابیں بھی تھیں جن میں ترجمے بھی شامل تھے۔ مشرق وسطی کے بارے میں مغرب کا تحقیقی سرمایہ خود مشرق وسطی سے بھی زیادہ تھا۔ یورپی سیاحوں اور ماہرین آثار قدیمہ نے وہ کام شروع کر دیا تھا جس نے مشرق وسطی کی قدیم تہذیب وتمدن کے آثار اور یادگاروں کی دریافت اور ان کی قدیم ترین زبانوں کے فہم اور ان کے فراموش کردہ عظیم اور سنہری ماضی کی بحالی کا راستہ کھولا۔ کیمبرج یونیورسٹی میں عربی زبان وادب کی تعلیم کا پہلا شعبہ 1633ء میں سر ٹامس ایڈم نے قائم کیا۔ اس شعبے میں اور مغربی یورپ کے دوسرے ملکوں کے اسی طرح کے مراکز میں جدید اور دور حاضر کے امور کے بجائے اس علاقے کی قدیم زبانوں' ادب اور تہذیب وثقافت کی تحقیق پر زیادہ توجہ صرف کی گئی اور اس پر طبع زاد کتابیں لکھی گئیں۔ اس کے مقابلے میں حیرت انگیز طور پر مشرق وسطی میں ایسی کوئی

سعی و جستجو نظر نہیں آتی کہ کسی نے یورپ کی زبانوں' تہذیب و ثقافت اور مذاہب پر تحقیق کے بارے میں کسی قسم کا اشتیاق ظاہر کیا ہو۔ صرف عثمانی سلطنت نے ان کے بارے میں معلومات جمع کرنے کی کوشش کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسے اپنے دفاع اور سفارتی تعلقات کے لیے ان کے ساتھ رابطے رکھنا پڑتے تھے۔ لیکن ان کی معلومات کا بھی جو ریکارڈ ملتا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اٹھارہویں صدی کے آخری برسوں تک ان کا علم بھی عام طور پر بہت سرسری سا تھا۔ بلکہ کہیں تو غلط اور پرانا تھا۔

یورپ کے بارے میں مسلم تحریروں کی خصوصیت یہ تھی کہ ان کے خیال میں وقت ایک ہی جگہ کھڑا تھا' کوئی چیز تبدیل نہیں ہو رہی تھی۔ دوسرے زمانوں اور مقامات کے بارے میں ان کی تحریروں سے بھی یہی پتہ چلتا ہے۔ ایک طبیب یا سائنس داں اس بات سے مطمئن ہو جاتا تھا کہ اس نے پچاس یا سو سال پرانی کتاب کا ترجمہ کر لیا ہے۔ کاتب چلپی 1655ء میں عیسائی مذہب پر لکھتا ہے تو قرون وسطی کے مذہبی مناقشوں میں ہی پھنسا رہتا ہے۔ اسے یہ علم ہی نہیں کہ پانچ سو سال کے اندر عیسائی مذہب میں کافی تبدیلیاں آ چکی ہیں۔ وہ اصلاح مذہب کی تحریک' مذہبی جنگوں حتیٰ کہ روم اور قسطنطنیہ میں پیدا ہونے والے مذہبی اختلافات کا حوالہ تک نہیں دیتا۔ اس طرح اٹھارہویں صدی کے اوائل کا ایک عثمانی مورخ ناعمہ اپنے زمانے کی عیسائی مملکتوں کا موازنہ قرون وسطی کے صلیبی جنگ بازوں سے کرتا ہے اور ان کے بارے میں بھی زیادہ تفصیل میں جانے سے احتراز کرتا ہے۔ اور اٹھارویں صدی کے آخر کا ایک ترک آرٹسٹ اپنے زمانے کی یورپی عورتوں کے لباس کی تصویر کشی کرتے ہوئے سترہویں صدی کی عورتوں کے لباس کی تصویر بنا دیتا ہے۔

دونوں معاشروں کا ایک دوسرے کے متعلق رویہ میں ایسا فرق کیوں تھا؟ ظاہر ہے اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یورپ میں مذہبی رواداری زیادہ تھی۔ بلکہ یہاں تو معاملہ ہی بالکل مختلف تھا۔ اسلام کے بارے میں عیسائیوں کا رویہ زیادہ متعصبانہ اور عدم رواداری پر مبنی تھا۔ جبکہ عیسائیوں کے بارے میں مسلمانوں میں ایسا رویہ نہیں تھا۔ مسلمانوں کے اندر عیسائی مذہب کے متعلق زیادہ رواداری اور زیادہ تحمل و برداشت کی وجہ مذہبی' تاریخی اور کسی حد تک عملی بھی تھی۔ حضرت محمد ﷺ حضرت عیسیٰ سے قریب چھ سو سال بعد دنیا میں تشریف لائے۔ مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں کے نزدیک ان کا مذہب خدا کی طرف سے بھیجے جانے والے مذاہب میں سے آخری مذہب تھا۔ لیکن

تاریخی واقعات کے سلسلے نے ان کے تصورات میں فرق و امتیاز پیدا کر دیا تھا۔ مسلمانوں کے نزدیک حضرت عیسیٰ آنحضرت ﷺ کے پیش رو پیغمبر تھے اور حضرت محمد آخری نبی۔ لیکن عیسائی اسے نہیں مانتے تھے۔ مسلمانوں کے نزدیک عیسائی مذہب ایک سچے مذہب کی ابتدائی نامکمل اور تحریف شدہ شکل ہے۔ اس لیے اس کے اندر حق وصداقت کے وہ بعض اجزاء ابھی موجود ہیں جو حضرت عیسیٰ پر خدا نے نازل کیے تھے۔ چنانچہ مسلمان عیسائیوں اور یہودیوں دونوں کو اپنے ہی مذہب کے ابتدائی سلسلے کی کڑی سمجھتے تھے اور ان کے ساتھ تحمل و برداشت کا درس دیتے تھے۔ عیسائیوں کے نزدیک اپنے مذہب کے بعد آنے والے کسی مذہب کے ساتھ برداشت کا مظاہرہ کرنا مذہبی طور پر ناممکن تھا۔ عیسائیوں کے لیے تو یہودیوں کو برداشت کرنا ہی خاصہ مشکل تھا حالانکہ یہودی مذہب کو انہیں بھی ایسا ہی سمجھنا چاہیے تھا جیسے مسلمان عیسائی مذہب کو سمجھتے تھے۔ عیسائیوں کے نزدیک اسلام کو برداشت کرنے کا مطلب یہ تھا کہ اپنے مذہب کے بعد ایک اور مذہب اور انجیلوں کے بعد ایک اور الہامی کتاب نازل ہونے کی صداقت کو قبول کر لیا جائے۔ اسے قبول کرنے کو وہ بالکل تیار نہیں تھے۔

اس کے علاوہ چند عملی اسباب بھی تھے۔ اسلام عیسائیوں کی اکثریت والے علاقوں میں آیا اور ایک طویل عرصے تک مسلمان اپنے زیر تسلط ملکوں میں بھی اقلیت میں ہی رہے۔ اپنے زیر اقتدار علاقوں میں حکمرانوں کے لیے اکثریت کے ساتھ برداشت اور رواداری کا مظاہرہ کرنا انتظامی اور معاشی ضرورت بن جاتا ہے۔ اکثر مسلمان حکمرانوں نے نہایت دانش مندی کے ساتھ اس حقیقت کو پہچانا۔ تاہم یورپ کو عام طور پر کسی ایسی مصلحت سے کام لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ یورپ کے ایک ملک اسپین میں عیسائیوں نے اس عدم رواداری کا مظاہرہ کیا۔ پھر مسلمانوں سے اسپین واپس لینے کے لیے بازیابی کی جو جنگ لڑی گئی اس نے مسلمانوں اور یہودیوں کا تو اس ملک سے انخلا کر دیا لیکن اس ملک کو ہمیشہ کے لیے مفلس اور کنگال بنا دیا۔

دونوں تہذیبوں کے درمیان ایک اور ایسا اہم فرق بھی موجود تھا جس نے دلچسپی اور تجسس کو مہمیز دی۔ اسلامی دنیا میں موجود مختلف اور متنوع تہذیبوں اور رنگارنگ لوگوں کے مقابلے میں قرون وسطی کے یورپی فرنگی یقیناً اکتاہٹ کی حد تک یکسانیت کا نظارہ پیش کرتے ہوں گے۔ عملی طور پر یہ علاقہ ایک مذہب ایک نسل اور کم و بیش ایک ہی کلچر کا حصہ تھا۔ وہاں جو اہم معاشرتی طبقے تھے ان کا ایک ہی لباس تھا۔ اس کے برخلاف اسلامی دنیا میں نسلوں، عقیدوں، لباسوں اور

ثقافتوں کا ایک رنگا رنگ مجموعہ موجود تھا۔ فرنگی عیسائی اس یک رنگی اور یکسانیت کو پسند کرتے تھے اور اس سے ذرا سا انحراف بھی برداشت کرنے کو تیار نہیں تھے۔ چنانچہ انہوں نے بدعتیوں، چڑیلوں، یہودیوں اور ان لوگوں کی پکڑ دھکڑ میں بے تحاشہ قوت ضائع کی جو ان کے عقائد ۔ سے ذرا سا بھی انحراف کرتے تھے۔

ایک اعتبار سے البتہ یورپ تنوع اور رنگا رنگی کا نمونہ تھا۔ اور وہ تھا زبانوں کا معاملہ۔ اس کے مقابلے میں عربی بولنے والی دنیا میں عربی ہی مذہب کی زبان بھی تھی اور تجارت وثقافت کی بھی۔ یہ زبان ماضی کے علوم کا خزانہ اور جدید دور کے کاروبار حکومت وتجارت کا وسیلہ تھی۔ یورپ میں مذہب، تعلیم وتعلم اور روزمرہ کے کاروبار کے لیے مختلف زبانیں استعمال ہوتی تھیں۔ یورپ کا کلاسیکی ادب اور عیسائیوں کی مذہبی کتابیں تین زبانوں میں تھیں، لاطینی، یونانی اور عبرانی۔ اس میں ایک اور زبان آرامی کا بھی اضافہ کیا جاسکتا ہے اگر عہدنامہ عتیق کی آرامی کتابوں کو بھی اس میں شامل کرلیا جائے۔ چنانچہ زمانہ قدیم سے ہی عیسائی اپنی روزمرہ زبان کے علاوہ دیگر مشکل زبانوں پر قدرت حاصل کرنے کی ضرورت کا احساس رکھتے تھے اور اس سے بھی زیادہ اس حقیقت سے بھی واقف تھے کہ علم ودانش کے دوسرے ذرائع بھی ہیں جو غیر ملکی زبانوں میں محفوظ ہیں۔ اور اس علم ودانش کے حصول کے لیے ان زبانوں کا جاننا ضروری ہے۔ عربوں کے ہاں صورتحال بالکل مختلف تھی۔ ان کے نزدیک ان کی زبان، مذہب اور علم وادب کے لیے ایک مکمل زبان تھی۔ وہ ایک ہی وقت میں دینی اور دنیوی دونوں فرائض ادا کرنے کی اہلیت رکھتی تھی۔ اس لیے ان کے ہاں دوسری زبانیں سیکھنے کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔

یورپ میں مختلف زبانیں بولی جاتی تھیں۔ اور ان میں سے ہر زبان کسی خاص مقصد کے لیے ہی کارآمد تھی۔ چنانچہ یورپ کے باشندے بچپن سے ہی جانتے تھے کہ اپنے ہمسایوں کو سمجھنے یا تعلیم وتجارت کے لیے سفر کرنے کی غرض سے کئی زبانیں جاننا ضروری ہیں۔ اس سے بھی زیادہ اپنا مذہب اور دوسرے علوم جاننے کے لیے بھی دوسری زبانیں سیکھنا ضروری تھیں۔ آج بھی حال یہ ہے کہ بحیرۂ روم کے جنوبی ساحل پر مسلمانوں میں صرف ایک زبان یعنی عربی بولی اور لکھی جاتی ہے جبکہ شمالی ساحل پر (یورپ میں) قریب قریب ایک درجن زبانیں رائج ہیں۔

مسلمانوں بالخصوص عرب ملکوں کے شہروں میں بے انتہا تنوع موجود تھا جس میں ایشیا، افریقہ حتیٰ کہ یورپ سے آنے والے سیاحوں، مسافروں، غلاموں اور تاجروں کی آمدورفت سے

اور بھی رنگ برنگی کیفیت پیدا ہوتی رہتی تھی۔ مشرق وسطیٰ کے بڑے شہروں میں اگر عجیب وغریب پوشاک میں ملبوس کوئی شخص نظر آ جاتا تو کسی کو بھی حیرت نہ ہوتی کیونکہ وہاں ایسے نظارے عام تھے۔ لیکن مراکش، ترکی، ایران یا دوسرے مسلم ممالک کا کوئی باشندہ اگر یورپ پہنچ جاتا تو وہاں کے لوگوں کے لیے وہ تماشہ بن جاتا۔

یورپ کے لوگوں کے اس تجسس اور بداخلاقی کی حد تک تماشہ بنانے کے اس شوق کو یورپ جانے والے مسلمانوں نے بہت محسوس کیا۔ چنانچہ اٹھارہویں صدی کے اوائل میں عثمانی سفیر محمد پاشا یورپ کے لوگوں کی اس عجیب وغریب حرکت پر سخت حیران ہوا کہ محض اسے ایک نظر دیکھنے کے لیے انہوں نے دور دراز کے سفر کیے اور طویل انتظار کی تکلیف برداشت کی۔ اس نے تجسس کے لیے ''حرص'' کا لفظ استعمال کیا ہے یعنی ''مجھے دیکھنے کی حرص میں وہ اتنے پاگل ہو گئے تھے۔(4) عزمی آفندی نے 1790ء میں برلن کے بارے میں لکھا ''چونکہ گزشتہ تیس سال سے سلطنت عثمانیہ کا کوئی سفیر برلن نہیں آیا اس لیے برلن کے باشندوں کے لیے ہمارے پہنچنے تک اپنے صبر پر قابو پانا مشکل ہو گیا تھا۔ شدید سردی اور برف باری کی پروا کیے بغیر مرد اور عورتیں گاڑیوں اور گھوڑوں پر سوار اور پاپیادہ صرف ہمیں دیکھنے یہاں تک (کوپے نیک تک) آئے اور پھر واپس برلن چلے گئے۔ عزمی لکھتا ہے کہ کوپے تک سے برلن تک سارے راستے کے دونوں جانب ہمارا تماشہ دیکھنے والوں کا ہجوم تھا۔ دارالحکومت میں مجمع اس سے بھی زیادہ تھا۔ واصف نے ایسا ہی نظارہ میڈرڈ میں داخل ہوتے وقت دیکھا۔(6) بہت سے دیگر مہمان اس نظارے پر خوش بھی ہوتے تھے کہ لوگوں نے اتنا طول طویل سفر کیا اور اتنی رقم خرچ کی اور اتنی تکلیف اٹھائی محض انہیں ایک نظر دیکھنے کے لیے۔ ان سفیروں کے لیے اس قسم کا تجسس یا حرص یقیناً غیر معمولی بات تھی۔

ابتدائی ادوار میں دونوں تہذیبوں کے رویوں میں اس فرق کو اس حقیقت پر مبنی قرار دیا جا سکتا تھا کہ ایک تہذیب ابھی بہت کچھ سیکھ رہی تھی اور دوسری تہذیب کے پاس سکھانے اور دینے کو بہت کچھ تھا۔ لیکن صلیبی جنگوں کے خاتمے کے بعد یہ تصریح کافی نہیں رہتی اور قرون وسطیٰ تک یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہمیں دو معاشروں کے بنیادی رویوں میں فرق واختلاف سے واسطہ ہے۔

بنیادی بات تو یہ تھی کہ یورپ کے اندر اجنبی لوگوں کو جاننے کا اشتیاق نہیں تھا۔ ان کے ہاں اس تجسس کی کمی تھی۔ تاہم مستثنیات بہرحال موجود تھیں۔ یونان کے بابائے تاریخ ہیرودوتس

نے وحشیوں کے علاوہ یونان اور قدیم زمانے کے ساتھ نئے دور پر بھی لکھا۔ چونکہ وہ مشرقی رسم الخط نہیں پڑھ سکتا تھا اس لیے اس نے مشرق سے آنے والے مسافروں سے معلومات حاصل کر کے اس بارے میں لکھا۔ کئی صدی بعد ایک اور یورپی مصنف' فلسطین میں لاطینی سلطنت کے شہر طائر کے بشپ ولیم (وفات 1190) نے ہمسایہ مسلم ممالک کی تاریخ لکھی۔ اس نے بھی اپنے مآخذ مشرق میں تلاش کیے اور چونکہ عربی جانتا تھا اس لیے اصل متن بھی پڑھے۔

لیکن اجنبی تاریخ کے ایسے طالب علم شاذ و نادر ہی تھے۔ یورپ کے بیشتر مورخوں نے' خواہ وہ قدیم تھے یا ازمنۂ وسطیٰ کے' اپنی تحقیق و مطالعہ کو اپنے ملکوں کے واقعات اور لوگوں تک ہی محدود رکھا اور زیادہ تر اپنے زمانے کی تاریخ ہی لکھی۔ ان کے قاری بھی یہی چاہتے تھے۔ کلاسیکی علم تاریخ میں ہیرودوتس کی کچھ اپنی مجبوریاں تھیں اسی لیے اس کی تعریف سے زیادہ اس پر تنقید کی جاتی ہے۔ طائر کے بشپ ولیم کی تاریخ بہت زیادہ پڑھی گئی اور فرانس میں اس کا ترجمہ بھی ہوا۔ جہاں تک ہماری معلومات ہیں اس نے مسلمانوں کی جو تاریخ لکھی اس کا ایک بھی نسخہ محفوظ نہیں رہا۔

یہ بات واقعی حیرت ناک ہے کہ قدیم اسلامی تہذیب نے جو اپنے ابتدائی دور میں یونانی اور ایشیائی تہذیبوں سے بہت زیادہ متاثر ہوئی' مغرب کو فیصلہ کن طور پر مسترد کر دیا۔ تاہم اس کی ایک وجہ یہ بیان کی جا سکتی ہے کہ ابتدا میں جب اسلام پھیل رہا تھا اور بیرونی اثرات اپنے اندر جذب کر رہا تھا اس وقت مغربی یورپ کے پاس اسے دینے کو بہت کم یا بالکل ہی کچھ نہیں تھا۔ بلکہ بظاہر نظر آنے والے کم تر کلچر کے حوالے سے وہ الٹا مسلمانوں کے جذبہ افتخار کو اور بھی ابھار رہا تھا۔ یہ حقیقت خود ہی مسلمانوں کی نظر میں انہیں ذلیل کر دیتی تھی کہ وہ عیسائی ہیں۔ مسلمانوں کا یہ عقیدہ تھا کہ ان کا مذہب تمام سچے الہامی مذاہب کے سلسلے کی آخری کڑی ہے اور دوسرے مذاہب کے پاس جو حق و صداقت نامکمل شکل میں موجود ہے وہ ان کے پاس مکمل شکل میں موجود ہے۔ اس لیے عیسائی فکر اور عیسائی تہذیب دونوں ہی ان کے لیے قابل قبول نہیں تھے۔ ابتدائی دور میں اسلام نے مشرقی عیسائیت کا کچھ اثر قبول کیا لیکن اس کے بعد کسی دور کا بھی حتیٰ کہ بازنطینی تہذیب کے اعلیٰ ترین عیسائی دور کا بھی اسلامی تہذیب پر برائے نام ہی اثر ہوا۔ اس کے بعد جب عیسائی تہذیب وسعت اختیار کر رہی تھی اور مسلمان ایک طرح سے پیچھے ہٹ رہے تھے اور دونوں تہذیبوں کے درمیان تعلقات اور رابطوں کے انداز میں فرق بڑھنے لگا تھا اس وقت تک اسلام اپنے طرز حیات' طرز فکر اور اپنے رویوں میں پختہ ہو چکا تھا۔ اور بیرونی محرکات و ہیجانات سے بے

نیاز ہوگیا تھا۔ خاص طور سے ان اثرات سے محفوظ ہوگیا تھا جو ہزار سالہ دشمن یعنی مغرب کی سمت سے آرہے تھے۔ سلطنت عثمانیہ کی فوجی طاقت ان کے لیے ایک محفوظ فصیل کا کام دے رہی تھی جو مسلمانوں کے زوال کے باوجود جدید دور تک تسلسل کا کام ہی دیتی رہی۔ اس لیے مسلمان دوسری تمام تہذیبوں کے مقابلے میں اپنی تہذیب کو برتر اور ناقابل ترمیم و تنسیخ سمجھتے رہے۔ جیسا کہ ہم میں سے کچھ لوگ آج مغرب کو ایسا سمجھتے ہیں۔ اندلس سے ایران تک قرون وسطی کے مسلمان کے لیے عیسائی یورپ پسماندہ اور جاہل کافروں کی سرزمین تھا۔ یہ ایسا نقطہ نظر تھا جسے غالباً ایک زمانے میں جائز قرار دیا جاسکتا تھا۔ لیکن قرون وسطیٰ کے بعد یہ نظریہ خطرناک حد تک متروک ہوچکا تھا۔

دریں اثنا خود یورپ نے بھی بیرونی دنیا کے بارے میں اپنا رویہ بدل لیا تھا۔ یورپی دانشوروں کا تجسس اور سائنسی تحقیق بھی تین اہم اتفاقات کا نتیجہ تھی۔ ایک اتفاق نئی دنیا کی دریافت تھی جس کے باشندے بالکل ہی عجیب وغریب تھے کہ وہ وحشی بھی تھے اور مہذب بھی اور ایک ایسے کلچر سے تعلق رکھتے تھے جس کا ذکر مذہبی وکلاسیکی کتابوں اور قدیم یورپی روایات میں کہیں بھی نہیں آیا تھا۔ ایسی حیرت انگیز صورت حال نے ظاہر ہے شوق تحقیق اور اشتیاق و تجسس کے جذبات ضرور بھڑکائے ہوں گے۔ دوسری تبدیلی نشاۃ ثانیہ کی نمود تھی۔ اب قدیم علوم کا احیاء ہوا جس نے تحقیق کا شوق اور بھی پیدا کیا اور اس جذبہ کی تسکین کا سامان بھی فراہم کیا۔ تیسری تبدیلی اصلاح مذہب کی تحریک کا آغاز تھا۔ جس کے ذریعہ فکر و بیان پر مذہبی اجارہ داری کے اقتدار اعلیٰ کا خاتمہ ہوا۔ اور انسانی دل ودماغ اس طرح آزاد ہوگئے جس کی مثال قدیم ایتھنز کے دور سے اس وقت تک کہیں نہیں ملتی۔

جوں جوں مسلمانوں کی فتوحات انہیں ایسے دور دراز اور مختلف النوع مقامات تک لے گئیں جیسے یورپ، ہندوستان اور چین۔ انہوں نے بھی اپنے طور پر کئی دریافتیں کیں ان کی بھی اپنی نشاۃ ثانیہ ہوئی جب انہوں نے اپنی ابتدائی صدیوں میں یونانی اور اس سے کسی حد تک کم ایرانی علوم وفنون دریافت کیے۔ لیکن یہ واقعات ایک ہی وقت میں نمودار نہیں ہوئے اور ان کے ساتھ مذہبی جکڑ بندیوں سے آزاد ہونے کا عمل بھی فوراً شروع نہیں ہوا۔ اسلامی نشاۃ ثانیہ اس وقت ظہور پذیر ہوئی جب اسلام کی وسعت پذیری ختم ہوچکی تھی اور عیسائیت کا جوابی حملہ شروع ہوچکا تھا۔ قدیم اور جدید کی جنگ اور ماہرین الٰہیات اور فلسفیوں کی دانش مندانہ چپقلش الٰہیات کی فیصلہ کن اور پائیدار فتح کی صورت میں ختم ہوچکی تھی۔ اس سے مسلم دنیا کا اپنے آپ میں خود کفیل ہونے اور

دوسروں سے برتر ہونے کا عقیدہ پختہ ہوگیا اور یہ ایمان ہوگیا کہ ہم ہی حق وصداقت اور مہذب طرز زندگی کے امین ہیں۔ صدیوں کی شکست خوردگی کے بعد ہی کہیں جا کر دنیا کے بارے میں مسلمانوں کے اس تصور میں تھوڑی بہت تبدیلی واقع ہوئی اور انہیں یہ معلوم ہوا کہ اس دنیا میں ان کا اپنا مقام کیا ہے۔ اس کے بعد ہی انہوں نے حقارت کی نظر کے سوا کسی دوسری نظر سے بھی عیسائی مغرب کو دیکھنا شروع کیا۔

مسلمانوں اور یورپ کے درمیان ایک نہایت اہم اور اس وقت کے حالات کے مطابق جو فرق تھا وہ تجارت اور تجارت میں مصروف قوموں کے اثرات کا تھا۔ مشرق وسطی میں یورپ کے تاجر بے شمار تھے اور بہت دولت مند بھی تھے۔ حکومتوں کی پالیسی اور تعلیم پر ان کے اثرات مسلسل بڑھ رہے تھے۔ ان کا اثر ورسوخ اتنا بڑھ گیا تھا کہ وہ ان مملکتوں کی پالیسی تبدیل کرا سکتے تھے۔ یورپ میں مسلمان تاجر تعداد میں بہت کم اور غیر اہم تھے اور مسلمانوں کا تاجر طبقہ کوئی بورژوا سوسائٹی یا تجارتی معاشرہ نہیں بنا سکا اور نہ فوجی' افسر شاہی اور مذہبی اشرافیہ یا حکومت و تعلیم پر اس اشرافیہ کے تسلط کو چیلنج کر سکا تھا۔

مغرب کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے میں اسلامی دنیا اور جاپان کے رویہ میں جو فرق ہے عام طور پر اس کا موازنہ کیا جاتا ہے۔ جاپان کی صورت حال بالکل مختلف تھی۔ جاپان دور افتادہ جزائر پر مشتمل ایک ایسا ملک ہے جو مغربی طاقتوں کی مداخلت یا حملوں سے دور رہا۔ مغرب کے بارے میں مسلمانوں کے تصور وادراک کو ایک ایسی حقیقت نے بھی متاثر کیا بلکہ وہ ان کے خیالات پر چھائی رہی' جو جاپان کے ہاں نہیں تھی۔ وہ تھا مذہب۔ باقی دنیا کی طرح مسلمان یورپ کا تصور بھی اوّل و آخر خالصتاً مذہبی نقطہ نظر سے ہی کرتے تھے۔ یعنی یورپ یا مغرب نہیں بلکہ عیسائی دنیا کے طور پر۔ مشرق بعید کے برعکس مشرق وسطی میں عیسائیت سے سب مانوس تھے اور اسے رد کرتے تھے۔ چنانچہ عام عقیدہ یہ تھا کہ گمراہیوں سے معمور اور متروک مذہب سے کیا علم حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اس تصور نے صورت حال اور بھی خراب کی کہ اس مذہب کو نہ صرف اپنے مذہب سے کمتر تسلیم کیا جاتا تھا بلکہ اپنا دشمن بھی مانا جاتا تھا۔ ساتویں صدی میں عرب میں اپنے ظہور کے ساتھ ہی عیسائیت کے ساتھ اسلام کی چپقلش شروع ہوگئی تھی۔ یہ چپقلش مسلمانوں کی فتوحات' پھر جنگ بازیافت کے ذریعہ عیسائیوں کی فتح' اس کے بعد جہاد اور صلیبی جنگوں' ترکی کی پیش قدمی اور پھر

یورپ کی توسیع اور کامیابیوں کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہی۔ مسلمانوں نے دوسری قوموں کے ساتھ بھی جنگیں لڑیں۔ لیکن عیسائیت کے خلاف ان کی جنگیں سب سے طویل اور زیادہ تباہ کن ثابت ہوئیں جو جہاد اعظم کے طور پر مسلمانوں کے شعور پر حاوی ہو گئیں۔ بلاشبہ میدان جنگ میں دشمن سے بھی سبق حاصل کیا گیا لیکن وہ اپنے اثرات اور اپنی قدر و قیمت کے لحاظ سے محدود ہی رہا۔ اس کے علاوہ اسلام کے اندر جو معاشرتی اور علمی قلعہ بندیاں موجود تھیں انہوں نے بھی اس اثر کو کند کر دیا۔

ادھر یورپ جانے والے بعض مسلمان کارآمد معلومات اکٹھی کرنے کے لیے مضطرب بھی رہے۔ اوّل اوّل یہ معلومات فوجی امور تک ہی محدود رہیں۔ تاکہ دوبارہ جنگ چھڑنے پر کام آ سکیں۔ چنانچہ یورپ سے ترک اور مراکشی سفارت خانوں کو جو رپورٹ دی جاتی تھیں وہ عام طور پر سفارتی نمائندوں کے سفر کی مفصل داستانیں ہی ہوتی تھیں۔ ان میں سڑکوں اور راستوں' راستے میں ملنے والے پڑاؤ اور جن مقامات سے وہ گزرے ان کے دفاع کے انتظامات کی تفصیل ہی شامل ہوتی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ان میں وہ سیاسی معلومات بھی درج ہونے لگیں جنہیں کارآمد سمجھا جاتا تھا۔ لیکن یہ کام بہت ہی بعد میں شروع ہوا۔ قرون وسطی میں یہ عمل بالکل ہی مفقود رہا حتیٰ کہ اٹھارہویں صدی کے آخر تک یورپ سے بھیجی جانے والی عثمانی نمائندوں کی سیاسی رپورٹ بھی حیرت انگیز طور پر بہت ہی مختصر' نہایت سرسری اور سادہ لوحی پر مبنی ہوتی تھیں۔ اٹھارہویں صدی کے آخر تک یورپ کے بارے میں مسلمانوں کی پریشانی اور فکرمندی میں اضافہ ہونے لگا اور عجیب وغریب اور خطرناک معاشرہ کا مطالعہ کرنے کی ضرورت کا احساس ہو جانے کے اشارے بھی ملنے لگے۔ اب پہلی بار مسلمان' عیسائی یورپ کا سفر اختیار کرنے لگے اور وقتاً فوقتاً کچھ عرصے کے لیے وہاں قیام بھی کرنے لگے۔ وہاں مستقل سفارت خانے قائم کیے جانے لگے اور عثمانی سفارتی نمائندے اور مختلف عمال حکومت کبھی کبھی تو کئی کئی برس وہاں رہنے لگے۔ اس کے بعد طلبہ جانا شروع ہوئے۔ ابتداء میں کم تعداد میں' پھر زیادہ تعداد میں مشرق وسطی کے حکمران اپنے نوجوان یورپ بھیجتے تھے تاکہ وہ حکومت کے استحکام اور سلطنت کے دفاع کے لیے ضروری علوم وفنون اور ہنر سیکھ سکیں۔ اگرچہ اب بھی انہیں بھیجنے کا اصل مقصد فوجی ہی تھا لیکن وقت گذرنے کے ساتھ اس کے اثرات بہت دور تک گئے اور ان طلبہ نے یورپ کی یونیورسٹیوں حتیٰ کہ فوجی تربیتی مراکز میں جو کچھ سیکھا اس کی وسعت حکمرانوں کی خواہشات سے بھی آگے تک گئی۔ انیسویں صدی کی دوسری چوتھائی تک ایسے ترک' عرب اور ایرانی طلبہ کی تعداد بہت ہی کم تھی جو کوئی یورپی

زبان پڑھ سکتے تھے۔ ان میں بھی زیادہ تعداد ان لوگوں کے بیٹوں پوتوں کی تھی جو عیسائی یا یہودی سے مسلمان ہوئے تھے۔ لیکن وہ ایک اہم اور بااثر گروہ بنتے جا رہے تھے۔ ایسا گروہ جو نصابی کتابوں کے علاوہ بھی دوسری کتابیں پڑھتا تھا اور وہ ترجمان اور ترجمہ کرنے والوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کی حیثیت سے اپنا اثر ورسوخ بڑھا رہا تھا۔

اب تبدیلی کی اصل ترغیب وتحریک بلاشبہ ساری دنیا پر مغرب کا غلبہ بن رہا تھا۔ لیکن دریافت کے عمل میں تیزی کا سبب نئے وسائل کی فراہمی بھی تھی۔ خاص طور سے مغرب میں پرنٹنگ پریس کا استعمال اور اخباروں اور رسالوں کا اجرا اور کتابوں کی چھپائی جس کے ذریعہ یورپی حقائق اور خیالات مسلم قاری تک پہنچ رہے تھے۔

ان میں سے سب سے موثر وسیلہ اخبارات تھے۔ مغرب کی اس اختراع سے اسلامی مشرق ایسا بے خبر بھی نہیں تھا۔ 1690ء میں ہی مراکشی سفیر غسانی نے اپنے روزنامچے میں "لکھنے کے کارخانے" کا ذکر کیا تھا۔ اس کی مراد پرنٹنگ پریس تھا۔ اس نے ان اخباروں کی اطلاع بھی دی تھی جو اس وقت اسپین میں شائع ہو رہے تھے۔ (7) اس نے لکھا تھا کہ دوسری باتوں کے علاوہ یہ اخبارات ہیجان انگیز جھوٹ سے بھرے ہوتے ہیں۔ عثمانی مبصروں نے پہلی بار اٹھارہویں صدی میں یورپی اخبارات سے باخبر ہونے کے اشارے دیئے۔ اس بات کی شہادت موجود ہے کہ شاہی دربار کے لیے اخبارات سے بعض اقتباسات ترکی زبان میں ترجمہ کیے گئے۔ شروع میں تو یہ کام وقتاً فوقتاً ہوتا رہا بعد میں باقاعدہ ایک پریس بیورو بنا دیا گیا جو عثمانی سلطنت نے انیسویں صدی میں اور اس کے بعد بھی برقرار رکھا۔ قاہرہ میں خدیو کے محل کے محافظ خانے میں موجود مخطوطات سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ محمد علی پاشا کے بعد اس کے جانشین بھی مغربی اخبارات سے فائدہ اٹھاتے رہے۔

اس علاقے میں جو پہلا اخبار شائع ہوا اس کی تحریک کسی مقامی باشندے کی طرف سے نہیں ہوئی تھی بلکہ ایک غیر ملکی نے یہ قدم اٹھایا تھا۔ یہ اخبار فرانس کے زیر اہتمام فرانسیسی زبان میں چھپتے تھے اور فرانس کی انقلابی حکومت کے پروپیگنڈہ کے لیے نکالے گئے تھے۔ 1790ء کے عشرے میں فرانس نے استنبول میں اپنے سفارت خانے میں ایک پرنٹنگ پریس لگایا جہاں سے وہ اطلاعات، اعلامیے اور اعلان شائع کرتے تھے۔ 1795ء تک فرانسیسی سفیر نے چھ سے آٹھ صفحات تک کا ایک پندرہ روزہ اخبارچہ شائع کرنا شروع کر دیا تھا۔ ظاہر ہے اس کا مقصد فرانسیسی

باشندوں کی رہنمائی تھی یہ اخبارچہ عثمانی سلطنت کے تمام علاقوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ ایک سال بعد اسے باقاعدہ اخبار بنادیا گیا۔ جس کا نام La Gazette Francasie Constantinople تھا۔ مشرق وسطیٰ سے شائع ہونے والا یہ پہلا اخبار تھا۔ (8) مصر پر حملے کے ساتھ بوناپارٹ نے استنبول کا اخبار بند کر دیا لیکن قاہرہ میں ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ اس کے لیے وہ دو پرنٹنگ پریس وہاں لایا جن میں عربی اور یونانی کے ساتھ فرانسیسی زبان کا ٹائپ بھی تھا۔ 29 اگست 1798ء کو فرانسیسیوں نے Courier de l, 'Egypte, اخبار کا پہلا شمارہ شائع کیا۔ یہ اخبار ہر پانچ دن کے بعد چھپتا تھا اور مقامی اور بعض اوقات یورپ کی خبریں شائع کرتا تھا۔ اس کے 116 شمارے شائع ہوئے۔

یہ اخبار یا اخبارچہ اور اس کے ساتھ زیادہ مفصل رسالہ La Decade d,'Egypte, صرف فرانسیسی زبان میں شائع ہوتے تھے۔ لیکن 16 جون 1800ء کو جنرل کلیبر کے قتل کے بعد اس کے جانشین عبداللہ مینو نے عربی زبان کا پہلا اخبار جاری کیا۔ اس کا نام تھا التنبیہ لیکن یہ زیادہ عرصہ نہیں چلا۔

مشرق وسطیٰ میں اخباروں کے اجراء کا دوسرا دور 1824ء میں شروع ہوا جب ایک ماہنامہ نکالا گیا۔ اگرچہ یہ فرانسیسی زبان میں شائع ہوتا تھا۔ اور اس کی مخاطب خاص طور پر غیر ملکی آبادی ہی ہوتی تھی لیکن اس نے اس زمانے کے معاملات میں کسی حد تک اہم حصہ لیا۔ ایک آدھ بار اس کے ایڈیٹر کو ارباب اختیار کے ساتھ مقابلہ بھی کرنا پڑا۔ مثلاً اس وقت جب اس نے یونانی باغیوں کے مقابلے میں عثمانیوں کے مفادات کی حمایت کی۔ اس واقعہ سے دو واقعات اور سامنے آئے۔ ایک اخباروں کی طاقت اور دوسرے سنسر کا خطرہ۔ روسیوں نے اخبار کی پالیسی سے ناراض ہو کر عثمانی حکام پر دباؤ ڈالا کہ اخبار پر پابندی لگادی جائے۔ اس زمانے کے ترک مورخ مصطفیٰ نے لکھا ہے کہ روسی سفیر نے کہا:

> ''ٹھیک ہے فرانس اور انگلستان میں صحافی آزادی کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کر سکتے ہیں، حتیٰ کہ اپنے بادشاہوں کے خلاف بھی لکھتے ہیں۔ اس لیے پرانے زمانے میں کئی مواقع پر ان صحافیوں کی وجہ سے فرانس اور انگلستان میں جنگیں بھی چھڑیں۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ مامون من اللہ (یعنی عثمانی) قلمرو ایسی چیزوں سے محفوظ تھی یہاں تک کہ یہ آدمی ازمیر میں نمودار ہوا اور اس نے اپنا

اخبار شائع کرنا شروع کر دیا۔ اسے اس کام سے روکنا ہی مناسب ہوگا۔
اس انتباہ کے باوجود اخبار چلتا رہا اور بعد میں اس کے ساتھ اور اخبار بھی شامل ہو گئے۔
مصر کے شیخ رفاعہ نے جو 1826ء میں پیرس گیا تھا اخبارات کی اہمیت کو فوراً تسلیم کر لیا۔

"انسان روزانہ جریدے کے ذریعہ جسے جرنل اور گزٹ کہا جاتا ہے معلوم کر لیتا ہے کہ دوسروں کے دماغ میں کیا ہے۔ ان سے انسان وہ نئے واقعات جان لیتا ہے جو ملک کے اندر اور باہر پیش آ رہے ہیں۔ اگرچہ وہ ان کے اندر اتنا زیادہ جھوٹ پائے گا جس کا شمار نہیں' تاہم ان میں ایسی خبریں بھی ہوتی ہیں جن سے انسان علم حاصل کر سکتا ہے۔ ان میں نئے سائنسی سوالات پر بحث کی جاتی ہے یا اعلان ہوتے ہیں یا کارآمد مشورے ہوتے ہیں خواہ وہ کسی بڑے آدمی کی طرف سے آئیں یا چھوٹے آدمی کی طرف سے۔ کیونکہ بعض اوقات چھوٹے لوگوں کے پاس بھی ایسے خیالات ہوتے ہیں جو بڑے لوگوں کے دماغ میں نہیں آتے۔ ان جریدوں کے فوائد میں سے چند فائدے یہ ہیں۔ اگر کوئی آدمی اچھا یا برا کام کرتا ہے تو رسالے کے لوگ اس کے بارے میں لکھتے ہیں تا کہ تمام خاص اور عام لوگوں کو اس کا علم ہو جائے اور نیک کام کرنے والوں کی تحسین کی جائے اور برے کام والوں کی مذمت کی جائے۔ اسی طرح اگر کوئی آدمی کسی دوسرے آدمی کے ساتھ برائی کرتا ہے تو وہ آدمی اپنی شکایات لکھ کر ان جریدوں کو بھیج دیتا ہے اور ہر خاص و عام اس سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ اور مظلوم اور اس کے لوگوں کی کہانی اسی طرح جان جاتا ہے جیسے وہ وقوع پذیر ہوئی کسی قسم کے تغیر و تبدل کے بغیر' تا کہ عدل و انصاف کی کرسی تک یہ معاملہ پہنچے اور قانون کے مطابق اس کا فیصلہ کیا جائے اور دوسروں کے لیے وہ تنبیہ اور مثالی ثابت ہو۔(10)

مشرق وسطی میں پہلا باقاعدہ جریدہ مصر میں محمد علی پاشا نے جاری کیا۔ یہ مصر کا سرکاری گزٹ تھا۔ اس کا پہلا شمارہ 20 نومبر 1828ء کو قاہرہ میں چھپا۔ اس کا عثمانی نمونہ چند سال بعد 1832ء میں جاری ہوا۔ اس کے اداریہ میں واضح کیا گیا کہ یہ سرکاری اخبار شاہی تاریخ نویسی کے

قدیم ادارے کی ارتقائی شکل ہے اور اس کا مقصد یہ فرائض انجام دینا ہیں کہ حکومت کے اقدامات اور احکام کی صراحت کے بجائے واقعات کی اصل نوعیت بیان کی جائے تا کہ کسی قسم کے غلط فہمی پیدا نہ ہو اور بلا جواز تنقید کا راستہ روکا جائے۔ اس کی ایک اور غرض یہ بیان کی گئی کہ تجارت، سائنس اور فنون کے متعلق کارآمد معلومات فراہم کی جائیں۔ 1834ء میں عثمانی پوسٹل سروس کے اجراء سے اس اخبار کو بہت مدد ملی۔ یہ اخبار اس وقت تک ترکی زبان کا تنہا اخبار رہا جب تک پہلا سرکاری اخبار نہیں نکل آیا۔ یہ ہفت روزہ اخبار 1840ء میں ایک انگریز ولیم چرچل نے نکالا تھا۔ ایران میں اس قسم کا سرکاری جریدہ 1835ء میں مرزا محمد صالح نے جاری کیا۔ مرزا صالح انگلستان میں پڑھنے والے پہلے ایرانی طلبہ میں سے تھا۔

جدید قاری کے لیے یہ سرکاری گزٹ جو قاہرہ، استنبول اور تہران سے نکلتے تھے۔ نہایت معمولی، خشک اور بہت ہی محدود دلچسپی کے حامل ہوتے تھے۔ تاہم انہوں نے ترکی، مصری اور ایرانی قارئین کو بیرونی دنیا سے روشناس کرانے میں کسی حد تک اہم کردار ادا کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے ایک نئی اخباری زبان بھی پیدا کی جس کے ذریعہ اب اداروں اور ان افکار پر تبصرہ کیا جاتا تھا جو ابھی تک عام لوگوں کے سامنے نہیں آئے تھے۔ طباعت میں آنے والے انقلاب نے دریافتوں کے عمل کو اور آگے بڑھایا۔ بعد میں جو اخبار اور جرائد شائع ہونا شروع ہوئے انہوں نے ترجمے کے فن کو بھی فروغ دیا جس کے ذریعہ یورپ کے بارے میں بے شمار معلومات مسلمان قاری تک پہنچائی جا رہی تھیں کیونکہ اکثر و بیشتر یہ معلومات یورپ والے خود لکھ رہے تھے۔ ان کا ترجمہ مقامی زبانوں میں کیا جا رہا تھا۔

انیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں مغربی اصلاحات کے نفاذ کے دو بڑے مرکز تھے۔ ایک ترکی اور دوسرا مصر۔ ان دونوں مراکز میں مغربی کتابوں کے تراجم کو خاص اہمیت دی جا رہی تھی۔ مصر میں بالخصوص حکومت کے زیر اہتمام ترجمے کا ایک باقاعدہ اور منظم پروگرام تھا۔ اس کی مثال عباسی خلفاء کے دور کے سوا اور کہیں نہیں ملتی۔ عباسی دور میں عربی زبان میں سائنس اور فلسفے کی یونانی کتابوں کے ترجمہ کا حکم جاری کیا گیا تھا۔ 1822ء اور 1842ء کے دوران قاہرہ میں 243 کتابیں طبع کی گئیں جس میں بیشتر ترجمے تھے۔ اگرچہ یہ کتابیں مصر میں شائع ہوئی تھیں جو عربی بولنے والا ملک ہے لیکن آدھی سے زیادہ کتابیں ترکی زبان میں تھیں۔ محمد علی پاشا کے دور کے مصر میں اشرافیہ کی زبان ترکی ہی تھی اور بری اور بحری افواج کے موضوعات پر جن میں نظری اور

اطلاقی ریاضی بھی شامل تھی، قریب قریب تمام کتابیں ترکی زبان میں تھیں۔ پاشا جن طلبہ کو یورپ پڑھنے کے لیے بھیجا کرتا تھا ان میں بھی نصف سے زیادہ ترکی بولنے والے ہوتے تھے۔ تاہم طب، بیطاری اور زراعت پر بیشتر کتابیں عربی میں تھیں۔ یہ مضامین ترکی کے حکمران طبقے کے لیے نہیں تھے۔ تاریخ کے علم کو بھی عارضی طور پر ہی سہی، سرکاری طور پر کارآمد علم کی حیثیت سے تسلیم کرلیا گیا تھا اس لیے وہ بھی حکمران طبقے کے لیے مخصوص تھا۔ چنانچہ محمد علی پاشا کے ابتدائی دور میں تاریخ پر جو چند کتابیں شائع کی گئیں وہ سب ترکی زبان میں ہیں۔ 1829ء اور 1834ء کے دوران میں تاریخ کی چار کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔ ایک روس کی کیتھرین دی گریٹ پر اور تین نپولین اور اس کے دور پر تھیں۔ اس کے بعد کئی سال کا وقفہ ہے پھر جس تاریخی کتاب کا ترجمہ کیا گیا وہ والٹیئر کی Historie de Charles XI مطبوعہ 1841ء تھی۔ اس بار یہ ترجمہ ترکی میں نہیں تھا بلکہ عربی میں تھا۔ اس کے بعد مصر میں تاریخی کتابوں کے جو ترجمے شائع ہوئے وہ عربی میں تھے۔ (11)

مصر میں جو ترجمے شائع ہوئے وہ ترکی میں بھی پڑھے جاتے تھے اور چند ترجمے وہاں دوبارہ بھی شائع کیے گئے۔ لیکن اس وقت تک استنبول میں ترجمے کی تحریک سائنسی کتابوں تک ہی محدود تھی۔ اس صدی کے وسط میں کہیں جا کر استنبول میں تاریخی کتابوں کے ترجمے نمودار ہونا شروع ہوئے۔ اس سلسلے میں سب سے اہم واقعہ تاریخ عالم کے انگریزی خلاصے کے ترکی ایڈیشن کی اشاعت ہے جو 1866ء میں شائع ہوا۔

ایران میں عظیم وقائع نگار رشید الدین کے بعد مغربی تاریخ سے دلچسپی کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ اس کی کتابوں کی نقالی کرنے والے تو بہت پیدا ہوئے لیکن کسی نئی چیز یا نئی معلومات کا اضافہ نہیں کیا گیا۔ آخر انیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں کہیں جا کر ہمیں چند نئی کتابیں ملتی ہیں جن میں سے بیشتر مخطوطے کی شکل میں ہی ہیں۔ یہ مغرب کی تاریخ سے متعلق ہیں۔ یہ کتابیں براہ راست مغربی مآخذوں کے بجائے ترکی سے ماخوذ ہیں۔ ایک مخطوطے میں جس پر مصنف کا نام اور کوئی تاریخ درج نہیں ہے اور جو غالباً انیسویں صدی کے اوائل کا ہے جولیس سیرز سے چارلس اوّل تک کی تاریخ آٹھ ابواب میں بیان کی گئی ہے۔ (12) اس کے علاوہ مغرب کی تاریخ پر فارسی میں لکھی ہوئی کتابیں انیسویں صدی کے دوسرے نصف کے بھی آخر میں کہیں جا کر نظر آتی ہیں۔ اس وقت ترکی اور عربی دونوں زبانوں میں کافی بڑا ذخیرہ موجود تھا۔ ان کتابوں نے اخباروں اور رسالوں کے ساتھ یقیناً مسلمان قاری کے سامنے دنیا کی تصویر کافی تبدیل کر دی ہوگی۔

انیسویں صدی کے پہلے نصف میں ایسی کتابوں اور رسالوں کا تو جیسے طوفان آ گیا۔

اب یورپ کو دریافت کرنے کے لیے کسی نئے مسلم مہم جو کی ضرورت نہیں تھی۔اب تو یورپ خود ہی مسلمانوں کی سرزمینوں پر چڑھائی کر رہا تھا اور مسلمان ملکوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کے لیے اپنی شرائط منوا رہا تھا۔مسلمانوں کو ان تعلقات کے ساتھ مانوس ہونے اور اپنے آپ کو ان کے مطابق ڈھالنے میں کچھ وقت لگا لیکن واقعتاً انہیں کبھی تسلیم نہیں کیا گیا۔

انیسویں صدی میں یہ تبدیلی کئی شعبوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ان میں سے ایک تو وہ تھا جس کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے یعنی غیر ملکی یا یورپی زبانوں کے بارے میں رویہ۔پہلی بار کسی غیر مغربی زبان کا سیکھنا جائز اور پھر مناسب اور آخر کار ضروری قرار دیا گیا اور پھر مسلم نوجوانوں کو غیر ملکی استادوں کی نگرانی میں دیا گیا۔پہلے تو اپنے ملک میں اور آخر کار یورپ میں۔اس سے چند سال پہلے تک ایسے کام ہولناک اور نا قابل بیان تصور کیے جاتے تھے۔اب غیر ملکی زبان کا علم ایک اہم قابلیت مانا جاتا تھا۔اور زبانوں کی تعلیم اور تراجم کے مراکز کا درجہ فوج اور شاہی دربار کے ممتاز اداروں کے برابر ہو گیا تھا۔حالات کی اس اہم تبدیلی نے عیسائی اقلیتوں کو بھی ایک خاص اہمیت دلا دی۔ بالخصوص عرب ملکوں میں جہاں ترکی اور ایران سے زیادہ وہ مسلم اکثریت کی زبان اور ثقافت میں برابر کے شریک تھے۔

اب یورپ جانے والے مسلمانوں کا طوفان بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ پہلے سفارتی نمائندے آئے پھر طلبہ' اس کے بعد دوسرے سیاح اور کچھ عرصے بعد سیاسی پناہ گزین۔یورپ سے مشرق وسطی میں علم و افکار کی آمد جو ان رسائل سے ہو رہی تھی اب اور وسیع ہو گئی۔انسانوں کی بڑھتی ہوئی آمد و رفت کے ساتھ رابطے کے کچھ اور راستے بھی کھل گئے۔مکتب اور فوج' کتاب اور اخبار' سرکاری دفاتر اور کاروباری ادارے سب کے سب یورپ کے بارے میں مسلمانوں کے علم میں اضافہ کر رہے تھے۔اب یورپ کے بارے میں یہ احساس بڑھ رہا تھا کہ وہ بہت ہی طاقتور اور وسعت پذیر قوت ہے' جس سے اسلام کی بنیادوں کو خطرہ ہے' اس لیے ضروری ہے کہ اسے پوری طرح سمجھا جائے اور اس کی تقلید یا نقل کے لیے کچھ تدابیر اختیار کی جائیں۔اب یورپ سے بے نیازی اور عدم دلچسپی کا پرانا رویہ بدلا تھا خواہ وہ کچھ عرصے کے لیے ہی سہی۔آخر کار مسلمان یورپ کی طرف واپس جا رہے تھے۔یہ واپسی تحسین و آفرین یا احترام کے ساتھ نہیں تھی کیونکہ خوف کا عنصر اس میں بہر حال شامل تھا۔تاہم یورپ کی نقل کر کے بہر حال اسے خراج تحسین پیش کیا جا رہا تھا اور یہ سلسلہ ہمارے زمانے تک جاری ہے۔

❁......❁......❁
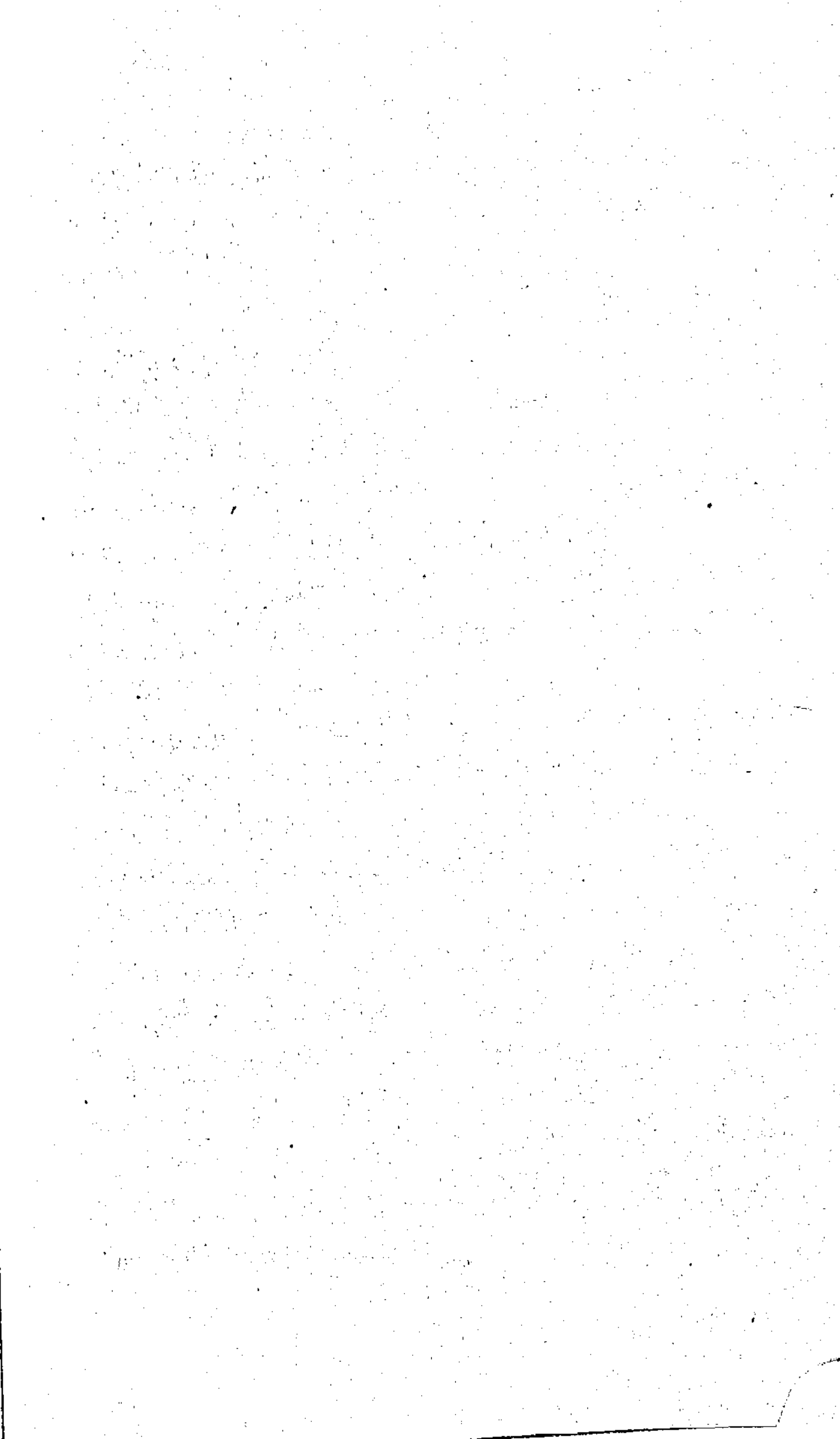
Notes

Chapter I

1. Edward Gibbon, *The Decline and Fall of the Roman Empire*, ed. J.B. Bury (London, 1909/1914), vol. 6, chap. 52:16.
2. Zuhrī, *Kitāb al-Djuʿrāfiya.* Mappemonde du Calife al-Ma'mun réproduite par Fazàri (III/IX s.) rééditée et commentée par Zuhrī (VI[e]/XII[e] s.), ed. M. Hadj-Sadok in *Bulletin d'études orientales* 21 (1968): 77/230; cf. French transl., p. 39.
3. Ibn ʿAbd al-Ḥakam, *Futūḥ Miṣr wa-akhbāruhā*, ed. C. C. Torrey (New Haven, 1922), pp. 216–217.
4. Ibn al-Qalānisī, *Dhayl ta'rīkh Dimashq (History of Damascus 365–555 A.H.)*, ed. H. F. Amedroz (Beirut, 1908), p. 134; cf. English transl., H. A. R. Gibb, *The Damascus Chronicles of the Crusades*, (London, 1932), p. 41.
5. Ibn al-Athīr, *al-Kāmil fi'l-ta'rīkh*, ed. C. J. Thornberg (Leiden, 1851–1876), 10:185, year 491.
6. *Ibid.*, 10: 192–193, year 492.
7. E. Ashtor, "The Social Isolation of the *Ahl adh-Dhimma*," *Pal Hirschler Memorial Book* (Budapest, 1949), pp. 73–94.
8. Abū Shāma, *Kitāb al-Rawḍatayn fi akhbār al-dawlatayn*, 2nd edition, ed. M. Hilmī Ahmad (Cairo, 1962), 1 pt. 2: 621–622.

9. Ahmedi in *Osmanli Tarihleri,* ed. N. Atsiz (Istanbul, 1949), p. 7; cf. Paul Wittek, *The Rise of the Ottoman Empire* (London, 1938), p. 14.
10. Oruç, *Die frühosmanischen Jahrbucher des Urudsch,* ed. F. C. H. Babinger (Hanover, 1925), p. 124; *Oruç Beğ Tarihi,* ed. N. Atsiz (Istanbul, 1972), pp. 108–9.
11. English transl., E. J. W. Gibb, *The Capture of Constantinople* (London, 1879) pp. 33–34 (slightly revised); cf. Sa'd al-Din, *Taj al-tavarih* (Istanbul, 1279 A.H.), 1:419ff.
12. Tursun, *The History of Mehmed the Conqueror,* ed. and trans. H. Inalcik and R. Murphy (Minneapolis and Chicago, 1978), fols. 156a–156b.
13. Neşri, *Gihānnümā, die Altosmanische Chronik des Mevlānā Mehemmed Neschrī,* ed. F. Taeschner (Leipzig, 1951), 2:307–8; *Kitab-i Cihan Nüma, Neşri Tarihi,* ed. F.R. Unat and M.A. Köymen (Ankara, 1949), 2: 838–39.
14. R. Knolles, *The generall historie of the Turkes, from the first beginning of that nation to the rising of the Othoman families* (London, 1603), p.1.
15. Eskandar Monshi, *History of Shah Abbas the Great,* trans. R. M. Savory, (Boulder, 1978), 2:1202–3.
16. *Tarih al-Hind al-Garbi* (Istanbul, 1729), fol. 6bff.
17. On this project, see the article of H. Inalcik, "Osmanli-Rus rekabetinin menşei ve Don Volga Kanali teşebbüsü (1569)," *Belleten* 46 (1948): 349–402; English version, "The Origins of the Ottoman-Russian Rivalry and the Don Volga Canal, 1569," *Annals of the University of Ankara* 1 (1946–47): 47–107.
18. Ogier Ghiselin de Busbecq, *The Turkish Letters . . . ,* trans. C. T. Forster and F. H. B. Daniell (London, 1881), 1: 129–30; cf. *The Turkish Letters . . . ,* trans. W. S. Forster (Oxford, 1927), pp. 40–41.
19. *Silihdar tarihi* (Istanbul, 1928), 2:80.
20. *Ibid.,* 2:87; cf. German transl., R. F. Kreutel, *Kara Mustafa vor Wien* (Graz, 1955), pp. 160 and 166.
21. Cited in Ahmet Refik, *Ahmet Refik hayati secme şiir ve yazilari,* ed. R. E. Koçu (Istanbul, 1938), p. 101.
22. F. von Kraelitz-Greifenhorst, "Bericht über den Zug des Gross-Botschafters Ibrahim Pascha nach Wien im Jahre 1719," *Akademie der Wiss. Wien: Phil. Hist. Kl. Sitzungsberichte* 158 (1909): 26–77.
23. *Das Asafname des Lutfi Pascha,* ed. and trans. R. Tschudi (Berlin, 1910), p. 34.
24. *Mühimme defteri,* vol. 16, no. 139: "Donanma-i hümayun küffar-i ḫaksar donanmasi ile mülaki olup iradet Allah nev'-i aḫire müte-'allik oldu . . ." Cf. M. Lesure, *Lepante: la crise de l'empire Ottoman* (Paris, 1972), p. 180.
25. *Tarih-i Peçevi* (Istanbul, 1283 A.H.), 1: 498–99; cf. A. C. Hess, "The

Battle of Lepanto and its Place in Mediterranean History," *Past and Present* 57 (1972): 54.
26. Kemalpaşazade, *Histoire de la campagne de Mohacz . . .*, ed. and trans. M. Pavet de Courteille (Paris, 1859), pp. 24–27.
27. Qur'ān, 60.1; cf. Qur'ān 5.51.
28. *Tarih-i Cevdet* (Istanbul, 1301–1309 A.H.) 5:14.
29. Vasif in Cevdet, 4:357–58; cf. French transl., Barbier de Meynard, "Ambassade de l'historien Turc Vacif-Efendi en Espagne (1787–1788)," *Journal Asiatique* 5 (1862): 521–23.
30. V. L. Ménage, "The English Capitulations of 1580: A Review Article," *International Journal of Middle Eastern Studies* 12 (1980): 375.
31. Ibrahim Müteferrika, *Uṣūl al-ḥikem fī niẓām al-umem* (Istanbul, 1144 A.H.); *idem*, French version, *Traité de la Tactique* (Vienna, 1769).
32. T. Öz, ed., "Selim III ün Sirkatibi tarafindan tutulan Ruzname," *Tarih Vesikalari* 3 (May, 1949): 184; cf. Cevdet, 6:130; cf. B. Lewis, "The Impact of the French Revolution on Turkey," in *The New Asia: Readings in the History of Mankind*, ed. G.S. Metraux and F. Crouzet (1965), p. 119, n. 37.
33. Cevdet, 6: 118–19; see further B. Lewis, "The Impact of the French Revolution . . .," p. 57, n. 12.
34. E. Z. Karal, "Yunan Adalarinin Fransizlar tarafindan işgali," *Tarih Semineri Dergisi*, (1937), p. 113 ff; Cevdet, 6: 280–81.
35. Cevdet, 6: 311; cf. Bernard Lewis, *The Emergence of Modern Turkey* (London, 1968), pp. 66–67.
36. Jabartī, *'Ajā'ib al-athār fī al-tarājim wa'l-akhbār* (Būlāq, 1297 A.H.), 3:2–3.
37. Nicola Turk, *Chronique d'Egypte 1798–1804*, ed. and trans. Gaston Wiet (Cairo, 1950), text pp. 2–3; cf. French transl., pp. 3–4. See also George M. Haddad, "The historical work of Niqula el-Turk, 1763–1828," *Journal of the American Oriental Society*, 81 (1961), pp. 247–51.
38. *Ibid.*, p. 173; cf. French translation, p. 223.
39. E. Ziya Karal, *Halet Efendinin Paris Büyük Elçiligi 1802–1806* (Istanbul, 1940), pp. 32–34, 35, and 62; cf. B. Lewis, "The Impact of the French Revolution . . .," p. 54.
40. *Asim Tarihi* (Istanbul, n.d.), 1:374–76; cf. Cevdet, 8:147–48 and Bernard Lewis, *The Emergence of Modern Turkey*, p. 72.

Chapter II

1. H. R. Idris, "Commerce maritime et kirāḍ en Berberie orientale," *JESHO*, 14 (1961), pp. 228–29.

2. W. Cantwell Smith, *The Meaning and End of Religion* (New York, 1964), pp. 58ff, 75ff; cf Marcel Simon, *Verus Irael* (Paris, 1948), p. 136 ff.
3. Qur'ān, 112.
4. *Ibid.,* 16.115.
5. *Ibid.,* 109.
6. See D. Santillana, *Instituzioni di Diritto Musulmano,* 1 (Rome, 1926): 69–71; L. P. Harvey, "Crypto-Islam in Sixteenth Century Spain," *Actas del Primer Congreso de Estudios Árabes e Islámicos* (Madrid, 1964), pp. 163–178; al-Wansharīshī, *Asnā al-matājir fī bayān aḥkām man ghalaba ʿala waṭanihi al-naṣārā wa-lam yuhājir,* ed. Ḥusayn Mu'nis, in *Revista del Instituto Egipcio de Estudios Islámicos en Madrid* 5 (1957): 129–191.
7. Ṣāʿid b. Aḥmad al-Andalūsī, *Kitāb Ṭabaqāt al-Umam,* (Cairo, n.d.), p. 11; cf. French transl., R. Blachère, *Livre des catégories des nations, Publications de l'Institut des Hautes Études Marocaines* 28 (Paris, 1935): 36–37.

Chapter III

1. Rashīd al-Dīn, *Histoire universelle . . . ,* I, *Histoire des Franks,* ed. and trans. K. Jahn (Leiden, 1951), text p. 11; cf. French transl., p. 24; cf. German transl., K. Jahn, *Die Frankengeschichte des Rašīd ad-Dīn* (Vienna, 1977), p. 54.
2. G.S. Colin, "Un petit glossaire hispanique arabo-allemand de début du XVI^e siècle," *al-Andalus* 11 (1946): 275–81.
3. On the translation movement and its accomplishments, see F. Rosenthal, *The Classical Heritage in Islam* (London, 1975).
4. On the Orosius version, see G. Levi Della Vida, "La traduzione araba delle storie di Orosio," *al-Andalus* 19 (1954): 257–93.
5. Awḥadī, ed. M. Hamidullah, "Embassy of Queen Bertha to Caliph al-Muktafi billah in Baghdad 293/906," *Journal of the Pakistan Historical Society* 1 (1953): 272–300. See further, G. Levi Della Vida, "La corrispondenza di Berta di Toscano col Califfo Muktafi," *Rivista Storica Italiana* 66 (1954): 21–38; C. Inostrancev, "Notes sur les rapports de Rome et du califat abbaside au commencement du X^e siècle," *Rivista degli Studi Orientali* 6 (1911–1912): 81–86.
6. Ibn al-Nadīm, *Kitāb al-Fihrist,* ed. G. Flügel (Leipzig, 1871), 1: 15–16; cf. English transl., B. Dodge (New York, 1970), 1: 28–31.
7. Both volumes of Osman Ağa's memoirs were first published in German translation: see R. F. Kreutel and O. Spies, *Leben und Abenteuer des Dolmetschers ʿOsman Ağa* (Bonn, 1954), and R. F. Kreutel, *Zwischen Paschas und Generalen* (Graz, 1966). The Turkish text of one

volume has been edited by R. F. Kreutel, *Die Autobiographie des Dolmetschers 'Osman Ağa aus Temeschwar* (Cambridge, 1980).

8. Ö. L. Barkan, *XV ve XVIinci asirlarda Osmanli Imparatorluğunda zirai ekonominin hukuki ve mali esaslari*, vol. 1, *Kanunlar* (Istanbul, 1943), p. 213.
9. See J. Wansbrough, "A Mamluk Ambassador to Venice in 913/1507," *Bulletin of the School of Oriental and African Studies* 26, pt. 3 (1963): 503–30.
10. F. Babinger, "Der Pfortendolmetscher Murad und seine Schriften," in *Literaturdenkmäler aus Ungarns Türkenzeit*, ed. F. Babinger et al. (Berlin and Leipzig, 1927) pp. 33–54.
11. Evliya, *Seyahatname* (Istanbul, 1314 A.H.), 7: 322; cf. German translation, R. F. Kreutel, *Im Reiche des Goldenen Apfels* (Graz, 1957), p. 199.
12. Evliya, 7: 323; cf. Kreutel, p. 200.
13. Evliya, 3: 120–21.
14. Muḥammad b. 'Abd al-Wahhāb, al-Wazīr al-Ghassānī, *Riḥlat al-wazīr fī iftikāk al-asīr*, ed. Alfredo Bustānī (Tangier, 1940), p. 96; cf. French transl. by H. Sauvaire, *Voyage en Espagne d'un Ambassadeur Marocain* (Paris, 1884), pp. 225–26.
15. Kâtib Çelebi, *Irşad al-hayara ila tarih al-Yunan wa'l-Rum wa'l-Nasara*, manuscript in Türk Tarih Kurumu Library, no. 19 (no pagination). Kâtib Çelebi is also known as Hajji Khalifa, in Turkish orthography Haci Halife. The ms. is briefly described by V.L. Ménage in "Three Ottoman Treatises on Europe," *Iran and Islam*, ed. C.E. Bosworth (Edinburgh, 1971), pp. 421–23.
16. Arnold of Lübeck, *Chronicon Slavorum*, ed. W. Wattenbach, *Deutschlands Geschichtsquellen* (Stuttgart-Berlin, 1907) bk. vii, chap. 8.
17. A. Bombaci, "Nuovi firmani greci di Maometto II," *Byzantinische Zeitschrift* 47 (1954): 238–319; *idem*, "Il 'Liber Graecus,' un cartolario veneziano comprendente inediti documenti Ottomani in Greco (1481–1504)," *Westöstliche Abhandlungen*, ed. F. Meier, (Wiesbaden, 1954), pp. 288–303. See further Christos G. Patrinelis, "Mehmed II the Conqueror and his presumed knowledge of Greek and Latin," *Viator*, 2 (1971): 349–54.
18. See H. and R. Kahane and A. Tietze, *The Lingua Franca in the Levant* (Urbana, 1958).
19. L. Bonelli, "Elementi italiani nel turco ed elementi turchi nell italiano," *L'Oriente* 1 (1894): 178–96.
20. Şem'danizade, *Şem'dani-zade Findiklili Süleyman Efendi tarihi mür'it-tevarih*, ed. M. M. Aktepe (Istanbul, 1978), p. 107. See preface to *Relation de l'ambassade de Méhmet Effendi à la cour de France en 1721 écrite*

par lui même et traduite du turc par Julien Galland (Constantinople and Paris, 1757).

21. Cited in C. Issawi, "The Struggle for Linguistic Hegemony," *The American Scholar* (summer, 1981), pp. 382–87.
22. Seid Mustafa, *Diatribe de l'ingénieur sur l'état actuel de l'art militaire, du génie et des sciences à Constantinople* (Scutari, 1803; reprinted by L. Langlès, Paris, 1810), pp. 16–17. According to Langlès, Seid Mustafa was a graduate and later a teacher of engineering. Hammer-Purgstall, however, says that "Seid Mustafa" was a fiction and that the tract was written at the request of the Reis Efendi by the Greek dragoman Yakovaki Argyropoulo. On Y. Argyropoulo, a key figure in the early translation movement, see "Jacques Argyropoulos," *Magasin Pittoresque* (1865), pp. 127–28.
23. Şanizade, *Tarih* (Istanbul, 1290–1291 A.H.), 4: 33–35; cf. Cevdet, 11: 43 and [J. E. de Kay] *Sketches of Turkey in 1831 and 1832* (New York, 1833).
24. B. Lewis, *The Emergence of Modern Turkey,* pp. 88–89.
25. S. Ünver, *Tanzimat,* 1, Turkish Ministry of Education (Istanbul, 1940), pp. 940–41.

Chapter IV

1. For contrasting views on the significance of the Hellenistic element in Islamic civilization and of the resulting affinities with Christendom, see C.H. Becker, *Islamstudien,* vol. 1 (Leipzig, 1924), especially chapters 1, 2, 3, and 14; and also Jörg Kraemer, *Das Problem der Islamischen Kulturgeschichte* (Tübingen, 1959).
2. Ibn al-Faqīh, cited in Yāqūt, *Muʿjam al-buldān,* s.v. "Rūmiya."
3. Part of his account is preserved and quoted in Ibn Rusteh, *Kitāb al-Aʿlāq al-nafīsa,* ed. M. J. De Goeje (Leiden, 1892), pp. 119–130. See further, *Encyclopedia of Islam,* 2nd ed., s.v. 'Hārūn b. Yaḥyā' (M. Izzedin). The *Encyclopedia of Islam* will hereafter be cited as EI1. or EI2.
4. The Kadi's memoirs were published by I. Parmaksizoğlu, "Bir Türk kadisinin esaret hatiralari," *Tarih Dergisi* 5 (1953): 77–84.
5. On Osman Ağa, see above Chap. 3, n. 7. On other prisoners, see O. Spies, "Schicksale Türkischer Kriegsgefangener in Deutschland nach den Türkenkrieg," *Festschrift Werner Caskel,* ed. E. Graf (Leiden, 1968), pp. 316–35.
6. Usāma, *Kitāb al-Iʿtibār,* ed. P.K. Hitti (Princeton, 1930), p. 132; cf. English transl., P.K. Hitti, *An Arab-Syrian Gentleman and Warrior in the Period of the Crusades* (New York, 1929), p. 161.

7. On this story, see V. Barthold, "Karl Veliki i Harun ar-Rashid," *Sočineniya* 6 (Moscow, 1966): 342–64; Arabic transl. in V. V. Barthold, *Dirāsāt fī ta'rīkh Filasṭīn fi'l-ʿuṣūr al-wusṭā,* trans. A. Haddād (Baghdad, 1973): 53–103. Also see S. Runciman, "Charlemagne and Palestine," *English Historical Review* 50 (1935): 606–19.
8. See above, chap. 3, n. 5.
9. Arabic text, R. Dozy, ed., *Recherches sur l'histoire et la litterature de l'Espagne pendant le moyen âge,* 3rd ed. (Paris-Leiden, 1881), 2: 81–88; reprinted by A. Seippel, *Rerum Normannicarum Fontes Arabici* (Oslo, 1946), pp. 13–20. Cf. German translation, G. Jacob, *Arabische Berichte von Gesandten an germanische Fürstenhöfe aus dem 9. und 10. Jahrhundert* (Berlin-Leipzig, 1927), pp. 38–39; French transl. in R. Dozy, *Recherches,* 3rd ed., 2: 269–78. For discussions, see W. E. D. Allen, *The Poet and the Spae-Wife* (Dublin, 1960), and E. Lévi-Provençal, "Un échange d'ambassades entre Cordoue et Byzance au IX[e] siècle," *Byzantion* 12 (1937): 1–24, who dismisses the story as a literary fabrication based on a genuine embassy to Constantinople. See further, EI2. , s.v. "Ghazāl" (A. Huici Miranda). Also see A. A. el-Hajji, "The Andalusian Diplomatic Relations with the Vikings during the Umayyad Period," *Hesperis Tamuda,* 8 (1967): 67–110.
10. The surviving fragments of Ibrāhīm ibn Yaʿqūb's travels have formed the subject of an extensive literature. Both texts, the ʿUdhrī version as preserved by Qazvīnī and the Bakrī passages are available in print: Qazvīnī, in the *editio princeps* by F. Wüstenfeld, *Zakarija ben Muhammed ben Mahmud al-Cazwini's Kosmographie,* II, *Kitāb Athār al-bilād. Die Denkmäler der Länder* (Göttingen, 1848); the Bakrī excerpt was first edited by A. Kunik and V. Rosen, *Izvestiya al-Bekri i drugikh' autorov' o Rusi i Slavyanakh* (St. Petersburg, 1878–1903), reprinted with a critical commentary by T. Kowalski, *Relatio Ibrāhīm Ibn Jaʿkūb de itinere slavico,* in *Monumenta Poloniae Historica* 1 (Cracow, 1946): 139ff., and now conveniently accessible in an edition of Bakrī's book by A.A. el-Hajjī, ed., *Jughrāfiya al-Andalus wa-Urūba* (Beirut, 1968). Translations include G. Jacob in *Arabische Berichte . . .*, pp. 11–33; and most recently, A. Miquel, "L'Europe occidentale dans la relation arabe de Ibrāhīm b. Yaʿqūb," *Annales ESC* 21 (1966): 1048–1064. Other studies include, B. Spuler, "Ibrāhīm ibn Jaʿqūb Orientalistische Bemerkungen," *Jahrbücher für Geschichte Osteuropas,* 3 (1938): 1–10; E. Ashtor, *The Jews of Moslem Spain,* vol. 1 (Philadelphia, 1973), pp. 344–49; A.A. el-Hajji, "Ibrāhīm ibn Yaʿqūb at-Tartūshī and his diplomatic activity," *The Islamic Quarterly* 14 (1970): 22–40. See further EI2. , s.v. "Ibrāhīm b. Yaʿqūb," (A. Miquel).
11. G. Jacob, *Arabische Berichte,* p. 31, n. 1: "Es ist charakteristisch, dass der arabische Diplomat den Kaiser als Gewährsmann nicht nennt,

wahrend der jüdische Handelsmann sich mit dieser Beziehung brüstet."

12. Mentioned in the biography of John of Gorze, see R. W. Southern, *The Making of the Middle Ages* (London, 1953), p. 36ff.
13. Ibn Wāṣil, *Mufarrij al-kurūb fī akhbār banī Ayyūb,* ed. H. M. Rabie (Cairo, 1979), 4: 248.
14. Ibn Khaldūn, *Al-Ta'rīf bi-ibn Khaldūn wa-riḥlatuh gharban wa-sharqan,* ed. Muḥammad ibn Ta'wīt al-Tanjī (Cairo 1951), pp. 84–85; cf. French transl. by A. Cheddadi, *Le Voyage d'Occident en Orient* (Paris, 1980), pp. 91–92.
15. Usāma, pp. 140–141; cf. Hitti, pp. 169–76.
16. *Abū Ḥāmid al Granadino y su relación de viaje por tierras eurasiáticas,* ed. and trans. C.E. Dubler (Madrid, 1953). See further, I. Hrbek, "Ein arabischer Bericht über Ungarn," *Acta Orientalia* 5 (1955): 205–30.
17. Ibn Jubayr, *Riḥla (The Travels of Ibn Jubayr)* ed. W. Wright (Leiden, 1907), p. 303; cf. English transl. R. C. J. Broadhurst, *The Travels of Ibn Jubayr* (London, 1953), p. 318.
18. Ibn Jubayr, pp. 305–6; cf. Broadhurst, p. 321.
19. *Ibid.,* p. 301; cf. Broadhurst, pp. 316–17. The concluding quotation is from Qur'ān, 7.154.
20. Ibn Shāhīn al-Ẓāhirī, *Zubdat kashf al-mamālik,* ed. P. Ravaisse (Paris, 1894) p. 41; cf. French translation, J. Gaulmier, *La zubda kachf al-mamālik* (Beirut, 1950), p. 60. Cf. M. A. Alarcón and R. Garcia, *Los documentos árabes diplomáticos del Archivo de la corona de Aragón* (Madrid and Granada, 1940).
21. See P. Pelliot, "Les Mongols et la Papauté," *Revue de l'Orient Chrétien* 3rd ser., 23 (1922–23): 3–30, 24 (1924): 225–335, and 28 (1931); V. Minorsky, "The Middle East in Western Politics in the thirteenth, fifteenth, and seventeenth Centuries," *Royal Central Asian Society Journal* 4 (1940): 427–61; J. A. Boyle, "The Il-Khans of Persia and the Princes of Europe," *Central Asian Journal* 20 (1976): 28–40; D. Sinor, "Les Relations entre les Mongols et l'Europe jusqu'à la Mort d'Arghoun et de Bela IV," *Cahiers d'Histoire Mondiale* 3 (1956): 37–92.
22. 'Umarī, *al-Ta'rīf bil-muṣtalaḥt al-sharīf* (Cairo, 1312 A.H.).
23. Qalqashandī, *Ṣubḥ al-a'shā fī ṣinā'at al-inshā'* (Cairo, 1913ff), 8: 25ff; cf. M. Amari, "Dei titoli che usava la cancelleria di Egitto," *Mem. del. R. Acc. Linc.* (1883–84): 507–34; H. Lammens, "Correspondence diplomatiques entre les sultans mamlouks d'Égypte et les puissances chrétiennes," *Revue de l'Orient Chrétien* 9 (1904): 151–87 and 10 (1905): 359–92.
24. Qalqashandī, 7: 42ff.

25. Juvaynī, *Ta'rīkh-i jihān gushā,* ed. M. M. Qazvīnī, vol. 1 (London, 1912), pp. 38–39. Cf. English transl., J. A. Boyle, *The History of the World Conqueror* (Manchester, 1958), 1: 53.
26. Nicholas de Nicolay, *Les navigations* . . . (Antwerp, 1576), p. 246.
27. B. Lewis, *Notes and Documents from the Turkish Archives* (Jerusalem, 1952), pp. 32 and 34.
28. A. Arce, "Espionaje y última aventura de Jose Nasi (1569–1574)" *Sefarad* 13 (1953): 257–86.
29. C.D. Rouillard, *The Turk in French History, Thought, and Literature 1520–1660* (Paris, 1938), pt. 1, chap. 2.
30. M. Herbette, *Une Ambassade Persane sous Louis XIV* (Paris, 1907).
31. A. A. De Groot, *The Ottoman Empire and the Dutch Republic: A History of the Earliest Diplomatic Relations 1610–1670* (Leiden, 1978), pp. 125–29.
32. On the reports of Ottoman embassies to Europe and elsewhere, see F. Babinger, *Die Geschichtsschreiber der Osmanen und ihre Werke* (Leipzig, 1927), pp. 322–37, hereafter cited as *GOW;* and for a much fuller account, F. R. Unat, *Osmanli Sefirleri ve Sefaretnameleri* (Ankara, 1968). A few of these texts have been translated (see Babinger, *loc. cit.*); the best and most recent are the annotated German versions published by R. F. Kreutel in his series, *Osmanische Geschichtsschreiber* (Graz, 1955ff). On European diplomacy in Istanbul, see B. Spuler, "Die europäische Diplomatie in Konstantinopel bis zum Frieden von Belgrad (1739)," *Jahrbücher für Kultur und Geschichte der Slaven,* 11 (1935): 53–115, 171–222, 313–366; idem, "Europäische Diplomaten in Konstantinopel bis zum Frieden von Belgrad (1739)," *Jahrbücher für Geschichte Osteuropas* 1 (1936): 229–62, 383–440.
33. See Babinger, *GOW,* p. 325.
34. See K. Teply, "Evliyā Çelebi in Wien," *Der Islam* 52 (1975): 125–31.
35. Evliya, 7: 398–99; cf. Kreutel, p. 160–61.
36. There are several editions of the embassy report of Mehmed with some variations in the text. The book was first published in Paris and Istanbul with a French translation as *Relation de l'embassade de Méhmet Effendi à la cour de France en 1721 écrite par lui même et traduit par Julién Galland* (Constantinople and Paris, 1757). I have used the Turkish edition of Ebuzziya, ed., *Paris Sefaretnamesi* (Istanbul, 1306). When this book was already in proof a new edition of Galland's version appeared—Mehmed Efendi, *Le paradis des infidèles,* ed. Gilles Veinstein, (Paris, 1981).
37. Mehmed Efendi, p. 345; cf. French transl., pp. 34ff.
38. *Ibid.,* p. 43; cf. French transl., p. 49.
39. *Ibid.,* p. 64; cf. French transl., pp. 62–63.
40. Duc de St. Simon, cited in N. Berkes, *The Development of Secularism in*

Turkey (Montreal, 1964), p. 35. For a brief but illuminating appreciation of Mehmed and his role see A. H. Tanpinar, *XIX Asir Türk edebiyati tarihi*, vol. 1 (Istanbul, 1956), pp. 9ff.

41. Resmi, *Viyana Sefaretnamesi* (Istanbul, 1304), p. 33.
42. Azmi, *Sefaretname 1205 senesinde Prusya Kirali Ikinci Fredrik Guillaum'in nezdine memur olan Ahmed Azmi Efendinin dir* (Istanbul, 1303 A.H.), p. 52; Resmi, *Berlin Sefaretnamesi* (Istanbul, 1303), p. 47.
43. Vasif's report is printed in Cevdet, 4: 348–58.
44. Vasif in Cevdet, 4: 349–50.
45. On Ratib, see Cevdet, 5: 232ff; F. R. Unat, *Osmanli Sefirleri*, pp. 154–62; C. V. Findley, *Bureaucratic Reform in the Ottoman Empire: The Sublime Porte, 1789–1922* (Princeton, 1980), pp. 118 and 372; S. J. Shaw, *Between Old and New, The Ottoman Empire Under Sultan Selim III* (Cambridge, Mass., 1971), pp. 95–98.
46. On Moroccan ambassadors and other Muslim travelers to Spain, see H. Pérès, *L'Espagne vue par les Voyaguers Musulmans de 1610 a 1930* (Paris, 1937).
47. See above chapter 3, note 14.
48. S.C. Chew, *The Crescent and the Rose* (Oxford, 1937), pp. 327–33.
49. M. Herbette, *Une Ambassade Persane*, passim.
50. On Shirāzī, see C. A. Storey, *Persian Literature*, vol. 1, pt. 2 (London, 1953) pp. 1067–8.
51. Parts of this narrative were translated from a manuscript by A. Bausani, "Un manoscritto Persiano inedito sulla Ambasceria di Ḥusein Ḫān Moqaddam Āğūdānbāšī in Europa negli anni 1254–1255 H. (1838–39 A.D.)," *Oriente Moderno* 33 (1953). The original was published in Iran but from a different manuscript, *Sharḥ-i ma'mūriyat-i Ājūdān bāshī (Ḥusayn Khān Niẓām ad-Dawla) dar Safārat-i Otrīsh, Farānsa, Inglistān* (Tehran (?), 1347 S.).
52. A. Bausani, "Un manoscritto Persiano . . . ," p. 488. This paragraph is missing from the Tehran edition.
53. Ilyās b. Ḥannā, *Le plus ancien voyage d'un Oriental en Amerique (1668–1683)*, ed. A. Rabbath, S. J. (Beirut, 1906). This edition first appeared in the Beirut review *al-Mashriq*, nos. 18 (Sept. 1905) through 23 (Dec. 1905) as "Premier voyage d'un oriental en Amerique."
54. Azulay, *Ma'gal ṭōḇ ha-shalem*, ed. A. Freimann (Jerusalem, 1934); English transl. in E. Adler, *Jewish Travellers*, pp. 345–68.
55. P. Preto, *Venezia e i Turchi* (Padua, 1975), p. 128 citing P. Paruta, *Historia della guerra di Cipro* (Venice, 1615), p. 35. On the Turkish colony in Venice, see also A. Sagrado and F. Berchet, *Il Fondacho dei Turchi in Venezia* (Milan, 1860), pp. 23–28 and G. Verecellin, "Mercanti Turchi a Venezia alla fine del cinquecento," *Il Veltro:*

Rivista della Civiltà Italiana, 23, nos. 2–4 (Mar.–Aug., 1979): 243–75. On the role of Venice as intermediary between Turkey and Europe, see W. H. McNeill, *Venice, the Hinge of Europe 1081–1797* (Chicago, 1974).

56. Preto, p. 129.
57. *Ibid.,* p. 132.
58. *Ibid.,* p. 139.
59. Sir Joshua Hassan, *The Treaty of Utrecht and the Jews of Gibraltar* (London, 1970).
60. For an early example, see F. Babinger, " 'Bajezid Osman' (Calixtus Ottomanus), ein Vorläufer und Gegenspieler Dschem-Sultans," *La Nouvelle Clio* 3 (1951): 349–88.
61. There is a considerable literature on Jem and his adventures in Europe, notably L. Thuasne, *Djem-Sultan: Etude sur la question d'Orient à la fin du XV^e^ siècle* (Paris, 1892); and I.H. Ertaylan, *Sultan Cem* (Istanbul, 1951). The Turkish memoirs were published under the title, *Vakiat-i Sultan Cem* (Istanbul, 1330 A.H.). See further, *EI2.* , s.v. "Djem," (H. Inalcik). For a collection of letters addressed to the sultan on this subject, see J. Lefort, *Documents grecs dans les Archives de Topkapi Sarayi, Contribution à l'histoire de Cem Sultan* (Ankara, 1981).
62. *Vakiat,* pp. 10–11.
63. Ahmad ibn Muhammad al-Khālidī, *Lubnān fī ʿahd al-Amīr Fakhr al-Dīn al-Maʿnī al-Thānī,* eds. Asad Rustum and Fu'ād Bustānī (Beirut, 1936, reprinted 1969), pp. 208–41, Mr. Arnon Gross, to whose unpublished study of this text I am indebted, has shown that the text is not, as the editors suggest, a "fake" but is an interpolation based on an authentic narrative.
64. Şerafettin Turan, "Barak Reis'in, Şehzade Cem mes'elesiyle ilgili olarak Savoie 'ya gönderilmesi," *Belleten* 26, no. 103 (1962): 539–55; V.L. Ménage, "The Mission of an Ottoman Secret Agent in France in 1486," *Journal of the Royal Asiatic Society* (1965): 112–32.
65. S. Skilliter, "The Sultan's Messenger, Gabriel Defrens: An Ottoman Master-Spy of the Sixteenth Century," *Wiener Zeitschrift für die Kunde des Morgenlandes,* ed. A. Tietze, vol. 68 (Vienna, 1976), pp. 47–59.
66. ʿUmarī, ed. M. Amari, "Al-ʿUmarī, Condizioni degli stati Cristiani dell' Occidente secondo una relazione di Domenichino Doria da Genova", *Atti R. Acad. Linc. Mem.,* 11 (1883): text p. 15, trans. p. 87. Hereafter cited as ʿUmarī (Amari).
67. Mehmed, p. 25; French transl., pp. 34–35.
68. Vasif, in Cevdet, 4: 349.
69. Azmi, p. 12.

70. A.W. Kinglake, *Eothen* (London, n.d.), pp. 9–11.
71. Iʿtiṣām al-Dīn, see C. A. Storey, *Persian Literature,* vol. 1, pt. 2, p. 1142. Cf. English transl., J. E. Alexander, *Mirza Itesa Modeen* (London, 1827).
72. *Masīr-i Ṭālibī ya Sefarnāma-i Mīrzā Abū Ṭālib Khān,* ed. H. Khadīv-Jam (Tehran, 1974); cf. English trans., C. Stewart, *Travels of Mirza Abu Talib Khan . . .* (London, 1814). Also see Storey, *Persian Literature,* 1, pt. 2, pp. 878–79.
73. Seyyid Ali's report was published by Ahmed Refik in *Tarih-i Osmani Encümeni Mecmuasi,* 4 (1329/1911): 1246ff, 1332ff, 1378ff, 1458ff, 1548ff. See further M. Herbette, *Une ambassade Turque sous le Directoire,* Paris, 1902.
74. On Ali Aziz, see A. Tietze, "ʿAzīz Efendis Muhayyelat," *Oriens* 1 (1948): 248–329; E. Kuran, "Osmanli daimi elçisi Ali Aziz Efendi'-nin Alman şarkiyatçisi Friedrich von Diez ile Berlin'de ilmi ve felsefi muhaberati (1797)" *Belleten* 27 (1963): 45–58; and *EI2.,* s.v. "ʿAlī ʿAzīz" (A. Tietze).
75. On these embassies, see T. Naff "Reform and the conduct of Ottoman Diplomacy in the Reign of Selim III, 1789–1807," *Journal of the American Oriental Society* 83 (1963): 295–315; E. Kuran, *Avrupa da Osmanli Ikamet Elçiliklerinin Kuruluş ve Ilk Elçilerin Siyasi Faaliyetleri 1793–1821* (Ankara, 1968); S. J. Shaw, *Between Old and New* pp. 180ff.
76. On Mehmed Raif see S. J. Shaw, *Between Old and New,* index.
77. On the Egyptian student missions, see J. Heyworth-Dunne, *An Introduction to the History of Education in Modern Egypt* (London, 1938), pp. 104ff, 221ff, and *passim.*

There is an extensive literature on Sheikh Rifāʿa in Arabic and in Western languages. See *EI1.,* s.v. 'Rifāʿa Bey' (Chemoul); further, J. Heyworth-Dunne, "Rifāʿah Badawī Rāfiʿ aṭ-Ṭahṭāwī: The Egyptian Revivalist", *BSOAS* 9 (1937–39): 961–67, 10 (1940–42): 399–415. The fullest treatment is that of Gilbert Delanoue, *Moralistes et politiques musulmans dans l'Egypte du XIXème siècle (1798–1882)* (Service de reproduction des theses, Lille, 1980), 1, chap. 5. Sheikh Rifāʿa's travels in France, entitled *Takhlīṣ al-ibrīz fī talkhīṣ Barīz* (usually known as *al-Rihla*) has been printed a number of times. References are to the (Cairo, 1958) edition.
78. Published in I. Raʿin, *Safarname-i Mīrzā Ṣāliḥ Shīrāzī,* (Tehran, 1347s). See further Storey, *Persian Literature,* I, pt 2, pp. 1148–50, and Hafez Farman Farmayan, "The Forces of modernization in nineteenth century Iran: a historical survey," in W. R. Polk and R. L. Chambers (editors), *Beginnings of Modernization in the Middle East* (Chicago 1968), pp. 122ff.

Chapter V

1. *Irşad.* See above chapter 3, n. 15.
2. See C.A. Nallino, "al-Khuwarizmi e il suo rifacimento della Geografia di Tolomeo" in *Raccolta di Scritti,* vol. 5 (Rome, 1944), pp. 458–532; D. M. Dunlop, "Muḥammad b. Mūsā al-Khwārizmī," *Journal of the Royal Asiatic Society* (1943): 248–50; and R. Wieber, *Nordwesteuropa nach der arabischen Bearbeitung der Ptolemäischen Geographie von Muḥammad b. Mūsā al-Ḫwārizmī* (Walldorf-Hessen, 1974).
3. The Muslim geographical literature of the Middle Ages is examined in two major works, one by A. Miquel, *La géographie humaine du monde musulman jusqu'au milieu du lle siècle,* 3 vols. (Paris, 1967–80), especially vol. 2, *Géographie arabe et représentation du monde: la terre et l'étranger,* chapters 6 and 7 on eastern and western Europe; the other by I.J. Kračkovsky, *Istoriya Arabskoy Geografičeskoy Literatury, Izbranniye Sočineniya,* vol. 5 (Moscow-Leningrad, 1957), Arabic transl. by S.U. Hāshim, *Ta'rīkh al-adab al-djughrāfī al-'arabī* (Cairo, 1963). For a briefer survey, see *EI2.* , s.v. "Djughrāfiya," (S. Maqbul Aḥmad). On medieval Muslim geographers' knowledge of Europe, see I. Guidi, "L'Europa occidentale negli antichi geografi arabi," *Florilegium M. de Vogüe* (1909): 263–69; E. Ashtor, "Che cosa sapevano i geografi Arabi dell'Europa occidentale?," *Rivista Storica Italiana* 81 (1969): 453–79; K. Jahn, "Das Christliche Abendland in der islamischen *Geschichtsschreibung* des Mittelalters," *Anzeiger der phil.-hist. Klasse der Österreichischen Akademie der Wissenschaften* 113 (1976): 1–19; Y.Q. al-Khūrī, "al-Jughrāfīyūn al-ʿArab wa-Urūba," *al-Abḥāth* 20 (1967): 357–92.
4. Ibn Khurradādhbeh, *Kitāb al-masālik wa'l-mamālik,* ed. M. J. de Goeje (Leiden, 1889), p. 155.
5. *Ibid.,* pp. 92–93.
6. *Ibid.,* p.153. For an important recent study see M. Gil, "The Rādhānite Merchants and the Land of Rādhān," JESHO 18 (1974): 299–328.
7. Ibn al-Faqīh, *Mukhtaṣar Kitāb al-Buldān,* ed. M. J. de Goeje (Leiden, 1885); cf. French transl., H. Massé, *Abrégé des Livre des Pays* (Damascus, 1973) p. 8.
8. Ibn Rusteh, *Kitāb al-aʿlāq al-nafīsa,* ed. M. J. de Goeje (Leiden, 1892), p. 85; cf. French transl., G. Wiet, *Les Atours Precieux* (Cairo, 1958), p. 94.
9. Masʿūdī, *Kitāb al-tanbīh wa'l-ishrāf* (Beirut, 1965), pp. 23–24; cf. French transl., Carra de Vaux, *Macoudi, le livre de l'avertissement et de la révision* (Paris, 1897), pp. 38–39.
10. Masʿūdī, *Murūj al-dhahab,* ed. and transl. F. Barbier de Meynard and

Pavet du Courteille (Paris, 1861–77) 3: 66–67; *ibid.*, 2nd ed., C. Pellat (Beirut, 1966–70) 2: 145–46; cf. revised French transl., C. Pellat (Paris, 1962–71) 2: 342.

11. On Arabic accounts of the Vikings, see A. Melvinger, *Les premières incursions des Vikings en Occident d'après les sources arabes* (Uppsala, 1955); A. A. el-Hajji, "The Andalusian diplomatic relations with the Vikings . . ." The sources were collected by A. Seippel, *Rerum Normannicarum,* and translated into Norwegian by H. Birkeland, *Nordens Historie i Middelalderen etter Arabiske Kilder* (Oslo, 1954).
12. See *EI*2. , s.v. *"Asfar,"* (I. Goldziher) and *idem. Muslim Studies* vol. 1, transl. C.R. Barber and S.M. Stern (London, 1967), pp. 268–69.
13. Masʿūdī, *Murūj,* ed. Barbier de Meynard, 3: 69–72; C. Pellat ed., 2: 147–48; cf. Pellat transl. 2: 344–45. For an English translation and discussion, see B. Lewis, "Masʿūdī on the Kings of the 'Franks,'" *Al-Masʿūdī Millenary Commemoration Volume* (Aligarh, 1960), pp. 7–10.
14. Ibn Rusteh, p. 130; cf. Wiet transl., p. 146.
15. Yāqūt, s.v. "Rūmiya." On the Arabic accounts of Rome, see I. Guidi, "La descrizione di Roma nei geografi arabi," *Archivio della Società Romana di Storia Patria* 1 (1877): 173–218.
16. *Ibid.*
17. Qazvīnī, pp. 388–89; cf. Jacob, pp. 26–27; cf. Miquel, pp. 1057–58. For a later account of catching a "large fish," probably a whale, see *Vakiat-i Sultan Cem,* pp. 9–10.
18. A. Kunik and V. Rosen, *Izvestiya al-Bekri,* pp. 34–35; T. Kowalski, *Relatio Ibrāhīm ibn Jaʿkūb,* pp. 2–3; Bakri, *Jughrāfiya,* ed. A. A. el-Hajji, pp. 160–63; G. Jacob, *Arabische Berichte,* pp. 12–13.
19. Qazvīnī, pp. 334–35; cf. Jacob, pp. 31–32; cf. Miquel, pp. 1052–53.
20. Zuhrī, pp. 229–30/77–78; cf. French transl., p. 93.
21. Idrīsī, *Opus Geographicum,* ed. A. Bombaci *et.al.,* fasc. 8 (Naples, 1978), p. 944; cf. A. F. L. Beeston, "Idrisi's Account of the British Isles," *BSOAS* 13 (1950): 267.
22. Idrīsī, *Opus,* fasc. 8, p. 946.
23. *Ibid.,* pp. 947–48.
24. Ibn Saʿīd, *Kitāb Basṭ al-arḍ fi'l-ṭūl wa'l-ʿarḍ,* ed. J.V. Gines (Tetuan, 1958), p. 134. Cf. Abū'l-Fida, *Taqwīm al-buldān,* ed. J.S. Reinaud and M. de Slane (Paris, 1840), p. 187; and Seippel, *Rerum Normannicarum,* p. 23.
25. Ibn Khaldūn, *al-Muqaddima,* ed. Quatremère (Paris, 1858) 3: 93; cf. French transl., M. de Slane, *Les Prolégomènes* (Paris, 1863–68) 3: 129; cf. English transl., F. Rosenthal, *The Muqaddima* (New York-London, 1958) 3: 117–18.
26. Ibn Khaldūn, *Kitāb al-ʿIbar* 6 (Cairo, 1867): 290–91.
27. See K. Jahn's partial edition with French translation of Rashīd al-

Dīn's section on Europe, *Histoire universelle de Rašīd ad-Dīn*, and his later German translation, *Die Frankengeschichte* . . . See further, K. Jahn, "Die Erweiterung unseres Geschichtbildes durch Rašīd al-Dīn," *Anzeiger der phil.-hist. Klasse der Österreichischen Akad. der Wiss.* (1970): 139–49 and J. A. Boyle, "Rashīd al-Dīn and the Franks," *Central Asian Journal* 14 (1970): 62–67.

28. Rashīd al-Dīn, *Histoire*, pp. 5–18; Frankengeschichte, p. 49.
29. On Piri Reis and his map, see P. Kahle, *Die verschollene Columbus-Karte von Amerika vom Jahre 1498 in einer türkischen Weltkarte von 1513* (Berlin-Leipzig, 1932); R. Almagia, "Il mappamondo di Piri Reis la carte di Colombo del 1498," *Societa Geografica Italiana, Bolletino* 17 (1934): 442–49; E. Braunlich, "Zwei türkische Weltkarten aus dem Zeitalter der grossen Entdeckungen," *Berichte . . . Verhandl. Sächs. Ak. Wiss. Leipzig, Phil. Hist. Kl.* 89, pt. 1 (1939); Afetinan, *Piri Reis'in Amerika haritasi 1513–1528* (Ankara, 1954). On Ottoman geographical literature in general, see *EI2.*, s.v. *"Djughrāfiyā,"* vi, the article by F. Taeschner; *idem*, "Die geographische Literatur der Osmanen," *Zeitschrift der Deutschen Morgenländischen Gesellschaft* 77 (1923): 31–80; A. Adnan-Adivar, *La science chez les Turcs Ottomans* (Paris, 1939); *idem*, *Osmanli Turklerinde Ilim* (Istanbul, 1943)—a fuller Turkish version of *La science*.
30. *Tarih al-Hind al-Garbi.*
31. Adnan-Adivar, *Ilim*, p. 73, citing d'Avezac, "Mappemonde Turque de 1559," *Acad. Inscr. et Belles Lettres* (Paris, 1865).
32. Kâtib Çelebi, *Mīzān al-ḥaqq fī ikhtiyār al-aḥaqq* (Istanbul, 1268 A.H.), p. 136; cf. English translation, G. L. Lewis, *The Balance of Truth* (London, 1957), p. 136.
33. Adnan-Adivar, *Science*, p. 121; *Ilim*, p. 134.
34. *Ibid.*, p. 122; *Ilim*, p. 135.
35. *Ibid.*, p. 135; *Ilim*, p. 153.
36. Vasif, *Tarih*, 2: 70; cited in J. von Hammer, *Geschichte des Osmanischen Reiches*, 2nd. ed. (Pest, 1834–36) 4: 602 and *idem*, French transl. by J. J. Hellert, *Histoire de l'Empire Ottoman* (Paris, 1835ff) 16: 248–49.
37. Hammer, *Histoire*, 16: 249 note.
38. Âli, *Künh al-ahbar* (Istanbul, 1869) 5: 9–14; *idem*, *Meva'iddü'n-Nefa'is fi kavaʿidi'l-mecalis* (Istanbul, 1956) facs. 152–53.
39. Evliya, 7: 224–25; cf. Kreutel, p. 39.
40. Oruç, ed. Babinger, p. 67. On Mehmed's alleged interest in Western scholarship, see F. Babinger, *Mehmed the Conqueror and His Time*, transl. R. Mannheim (Princeton, 1978), pp. 494ff.
41. On these works, see B. Lewis, "The Use by Muslim Historians of Non-Muslim Sources" in *Islam in History* (London, 1973), pp. 101–14.
42. V. L. Ménage, "Three Ottoman Treatises . . ." p. 423.
43. On Huseyn Hezārfenn, see H. Wurm, *Der osmanische Historiker Ḥüseyn*

b. Ğa'fer, genannt Hezārfenn . . . (Freiburg im Breisgau, 1971), esp. pp. 122–49. The mss. of the *Tenkih* are listed in Babinger *GOW*, pp. 229–30. The ms. used here is in the Hunterian Museum in Glasgow (cf. JRAS, 1906, pp. 602ff).

44. Müneccimbaşi, *Saha'if al-ahbar* (Istanbul, 1285/1868–69) 2: 652.
45. Oruç, Kreutel transl., p. 95, (from ms.; the Turkish original of this section of Oruç's book is still unpublished).
46. Firdevsi-i Rumi, *Kutb-Name*, eds. I. Olgun and I. Parmaksizoğlu (Ankara, 1980), p. 74.
47. *Ibid.*, p. 93.
48. Selaniki, ms. Nuruosmaniye 184, cited by A. Refik, *Türkler ve Kraliçe Elizabet* (Istanbul, 1932), p. 9.
49. Kâtib Çelebi, *Fezleke* (Istanbul, 1276 A.H.), 2: 234, cf. Naima, *Tarih* (Istanbul, n.d.), 4: 94.
50. *Fezleke*, 2: 134–35; cf. Naima, 3: 69–70.
51. *Ibid.*, 1: 331–33; cf. Naima 2: 80–82.
52. *Ibid.*, 2: 382; cf. Naima 5: 267. For a detailed and documented life of Cappello, see G. Benzoni in *Dizionario Biografico degli Italiani*, XVIII (Rome, 1975), pp. 786-89.
53. Peçevi, 1: 106.
54. B. Lewis, "The Use by Muslim Historians. . . ." pp. 107–8, p. 314, n. 20, citing F. V. Kraelitz, "Der osmanische Historiker Ibrāhīm Pečewi" *Der Islam* 7 (1918): 252–60.
55. Peçevi, 1: 184 (on expedition in 1552); *idem*, 1: 255 (Morisco rising in 1568–70); *idem*, 1: 343–48 (expedition against Spain); *idem*, 1: 485 (the Moriscos); *idem*, 1: 106–8 (on gunpowder and printing).
56. Naima, 1: 40ff.
57. *Ibid.*, 1: 12.
58. Silihdar, *Nusretname*, fols. 257–58. I owe this reference to Dr. C. J. Heywood.
59. Şem'danizade, 3: 21–22.
60. *Ibid.*, 1: 42–43.
61. *Icmal-i ahval-i Avrupa*. Süleymaniye Library, Esat Efendi Kismi, no. 2062. See V. L. Ménage, "Three Ottoman Treatises. . . ." pp. 425ff.
62. V. L. Ménage, "Three Ottoman Treatises. . . ." p. 428.
63. For details, see B. Lewis, *Islam in History*, p. 314 n. 26.

Chapter VI

1. F. Kraelitz, "Bericht über den Zug . . . ," p. 17.
2. Thus, the Tatar may be rhymed as *ṣabā-raftār aduw-shikâr*, "moving

like the east wind, hunting the enemy," or simply as *bad-raftâr,* "of bad demeanour."

3. E. Prokosch, *Molla und Diplomat* (Graz, 1972), p. 19, translated from an unpublished Turkish manuscript.
4. *Irşad.* See above chapt. 3, n. 15.
5. R. Kreutel, *Kara Mustafa vor Wien* (Graz, 1955), pp. 140–41, translated from an unpublished Turkish manuscript.
6. Evliya, 6:224–25; cf. Kreutel, p. 39.
7. A. Hess, "The Moriscos: An Ottoman Fifth Column in Sixteenth Century Spain," *American Historical Review* 74 (1968): 19, citing Feridun, *Münşa'at al-salatin,* 2nd ed., (Istanbul, 1275 A.H.), 2: 542; Feridun, *Münşa'āt,* 1st ed. (Istanbul, 1265), 2: 458. On Moriscos, see also above p. 180.
8. S. Skilliter, *William Harborne and the Trade with Turkey 1578–1582: A Documentary Study of the First Anglo-Ottoman Relations* (Oxford, 1977), p. 37, citing Feridun, *Münşa'at,* 2nd ed., 2: 543; Feridun, *Münşa'āt,* 1st ed., 2: 450.
9. Yāqūt, s.v. "Rūmiya."
10. N. V. Khanikov reads this as a reference to the anti-Pope, Cardinal Peter, who had adopted the style of Anacletus II; see Khanikov in *Journal Asiatique* 4 (1864): 152 and text p. 161 of commentary.
11. Ibn Wāṣil, 4: 249.
12. Qalqashandī, 8: 42ff. The odd title "protector of bridges" may be an echo of *Pontifex Maximus.*
13. *Irşād,* see above, chap. 3, n. 15.
14. Ghassānī, pp. 52ff, 67ff; cf. Sauvaire, pp. 152ff, 162ff. The editor of the Arabic text omits some of the anti-Christian comments.
15. Ibn Wāṣil, 4: 248–49.
16. Ghazzāl, p. 24; cf. H. Pérès, *L'Espagne revue par les voyageurs Musulmans de 1610 à 1930* (Paris, 1937), pp. 29–30.
17. Azmi, p. 16.
18. F. Kraelitz, "Bericht . . . ," pp. 26ff.
19. Resmi, *Sefaretname-i Ahmet Resmi Prusya Kirali Büyük Fredrik nezdine sefaretle giden Giridi Ahmet Resmi Efindi'nin takriridir* (Istanbul, 1303 A.H.), p. 18.
20. Miknāsī, *al-Iksīr fi fikāk al-asīr,* ed. M. al-Fāsī (Rabat, 1965), *passim.*
21. Cevdet, 6: 394ff.
22. Turkish text in E. Z. Karal, *Fransa-Misir ve Osmanli Imparatorlugu (1797–1802)* (Istanbul, 1938), p. 108; Arabic in Shihāb, *Ta'rīkh Aḥmad Bāshā al-Jazzār,* ed. A. Chibli and J. A. Khalife (Beirut, 1955), p. 125.

Chapter VII

1. B. Lewis, *Islam: from the Prophet Muhammad to the Capture of Constantinople* (New York, 1974), 2:154, citing Jāḥiẓ (attrib.), *Al-Tabaṣṣur bi 'l-tijāra*, ed. H. H. 'Abd al-Wahhāb (Cairo, 1354/1935).
2. Qazvīnī, p. 388; cf. Jacob, pp. 25–26; cf. Miquel, pp. 1058–59.
3. Ibn Sa'īd, p. 134.
4. Rashīd al-Dīn, *Histoire*, pp. 4–5/17–18; *Frankengeschichte*, pp. 48–49.
5. Ibn Ḥawqal, *Kitāb Ṣūrat al-arḍ*, ed. J. H. Kraemer (Leiden, 1938), p. 110; cf. French translation, J. H. Kramers and G. Wiet, *Configuration de la terre* (Beirut and Paris, 1964), p. 109; cf. C. Verlinden, *L'Esclavage dans l'Europe médiévale*, I, *Péninsule Ibérique—France* (Bruges, 1955), p. 217; on the Ṣaqāliba, see R. Dozy, *Histoire des Musulmans d'Espagne*, 2nd ed., revised by E. Lévi-Provençal (Leiden, 1932), 2: 154, citing Liudprand, *Antapodosis*, bk. 6, chap. 6.
6. On the Slavs under the Fatimids, see I. Hrbek, "Die Slaven im Dienste der Fatimiden," *Archiv Orientalni* 21 (1953): 543–81.
7. W. Heyd, *Histoire du Commerce du Levant au Moyen-Age*, trans. F. Raynaud (Amsterdam, 1967) 1: 95; I. Hrbek, "Die Slaven . . . ," p. 548.
8. On the Tatars and their activities, see A. Fisher, *The Crimean Tatars* (Stanford, 1978); *idem*, "Muscovy and the Black Sea Slave Trade," *Canadian American Slavic Studies* 6 (1972):575–94; and *idem*, *The Russian Annexation of the Crimea 1772–1783* (Cambridge, 1970).
9. E. J. W. Gibb, *A History of Ottoman Poetry*, Vol. 3 (London, 1904), p. 217.
10. On these works, see H. Müller, *Die Kunst des Sklavenkaufs* (Freiburg, 1980).
11. On these and other stories, see A. D. Alderson, *The Structure of the Ottoman Dynasty* (Oxford, 1956), pp. 85ff; Çağatay Uluçay, *Harem* II (Ankara, 1971); *idem*, *Padişahlarin Kadinlari ve Kizlari* (Ankara, 1980); E. Rossi, "La Sultana Nūr Bānū (Cecilia Venier-Baffo) moglie di Selim II (1566–1574) e madre di Murad III (1574–1595)," *Oriente Moderno* 33 (1953): 433–41; S. A. Skilliter, "Three Letters from the Ottoman 'Sultana' Ṣāfiye to Queen Elizabeth I" in *Documents from Islamic Chanceries*, ed. S. M. Stern (Oxford, 1965), pp. 119–57.
12. Ibn al-Ṭuwayr, cited by al-Maqrīzī, *al-Mawāʿiẓ wa'l-iʿtibār bi-dhikr al-khiṭaṭ wa'l-āthār* (Būlāq, 1270/1853) 1: 444.
13. J. Richard, "An account of the Battle of Hattin," *Speculum*, 27 (1952): 168–77.
14. *Bulla in Cena Domini*, Clement VII *anno* 1527, Urban VIII *anno* 1627. Cited in K. Pfaff, "Beiträge zur Geschichte der Abendmahlsbulle vom 16. bis 18. Jahrhundert," *Römische Quartalschrift für christliche Altertumskunde* 38 (1930): 38–39.

15. *CSP* Spanish (1568–79) London 1894 (n. 609), p. 706, Spanish ambassador in London to Phillip II (28 Nov. 1579); *CSP* Venetian (1603–07), p. 326; letter dated 28 Feb. 1605 o.s. from Venetian consul in Melos to Bailo in Istanbul. I owe the references in this and the preceding note to the late V. J. Parry.
16. Qazvīnī, p. 362; cf. Jacob, p. 32.
17. Ibn Saʿīd, p. 134.
18. Rashīd al-Dīn, *Histoire*, pp. 4–5/18; *Frankengeschichte*, p. 49.
19. N. Beldiceanu, *Les actes des premiers Sultans* vol. 1 (Paris, 1960), p. 127.
20. Peçevi, 1:365; translated in B. Lewis, *Istanbul and the Civilization of the Ottoman Empire* (Norman, 1963), pp. 133–35.
21. Ghassānī, pp. 44–45; cf. Sauvaire, pp. 97–99.
22. Vasif, in Cevdet, 4:357; cf. Barbier de Meynard, pp. 520–21.
23. Mehmed, p. 109; cf. French transl., p. 163.
24. Resmi, *Sefaretname-i . . . Prusya . . .*, pp. 27–28, 33, and 36.
25. Azmi, *passim*.
26. Hashmet, *Intisāb al-mulūk*, appended to *Divān* (Būlāq, 1842), pp. 8–9.
27. *Masīr-i Ṭālibī yā Safarnāma-i Mīrzā Abū Ṭālib Khān*, ed. H. Khadīv-Jam (Tehran, 1974), p. 201ff; cf. English transl., C. Stewart, *Travels of Mirza Abu Taleb Khan . . .*, (London, 1814), vol. 2, chap. 13:1ff.
28. Karal, *Halet*, pp. 32–33.

Chapter VIII

1. Cited in *EI2.* , s.v. "Ḳaysar" (R. Paret and I. Shahid).
2. Ṭabarī, *Ta'rīkh al-rusul wa'l-mulūk*, ed. M. J. De Goeje (Leiden, 1879–1901), 3: 695. Hārūn may have been insulted because Nikephoras had previously addressed him as "King of the Arabs"—a demeaning title in Muslim terms.
3. Ghassānī, p. 41; cf. Sauvaire, pp. 90–91. *Vakiat-i Sultan Cem*, p. 21.
4. S. M. Stern, "An Embassy of the Byzantine Emperor to the Fatimid Caliph al-Muʿizz", *Byzantion* 20 (1950): 239–58.
5. Many examples are preserved in the Public Records Office in London. For further references, see *EI2.* , s.v. "Diplomatic."
6. F. Kraelitz, "Bericht . . . ," pp. 24–25. Kraelitz's German translation of this expression is based on a misunderstanding of the Turkish text.
7. Public Record Office SP 102/61/14.
8. Ghassānī, pp. 80ff.; cf. Sauvaire, pp. 181ff.
9. Mehmed, p. 65; cf. French transl. p. 97.

10. Azmī, pp. 46ff and *passim.*
11. Abū 'l-Faraj al-Iṣfahānī, *Kitāb al-Aghānī* (Bulāq, 1285) 17: 14; English translation in B. Lewis, *Islam,* 1: 27.
12. Qalqashandī, 8: 53.
13. Rashīd al-Dīn, *Histoire,* pp. 2–3/15–16; *Frankengeschichte,* pp. 46–47.
14. ʿUmarī, (Amari) text pp. 96–97; translation, p. 80.
15. Qalqashandī, 8: 46–48.
16. Rashīd al-Dīn, *Histoire,* pp. 7–8/21; *Frankengeschichte,* pp. 51–52.
17. *Irşād.* See above, chap. 3, n. 15.
18. *Icmāl-i ahval-i Avrupa.* See above, chap. 5, n. 59.
19. Mehmed, pp. 33–36.
20. Şem'danizade, 2: 22.
21. Karal, *Halet,* pp. 32–44, and 62. On Halet's audience with Napoleon, see B. Flemming "Ḥālet Efendis zweite Audienz bei Napoleon," *Rocznik Orientalistyczny* 37 (1976): 129–36.
22. Asim, 1: 62, 76, 78, 175, 265, and 374–376.
23. Abu Ṭālib, *Masir,* p. 242; cf. Stewart, 2:55.
24. *Ibid.,* pp. 250–51; cf. Stewart, 2:81.
25. Qazvīnī, ed. Wüstenfeld, p. 410; cf. Jacob, pp. 21–22.
26. Usāma, pp. 138–39; cf. Hitti, pp. 167–68.
27. Jabartī, 3:117ff.
28. Abū Ṭālib, *Masīr,* pp. 278–79; cf. Stewart, pp. 101–4.
29. Rifāʿa, pp. 120 and 148.

Chapter IX

1. B. Goldstein, "The Survival of Arabic Astronomy in Hebrew," *Journal for the History of Arab Science* 3 (Spring, 1979): 31–45.
2. Usāma, pp. 132–33; cf. Hitti, p. 162.
3. U. Heyd, "The Ottoman *'Ulema'* and Westernization in the Time of Selim III and Mahmud II," *Scripta Hierosolymitana,* Vol. IX: *Studies in Islamic History and Civilization,* ed. U. Heyd (Jerusalem, 1961), pp. 74–77.
4. Qur'ān, 9.36.
5. On mining in the Ottoman Empire, see R. Anhegger, *Beitraege zur Geschichte des Bergbaus im Osmanischen Reich* (Istanbul, 1943).
6. On these matters I have profited from a paper by Dr. Rhoads Murphey, "The Ottomans and Technology," presented to the Second International Congress on the Social and Economic History of Turkey, Strasbourg, 1980. The Ottoman use of firearms was extensively discussed by V. J. Parry in *EI2.*, s.v. "Bārūd" and in "Materi-

als of War in the Ottoman Empire," *Studies in the Economic History of the Middle East*, ed. M. A. Cook (London, 1970), pp. 219–29.

7. U. Heyd, "Moses Hamon, Chief Jewish Physician to Sultan Suleyman the Magnificent," *Oriens* 16 (1963): 153, citing Nicholas de Nicolay, bk. 3, chap. 12.
8. *Ibid.*, Nicholas de Nicolay, *loc. cit.*, "bien sçavants en la Theórique et experimentez en pratique."
9. U. Heyd, "An Unknown Turkish Treatise by a Jewish Physician under Suleyman the Magnificent," *Eretz-Israel* 7 (1963): 48–53.
10. U. Heyd, "Moses Hamon . . . ," pp. 168–69.
11. Adnan-Adivar, *Science*, pp. 97–98; *Ilim*, pp. 112–13. A Persian physician called Bahā al-Dawla (d. ca. 1510), in a work entitled *Khulāsat al-Tajārib*, the quintessence of experience, wrote a few pages on syphilis, which he calls "the Armenian sore" or "the Frankish pox." According to this author, the disease originated in Europe, from which it was brought to Istanbul and the Near East. It appeared in Azerbayjan in 1498, and spread from thence to Iraq and Iran (Haskell Isaacs, "European influences in Islamic medicine," *Mashriq: Proceedings of the Eastern Mediterranean Seminar, University of Manchester 1977–1978*). The same article also discusses a work produced in the Ottoman lands in the second half of the seventeenth century, by the Syrian physician of Sultan Mehmed IV.
12. *Idem, Science*, pp. 128–29; *Ilim*, pp. 141–43.
13. Mehmed, pp. 26ff and 122; cf. French transl. pp. 36–40, 186–90.
14. *Tarih-i 'Izzi* (Istanbul, 1199 A.H.), pp. 190a–190b.
15. Busbecq, pp. 213–14; cf. E. G. Forster, p. 135; cf. Forster and Daniell, 1: 125.
16. O. Kurz, *European Clocks and Watches in the Near East* (London, 1975), pp. 70–71, citing Rousseau, *Confessions*, English transl. (1891), p. 3; Voltaire, *Correspondence*, ed. T. Bestermann, vol. 78 (Geneva 1962), p. 127; and S. Tekeli, *16'inci Asirda Osmanlilarda saat ve Takiyuddin'in "Mekanik saat konstruksuyonouna dair en parlak yildizlar" adli eseri* (Ankara, 1966).
17. Jāmī, *Salāmān va-Absāl* (Tehran, 1306s), p. 36; English translation by A. J. Arberry, *Fitzgerald's Salaman and Absal* (Cambridge, 1956), p. 146; cit. Lynn White Jr., *Medicine, Religion and Technology* (Berkeley and Los Angeles, 1978), p. 88.
18. Janikli Ali Pasha's memorandum survives in a ms. in the Upsala University Library.
19. Adnan-Adivar, *Science*, pp. 142ff; *Ilim*, pp. 161–63.
20. Baron F. de Tott, *Memoires* (Maestricht, 1785) 3: 149.
21. G. Toderini, *Letteratura turchesca* (Venice, 1787) 1: 177ff.

22. Aubert du Bayet (later Dubayet) was born in New Orleans and had fought in the American Revolution under Lafayette. He had been active in the French Revolution from the start and sat in the French legislative assembly as deputy for Grenoble.
23. B. Lewis, *Emergence,* pp. 85ff.

Chapter X

1. S.K. Yetkin, *L'Architecture Turque en Turquie* (Paris, 1962), pp. 133ff.
2. Mehmed, p. 199; cf. Kreutel and Spies (Bonn, 1954), p. 71, where the same saying is quoted.
3. A. Refik, *Hicri on ikinci asirda Istanbul hayati (1100–1200)* (Istanbul, 1930), p. 58; Adnan-Adivar, *Science,* pp. 125–26; *idem, Ilim,* p. 133; Berkes, *Secularism,* p. 27.
4. Karal, *Tanzimat,* p. 19; Berkes, *Secularism,* p. 33.
5. Mehmed, p. 91; cf. French transl., p. 137.
6. *Ibid.,* pp. 139–40; cf. French transl., p. 214.
7. *Ibid.,* p. 78; cf. French transl., p. 118.
8. *Ibid.,* p. 109; cf. French transl., p. 163. Behzad was a famous Persian painter; Mani, the founder of the Manichean religion, is famed in Muslim legend as a great artist.
9. F. Babinger, "Vier Bauvorschläge Leonardo da Vinci's an Sultan Bajezid II. (102/3)," *Nachrichten der Akad. der Wiss. in Göttingen, I. Phil.-Hist. Klasse,* no. 1 (1952): 1–20; *idem,* "Zwei Bildnisse Mehmed II von Gentile Bellini," *Zeitschrift für Kulturaustausch* 12 (1962): 178–82; J. von Karabacek, *Abendländische Künstler zu Konstantinopel im XV. und XVI. Jahrhundert:* I, *Italienische Künstler am Hofe Muhammads II. des Eroberers 1451–1481* (Vienna, 1918).
10. N. Atasoy, "Nakkaş Osman'in padişah portreleri albümü," *Türkiyemiz* 6 (1972): 2–14 where color prints of the twelve sultans, from Osman to Murad III, are given.
11. See A. Boppe, *Les peintres du Bosphore* (Paris, 1911); and R. van Luttervelt, *De "Turkse" Schilderijen van J.B. Vanmour en zijn School* (Istanbul, 1958).
12. On Turkish painting and decoration, see G. M. Meredith-Owens, *Turkish Miniatures* (London, 1963), p. 16; N. Atasoy and F. Çağman, *Turkish Miniature Painting* (Istanbul, 1974); G. Renda, *Batililaşma döneminde Türk resim sanati* (Ankara, 1977).
13. A. Destrée, "L'ouverture de la Perse à l'influence européenne sous les Rois Safavides et les incidences de cette influence sur l'évolution de l'art de la miniature," *Correspondence d'Orient* 13–14 (1968): 91–104.

14. Cited in W. Blunt, *Isfahan Pearl of Persia* (London and Toronto, 1966), p. 100.
15. Cited in A. Destrée, "L'ouverture . . . ," p. 97.
16. I. Stchoukine, *Les peintures des manuscrits de Shah ʿAbbas Iᵉʳ* (Paris, 1964).
17. B. Gray, "A Fatimid Drawing," *British Museum Quarterly* 12 (1938): 91–96.
18. See facsimiles in Jahn (ed.), Rashīd al-Dīn, *Frankengeschichte;* D. S. Rice, "The seasons and the labors of the months in Islamic art," *Ars Orientalis,* I (1954), pp. 1–39.
19. On Levni, see S. Ünver, *Levnî* (Istanbul, 1957).
20. The date in the colophon (1190/1776) is certainly wrong, as the Frenchwoman is depicted wearing a Phrygian cap with tricolor. A similar but rather better ms. in the Istanbul University Library is dated 1206/1793. See Norah M. Titley, *Miniatures from Turkish Manuscripts* (London, 1981), n. 23. See further, G. Renda, *Batılılaşma . . . ,* pp. 220ff; E. Binney, *Turkish Miniature Paintings and Manuscripts* (New York, 1973) p. 102.
21. G. Renda, *Batılılaşma, passim.*
22. Qazvīnī, p. 404; cf. Jacob, p. 29; cf. Miquel, p. 1062.
23. Evliya, 7:312; cf. Kreutel, p. 185.
24. Mehmed, pp. 83ff; cf. French transl. pp. 127–31.
25. Ghassānī, p. 97ff.; cf. Sauvaire, p. 277ff; cf. Miknāsī, pp. 624–25.
26. Vasif, in Cevdet, 4:355; cf. Barbier de Meynard, p. 518.
27. E. de Leone, *L'Impero Ottomano nel primo periodo delle riforme (Tanzimat) secondo fonti italiani* (Milan, 1967), pp. 58–59, citing Cesare Vimercati, *Constantinople e l'Egitto* (Prato, 1849), p. 65.
28. A. Slade, *Records of Travel in Turkey, Greece . . .* (London, 1832) 1: 135–36. On the harem orchestra, see Princess Musbah Haidar, *Arabesque,* revised ed., (London, 1968), p. 61.
29. Ghassānī, p. 62; cf. Sauvaire p. 141.
30. Ghazāl, p. 20; cf. Miknāsī, pp. 107–9 and 139.
31. Hatti in *Tarih-i Izzi,* pp. 190ff.
32. On the theatre, see A. Bombaci, "Rappresentazioni drammatiche di Anatolia," *Oriens* 16 (1963): 171–93; *idem,* "Ortaoyunu," *Wiener Zeitschrift für die Kunde des Morgenlandes* 56 (1960): 285–97; M. And, *A History of Theatre and Popular Entertainment in Turkey* (Ankara, 1963–64); *idem, Karagöz, Turkish Shadow Theatre* (Ankara, 1975).
33. Vasif, in Cevdet, 4: 355; cf. Barbier de Meynard, p. 518.
34. Miknāsī, pp. 52 and 70.
35. Evliya, 7: 267; cf. Kreutel, p. 108.
36. Bibliotheque National, Arabe no. 6243. See Blochet, Catalogue, p. 219.

Chapter XI

1. Sir William Jones, "A Prefatory Discussion to an Essay on the History of the Turks," in *The Works of Sir William Jones,* vol. 2 (London, 1807), pp. 456–57.
2. Ibn Rusteh, pp. 129–30.
3. Qazvīnī, pp. 334–35; cf. Jacob, p. 32; cf. Miquel, p. 1053.
4. Abū Ṭālib, *Masīr,* p. 74; cf. Stewart, pp. 135–37.
5. Evliya, 7: 318–19; cf. Kreutel, pp. 194–95.
6. Rifāʿa, pp. 119–20.
7. Abū Ṭālib, *Masīr,* p. 268; cf. Stewart, pp. 135–37.
8. Vasif, pp. 349, 351; cf. Barbier de Meynard, pp. 508, 512.
9. *Sharḥ-i maʿmūriyat-i Ājūdān bāshī . . . ,* p. 385; Bausani, "Un manoscritto persiano . . . ," pp. 502–3.
10. On al-Ghazāl, see above, chap. 4, note 9.
11. Qazvīnī, pp. 404 and 408; cf. Jacob, pp. 29, 30–31; cf. Miquel, p. 1062. Also cf. Jacob p. 14 and Kunik-Rosen, p. 37.
12. Usāma, pp. 135–36; cf. Hitti, pp. 164–65.
13. Ibn Jubayr, pp. 305–6; cf. Broadhurst, pp. 320–21.
14. Evliya, 7: 318–19; cf. Kreutel, pp. 194–95.
15. Ghazāl, pp. 12 and 23.
16. Mehmed, p. 25; cf. French transl., pp. 34–35.
17. Abū Ṭālib, *Masīr,* pp. 225–26; cf. Stewart, 2:27–31.
18. *Ibid.,* pp. 315–16; cf. Stewart, 2:254–55.
19. *Ibid.,* p. 305; cf. Stewart, 2:255.
20. On Fazil see E. J. W. Gibb, *Ottoman Poetry,* 4:220 ff. On illustrated mss. of his poem, see above Chapter X, n. 20.
21. Karal, *Halet,* pp. 33–34.
22. Rifāʿa, pp. 123ff.
23. Ājūdānbāshī, p. 281; Bausani, "Un manoscritto persiano . . . ," pp. 496–97.
24. Mehmed, p. 112; cf. French transl. p. 169.
25. The original Persian text was edited and published by his son and another person in Calcutta in 1812. An Urdu version appeared in Muradabad in India in 1904. A scholarly edition of the text—the first in Iran—was published in Tehran a few years ago. In contrast, an English version published in London in 1810 enjoyed considerable success. It was republished in a second edition, with some additional matter, in 1812. A French translation from the English appeared in Paris in 1811 and another in 1819. A German translation from the French was published in Vienna in 1813. The English version is, to put it charitably, remarkably free and is

probably the result of some form of oral translation through an intermediary.

Chapter XII

1. S. Moreh, ed. and trans., *Al-Jabartī's Chronicle of the First Seven Months of the French Occupation of Egypt* (Leiden, 1975), p. 117.
2. Jabartī, *ʿAjāʾib,* 3: 34–35.
3. *Dictionnaire français-arabe d'Ellious Bochtor Egyptien . . . revu et augmenté par Caussin de Perceval* (Paris, 1828–29).
4. Mehmed, p. 43.
5. Azmi, pp. 30–31.
6. See above ch. XI note 8.
7. Ghassānī, p. 67; cf. Sauvaire, p. 150.
8. On this and other publications, see L. Lagarde, "Note sur les journaux français de Constantinople à l'époque révolutionnaire," *Journal Asiatique* 236 (1948): 271–76; R. Clogg, "A Further Note on the French Newspapers of Istanbul during the Revolutionary Period," *Belleten* 39 (1975): 483–90; and *EI*2., s.v. "Djarīda."
9. Lûtfi, *Tarih* 3: 100; cf. A. Emin, *The Development of Modern Turkey as Measured by its Press* (New York, 1914), p. 28.
10. Rifāʿa, p. 50.
11. On the first translation movement in Egypt, see Jamal al-Dīn al-Shayyāl, *Tarīkh al-tarjama wa'l-ḥaraka al-thaqāfiyya fī ʿaṣr Muḥammad ʿAlī* (Cairo, 1951), and J. Heyworth-Dunne, "Printing and Translation under Muḥammad ʿAlī," *JRAS* (1940), pp. 325–49.
12. Details in the amplified Russian translation of Storey, *Persian Literature* by Y.E. Bregel, *Persidskaya Literatura* (Moscow, 1972), pt. 2, p. 1298, where other Persian works on American and European history are listed.

اشاریہ

الف

ب

پ

ت

تاریخی کتابیں

جدید دور کے مسائل اور ان کا حل (قرآن و حدیث طیبہ کی روشنی میں)	ڈاکٹر لیاقت علی نیازی
مسلمانوں کا علم جغرافیہ اور شوقِ سیاحت	صوفی غلام مصطفیٰ تبسم
تاریخ جمہوریت	شاہد حسین رزاقی
پاکستانی مسلمانوں کے رسم و رواج	شاہد حسین رزاقی
اقبال کے آخری دو سال	عاشق حسین بٹالوی
چند یادیں چند تاثرات	عاشق حسین بٹالوی
ہماری قومی جدوجہد	عاشق حسین بٹالوی
شمالی پاکستان	رشید اختر ندوی
ارضِ پاکستان کی تاریخ (جلد اوّل، دوم)	رشید اختر ندوی
ہمایوں نامہ	ترجمہ رشید اختر ندوی
تزکِ بابری	ترجمہ رشید اختر ندوی
تزکِ جہانگیری	مولوی سید احمد رامپوری
تزکِ تیموری	ابو ہاشم ندوی
دربارِ اکبری	مولانا محمد حسین آزاد
شاہ جہان نامہ	محمد صالح کمبوہ / ممتاز لیاقت
تاریخِ بیت المقدس	ممتاز لیاقت
تاریخِ پنجاب معہ حالات شہر لاہور	سید محمد لطیف
تاریخِ لاہور	
تاریخِ پنجاب	

www.sang-e-meel.com
ISBN 969-35-1259-6